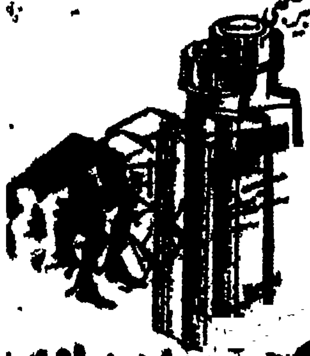


نظر نہ آئے
مگر محسوس کیے کیوں جاتے ہیں!





نزلہ
زکام اور
کھانسی کی خصوصی دوا

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان


میرے خوابوں کی سرزمین مشرقی پاکستان
صہبا لکھنوی

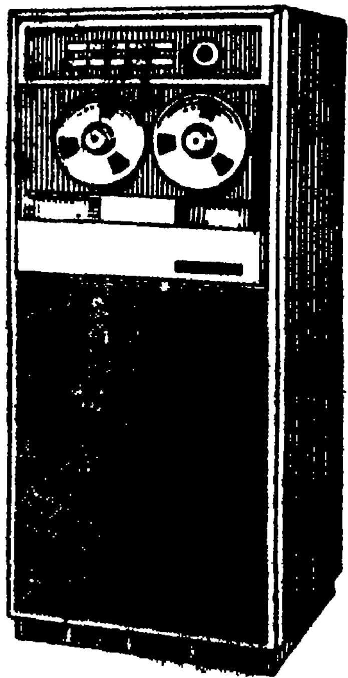


آپ اور ہمارے کمپیوٹر

جب بھی آپ کے انعامی بونڈز پر انعام نکلے گا

حبیب بینک کے کمپیوٹر

آپ کو خوشخبری دیں گے۔

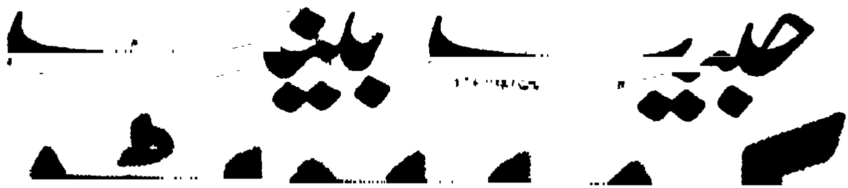


حبیب بینک نے آپ کی خدمت کے لئے نئی کمپیوٹر سروس شروع کی ہے۔ حبیب بینک کمپیوٹر جو ڈھاکہ اور کراچی میں نصب کئے جا چکے ہیں نہ صرف بڑے بڑے اداروں کی ضروریات پوری کرتے ہیں بلکہ اب آپ کی انفرادی خدمت کے لئے بھی پیش پیش ہیں۔

آپ اپنے انعامی بونڈ کے نمبر حبیب بینک کی اپنی شاخ میں درج کرا دیں اور آئندہ قرعہ اندازی میں جب بھی آپ کے کسی بونڈ پر انعام نکلے گا ہمارا کمپیوٹر ڈویژن آپ کو اس کی خوشخبری دے گا۔ یہ خدمت حبیب بینک اپنے کرم فرماؤں کیلئے بلا معاوضہ انجام دیتا ہے۔

حبیب بینک کمپیوٹر۔ سیل اور انوینٹری اکاؤنٹ۔ ڈیویڈنڈ وارنٹ۔ پبلک سروس بل۔ سیلز انالسس۔ پے رول۔ لاگت کا تخمینہ۔ بیلنس شیٹ اور مارکیٹ کے اعداد و شمار بھی ایسی برق رفتاری سے تیار کرتے ہیں جس کی کاروباری دنیا میں مثال نہیں ملتی۔

آپ حبیب بینک کے تجربہ کار اور قابل کمپیوٹر عملے پر مکمل اعتماد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ کس قسم کی خدمت درکار ہے اور آپ ان کو اپنی خدمت کے لئے ہمیشہ مستعد پائیں گے۔



حبیب بینک کمپیوٹر

کو بہتر خدمت کا موقع دیجئے

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈ کوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء
ٹیلی فون: ۷۳۹۹۳۱

سالنامہ ۶۸ء

افکار

مدیر
صہبا لکھنوی

زرِ سالانہ	بیرونی ملکوں سے	قیمت
۱۲ روپے	۴۰ شلنگ | ۱۰ ڈالر	۴ روپے

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ، کراچی

لندن آفس
۱۱۲- پرنسیز ایونیو۔ لندن۔ این ڈبلیو ۹

عبدالرحمٰن چغتائی

اوورٹائم

مزدور پسینے سے شرابور تھا
تھکن سے چور چور ہو رہا تھا
آنکھیں خون آلود تھیں
شانے جھکے ہوئے تھے
نشیب و فراز سے دوچار
معاً اس کی نگاہیں کلنڈر پر جا پڑیں
جو ایک اُجلی سی دیوار پر لگا ہوا تھا۔
اتوار کی چھٹی اور اس کا سرخ نشان
اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا،
اس کا دماغ بوجھل ہو گیا
اوورٹائم ـــــ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا
اس کے سات بچے تھے
چھ لڑکیاں اور ایک دودھ پیتا بچہ
گھسٹتے بھی تو یارڈ سے باہر نکل گیا
قدم قدم چلنے لگا۔

دور برآمدے میں مل کا مالک کھڑا تھا
مزدور نیچے کھڑے
ٹکر ٹکر مالک کا منہ دیکھ رہے تھے
مل کے مالک نے مسکراتے ہوئے کہا
اتوار کی چھٹی ہے
اتوار کو اوورٹائم نہیں ہوگا۔
مزدور چلّاتے رہے اور وہ بھی ان میں مل گیا:
اوورٹائم، اوورٹائم!
مندھی مندھی آنکھیں بے نور ہو رہی تھیں
مالک دفتر کے دروازے تک پہنچ چکا تھا
اوورٹائم نہیں ہوگا!

چغتائی

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
——— (اقبالؒ)

ترتیب

سرِ ورق :- مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائیؒ

۱۵- مختصر افسانہ

۱۶- غزل

سال: ۲۳ ○ جنوری فروری ۱۹۶۸ء ○ شمارہ: ۱۹۷-۱۹۸

ماہنامہ افکار

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی   طابع: مشہور آفسٹ پریس، کراچی   دفتر: رالسن روڈ، کراچی

اشاریہ

تیئسویں ۲۳ سالگرہ پر "افکار" کا سالنامہ حاضر ہے۔

تیئیس ۲۳ سال تک "افکار" نے زندہ رہ کر اور تعمیری و تخلیقی ادب پیش کر کے زبان و ادب کی جو بڑی جلیل خدمت انجام دی ہے وہ افکار دوستوں، رفیقوں، صاحبانِ ذوق اور اہلِ فکر و نظر سے مخفی نہیں۔ یہ سالنامہ بھی ہمارے اسی جذبۂ وارفتگی، ادبی جنون اور خوب سے خوب تر کی جستجو کا حامل ہے جس سے سرشار ہو کر ہم نے ۲۳ سال میں ان گنت منفرد و یادگار اور معیاری خاص اشاعتیں پیش کی ہیں۔

آیئے، ایک نظر اس سالنامہ پر بھی ڈال لیجیے۔ جس میں اول تا آخر تازہ و غیر مطبوعہ تخلیقات جمع کر کے ہم نے افکار کے حسن و معیار کو برقرار رکھنے کی سعی و جہد کی ہے۔ مقالوں کے حصے میں نو تخلیقات ہیں۔ جن میں عملی تنقید کے بعض بہت اچھے نمونے شامل ہیں۔ آزاد کا طرزِ نگارش، اقبال اپنے خطوط کے آئینے میں، میر کا لہجہ، رسوا کی حقیقت نگاری اور ذکاء اللہ بحیثیت مورخ نہایت فکر انگیز مقالے ہیں۔ پروفیسر کرار حسین انگریزی کے مانے ہوئے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ پہلی بار بزمِ افکار میں شامل ہو رہے ہیں۔ ان کا مقالہ "فرد کی آزادی" اردو میں نئی چیز ہے۔ اس کے علاوہ ادیب اور معاشرہ، وفاداری اور ریسرچ کی بیماری بھی قارئین کو دعوتِ فکر دیں گے۔ یہ تمام مقالے منفرد طرز و اسلوب ہی کے نہیں تنوع اور معیار کے بھی حامل ہیں۔

"نقش و عکس" کے تحت چار شخصیتوں پر مضامین شامل ہیں۔ یہ چاروں شخصیتیں آپ کی جانی پہچانی ہیں۔

مقالوں کی طرح افسانوی حصہ بھی کافی وزنی ہے۔ چار طویل افسانے اور پندرہ مختصر افسانے اس حصہ کی زینت ہیں —— ان افسانوں کی ادبی اہمیت اور وقعت کا اندازہ آپ مطالعہ کے بعد ہی لگا سکیں گے۔ ہم نے آج کے بہت اچھے افسانے پیش کئے ہیں —— لکھنے والوں میں پرانے اور نئے افسانہ نگار دونوں ہی شامل ہیں، اور یہ افسانے زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں کی عکاسی ہی نہیں اس امر کی نشان دہی بھی کرتے ہیں کہ کل کی طرح آج بھی اردو افسانہ نئے امکانات کا حامل ہے۔

طویل افسانوں میں ڈاکٹر حسن منظر کا افسانہ نائیجیریا کی زندگی کے ایک عجیب و غریب رُخ کو پیش کرتا ہے جو یقیناً سب دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

اردو میں اچھے ڈراموں کا تقریباً قحط ہے۔ ہم نے بکوشش تین ڈرامے سالنامہ کے لئے حاصل کئے ہیں۔ علی عباس حسینی کا ڈرامہ گوناگوں ادبی لطافتوں کا آئینہ دار ہے۔ میرزا ادیب اور ابراہیم یوسف کے ڈرامے آج کی زندگی کے کامیاب مرقعے ہیں، اور یہ تینوں نام اردو ڈرامے کے سلسلے میں معیار کی ضمانت ہیں۔

منظومات کے حصے میں چالیس تخلیقات پیش کی جا رہی ہیں۔ مشہور و مستند لکھنے والوں کے دوش بدوش جدید دور کے وہ نمائندہ شاعر بھی سالنامہ میں شریک ہیں جو سائنس کو وقت کی رفتار سے ہم آہنگ رکھتے ہیں۔ جدّت، تنوع، معیار اور روایت کے بانکپن کے اعتبار سے منظومات کا حصہ بھی بے حد شگفتہ اور جاندار ہے۔

ڈرامہ کی طرح طنزیہ ادب پر بھی کڑا وقت ہے — بارے ہماری کوششیں بار آور ہوئیں کہ ہم طنز و مزاح کے حصہ کو بھی مثالی بنا سکے۔ آٹھ طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات پڑھ کر آپ یقیناً خوش ہوں گے — یہ تخلیقات موضوع کے اعتبار سے رنگا رنگ اور اس عہد کے تضاد کی آئینہ دار ہیں۔

اس بار سالنامہ کے تصویری حصہ میں ادیبوں کی متعدد تصاویر کے ساتھ قرۃ العین حیدر کی ایک اچھوتی پینٹنگ بھی شامل ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر اُن افکار دوستوں کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جن کی گراں قدر تخلیقات سے ہم اس سالنامہ کو وقیع و حسین بنا سکے — اہلِ قلم رفیقوں کے پرخلوص تعاون کے بغیر اتنے کم وقت میں سالنامہ پیش کرنا ہمارے لئے ممکن نہ تھا۔

سرورق مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کے موقلم کا رہینِ منت ہے جو موصوف نے بطورِ خاص اس سالنامہ کے لئے عطا فرمایا ہے۔ اس شفقت و عنایت کے لئے ہم دل کی گہرائیوں سے اُن کے ممنون ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ سالنامہ آج کے ادب کی رفتارِ ترقی کا گواہ ہے اور اس مفروضہ کی نفی کرتا ہے کہ ادب میں جمود ہے۔ جمود کا نعرہ سچ پوچھئے تو وہی نام نہاد ادیب بلند کرتے ہیں جو خود جمود کا شکار ہیں — سچ تو یہ ہے کہ ادبی سناٹا کبھی دور میں بھی نہیں رہا — بہر طور آج زندگی کے جس موڑ پر ہم کھڑے ہیں وہاں ادب ہماری آرزوؤں کی شمع بہار بن کر نمودار ہو رہا ہے جس کی لو سے مستقبل کے نئے نئے ادیب ابھر رہے ہیں۔ اور ادب کی آبیاری میں پرانے قافلہ سالاروں کے دوش بدوش مصروف ہیں۔

[illegible]


تنقید شخصیات

چاہتا۔ لیکن یہی پہلو داری ہے کہ جس میں آزاد کی شگفتگی اور بذلہ سنجی اس کی متانت و بردباری اور وضع داری، اس کی سادہ طبعی اور رنگین مزاجی کے علاوہ اس کا بے پایاں احساس جمال بھی شامل ہے جس نے آزاد کے طرز نگارش کو ان کی ذات کا آئینہ بنایا ہے۔ اپنی تحریروں کے ایک ایک لفظ میں آزاد چھپا ہوا ہے اور انھی تحریروں کی بدولت ہم آزاد کے باطن کو یوں دیکھنے کے قابل ہوئے ہیں کہ اس طرح کبھی کسی ظاہر بیں کو نظر نہیں آتا۔

لیکن آزاد کے طرز نگارش کی رنگینی اور شگفتگی کو جس نے اسے ہمیشگی کی صفت بھی دی ہے محض اس کی ذات کے اوصاف کا آئینہ نہیں۔ پنواڑی کی دوکان پر لگی ہوئی بھونڈی تصویر اور تجریدی آرٹ کے نا قابل فہم نقش میں بھی تصویریں بنانے والوں کی ذات کے علاوہ بھی کچھ اور ہے۔ یعنی یہ دونوں طرح کی تصویریں اس لئے اچھی ہیں کہ تصویریں بنانے والے کی ذات کے علاوہ ان میں وہ زمانہ بھی شریک ہے جس میں یہ تصویریں بنی ہیں اور اس زمانے کا وہ تہذیبی ذوق بھی شامل ہے جو اس کی بنیادی خصوصیت ہے۔ بلاشبہ آزاد کے طرز نگارش پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ آزاد کا طرز نگارش اس کے زمانے کے اس تہذیبی مزاج کا آئینہ ہے جسے نئے زمانے کے سنگ دآہن نے ریزہ ریزہ کر دیا ہے اور آزاد کا طرز اپنی وضعداری کے دیوانہ پن میں تہذیبی شیشے کی انھیں کرچیوں کو سمیٹ سمیٹ کر جوڑتا اور انھیں آئینہ بناتا ہے اور یوں اس کا طرز نگارش اس کی ذات سے بھی کہیں زیادہ اس کے عہد کے مزاج کا عکس اور پرتو بن گیا ہے۔

نثر کے اسلوب کا ذکر ہو تو لفظوں کو اس کی کسوٹی بنایا جاتا ہے۔ یہ بات ہر لکھنے والا جانتا ہے، لیکن اس بات کی نزاکتوں کا احساس کم لکھنے والوں کو ہے بلکہ بہت کم لکھنے والوں کو ہے اور ان کم لکھنے والوں میں اُردو کے نثاروں میں میرے نزدیک سب سے اونچا مقام آزاد کا ہے۔ آزاد کے طرز نگارش کا تجزیہ کیا جائے تو لفظوں کی اہمیت کے سلسلے میں کئی نتیجے نکلتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو کے کسی نثار کو اس بات کا اتنا شدید احساس نہیں جتنا آزاد کو کہ لفظوں کی قدر وقیمت کے متعدد مدارج ہیں۔

"پہلا درجہ یہ کہ چھوٹے بڑے اور آسان و مشکل ہر لفظ کی ایک ذاتی قیمت ہے، پھر یہ کہ لفظ جب کسی مرکب کا جزو بن جائے تو اس کی ذاتی قیمت کی نوعیت بدل جاتی ہے اور سب سے آخر میں یہ کہ وہ کسی جملے میں استعمال ہو تو اس کے آگے پیچھے کے لفظوں سے اس کی ذاتی حیثیت کے کیف وکم کے مدارج و مراتب میں اتنی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ لفظ کا رنگ روپ ہی بدل جاتا ہے۔ اس کی ذات دوسروں کی ذات میں گم ہو جاتی ہے اور وہ دوسرے لفظوں کے ساتھ مل کر وہ کام کرتا ہے جو تنہا اس کے بس میں نہیں تھا۔ موقع محل کے اعتبار سے الفاظ کے اسی استعمال کا نام احساس تناسب، احساس جمال اور احساس اثر ہے"۔ آزاد کے طرز نگارش کی اسی خصوصیت سے ان کے طرز میں اور بہت سی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان بہت سی باتوں میں سے ایک بات اور میرے نزدیک سب سے اہم بات گفتار و تحریر کا لہجہ ہے۔ اس لہجے میں کوئی دو صاحب طرز لکھنے والے ایک سے نہیں ہوتے۔ سرسید کے لہجے میں ایک حکیمانہ متانت ہے، نذیر احمد کے یہاں خطیبانہ زور اور شوخی، حالی کے لہجے میں معصومانہ سادگی اور شبلی کے لہجے میں عالمانہ شگفتگی۔ ان سب کے مقابلے میں آزاد کے یہاں جو کئی ملی جلی چیزیں ہیں۔ انھیں میں جذبات اور تہذیبی شعریت کہتا ہوں۔ آزاد مورخ بھی ہے، تذکرہ نگار بھی، ماہر لسانیات بھی اور بچوں کا ادیب بھی لیکن اس کی نثر کا لہجہ، موضوع خواہ کچھ بھی ہو، جذبات میں ڈوبا ہوا اور تہذیبی قدروں کے عناصر میں رچا ہوا شاعرانہ لہجہ ہے۔ اور ہم اس صداقت پسندی کے جس کی توقع ہم مورخ سے رکھتے ہیں، اس حق گوئی کے جو تذکرہ نگار کا منصب اولین ہے اور اس تجزیاتی بصیرت کے جو ماہر لسانیات کو

شبہ اکر بعد سے مُصر ہیں، عبادی، تمثیل جو ان پایہ ہیں اُس کے اُسلوبِ نگارش کی کوتاہیوں پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں کر سکتے۔
اسلوبِ نگارش کی اس تہذیبی انفرادیت اور طرزِ تحریر کو تہذیبی قدروں کا ترجمان بنانے کی خصوصیت کا ذکر ہو تو ہم آزاد کے علاوہ میرامن، رجب علی بیگ سرور اور غالب کا نام بھی لیں گے لیکن اس تہذیبی انفرادیت میں شاعرانہ بیان کی اعلیٰ سے اعلیٰ قدروں کو جذب کرنے کی خصوصیت نہ میرامن کی نثر میں ہے، نہ سرور کی نثر میں اور نہ غالب جیسے بعد کے نثار کی نثر میں۔ یہ بات صرف آزاد کی نثر میں ہے۔

حالی نے آزاد کی نثر کا ذکر کرتے ہوئے اس کی خوش بیانی کی تعریف کی ہے۔ شبلی نے اس کی گپوں کو وحی کا درجہ دیا ہے اور نئے نقاد پرانے توصیفی الفاظ استعمال کر کے اس کی نثر کو نازک خیالی، لطافت، معنویت اور خیال انگیزی کے علاوہ جلال کی بنیں جان کی نثر کہتے ہیں اور مہدی افادی جیسے نکتہ سنج اور ژرف بیں نے سرسید کے "معقولات"، نذیر احمد کی "مذہبیات"، شبلی کی مورخی اور حالی کی سوانح نگاری کا لوہا مانتے ہوئے اور آزاد کو آقائے اردو مانتے ہوئے اُن کی آقائیت کی بنیاد اس کی انشا پردازی کو قرار دیا ہے اور اسی وصف کی بدولت اُسے ایسے نثار کا درجہ دیا ہے جسے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ میرا تجزیہ یہ کہتا ہے کہ آزاد کو ان میں سے کسی چیز کی ضرورت اس لئے نہیں کہ اسے کلام پر پوری قدرت حاصل ہے لفظوں کی مزاج دانی اس پر ختم ہے۔ علمی الفاظ میں روزمرہ کا چٹخارہ پیدا کرنے اور سیدھے سادے روزمرہ کو علمی مرتبہ عطا کرنے کا کمال صرف اسے آتا ہے۔ اردو کے عظمائے نثر میں سے جن کے اسلوب میں جان کھپانے کی دانستہ اور ارادی جتنی کوششیں آزاد کی نثر کی تقلید میں ہوئیں کسی اور کی نثر کے سلسلے میں نہیں ہوئیں۔ اس تقلید کے طفیل ہمیں حسن نظامی، نیاز فتح پوری اور ابوالکلام تو بے شک مل گئے لیکن "کتابِ نثر" کی تفسیریں لکھنے والوں کی نظریں سب سے پہلے آزاد کی نثر پر پڑیں گی جس نے نثر کو نظم کا مزاج اور مرتبہ دیا اور جس نے نثر اور تہذیبی قدروں کے رشتے کو پختگی بھی دی اور ہمیشگی بھی۔ ایک آخری بات اور کسی نثار کی نثر کا ذکر کرتے ہوئے ہم جذبے اور عقیدت کی رو میں بہہ کر جو الفاظ ادا کرتے اور مدح سرائی کے جو تقاضے پورے کرتے ہیں، وہ آزاد کی نثر اور اُس کے طرزِ نگارش کے معاملے میں میری ناچیز رائے کے نزدیک حق گوئی کا پیمانہ ہیں۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی

اقبال اپنے خطوط کے آئینے میں

مولوی عبدالحق صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے ۔" خط دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت وخلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا . . . . . خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوسکتا ۔"

یہ صحیح بھی ہے ۔خطوں میں انسان اپنے جذبات، سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے اور جو بات جس طرح دل میں آتی ہے کہہ ڈالتا ہے اس کے برعکس مضامین اور مقالوں میں انسان کا غور وفکر تحریر کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ یہاں دل سے زیادہ دماغ کی نمائش ہوتی ہے۔ اس لئے مقالات میں لکھنے والے کی شخصیت اتنی اجاگر نہیں ہوتی جیسی خطوط میں روشن ہوتی ہے ۔ یہی بات علامہ اقبال کے خطوط پر صادق آتی ہے ۔ان کے خطوں سے ان کی سیرت کے چند در چند پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور بہت سی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں ۔ جن کا دوسرے ذرائع سے علم نہیں ہوسکتا تھا ۔

اقبال کے خطوں کو پڑھ کر بہت سے علمی اور ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ مسائل واضح ہوجاتے ہیں اور ان کے علمی وادبی ذوق کی گہرائی وگیرائی کا اندازہ ہوتا ہے ۔یہاں ان کے ذہن کی روشنی کے ساتھ ان کے جذبے کی گرمی بھی نمایاں نظر آتی ہے بعض ایسی باتیں بھی ہیں جن کی طرف ان کی شاعری میں محض اشارے ملتے ہیں مگر خطوں میں وہ زیادہ وضاحت سے بیان ہوئی ہیں ۔اس لئے اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے ان کے مکاتیب کا مطالعہ ازبس مفید ہے ۔

شیخ عطاء اللہ صاحب کے مرتب کردہ مکاتیب اقبال کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں ۔آپ کے خطوط کے بعض دوسرے مجموعے بھی سامنے آچکے ہیں ۔چنانچہ آپ کے مکتوب الیہ حضرات میں امراء و وزراء بھی ہیں اور علماء ومشائخ بھی ۔ ادیب اور استاد بھی ہیں ۔اور سیاسی رہنما بھی ۔ احباب بھی ہیں اور عقیدت مند بھی ۔ ایسے خطوط بھی ہیں جن میں آپ نے علمی، ادبی، مذہبی، تاریخی اور سیاسی مسائل میں دوسروں کی رہنمائی کی ہے ۔ اور ایسے بھی ہیں جن میں آپ نے خود کسی بزرگ سے کوئی بات پوچھی ہے ۔ ان دونوں صورتوں میں اور ایسے تمام خطوط سے شائقین کو بیش بہا فوائد حاصل ہوتے ہیں ۔

علامہ اقبال جیسی عظیم الشان ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں ۔ آپ کو اپنی زندگی ہی میں جو مقبولیت حاصل ہوئی ۔ وہ بھی ہر ایک کو حاصل نہیں ہوا کرتی ۔اس صدی کے سبھی ارباب کمال اور اصحاب فکر و نظر آپ کے مداح اور قدردان ہیں ۔شبلی نے آپ کو ملک الشعراء کہا ۔آزاد بلگرامی نے حسان الہند کا خطاب دیا ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے امام العصر کہہ کر پکارا۔ خواجہ حسن نظامی نے ترجمانِ حقیقت کے لقب سے یاد کیا۔ اور قوم نے حکیم الامت اور مفکرِ اعظم کے خطابات دیئے لیکن آپ کی فطرت میں جو غیر معمولی سادگی، تواضع اور انکسار تھا۔ اس میں آخر تک فرق نہ آیا۔

جن لوگوں نے آپ کو دیکھا ہے وہ اس کی شہادت دیتے ہیں۔ لیکن آپ کے خطوط سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں۔

"میرے کلام کی مقبولیت محض فضلِ ایزدی ہے۔ ورنہ اپنے آپ میں کوئی ہنر نہیں دیکھتا۔ اور اعمالِ صالحہ کی شرط بھی مفقود ہے"
اس کی ایک دلچسپ گواہی ایک اور خط سے ملتی ہے۔ جو میجر سعید محمد خان کو اس وقت لکھا گیا تھا۔ جب انہوں نے مسلمان نوجوانوں کی تربیت کے لئے علامہ اقبال کے نام پر ایک فوجی اسکول قائم کرنے کی تجویز کی تھی۔ علامہ ان کو لکھتے ہیں۔

" ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی اسکول کو موسوم کرنا کچھ زیادہ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس فوجی اسکول کا نام "ٹیپو فوجی اسکول" رکھیں۔ ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں جیسا کہ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے۔ اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے۔ بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں۔ یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔"

اللہ اکبر! کیا تواضع اور انکسار ہے! سچ پوچھئے تو اس انکسار ہی میں اقبال کی بزرگی اور عظمت پوشیدہ ہے۔
آپ شہرت، نمائش، منافقت اور ریاکاری سے کوسوں دُور تھے۔ محترمہ عطیہ فیضی صاحبہ کو لکھتے ہیں۔

" شمالی ہندوستان میں میری ذات سے عقیدت و احترام کے فقدان سے آپ کو انتہائی قلق ہوا۔ یقین مانیے مجھے دوسروں کے احترام کی پروا نہیں۔ میں دوسروں کی واہ واہ پر زندہ رہنے کا قائل نہیں۔"

خواجہ حسن نظامی صاحب کو لکھا تھا۔ " اس خط کا مقصد شکایت نہیں اور نہ یہ کہ اقبال کے کام کا اشتہار ہو جن نظامی کو خوب معلوم ہے کہ اُس کا دوست اشتہار پسند مزاج لے کر دنیا میں نہیں آیا۔ مگر یہ مقصد اس خط کا ضرور ہے کہ واقف حال دوست کی غلط فہمی دور ہو۔ تاکہ اقبال کی وقعت اپنے دوست کی نگاہ میں محض اس لئے کم نہ ہو کہ اس نے مسلمانانِ ہند کی بیداری میں حصّہ نہیں لیا"
عطیہ فیضی صاحبہ کو کس زور اور جوش سے لکھا ہے " لوگ ریاکاری سے عقیدت رکھتے ہیں اور اسی کا احترام کرتے ہیں۔ میں ایک بے ریا زندگی بسر کرتا ہوں اور منافقت سے کوسوں دور ہوں۔ اگر ریاکاری اور منافقت ہی میرے لئے وجہ حصولِ احترام و عقیدت ہو سکتی ہے تو خدا کرے میں اس دنیا سے ایسا بے تعلق اور بے گانہ جاؤں کہ میرے لئے ایک آنکھ بھی اشکبار اور ایک زبان بھی نوحہ خواں نہ ہو۔"

نواب صدر یار جنگ مرحوم نے اقبال نامہ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ " اصل امتیاز جو آئندہ ترقی و سربلندی کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔ وہ ان کا ذوقِ معرفت ادبی تھا۔ جو عمیق تھا۔ ہمہ گیر تھا۔ اس کا راز نشے۔ اسی کے نہ ہونے سے ہماری علمی مجلسیں بے کیف ہیں، راز یہ تھا کہ اقبال کو خوش بختی سے کالج میں علمائے سلف کی یادگار اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے ایک بزرگ مولانا سید میر حسن صاحب کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ کی صحبت و تعلیم نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

مگر سونا پرانی کان کا تھا۔ آج کے تعلیم یافتہ سہاگہ ڈالتے ہیں مگر سونا کہاں، جلا آجاتی ہے جو ہر نہیں نکھرتے "

حضرت علامہ کو خود اس حقیقت سے اتفاق تھا آپنے اپنے ان شفیق استاد کی بابت کہا ہے۔

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہیگا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

اسی طرح اقبال نے اپنے والد مرحوم سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ اکبر الہ آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" واقعی آپ نے سچ فرمایا کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہ شفقت ایک طرف۔ اسی واسطے جب کبھی موقع ملتا ہے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں، اور پہاڑ جانے کے بجائے ان کی گرمیٔ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں "۔

عالموں اور بزرگوں سے فیض حاصل کرنے کو اقبال کیسی اہمیت دیتے تھے۔ اس کا اندازہ اکبر الہ آبادی کے نام کے ایک اور خط سے ہوتا ہے۔ ان کے لڑکے ہاشم کا حوالہ دیتے ہیں لکھتے ہیں " کس قدر خوش نصیب لڑکا ہے کہ پیرانِ مشرق سے فیض کی نظر لے رہا ہے یہی نظر صبغت اللہ ہے۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ پیرانِ مشرق دنیا میں نہ رہیں گے اور آئندہ زمانے کے مسلمان بچے نہایت بدنصیب ہوں گے۔"

اقبال کو ملت اسلامیہ کے زوال کا شدید غم تھا۔ اور مسلمان جس طرح دین و مذہب سے دور ہوتے جا رہے تھے اس کا بھی ان کو سخت صدمہ تھا۔ انہوں نے اپنے پیغام سے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی اور نئی روح پھونکنے کی کوشش کی تھی۔ ایک خط میں سراج الدین پال صاحب کو لکھتے ہیں " حدیث میں آتا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاطِ ملی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے۔ مگر ہمیں اپنے ادائے فرض سے کام ہے۔ ملامت کا خوف رکھنا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔"

اس خط سے پندرہ برس کے بعد ایک خط میں مولوی صالح محمد صاحب کو لکھا ہے۔ " مجھ کو یہ خیال ہمیشہ روحانی تکلیف دیتا ہے کہ آنے والی مسلمان نسل کے قلوب ان واردات سے یکسر خالی ہیں۔ جن پر میرے افکار کی اساس ہے۔"

اقبال کو خدا نے خاص اوصاف و کمالات سے نوازا تھا۔ قناعت اور بے نیازی کے ساتھ حق گوئی اور بے باکی آپ کی فطرت کے جوہر تھے۔ دنیا کی ہوس اور جاہ و منصب کے لالچ سے آپ کو خدا نے محفوظ رکھا تھا۔ اصلاح قوم کا جو کام آپنے اپنے ذمہ لیا تھا اُس کو آخر تک بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ جب علامہ کو انگریز حکومت کی طرف سے "سر" کا خطاب ملا تھا۔ تو آپ کے مداحوں نے پرجوش مبارکبادیں دیں۔ دوسری طرف بعض عقیدت مندوں کو شک ہونے لگا کہ اب اقبال بھی ٹوڈی ہو گئے، اب ان کے منہ سے انگریز کے خلاف کیوں کوئی بات نکلے گی! اقبال گوشہ نشین اور اشتہاری دنیا سے دور رہنے والے آدمی تھے۔ اس لئے ان کی طرف سے اس بارے میں کوئی اور بھی بیان شائع نہیں ہوا، لیکن آج ان کے خطوط سے ان دونوں باتوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

میر غلام بھیک نیرنگ مرحوم کو لکھتے ہیں " میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا۔ مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے

والے ہیں۔ اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں سینکڑوں خطوط اور تار آتے اور آ رہے ہیں۔ اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے۔ سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے۔ اور قسم ہے اُس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا۔ اور مسلمان کہلاتا ہوں۔ دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاء اللہ۔"

یہی جذبہ، خلوص اور جوش تھا۔ جو اقبال کی رگ رگ میں بھرا ہوا تھا۔ اسی نے ان کے پیام میں بے پناہ سوز و گداز۔ اور درد و اثر پیدا کر دیا تھا۔

اسلام کی تعلیمات کا سرچشمہ قرآن پاک ہے۔ اقبال نے اپنے پیام میں قرآن کو پڑھنے اور اُس سے نور ہدایت حاصل کرنے پر بڑا زور دیا ہے۔ وہ خود بھی کلام پاک سے فیض حاصل کرتے رہتے تھے۔ ایک خط میں اکبر الہ آبادی کو لکھا تھا۔ "واعظ قرآن بننے کی اہلیت تو مجھ میں نہیں ہے۔ ہاں! اس مطالعہ سے اپنا اطمینان خاطر روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔"

نیاز الدین خان صاحب کو لکھتے ہیں۔ "قرآن کثرت سے پڑھنا چاہیئے تاکہ قلب محمدی نسبت پیدا کرے۔ اس نسبت محمدیہ کی تولید کے لئے یہ ضروری نہیں کہ قرآن کے معنی بھی آتے ہوں۔ خلوص دل کے ساتھ محض قرأت کافی ہے۔" دیکھیئے یہ پرانا خیال کہ "قرآن پڑھنے کے لئے فرض نہیں۔ کہ اُس کے معنی بھی آتے ہوں" حضرت علامہ نے کس زور کے ساتھ بیان کیا ہے اور کیا کچھ مفید بتایا ہے۔ جو لوگ عربی نہ جانتے اور قرآن کے مطالب کو نہ سمجھ سکنے کو بہانہ بناتے ہیں۔ قرآن نہ پڑھنے کا انہیں توبہ کرنی چاہیئے کہ اس طرح وہ عام مسلمانوں کو اتنی بڑی نعمت سے محروم کئے دیتے ہیں۔

اسی طرح اقبال کو ایک سچے اور درد مند مسلمان کے مانند رسول پاک صلعم سے عقیدت اور عشق تھا۔ اور حرمین شریفین کی زیارت کا ہمیشہ اشتیاق رہا۔ 1911ء میں اکبر الہ آبادی کو لکھا تھا۔ "خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارت روضۂ رسول نصیب کرے مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھیئے کب جوان ہوتی ہے۔" اس کے ۲۶ سال بعد 1937ء میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو لکھا ہے۔ "اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو مکہ ہوتا ہوا ممکن ہے مدینہ تک پہنچ سکوں۔ اب مجھ ایسے گنہگاروں کے لئے آستان رسالت کے سوا اور کہاں جائے پناہ ہے۔"

دنیا کے بکھیڑوں اور بیماریوں نے علامہ کو اس مقدس سفر کا کبھی موقع نہیں دیا۔ اس خط سے اگلے سال تو وہ عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ لیکن جب وہ گول میز کانفرنس کی شرکت سے واپسی میں اس سے چند سال قبل ممالک اسلامیہ کی سیاحت کو گئے تھے۔ تو ان کے لئے حرمین شریفین کی زیارت کا بڑا اچھا موقع تھا۔ لیکن اُس وقت بھی نہ جا سکے تھے۔ سبب خود ان ہی سے سنیئے۔ مولانا صالح محمد تونسوی کو لکھتے ہیں۔ "مدینۃ النبیؐ کی زیارت کا قصد تھا۔ مگر میرے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ دنیوی مقاصد کے لئے سفر کرنے کے ضمن میں حرم نبویؐ کی زیارت کی جرأت کرنا سوء ادب ہے۔ اس خیال نے باز رکھا۔ ورنہ کچھ مشکل امر نہ تھا۔ یروشلم سے سفر کرنا آسان ہے۔" یہ تھا شاعر اسلام کا جذبۂ محبت اور معیار آداب زیارت۔ سبحان اللہ۔! حرم پاک کا کیا احترام ملحوظ ہے!!

خطوط میں اکثر کاتب یا مکتوب الیہ کے کچھ ایسے بھی احوال آ جاتے ہیں۔ جن کا دوسرے ذرائع سے علم ممکن نہیں ہوتا۔ اقبال کی شب بیداری اور تہجد گزاری کا حال بھی ہمیں ان کے خطوط سے ہی معلوم ہوتا ہے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد کو لکھتے ہیں۔ "سردی آ رہی ہے۔ صبح چار بجے کبھی تین بجے اٹھتا ہوں۔ پھر اس کے بعد نہیں سوتا۔

سوائے اس کے کہ کبھی مصلے پر اداس ہو جاؤں۔

انہی کو ایک اور خط میں لکھا ہے۔ "بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لئے اٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے۔ سو خدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی دعا کروں گا۔ کہ اس وقت عبادت الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ دعا قبول ہو جائے"

اقبال ساری دنیا کی نجات کا راز صرف اسلام میں پوشیدہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات میں جا بجا اس پیغام پر بہت زور دیا ہے وہی نئے اقبال کے پیام کو سمجھنے کے لئے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ ایک خط میں پروفیسر آل احمد سرور کو لکھتے ہیں۔ "میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانۂ حال کے دوسرے ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے۔"

اقبال کا دردمند دل اس بات سے بہت کڑھتا تھا۔ کہ مسلمان قوم جس کو ساری دنیا کی رہنمائی کا منصب دیا گیا تھا خود ہی تعلیمات اسلام سے بیگانہ ہو چکی ہے اور ان میں ہر طرح کی برائیاں اور باہمی مخالفتیں جڑ پکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک دور بیں مفکر کی حیثیت سے ان کو مسلمانوں کی حالت سے مایوسی نہ تھی۔ ایک خط میں پروفیسر اکبر منیر کو لکھتے ہیں۔ "مغربی اور وسطی ایشیا کی مسلمان قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی۔ اور اگر ان کے اختلافات کا تصفیہ نہ ہو سکا۔ تو اللہ حافظ ہے۔ مضامین اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہو گا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلال اسلامی کا نظارہ دیکھے گی۔"

اقبال نے اپنے پیغام کے لئے اردو سے زیادہ فارسی سے کام لیا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ انہوں نے اردو کے دامن کو بھی اپنے جوہر پاروں سے کچھ کم مالا مال نہیں کیا۔ اقبال کو اردو زبان سے خاص شغف تھا۔ اور انہوں نے اردو کی خدمت اور اشاعت کرکے خود اردو کو گراں بار احسان بنایا ہے۔ یہ ۱۹۳۶ء میں مولوی عبدالحق صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہو گیا۔ تو انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانیئے کہ اس اہم معاملے میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بہ حیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

اسی خط میں آگے چل کر بڑی دلچسپ محل نظر اور قابل غور بات کہتے ہیں کہ "مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لئے جو لڑائیاں آئندہ لڑنی پڑیں گی۔ ان کا میدان پنجاب ہو گا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی۔ کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔"

ایک اور خط میں انجمن ترقی اردو کی تحریک کی بابت مولوی صاحب کو لکھا تھا۔ "آپ کی تحریک سے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ بہت سے اعتبار سے یہ تحریک اس تحریک سے کسی قدر کم نہیں۔ جس کی ابتداء سر سید رح نے کی تھی۔"

مولوی عبدالحق صاحب ہی کے نام کے ایک اور خط کا یہ جملہ علامہ اقبال کی اردو دوستی پر کس قدر روشنی ڈالتا ہے۔ لکھتے ہیں۔ "کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا۔ لیکن افسوس ایک تو علالت پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دوسرے بچوں کی خبرگیری اور ان کی تعلیم و تربیت کے فکر و افکار دامنگیر ہیں"

اقبال نے مسلمانوں کو سرگرمِ عمل رہنے کا بار بار پیغام دیا ہے۔ اور اس سلسلے میں جا بجا شاہین کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد صدیقی کو تمثیل کے لئے شاہین کو خاص طور پر انتخاب کرنے کا سبب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "وہ شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں (۱) خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔ اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو اقبال کے نزدیک ایک مردِ مومن میں پائی جانی ضروری ہیں۔

علامہ اقبال کے جو خطوط قائد اعظمؒ کے نام ہیں۔ ان سے علامہ کی عملی زندگی اور ان کی مفکرانہ ژرف نگہی کے وہ رخ ہمارے سامنے آتے ہیں جن سے زیادہ لوگ واقف نہیں۔ ان خطوں کے جواب جو قائد اعظم نے تحریر کئے۔ ہمارے سامنے نہ آئے۔ ورنہ سنہ ۱۹۳۶ء، اور سنہ ۱۹۳۷ء کی سیاست لوہانڈ دونوں عظیم المرتبت ہستیوں کے اعمال و افکار کے کئی اور رخ بھی ہمارے علم میں آجاتے۔

علامہ اقبال کا انتقال ۲۰ ر اپریل سنہ ۱۹۳۸ء کو ہوا تھا۔ اس سے کئی سال پہلے سے آپ ایسی شدید علالت میں مبتلا تھے کہ عملی زندگی سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ لیکن سنہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد اس برصغیر کی سیاسی فضا اتنی پیچیدہ نازک اور اہم ہو گئی تھی کہ بسترِ پر اُن سے خاموش نہ لیٹا جا سکا۔ اور قائد اعظم کے دوش بدوش آپ نے اسلامی ہند کی سیاسی جد و جہد میں اہم حصہ لیا۔ اقبال کے ان خطوں کو سمجھنے کے لئے اُس وقت کا سیاسی پس منظر جاننا ضروری ہے۔

سنہ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے ماتحت ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری کا جو حصہ دینا تجویز ہوا تھا۔ اُس کا اعلان ہو چکا تھا اور ملک کی سیاسی جماعتیں آئندہ انتخابات میں حصہ لینے اور اپنی اپنی راہ عمل معین کرنے میں مصروف تھیں۔ ان حالات میں قائد اعظم ۲۴ ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء کو انگلستان سے واپس آئے اور آپ نے اسلامیانِ ہند کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے جد و جہد شروع کی۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں قائد اعظم نے مختلف صوبوں کا دورہ کر کے مسلم لیگ کو ازسرِ نو منظم کرنا شروع کیا۔ اس وقت صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں الگ الگ سیاسی جماعتیں بنی ہوئی تھیں، جن کی تشکیل صوبائی مقاصد کے ماتحت صوبائی مصلحتوں کی بنا پر کی گئی تھیں چنانچہ بنگال، پنجاب، سرحد اور سندھ جیسے اہم صوبوں میں ایسے بہت کم لوگ تھے۔ جنہوں نے قائد اعظم کی آواز پر لبیک کہا۔ اور مسلم لیگ کی جدید تنظیم میں کوئی دلچسپی لی۔

علامہ اقبال ان دنوں بسترِ علالت پر تھے۔ مگر آپ نے قائد اعظم کا ساتھ دینا منظور کیا۔ اور آپ ہی پنجاب کی صوبائی لیگ کے صدر مقرر ہوئے۔ اس وقت پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لیکن اقبال کے ذاتی اثر اور مسلسل کام سے کئی بااثر حضرات مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس وقت تک محمد علی جناح کو "قائد اعظم" کا لقب قوم کی طرف سے نہیں ملا تھا۔ لیکن اقبال کی بصارت و بصیرت نے ان کو بتا دیا تھا کہ قوم کی کشتی کا آئندہ کھیون ہار یہی شخص ہوگا۔

علامہ اقبال نے ۲۸ ر مئی سنہ ۱۹۳۷ء کے خط میں قائد اعظم کو لکھا تھا کہ "اسلامی ہندوستان کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی فطانت اور فراست ہماری موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی" اس کے مہینہ بھر بعد

۲۱ر جون کے خط میں اور زیادہ صاف الفاظ میں لکھا۔ "اس وقت مسلمانوں کو اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید ملک کے گوشے گوشے سے اٹھنے والا ہے۔ صرف آپ ہی کی ذاتِ گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے۔"

علامہ اقبال کو قائداعظم کی ذات پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ اسلامی سیاست کے اس بحرانی اور نازک دور میں آپ نے ان سے پورا تعاون کیا۔ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "ہندوستانی مسلمان آپ سے متوقع ہیں کہ اس پر آشوب زمانے میں آپ ان کے مستقبل سے متعلق ان کی کامل اور واضح رہنمائی فرمائیں گے۔"

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے ماتحت ۱۹۳۶ء میں نئے انتخابات ہونے والے تھے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمان رہنماؤں نے علیحدہ علیحدہ جماعتیں بنا رکھی تھیں۔ جن کا لائحہ عمل ان کے صوبوں ہی میں محدود تھا۔ علامہ اقبال کو قائداعظم کی اس رائے سے پورا اتفاق تھا کہ اس وقت تمام مسلمانوں کو ایک کل ہند پالیسی اور پروگرام پر عمل کرنا ضروری ہے۔ آپ نے ۹ر جون ۱۹۳۶ء کے خط میں قائداعظم کو لکھا تھا۔

"مرکزی اسمبلی کے لئے بالواسطہ انتخاب نے ہمارے لئے یہ لازم کر دیا ہے کہ صوبائی اسمبلیوں کے مسلمان نمائندے ایک کل ہند پالیسی اور پروگرام پر متحد ہو جائیں تاکہ وہ مرکزی اسمبلی میں صرف ایسے لوگوں کو بھیج سکیں جو مرکزی اسمبلی میں اسلامی ہند کے ان مرکزی مسائل کی تائید و حمایت کریں جو ہندوستان کی دوسری بڑی قوم کی حیثیت سے مسلمانوں سے متعلق ہوں۔"

جون ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا پہلا جلسہ لاہور میں طلب کیا گیا۔ علامہ اقبال اور قائداعظم کے باہمی اعتماد اور تعاون کا اس امر سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ اقبال نے (غالباً ان کی خواہش کے مطابق) بورڈ کے مجوزہ منشور کی بابت اپنے خیالات ایک مسودہ کی شکل میں قائداعظم کو بھیج دیئے اور اپنے ۹ر جون کے خط میں دوسرے ضروری مشورے بھی دیئے اس خط کا یہ حصہ سننے لکھتے ہیں۔ "اسلامی اوقاف سے متعلق قانون (جیسا کہ مسجد شہید گنج نے ضرورت کا احساس کرایا ہے) اور اسلامی ثقافت، زبان، مساجد اور قانونِ شریعت سے متعلق مسائل پر بھی (پارلیمنٹری بورڈ کے) بیان میں توجہ کرنا لازمی ہے۔"

علامہ اقبال چاہتے تھے کہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس لاہور میں منعقد ہو۔ لیکن یونینسٹ جماعت کے رہنماؤں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اور کونسل کا اجلاس ٹلتا رہا۔ آخر اکتوبر ۱۹۳۷ء میں یہ تاریخی اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اقبال اپنے خیالات اور مشوروں سے قائداعظم کو برابر مطلع کرتے رہتے تھے۔ اجلاس لکھنؤ سے پہلے سات اکتوبر کے خط کا یہ حصہ بڑا دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں۔ "مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو مضطرب کر رکھا ہے۔ لیگ کے مقاصد کے لئے مسلمان عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا ہمارے لئے ایک نادر موقع ہے۔ مجھے امید ہے کہ لیگ اس مسئلے پر ایک مناسب قرارداد ہی منظور نہیں کرے گی بلکہ کوئی ایسی راہِ عمل بھی معین کی جائے گی جس میں مسلمان عوام بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں۔"

اس خط کے آخری جملے سے اقبال کے جوش و ایثار اور اسلامی خدمت کے جس جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ لکھا تھا۔ "ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لئے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو۔ جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔ ایشیا کے دروازے پر ایک مغربی چھاؤنی کا مسلط کیا جانا اسلام اور ہندوستان دونوں کے لئے خطرناک ہے۔

۱۹۳۰ء میں مسلم کانفرنس الہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے اس برصغیر کے شمال مغربی حصوں میں اسلامی ریاست قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی مگر قائد اعظم کے نام کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں آپ نے اپنی اس تجویز کو زیادہ وسعت دیدی تھی۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "اسلامی ہندوستان میں ان مسائل کے حل باسانی رائج کرنے کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعے ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام از بس لازم ہے۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبہ کا وقت نہیں آگیا ہے؟"

۲۱ جون کے خط میں لکھتے ہیں۔ "ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب اس طریق پر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق میں اسلامی اصلاحات کا نفاذ ہے۔ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو ہند اور بیرون ہند کی دوسری قوموں کی طرح حق خود اختیاری سے کیونکر محروم کیا جاسکتا ہے؟"

اس خط کے آخر میں یہ واضح فیصلہ اور دلچسپ انکشاف فرماتے ہیں۔ "ہندوستان کا امن، نسلی، مذہبی اور لسانی میلانات کی بناء پر ملک کی تقسیم پر منحصر ہے۔ اکثر برطانوی مدبر بھی اس نظریئے کو مانتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے میری روانگی کے وقت لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ ہندوستان کی مشکلات کا حل تو تمہاری اسکیم میں موجود ہے۔ لیکن اس کے بار آور ہونے کے لئے پچیس سال کی مدت درکار ہوگی۔"

قائد اعظم ایک عملی آدمی تھے۔ اور کوئی قدم اس وقت تک نہ اٹھاتے تھے جب تک کہ اس کے لئے راہ اچھی طرح ہموار نہ کرلیں۔ اس لئے پاکستان کا یہ تصور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخی قرارداد سے قبل مسلمانوں کا نصب العین نہ بن سکا۔ یوم اقبال کے ایک پیغام میں قائد اعظم نے علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے واضح طور پر کہا تھا۔ "ایک عظیم شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ اقبال ایک باعمل سیاست داں بھی تھے اور انہیں اسلام کے نصب العین پر پورا اعتقاد اور اعتماد تھا۔ وہ ان معدودے چند اشخاص میں تھے۔ جنہوں نے ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں جو تاریخی حیثیت سے مسلمانوں کا وطن بنے رہے ہیں۔ ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کا سب سے پہلے تصور کیا تھا۔"

علامہ اقبال نے قائد اعظم کے نام کے ان خطوں میں بعض اور دلچسپ اور اہم مسائل پر بھی واضح اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً معاشی کا مسئلہ ہمارے ذہنوں کو بہت کچھ الجھا رہا ہے۔ اقبال اس کا کامیاب حل صرف اسلامی قوانین میں پاتے ہیں اور اس لئے بھی یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی ریاست قائم کی جائے۔ جہاں اسلامی احکام جاری ہوسکیں۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط کے بعض حصے سنیئے فرماتے ہیں۔

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے کیونکر نجات دلائی جاسکتی ہے؟ . . . . . . خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلے کا حل موجود ہے۔ اور فقہ اسلامی کا ضروریات حاضرہ کو سامنے رکھ کر مطالعہ دوسرے مسائل کا حل بھی پیش کرسکتا ہے۔ شریعت اسلامی کے مفصل اور گہرے مطالعے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ اگر اسلامی قانون کو صحیح طور پر سمجھا اور نافذ کیا جائے۔ تو ہر شخص کو معمولی مسائل کی طرف سے اطمینان ہوسکتا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ کسی ایک آزاد اسلامی ریاست یا ایسی چند ریاستوں کی عدم موجودگی میں اسلامی شریعت کا نفاذ اس ملک میں ناممکن ہے۔ سالہا سال سے میرا یہی عقیدہ

رہا ہے اور اب بھی میں مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل یہی سمجھتا ہوں . . . . اسلام کے لئے سوشل ڈیما کریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج جب کہ اسے شریعت کی تائید اور موافقت حاصل ہو ۔ حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں ۔ بلکہ یہ تو اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہے ۔ مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے ۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں ۔ اسلامی ہندوستان میں ان مسائل کا حل بآسانی رائج کرنے کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعے ایک یا زیادہ اسلامی ریاستوں کا قیام اشد ضروری ہے ۔

علامہ اقبال کے خیالات اور نظریات ان کے طویل مطالعے اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ تھے ۔ انہوں نے مشرق اور مغربی علوم سے کامل استفادہ کیا تھا ۔ لیکن وہ جن نتائج تک پہنچے تھے ۔ وہ ان کی اپنی کاوش کا صلہ تھے ۔ اور ان کی روح رواں اسلامی تعلیمات تھیں ۔ علامہ کی بیباکی اور حق گوئی صداقت شعاری اور راست گفتاری ہر وقت اور ہر مرحلے پر قوم کی رہنمائی کرتی رہی ۔ انہوں نے ہمیشہ وہی کیا ۔ جسے سچ سمجھا اور قوم کے لئے مفید جانا ۔ پھر یہ کہ اس میں کبھی کسی صلے کی توقع نہ کی ۔ لیکن کتنی باتیں ہیں ۔ جو ہمیں معلوم نہیں ۔ اور اس لئے ہم غلط نتائج تک پہنچتے ہیں ۔

خواجہ حسن نظامی کے نام ایک خط میں (جس کا کچھ حصہ پہلے آ چکا ہے) علامہ اقبال لکھتے ہیں ۔ "مسلمانانِ ہندوستان کی بیداری کے پانچ اسباب جو آپ نے اس ہفتہ کے "توحید" میں ارقام فرمائے ہیں ۔ بالکل بجا ہیں ۔ لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ اقبال جس نے اسلامی قومیت کی حقیقت کا راز اس وقت منکشف کیا ۔ جب ہندوستان والے اس سے غافل تھے اور جس کے اشعار کی تاریخ زمیندار، کامریڈ، بلقان، طرابلس اور نواب وقار الملک کی حق گوئی کی تاریخ سے پہلے کی ہے ۔ کس کا خوشہ چیں ہے ۔؟"

(آخر میں کیا خوب شعر نقل کیا ہے

بکلامِ بیدلؔ اگر رسی گذرا ر جادۂ منصفی
کہ کسے نمی طلبد ز تو صلۂ دیگر مگر آفریں

بیدل کا شعر اقبال نے محض ادبی ذوق کی خاطر نقل نہیں کیا تھا ۔ بلکہ وہ پہلے ہی اس خط میں لکھ چکے تھے کہ "اس خط کا مقصد شکایت نہیں ۔" پھر یہ کہ احقاق حق کسی وقت بھی ہو ۔ اس کے مستحسن ہونے میں کیسے کلام ہو سکتا ہے ۔

ہماری عام نا واقفیت اور کسی کو گھٹانے یا کسی کو بڑھانے کی بیسیوں مثالیں سب کے سامنے ہیں ۔ لیکن جب بات حد سے بڑھ جائے تو دکھ ضرور ہوگا ۔ اس کی ایک اور پر لطف مثال سنیئے ۔ مولوی فضل الدین احمد الہلال کے منیجر تھے ۔ ان کی بابت حضرت علامہ مولانا سلیمان ندوی ؒ کے نام کے خط میں لکھتے ہیں ۔

"مولانا ابوالکلام کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا ۔ بہت دلچسپ کتاب ہے ۔ مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال کی آوازِ بازگشت ہیں ۔" شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں ۔ ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں ۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں ۔ نظم و نثر انگریزی اور اردو میں موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں ۔ بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا ۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے ۔ نہ کہ نام آوری ۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا ۔ تحریک الہلال نے اُسے مسلمان کیا ۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے ۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو ۔ میرے دل میں

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

پروفیسر کرار حسین

فرد کی آزادی

(۱) آزادی کا مسئلہ

انسان جبلی طور پر سماجی جانور ہے، وہ گروہوں اور جماعتوں میں رہتا ہے۔ ان میں سے کچھ گروہ اور جماعتیں ایسی ہیں جن میں خود پاتا ہے اور کچھ میں وہ بالارادہ شریک ہوتا ہے۔ گروہوں اور جماعتوں کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ گھر۔ برادری۔ قبیلہ۔ قوم ملت۔ ریاست۔ معاشرہ۔ مدرسہ۔ پیشہ۔ طبقہ۔ سیاسی پارٹی۔ مذہبی فرقہ وغیرہ وغیرہ۔ ان گروہوں اور جماعتوں کا اپنے جیسے گروہوں اور جماعتوں سے (Confrontation) ہوتا ہے جو مخالفت (Antagonism) کی حد تک پہنچ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

فرد کے مقابلہ میں جماعت کو ایک اقتدار حاصل ہوتا ہے جس کا رسم و رواج، رائے عامہ، قاعدہ، قانون، اوامر و نواہی کے ذریعہ اظہار ہوتا ہے اور جو وسیع علامتوں میں مثلاً باپ، بادشاہ، مولوی، پروہت، حکومت، پولیس، فوج، جیل خانہ میں متشکل ہوتا ہے۔

جماعت خود ایک طاقت ہے۔ اور اس کا فطری میلان طاقت کی زیادتی کی طرف ہے۔ جماعت کی ایک اہم حیثیت ترکیبی ریاست ہے اور ریاست کے لئے تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ طاقت ہی اس کے لئے خیر مطلق ہے۔

فرد کی بنیاد اپنی ذات ہے، اس کی پہلی ضرورت ذات کا تحفظ ہے۔ اس کا رجحان اپنی ذات کے اثبات اور نشو و نما کی طرف ہے اس کے سامنے نجات، یا اپنی ابتدائی ضروریات زندگی کے علاوہ مادی وسائل زندگی میں ایک منصفانہ حصہ، یا اپنی تہذیب و تربیت و ترقی کے مناسب مواقع کی فراہمی کے مقاصد ہوتے ہیں۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ جبلت کی جگہ شعور لیتا جاتا ہے، جماعت کے مقابلہ میں اپنی ذات کا شعور پیدا ہونا تہذیب کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ آزادی کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ اگر فرد کو اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں کوئی خارجی رکاوٹ نہ ہو تو اس حالت کو آزادی کہتے ہیں لیکن ابتدائی زندگی کی ضروریات کے علاوہ جو ہر حالت میں انسان محسوس کرتا ہے اس کی خواہشات اور مقاصد بہت حد تک اس کے ماحول اور تربیت سے صورت پذیر ہوتے ہیں اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب فرد کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جماعتی دباؤ اس کے یا اس جیسے دوسرے افراد کے مقاصد میں رکاوٹ بن رہا ہے، بالفاظ دیگر جب ایسے ظلم کا احساس ہوتا ہے تو آزادی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ سوال ظلم کی موجودگی کا نہیں ہے بلکہ ظلم کے احساس و شعور کا۔ جب تک غلام اور غلام بنانے والے غلامی کے ادارہ کو فطری سمجھتے ہیں اس وقت تک آزادی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، ابھی ممکن ہے ظالم نفسیاتی طریقوں سے ظلم کا احساس اور شعور مٹا کر آزادی کے مسئلہ کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب غلام ہوں یا غلام بنانے والوں میں ظلم کا احساس و شعور بیدار ہو جاتا ہے تو فرد کی آزادی کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔

یہ احساس و شعور کس طرح پیدا ہوتا ہے اس کے محرکات خارجی ہوتے ہیں یا داخلی ہوتے ہیں یہ موضوع ہماری بحث سے خارج ہے اہم بات یہ ہے کہ آزادی کے مسئلہ کا تعلق ظلم کے احساس یا بالفاظ دیگر عدل کے تقاضے سے ہے اگر آزادی کے مسئلہ کا تعلق احساس ظلم یا عدل کے تقاضے سے نہیں ہے۔ تو وہ نفسیاتی بے راہ روی یا دیوانگی کی ایک قسم ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے۔ ہم آزادی کے مسئلہ کے قانونی یا سیاسی پہلو سے زیادہ اخلاقی پہلو پر غور اور گفتگو کر رہے ہیں۔ کیونکہ گو یہ تینوں پہلو آپس میں مربوط ہیں لیکن اخلاقی پہلو زیادہ بنیادی ہے۔

(۲) آزادی کیوں؟

کیا ہر انسان آزاد پیدا ہوا ہے؟ یا انسان انسان سب برابر پیدا ہوئے ہیں؟ بدیہی طور پر انسانی بچہ سے زیادہ مجبور اور کسی جاندار کا بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ نہ وہ آزاد ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ معاشرتی ماحول کا دباؤ فطری ماحول کے دباؤ سے بھی سخت ہوتا ہے۔ نہ ہی انسان مواقع یا صلاحیتوں کے لحاظ سے مساوی پیدا ہوئے ہیں۔ مواقع کا مہیا کرنا یا صلاحیتوں کی نشوونما کرنا تو خیر انسانی معاشرہ کی ذمہ داری ہے لیکن پیدائشی صلاحیتوں میں نہ صرف قسم کے لحاظ سے بلکہ درجے کے لحاظ سے بھی فرق ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ تو آزادی اس معنی میں انسان کا پیدائشی اور فطری حق ہے کہ جس طرح حواس و اعضا و جوارح قوت کا انسان کو عطیہ ہیں اسی طرح آزادی بھی ایک عطیہ ہے جسکو انسان ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے لیکن جس کو معاشرہ غصب کر لیتا ہے۔

ان سیاسی عقائد میں تاریخی یا فلسفیانہ حقیقت نہ سہی لیکن اپنے زمانہ کے سیاق میں ان میں ایک افادی صداقت ضرور تھی جسکی وجہ سے مغربی ممالک میں جمہوریت کے لئے جدوجہد میں اور فرانس کے انقلاب میں اور امریکہ کی جنگ آزادی میں یہ عقائد بہت موثر ہتھیار ثابت ہوئے۔ میں ان عقائد پر بحث نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی اس بحث میں کہ انسان مجبور ہے یا مختار، اس بحث میں جو قدیم حکما سے لگا کر زمانہ حال کے وجودی مفکرین تک چلی آ رہی ہے حصہ لینے کی مجھ میں اہلیت ہے۔ لیکن شاید یہ کہنے میں مخالفت کا زیادہ اندیشہ نہیں ہے کہ (۱) انسانی زندگی کی سمت بے بسی سے طاقت کی طرف اور مجبوری سے آزادی کی طرف ہے (۲) اور زندگی کی جدوجہد میں ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت سے حصہ لینے کے لئے یہ یقین ضروری ہے کہ انسان مختار و آزاد ہے یا مجبور سے مجبور حالت میں بھی انسان اختیار اور آزادی کا ایک دائرہ اور ایک پہلو نکال ہی لیتا ہے تاکہ اس کی خودداری اور خود اعتمادی قائم رہے کہ ان صفات کا فقدان خود اس کی ذات کی نفی ہے گویا آزادی کا یقین اور آزادی کا استعمال انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اس معنی میں کہ یہ انسانی زندگی کا ایک جبر ہے۔

نظریۂ افادیت کے بانیوں اور حامیوں نے آزادی کا جواز کسی مفروضہ، غیر تاریخی فطری حق یا معاہدہ پر نہیں بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انفرادی آزادی میں بڑا فائدہ ہے۔ اگر حکومت لوگوں کے کاموں میں کم سے کم دخل دے اور افراد کو فکر و عمل میں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو تو زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ فلاح و بہبود ممکن ہو سکے گی۔ مل نے اور اس سے پہلے ملٹن نے بہت پر زور طریقہ سے آزادیٔ رائے کی وکالت کی اور ان کی دلیل یہ تھی کہ آزادی رائے اور آزادی اظہار حقیقت کی دریافت کے لئے بہت ضروری ہیں۔ رفتہ رفتہ فلسفۂ افادیت نے فلاحی ریاست کے تصور کو جنم دیا۔ جماعت کی قدر و قیمت بھی ان لوگوں کے نزدیک ان افراد کی کیفیت اور حالت (QUALITY) پر منحصر ہے جن پر وہ جماعت مشتمل ہے۔ مل نے اس نکتہ کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے "اگر ہم یہ سوال کریں کہ ہر معنی میں بلند سے بلند، اور پست سے پست معنی میں، ایک اچھی حکومت کن علل اور حالات پر منحصر ہے تو ہم یہ دیکھیں گے کہ سب سے اہم علت اور حالت یہ ہے

کہ اس معاشرہ کے افراد جن پر حکومت کی جارہی ہے کس مرتبہ کے انسان ہیں" ۔ ایک دوسری جگہ وہ لکھتا ہے "ایک ریاست کی قدر و قیمت ان افراد کی قدر و قیمت ہے جن پر وہ ریاست مشتمل ہے، ایک ریاست جو افراد کے ذہنی، اخلاقی، اور روحانی تربیت اور ترقی سے انتظامی سہولتوں کے پیش نظر چشم پوشی کرتی ہے۔ایک ریاست جو اپنے افراد کو انسانی حیثیت سے کوتاہ قامت رکھتی ہے تاکہ افراد اس کے ہاتھ میں بے عذر آلۂ کار بنے رہیں، خواہ ریاست کے مقاصد کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں ایک دن اس نتیجہ تک پہنچے گی کہ کم ہمت اور پست ارادہ افراد کوئی بلند مقام سرانجام نہیں دے سکتے اور وہ انتظامی مشین جس کو مکمل کرنے کے لئے اس نے ہر انسانی قدر کو قربان کر دیا اس کے کچھ کام نہ آسکے گی کیونکہ اس میں وہ زندگی کی طاقت نہ ہوگی جس کو مشین کو آسانی سے چلانے کی خاطر کچل دیا گیا ہے"

اب میں آپ کے سامنے فرد اور جماعت (یا ریاست) کے باہمی رشتہ کے متعلق دو نظریات پیش کرتا ہوں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ فرد کی ذات کا نشوونما جماعت کے اندر ہی ممکن ہے، جماعت کے باہر اس کی زندگی محدود۔ ناسیاتی اور بے معنی ہے۔ بلکہ جماعت کا ارادہ ہی فرد کا حقیقی ارادہ ہے۔جماعت کی اطاعت میں وہ اپنے ہی حقیقی ارادہ کی پیروی کر رہا ہے۔اسی میں اس کی حقیقی آزادی ہے، جماعت میں کھو کر ہی فرد اپنے آپ کو پاتا ہے۔انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ وہ جماعت کی خاطر زندہ رہے اور جماعت کی خاطر مرے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ فرد کی نشوونما آزادی ہی میں ممکن ہے۔ اور کیونکہ ہر جماعت فرد کی آزادی کی حدبندی کرتی ہے اس لئے جماعت کا وجود نہ صرف افراد کی کوتاہی کی دلیل ہے بلکہ ان کے نشوونما کے منافی بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں نظریات دو متضاد سروں کے نظریات ہیں۔ان دونوں نظریوں میں کچھ نیم حقیقتیں موجود ہیں اور ان میں تطابق بھی ممکن ہے ۔جو اس وقت ہمارا مقصد نہیں ۔میں نے دانستہ طور پر ان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کا تضاد واضح اور مبین ہو جائے۔ ان متضاد نظریات میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں فرد کے نشوونما اور اس کی خاطر آزادی کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔گو فرد کے نشوونما اور آزادی کی تعبیریں مختلف ہیں۔ان دو متضاد نظریوں کے ساتھ ساتھ یونان کے قدیم حکیم ارسطو کا یہ مقولہ ذہن میں رکھیے کہ ریاست زندگی کو ممکن بنانے کے لئے وجود میں آتی ہے اور زندگی کو اچھا بنانے کے لئے قایم رہتی ہے" اس کے نزدیک اچھی زندگی اپنی مخصوص صلاحیتوں کے مطابق مکمل زندگی ہے اور آزاد آدمی ہی اچھا انسان بن سکتا ہے، کیونکہ آزاد آدمی اپنے ارادہ میں آزاد ہے۔ غلام اور عورتیں پورے معنی میں اچھے آدمی نہیں بن سکتے کیونکہ وہ اپنے ارادے میں پوری طرح آزاد نہیں ہیں۔

اس بحث سے مندرجہ ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) فرد کی آزادی انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔یہی انسانی نشوونما کی صحیح سمت ہے اور آزادی کے تعین بغیر ذمہ داری، خودداری، اور خود اعتمادی کی صفات ختم ہو جاتی ہیں جو انسان کی خودی یا ذات کے لئے بنیادی صفات ہیں۔

(۲) فرد اور جماعت کے تقابل میں فرد ہی قدر اعلیٰ ہے۔

(۳) آزادی ایک ذریعہ ہے اور اس کا مقصد حکمائے یونان کے اصطلاحی معنوں میں اچھی زندگی ہے۔اور یہ بات جماعت کے لئے بھی مفید ہے کہ جن افراد پر وہ مشتمل ہے وہ "اچھے آدمی" ہوں۔

(۳) کیا آزادی ممکن ہے؟

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آزادی کا مقصد یہ ہے کہ ایک فرد اچھا انسان بن سکے اور معاشرہ یا معاشرہ کی سیاسی ہئیت یعنی ریاست کا کام یہ ہے کہ وہ مناسب حالات پیدا کرکے یا رہنمائی کرکے افراد کی اچھا انسان بننے میں مدد کرے تو یہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچھے انسان کی تعریف کون کرے۔ اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ بغیر فکر و عمل کی آزادی کے کوئی فرد اچھا انسان بن ہی نہیں سکتا تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ فیصلہ فرد ہی کو کرنا ہے۔ اس کے لئے ضرورت یہ ہے کہ

(۱) فرد میں اتنی معقولیت ہے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ اچھا انسان کسے کہتے ہیں

(۲) اجتماعی زندگی کو ممکن بنانے کے لئے اس میں اتنی رواداری ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے افراد کے ساتھ بحث و گفتگو کرنے کے بعد ایک متفقہ لائحہ عمل تک پہنچ سکتا ہے۔

بدقسمتی سے یہ دونوں مفروضے زیادہ صحیح نہیں ہیں۔ اگر انسان کے فکر و عمل کے محرکات کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں عقل کا بہت کم حصہ نکلے گا، اور انسانی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ملینگی جہاں بحث و مناظرہ کے بعد اہم معاملات کے متعلق ایک متفقہ رائے قائم ہوئی ہو یا ایک لائحہ عمل طے ہوا ہو بل کہ گمان تھا کہ بحث و مناظرہ سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے لیکن تجربہ یہ ہے کہ بحث و مناظرہ سے تعصبات اور شدید ہو جاتے ہیں یا ایک عام بے یقینی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جو متفقہ عمل کے منافی ہے یا جس کا نتیجہ ایک عام تصادم کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ بغیر طاقت کے استعمال کے دنیا میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

اسی انسانی کمزوری کو دلیل بنا کر اور سیاسی شعور کے فقدان کا عذر پیش کرکے کچھ قومیں دوسری قوموں کو غلام بنائے رکھتی ہیں، کچھ حاکم لوگوں کو اکثر معاملات میں اس حق رائے دہندگی سے بھی محروم کر دیتے ہیں جو کچھ نہ سہی ایک TOKEN ہی سہی لیکن بہ حیثیت TOKEN بڑی چیز ہے۔

(۲) فرد کی آزادی کی بنیاد پر جو ریاستیں قائم ہوتی ہیں ان کی قابل عمل صورت اکثریت کی حکومت ہے۔ اکثریت کی حکومت عقل اور آزادی کی حکومت نہیں ہوتی بلکہ وہ بھی جبر و استبداد کی ایک ہلکی صورت ہوتی ہے۔ ابسن کے ایک ڈرامہ میں ڈاکٹر اشاک مان کا دعویٰ کہ اکثریت ہمیشہ غلطی پر ہوتی اپنے اندر ایک معنی رکھتا ہے۔

اگر اس کا تجزیہ کیا جائے کہ اکثریت کس طرح قائم ہوتی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اکثریت کے وجود میں آنے کا کوئی ذریعہ ہوا افہام و تفہیم اور بحث و ترغیب یقیناً نہیں ہے۔

نہ اکثریت ہر صورت میں صحیح اکثریت ہوتی ہے۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک اقلیت جس کو کسی نوعیت کا غلبہ حاصل ہوتا ہے بہت سے لوگوں کو بجبر و اکراہ یا برضا و رغبت، زور سے یا فریب سے اپنے ساتھ لگا لیتی ہے اور اس طرح اکثریت بن جاتی ہے جب اکثریت اور اقلیت کے مفاد و نظریات میں اختلافات شدید پیدا ہو جاتے ہیں تو دو شدید صورتوں میں سے ایک کے رونما ہونے کا امکان ہے۔ یا تو اکثریت ظالم اکثریت بن جاتی ہے اور خیال و عمل میں یکسانیت پر زور دیتی ہے اور — homogeneous - Mass M - اور [illegible] کے ذریعہ وہ یقین کر لیتی ہے کہ اس کا خیال اور عمل ہی صحیح ہے اور اس سے انحراف یا اختلاف غلط ہے۔ نہ صرف اقلیت بلکہ ہر شخص جو آزادانہ فکر کر سکتا ہے

سوسائٹی کا مجرم بن جاتا ہے۔ سقراط کا واقعہ دنیا کی پہلی جمہوریت میں، آزادی کی تاریخ میں ایک بہت بڑا المیہ نشان ہے۔
یا اگر اکثریت تنظیمی اعتبار سے کمزور ہے تو وہ ایک متشدد اور متعصب اقلیت کو اس بات کا موقعہ فراہم کرتی ہے کہ وہ طاقت کے ذریعہ حکومت حاصل کرے اور ایک غیر ذمہ دار مطلق العنانی کی حکومت قائم کر لے۔ حکیم ارسطو نے کہا تھا کہ مزاج یا طوائف الملوکی کی کیفیت آمریت کو دعوت دیتی ہے۔

(۳) یہ دو شدید صورتیں تھیں جب قوم کی جمعیت جو مشترک مقاصد اور نظریات پر مبنی ہوتی ہے کمزور پڑ جاتی ہے اور طبقاتی مفادمیں شدید تضاد رونما ہو جاتا ہے۔ اور خانہ جنگی اور انقلاب کا خطرہ شدید ہو جاتا ہے۔ عام طور سے اکثریت اور اقلیت میں مختلف مفادات و نظریات میں طاقت کا ایک توازن سا قائم رہتا ہے۔ یہ توازن ترغیب اور دباؤ کے بڑے بڑے منطقے پیدا کر کے قائم ہوتا ہے۔ ترغیب اور دباؤ کے منطقوں سے ہماری مراد پارٹیاں۔ یونین۔ اخبارات، نشرواشاعت کے ذرائع وغیرہ ہیں۔ اکثریت کو اس کی ضرورت اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اور خانہ جنگی اور انقلاب کے خوف کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور اقلیت کو اپنے وجود اور مفاد کے تحفظ کے لئے اور اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے ہوتی ہے۔ ان زبردست ترغیب اور دباؤ کی مشینوں میں فرد کی حیثیت ایک پرزہ کی سی رہ جاتی ہے۔ یہ مشینیں جتنی پھیلتی جاتی ہیں فرد کی تنہائی کا احساس گہرا ہوتا جاتا ہے، اور جتنی یہ زیادہ طاقتور ہوتی جاتی ہیں اور ان کی کارکردگی (EFFICIENCY) بڑھتی جاتی ہے فرد اتنا ہی مجبور اور بے معنی ہوتا جاتا ہے۔ جس طرح جنگ کے دوران ایک فرد اپنے آپ کو ایک متحارب کیمپ میں پاتا ہے اور اپنے تحفظ کی خاطر اس کیمپ کے جذبات اور رویئے اور عمل کی تنظیم میں اس کو شریک ہونا پڑتا ہے، وہ ایک اسم نہیں رہتا بلکہ عدد بن جاتا ہے۔ اسی طرح امن کے زمانہ میں بھی وہ اپنے آپ کو سوسائٹی کے ایک نظام میں پاتا ہے۔ اور اپنے تحفظ کی خاطر اور ماحول پر کچھ قابو پانے کی خاطر اس کو تنظیموں میں شریک ہونا پڑتا ہے جہاں اس کی حیثیت ایک آزاد انسان کی بجائے ایک یونٹ کی سی رہ جاتی ہے۔ میں ایک ملک میں مختلف مفادات اور نظریوں کے توازن کا ذکر کر رہا ہوں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے گویا میں اگلے وقتوں کی باتیں کر رہا ہوں۔ اب تو چونکہ حکومت کی کارکردگی کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے اور مرکزیت کی طرف شدید رجحان کارفرما نظر آتا ہے، اور حکومت کا کام اس قدر پیچیدہ ہو گیا کہ عام طور سے یہ یقین کیا جاتا ہے کہ عام ذہنی سطح سے بالا، ماہرین ہی اس سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

اور چونکہ سائنس نے نہ صرف عام نشر و اشاعت کے آلات مثلاً پریس، سینما ریڈیو، ٹی، وی۔ حکومت کی طاقت اور دولت کے لئے مہیا کر دیئے ہیں بلکہ انسان کے لئے انسان کے جسم و دماغ، اس کی سائیکولوجی اور فزیالوجی پر بھی ایسی قدرت ممکن کر دی ہے کہ بہت سے مفکرین آئندہ انسان کا تصور خاص مقاصد کے لئے ڈھلی ہوئی مشین کی طرح کرتے ہیں اور تعلیم، پراپگنڈا، اور معاشی دباؤ سب حکومت ہی کے ہاتھ میں جمع ہیں اور چونکہ ہتھیار عام طور سے وہ ایجاد ہو چکے ہیں جن میں لا محالہ حکومت ہی کی اجارہ داری ہوتی ہے اور تمام طاقت حکومت کے ہاتھ میں جمع ہے۔ اور چونکہ بین الاقوامی دنیا میں ایک ہمہ وقت خوف و اندیشہ کی ہنگامی کیفیت طاری رہتی ہے اور خود مختار ملک اور معاشرے اپنے آپ کو ایسی طاقتوں کے شکنجہ میں گرفتار پاتے ہیں جو ان کے قابو سے باہر ہیں اور یہ آب و ہوا انفرادی آزادی کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔
اس لئے ایک مبصر جوڈ کا یہ کہنا کہ دو حکومتیں قادر مطلق اور مطلق العنان ہوتی جا رہی ہیں۔ پریس ان کی

آوازہ ہے، تعلیم ان کا پراپگنڈا ہے، تاریخ ان کی صفائی اور معذرت نامہ ہے فنون ان کی صدائے بازگشت ہیں انسانی دماغ مقید ہے اور اس کی کنجی حکومتوں کے پاس ہے" مبالغہ سے دور اور حقیقت سے نزدیک معلوم ہوتا ہے۔ فرد اپنے آپ کو بے بس اور مجبور محسوس کرتا ہے اور کوشش یہ ہے کہ یہ بے بسی اور مجبوری کا احساس بھی ختم ہو جائے۔ کیونکہ اس کا دماغ، اس کی تعلیم، اس کے پیشے، اس کی تفریحات سب مشینی پیداوار کی طرح ایک سانچے میں ڈھلتے جا رہے ہیں، اس میں حکومت کے کاروبار کی طرف سے ایک بے نیازی اور بے پروائی پیدا ہوتی جا رہی ہے اور اس پر اندر اور باہر سے حکومت کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی ہے۔

ایک طرف جب ہم ان جناتی قوتوں کو جو بیدار ہو کر زمین پر چھائی جا رہی ہیں اور ان رجحانات کو جو یہ قوتیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، انسانی ارادہ کے بغیر اختیار کرتی جا رہی ہیں، دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اس بات پر غور کرتے ہیں کہ انسانی دماغ میں اثر پذیری اور انفعالیت کی کتنی بے حد صلاحیت ہے تو انسانی عظمت میں سے یقین کمزور ہوتا نظر آتا ہے اور انسانی تقدیر سے مایوسی ہونے لگتی ہے۔ اس بے معنی اور سدرج کش فضا کے خلاف بغاوت کبھی اخلاقی بے راہ روی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے کبھی آزادی کا راستہ محض یہ نظر آتا ہے کہ بنیادی طور پر اس دنیا کو بے معنی اور سدرج کو ایک واہمہ قبول کر لیا جائے تو کیا چونکہ بہت کم انسان عقل سے کام لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور صحیح سیاسی شعور بہت کم انسانوں کو حاصل ہوتا ہے اس لئے ایک قوم کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسری "پسماندہ" قوم کو آزادی سے محروم رکھے۔ یا حکومت اس بات میں حق بجانب ہے کہ وہ افراد یا ان کے نمائندوں کو سیاسی میدان کے زیادہ سے زیادہ رقبہ سے بیدخل کر کے اس رقبہ کو حکومت کی جولانیوں کے لئے مخصوص کر لے یا افراد اور ان کے نمائندوں میں اتنا فاصلہ اور اتنی خندقیں حائل کر دے کہ افراد کی آزادی محض ایک واہمہ بن کر رہ جائے۔ میں اس نتیجہ سے متفق نہیں ہوں کیونکہ

(i) مانا کہ اکثر آدمی اپنے افعال میں عقل سے کام نہیں لیتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو لوگ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سیاست کے میدان میں لانے میں کامیاب ہوتے ہیں ان کے افعال کی محرک عقل ہی ہوتی ہے، اور ان میں بہت سیاسی شعور ہوتا ہے۔ سیاسی شعور فوری فائدہ کی حس سے بہت مختلف چیز ہے۔ فوری فائدہ کی حس تو جانوروں میں بھی ہوتی ہے۔ ایک قوم کے دوسری قوم کو آزادی سے محروم کرنے یا رکھنے میں جو محرکات ہوتے ہیں ان میں معقولیت یا نیک نیتی کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔

(ii) دوسرے اس لئے کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ دوسرے لوگ میرے مفاد کی حفاظت کریں گے۔ افراد اور ان کے نمائندوں میں جتنا فاصلہ کم ہوگا اتنی ہی آزادی ایک حقیقت ہوگی۔

(iii) تیسرے اس لئے اگر وہ بہت نیک دل اور نیک نیت (BENEVOLENT) بھی ہوں تو ایسا نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ میرا تو مفاد ہی یہ ہے کہ میں خود یقینی مقاصد میں شریک ہوں اور بلا رکاوٹ اپنے دائرہ میں ان کو پورا کرنے کی سعی کروں۔ آزادی اور جمہوریت کی بنیادی دلیل یہی ہے کہ ایک طبقہ یا گروہ کو تمام قوم کے مفاد کا متولی نہیں بنایا جا سکتا۔

(iv) چوتھے یہ کہ سیاسی زندگی میں اجارہ داری کے نتائج اقتصادی زندگی میں اجارہ داری سے بھی زیادہ مضر ہوتے ہیں۔

(v) پانچویں یہ کہ کوئی شخص تیرنا جانے یا نہ جانے، اگر وہ تیرنا سیکھنا چاہتا ہے تو پانی میں اس کو اترنا ضرور ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ڈوب بھی سکتا ہے مگر آزادی میں خطرہ ہوتا ہی ہے، لوگوں کے ذہنی افق کو تنگ رکھنا آزادی کی تربیت نہیں ہے بلکہ آزادی کی اکثر خرابیوں کا علاج زیادہ آزادی ہے۔ نہ میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ آزادی سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمام فلسفۂ آزادی کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ انسان عاقل ہے اور انسان اکثر و بیشتر اپنے

ارادہ اور فعل میں عقل سے کام نہیں لیتا لیکن انسانی عقل سے مایوس ہونا رحمتِ خداوندی سے مایوس ہونے سے بڑھ کر کفر ہے۔ انسان کا شرف وامتیاز ہی تو اس کی عقل ہی ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا مٹی کا دیا ہی سہی لیکن اسی کو آندھیوں میں روشن رکھنا ہے اور ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی روشنی نہیں۔ ہاں اس بحث کا مطلب یہ ضرور ہے کہ جہاں تک نگاہ جاتی ہے انسانی مستقبل میں انفرادی آزادی کا مطالعہ زیادہ دشوار ہوتا نظر آتا ہے جوں جوں تہذیب بڑھے گی حکومت کی کارکردگی کا میدان زیادہ وسیع ہوتا جائے گا لیکن اس کا محض مطلب یہ ہے کہ انفرادی آزادی کا مسئلہ زیادہ نازک اور دقیع ہوتا جائے گا۔ پہلی عالمگیر جنگ سے پہلے مغربی ممالک میں یہ گمان عام ہو چلا تھا کہ آزادی کی جنگ فتح پر ختم ہو چکی۔ پہلی جنگ اور دوسری جنگ کے بعد کسی آدمی کے لئے ایسے گمان پر قائم رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ بلکہ آج آزادی کی ازسرِ نو مثبت تعریف کرنے کی اور اس کے لئے پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ جد وجہد کرنے کی ضرورت اور بھی شدید ہے۔ نہ آزادی پیدائشی حق ہے، نہ اپنی آزادی کسی ریاست کے سپرد کی جا سکتی ہے بلکہ آزادی کے لئے بڑی سمجھ بڑی بیداری، بڑے محاسبۂ نفس اور بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ یہ وہ نعمت اور انعام نہیں جو بیوقوف یا جاہل یا غافل آدمی کے نصیب میں ہو آزادی کی تعریف لاسکی نے یہ کی ہے کہ آدمی اپنے آپ سے وفادار رہے اور اس میں مدافعت کرنے کی ہمت ہو۔ جہالت اور غفلت اور کم ہمتی اپنے آپ سے غداری ہے، اپنے اوپر ظلم ہے۔ اور آزادی کی سب سے بنیادی جنگ اسی ظلم کے خلاف لڑی جاتی ہے۔ آزادی کی قیمت جیسا کہ کہا گیا ہے ہمہ وقت بیداری ہے۔ اس بیداری میں صرف اپنے ماحول کا ہی احتساب شامل نہیں ہے بلکہ اپنے نفس کا احتساب بھی شامل ہے۔ غفلت کے نتیجہ میں ایک شخص بہت آسانی سے بھیڑ میں داخل اور بھیڑ چال میں شامل ہو جاتا ہے جو آزادی کی صریحاً نفی ہے۔ تیرنا آزادی ہے۔ بہنا غلامی ہے۔ اس کے لئے صحیح تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے اور اس تعلیم میں نظامِ تعلیم اتنی اہم چیز نہیں ہے کیونکہ نظام تو حکومت کی قائم کردہ ایک مشین ہے جس کا اولین مقصد اپنے کچھ مخصوص مفاد ہوتے ہیں بلکہ صحیح معلموں کی جن کا اولین مقصد خود نوجوان ہوں جو نوجوانوں کے ابھرتے ہوئے دماغوں پر کوئی خاص عقیدہ یا نظریہ یا Dogma مسلط کرنے اور ان کے اندر ایک مذہبی جنون یا سیاسی تعصب پیدا کرنے کی بجائے ان میں آزادانہ غور وفکر کی صلاحیتوں کو ابھاریں ظاہر ہے کہ یہ کام بہت ہمت طلب ہے لیکن اگر یہ نہ کیا گیا تو یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ایسی نسل پیدا ہو جائے، ان کی ایسی خواہشات اور مقاصد ہوں، کہ ان میں ظلم کا احساس یا آزادی کی امنگ ہی ختم ہو جائے۔

(۴) کیا آزادی قانون کی حاکمیت کے متراحت ہے؟

اب ہم "فطری حق" یا "پیدائشی حق" کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ بنیادی حقوق کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ گویا آزادی فطرت کے عطیہ کے طور پر انسان کو حاصل نہیں ہے بلکہ بہ حیثیت انسان کے ہر فرد کے کچھ حقوق ہیں جن کی ضمانت ریاست کو یا معاشرہ کو کرنی چاہیئے۔ بجائے آزادی کے مبہم اور مجرد لفظ کے اب ہم مخصوص حقوق کا تعین کرتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں۔

مل نے ضمیر کی آزادی، خیال واحساس کی آزادی، رائے اور اظہار کی آزادی، مذاق ومشاغل کی آزادی، جماعت بنانے کی آزادی کے حقوق کا شمار کیا۔ انگریزوں کے آئین میں انفرادی آزادیٔ اظہار کو فرض کر لیا گیا ہے اور اس پر قانونی طور پر کچھ پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں مثلاً انجمن اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کا منشور بھی منظور وشائع کر دیا۔ اکثر آئینوں میں بنیادی حقوق کی تعریف اور توضیح آئینی قانون میں ایک حصہ کے طور پر شامل ہیں۔ یہ باتیں بہت ضروری ہیں اور ہر سمجھدار آدمی ان کی دل سے قدر کرے گا۔ حقیقت یوں ہے کہ بنیادی

کی اور قانون اور قانونی اداروں کی خواہ وہ کتنے ہی اصلاح طلب ہوں مخالفت تو ایک ظالم اور جاہل آدمی ہی کر سکتا ہے۔

سیاسی اعتبار سے آزادی اس قانون کے راج کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو لوگوں نے یا ان کے نمائندوں نے بنایا ہو۔ اس کا مقابلہ طاقت کے راج یا دولت کے راج سے کیا جا سکتا ہے۔ قانون کا راج آزادی کی شرط اولین ہے لیکن وہ آزادی کے مترادف نہیں ہے۔ کیونکہ (۱) قانون کا راج طاقت کے راج یا دولت کے راج کی دوسری صورت ہو سکتا ہے (۲) نمائندگی کی مشینری ایسی بنائی جا سکتی ہے کہ فرد کا قانون سازی میں ختصر سے ختصر بھی حصہ نہ ہو (۳) کچھ "قانون" نمائندہ جماعت کی حاکمیت کے دسترس سے باہر بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ (۴) کچھ "قانون" نمائندہ جماعت کی حاکمیت کے دسترس سے باہر بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ (۵) "امن عامہ" کی خاطر یا ہنگامی حالات کا اعلان کر کے بنیادی حقوق کو عارضی طور پر ہی سہی کالعدم کیا جا سکتا ہے۔

(ج) آزادی اور ریاست

ریاست کے اقتدار [illegible] اور فرد کی آزادی کے مابین حد بندی کرنا سیاسیات کا نازک ترین مسئلہ ہے۔ شام مین نے آزادی کی حد یہ بتائی کہ ایک فرد کو وہ سب کچھ کرنے کا حق ہے جو دوسروں کے ایسے ہی حقوق کے منافی نہ ہو۔ مل نے اس مسئلہ کا جواب یہ دیا ہے کہ دوسرے کی آزادی میں دخل دینا بس اس حد تک جائز ہے کہ کوئی فرد اپنے آپ کو معاشرہ کے لئے خطرہ یا آفت کا باعث نہ بنائے۔ اس نے انسانی افعال کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ وہ افعال جن کا اثر محض اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے اور وہ افعال جن کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔ گو عملی طور پر یہ تقسیم زیادہ کارآمد نہیں ہے کیونکہ ایک طرف حکومت کے کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اور دوسری طرف معاشرہ کے داخلی روابط اس قدر گہرے اور مضبوط ہیں کہ ایسے افعال کی نشان دہی کرنا جن کا اثر محض ایک فرد کی ذات تک محدود ہو اور وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ دوسرے لوگوں پر اثر انداز نہ ہوں ناممکن ہے۔ لیکن نظری طور پر یہ تقسیم ممکن ہے۔ رسل لکھتا ہے کہ جہاں ایک فرد کے افعال براہ راست نمایاں طور پر، اور بلاشک و شبہ دوسروں کو نقصان نہ پہنچائیں تو ان حدود میں فرد کی آزادی کا احترام کرنا چاہئیے" یا "جو آزادی ہم چاہتے ہیں وہ دوسروں پر ظلم کرنے کا حق نہیں ہے۔ بلکہ اپنی منشا اور مرضی کے مطابق رہنے کا حق جس حد تک ہمارا یہ حق دوسروں کے ایسے ہی حق کے راستہ میں حائل نہ ہو" یا "جہاں ایک آدمی کی ملکیت دوسرے کے خرچ پر قائم نہیں ہوتی وہاں تک حکومت میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، مثلاً اس کے خیالات علم، آرٹ، ذاتی اخلاق" یہ باتیں السٹر پھیر کر ہی علم میں اور مل کی بات ہے اور عملی طور پر وہی اشکال اس کے اندر ہے گو ریاست اور فرد کے مابین کوئی عمرانی معاہدہ نہیں ہوتا اور نہ عمرانی معاہدہ کے ذریعہ ریاست وجود میں آتی ہے لیکن نہ کسی ایسے معاشرہ کا تصور کیا جا سکتا ہے جس میں حکومت کا اقتدار اسی قدر بڑھا ہوا ہو کہ فرد کی آزادی مطلقاً مفقود ہو جائے، نہ کسی ایسے معاشرہ کا جس میں فرد کو اتنی آزادی میسر ہو کہ حکومت کا اقتدار ہی ختم ہو جائے۔ ہاں فرد کو ریاست سے اور ریاست کو فرد سے کچھ جائز توقعات ضرور ہوتی ہیں اور یہی توقعات فرد کی آزادی اور ریاست کے اقتدار کی حد بندی اور تعریف کر دیتی ہیں۔ عام طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاست کے حسب ذیل مقاصد ہیں:

(۱) معاشرہ کا تحفظ و دفاع:۔ ریاست کی حفاظتی اور دفاعی تنظیم اپنی بقا کی خاطر بھی ہو سکتی ہے اور اظہار قوت کے فطری جذبہ کے تحت یا اس مفروضہ پر کہ اگر ہم دوسروں کو غلام نہیں بناتے تو دوسرے ہمیں غلام بنائیں گے دوسرے معاشروں پر اقتدار قائم کرنے کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔

(۲) معاشرے کے اندرونی حدود میں حکومت کا مقصد قیام امن و عدل ہوتا ہے۔ امن وہ بھی ہو سکتا ہے جو عدل کا نتیجہ ہو، وہ بھی ہو سکتا ہے جو ظلم کی کامیابی ہو۔ عدل کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حکومت کمزور کی دستگیری کر کے اس کو طاقتور کے برابر بنائے، عدل کی یہ بھی تعبیر ہو سکتی ہے کہ طاقتور اور کمزور کی کشتی میں حکومت ایک امپائر کے فرائض انجام دے

اور نہایت ایمانداری سے طاقتور کو زیادہ طاقتور اور کمزور کو زیادہ کمزور بنانے کے سامان پیدا کرے۔

(۳) تیسرا مقصد بہبود اور فلاحِ عامہ ہے۔ جس کو محض کچھ طبیعتوں میں بھی محدود کیا جا سکتا ہے اور تمام افراد میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ میں نے دانستہ "ترقی" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ اس لئے کہ ترقی کا لفظ محض فاصلہ کو بتاتا ہے۔ سمت کا تعین نہیں کرتا۔ نہ میں نے فلاح کی اصطلاح کا تجزیہ کیا ہے اس لئے کہ اس کا تجزیہ بالکل ایک دوسری بحث سے تعلق رکھتا ہے۔

غرض تعبیریں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن مقاصد یہی ہوتے ہیں۔ اور ان ہی مقاصد کی بجا آوری میں آزادی کے ساتھ حصہ لینے سے ایک آدمی قدیم اصطلاح میں "اچھا انسان" بن سکتا ہے۔ آزادانہ حصہ لینے کے معنی یہ ہیں کہ

(۱) اگر ان مقاصد کی تعبیر اس کے خیال کے مطابق غلط کی جا رہی ہے تو وہ اپنے خیال کے مطابق ان کی صحیح تعبیر کرے۔ بحث و تنقید کی یہ اولین شق ہے جس کے بغیر سقراط زندگی کو زندہ رہنے کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

(۲) دوسرے افراد کو اپنا ہم خیال اور ہم عقیدہ بنانے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

(۳) وہ قانونی ذرائع سے ان مقاصد کو اپنی تعبیر کے مطابق بروئے کار لانے کی سعی کرے۔

(۴) جو قانون اس راستہ میں رکاوٹ ہوں ان کو مناسب طور پر بدلنے کی سعی کرے۔

ایسی صورت حال کا تصور کرنا ممکن ہے جس میں فرد اور جماعت کے مفاد اور مقاصد مشترک ہوں۔ عدل و فلاح کی تعریف ایک ہی ہو۔ اور ہر فرد اس مقصد کو پورا کرنے میں آزادنہ یعنی اخلاقانہ طور پر حصہ لے رہا ہو تو ایسی صورت میں جماعت اور فرد کا تضاد، جبر و آزادی کا تضاد مٹ جاتا ہے اور انتہائی قربانی میں سے اثباتِ ذات کی صورت پیدا ہوتی ہے، مذہب کی زبان میں اس کو شہادت کہتے ہیں۔

عام طور سے وسیع منطقوں میں بدحالی اور بے چینی کا معروضی وجود فرد اور ریاست کے اندر اشتراکِ مقاصد یا ہم آہنگی کی موجودگی کی نفی کرتا ہے۔ لیکن فرد اور اس معاشرہ میں جس پر ریاست مشتمل ہوتی ہے ایک گہرا اپنایت کا رشتہ موجود ہوتا ہے۔ اور اسی دعوٰی پر ریاست اپنی بقا کی خاطر فرد سے انتہائی قربانی کا تقاضہ کرتی ہے۔ کسی جارحانہ حملہ کے خلاف مدافعت میں شرکت کرنا اور قربانی دینا ایک اعلیٰ اخلاقی قدر کا حامل ہے کیونکہ جارحانہ حملہ خود اک ظلم ہے۔

ایسی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ انتہائی قربانی کے تقاضہ میں نہ کوئی مقصد موجود ہوتا ہے نہ دفاع کی ضرورت۔ بلکہ جب جنگ کی آگ پھیلتی ہے تو اکثر قومیں اس کی لپیٹ میں آجاتی ہیں۔ اور بین الاقوامی قانون جنگل کا قانون بن جاتا ہے۔ ایسی قربانی کی ایک حیاتیاتی ضرورت سہی لیکن اخلاقی قدر کوئی نہیں ہوتی۔ یہ ہلاکت خود ان قوموں کی بداعمالیوں کا نتیجہ اور سزا ہوتی ہے۔ اس قربانی کا جواز کسی اخلاقی قانون سے نہیں بلکہ جنگل کے قانون سے ممکن ہے۔

لیکن اگر یہ تقاضہ جبری بھرتی وغیرہ کی صورت میں کسی ایسے مقصد کے لئے کیا جا رہا ہے جس کو ایک فرد انسانیت کے خلاف ظلم یقین کرتا ہے تو اس کی مخالفت کرنا فرد کی آزادی کا مقدس فریضہ ہے اور اس کی مخالفت نہ کرنا اپنے اوپر ظلم ہے۔

ریاست کے مقاصد کا ذکر کرنا اس بات کی کوشش تھی کہ فرد کی آزادی کو ذمہ داریوں سے وابستہ کر کے اس کی تعریف کی جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں بہت سے ایسے سوالات قایم کئے جا سکتے ہیں جن کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ کیا ایک فرد کی اول اور آخر وفاداری ریاست سے ہے؟ کیا کسی اصول کی خاطر کسی خاص حالت میں ریاست سے غداری کی جا سکتی ہے؟ کیا ریاست

کی سالمیت اس کے جغرافیائی حدود ہیں۔ اور اس کی سالمیت اور سیاسی اور نظریاتی بنیادوں پر بحث کرنے کی کس حد تک آزادی ہے۔ حکومت کی خارجہ پالیسی پر کس حد تک تنقید کی جاسکتی ہے۔ کسی "دوست" ملک کی حکومت یا وہاں کے معاشی اور سیاسی حالات پر کس حد تک تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ حکومت کی کسی ملک سے دوستی یا مخالفت فرد کو کس حد تک پابند کر دیتی ہے۔ خود اپنے ملک کی حکومت یا حاکموں پر کس حد تک تنقید کی جاسکتی ہے۔ کیا کل تک انڈونیشیا میں جو شخص صدر سوئیکارنو پر تنقید کرتا وہ ملک کا غدار تھا، آج وہ اس پر تبرّیٰ نہ کرے وہ ملک کا غدار ہے۔ کیا کسی اخلاقی ضابطے سے حکومت خود ریاست کی غدار نہیں ہوسکتی ہنگامی حالات کیا ہوتے ہیں اور کن حالات میں شہری آزادی کو کس حد تک ختم کرنا جائز ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات ایسے ہیں جن کا جواب بہت نازک اور مشکل ہے۔ لیکن شاید وہ تین مقاصد جن کو اوپر بیان کیا گیا ہے کسی خاص سوال کے متعلق ایک جواب تک پہنچنے میں کسی حد تک مفید ہوسکتے ہیں۔

اگر کسی شخص کو یہ یقین ہے کہ حکومت ظلم کر رہی ہے، قانون کا احترام اٹھ چکا ہے ایک خاص طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی دولت جمع ہو رہی ہے اور اس کا صرف بیجا ہو رہا ہے اور بدحالی اور محرومی اور ابتری پھیلتی جارہی ہے اور قانون کے ذریعہ اس صورت حال کی کوئی اصلاح نہیں ہوسکتی، اور نہ مروجہ قانون بدلے جاسکتے ہیں تو پھر خواہ وہ بغاوت کی حد تک اس صورت حال کی مخالفت نہ کرے لیکن اس کو بغاوت کا اخلاقی حق ضرور پہنچتا ہے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے میں اخلاقی طور پر آزاد ہے۔

امام حسینؑ نے یزید کی طاقت کے خلاف خروج کے تین جواز بتائے۔

(۱) حاکم جابر اور ظالم ہے۔ بندگان خدا سے ظلم و جور کا برتاؤ کرتا ہے۔ لوگوں پر ان کی مرضی کے خلاف حکومت کرتا ہے

(۲) اس نے خراج سلطنت (ملکی سرمایہ) کو اپنا خاص مال قرار دیدیا ہے۔

(۳) حلال خدا کو حرام اور حرام خدا کو حلال بناتا ہے یعنی اس کی مرضی ہی قانون ہے۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ بغاوت کی آزادی کے تین نہایت صحیح جواز ہیں۔ اور ویسے تو ہر کامیاب بغاوت کا نام انقلاب ہے اور ہر انقلاب آپ ہی اپنا جواز ہے۔

(۴) نظریاتی ریاست میں فرد کی آزادی

نظریہ آئیڈیالوجی کا ترجمہ ہے۔ آئیڈیالوجی کے لغوی معنی "خاص طور پر سماجی زندگی کے واقعات کے متعلق ایک نظام فکر، یا ایک طرز فکر جو کسی خاص فرد یا طبقے یا معاشرہ سے مخصوص ہو" بتائے گئے ہیں، دوسرے معنی میں تو ہر ریاست جس حد تک وہ کسی خاص معاشرہ یا تہذیب کی عکاسی کرتی ہے ایک آئیڈیالوجی اپنے پیچھے رکھتی ہے۔ لیکن ہم آئیڈیالوجی کی اصطلاح کو نظام فکر کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں۔ اس معنی میں نظریاتی ریاستیں وہ ہیں جو اپنے آپ کو کسی خاص نظام فکر سے وابستہ کرتی ہیں۔ ان نظریاتی ریاستوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان میں کسی کتاب اور کسی شخص کو آخری سند اور آخری حکم کا مقام حاصل ہوتا ہے۔

نظریاتی ریاستوں میں فرد کی آزادی کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوجاتا ہے۔

(۱) یہ ریاستیں ایک کتاب اور ایک شخص پر یقین سے پیدا ہوتی ہیں۔ ابتدائی انقلابی دور میں زیادہ سے زیادہ انفرادی حاصل ہوتی ہے۔ اس معنی میں نہیں کہ ہر شخص اپنے فکر و عمل میں آزاد ہوتا ہے۔ نہیں بلکہ ڈسپلن اور پابندیاں

سخت سے سخت ہوتی ہیں۔ بلکہ اس معنی میں کہ جماعت اور فرد کے مقاصد میں پوری ہم آہنگی ہوتی ہیں اور تحریک میں شمولیت کے محرکات میں جذبۂ آزادی بہت نمایاں ہوتا ہے۔

(۲) جب یہ تحریک انقلابی دور سے نکل کر ریاستی دور میں داخل ہوتی ہے اور اس کو طاقت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے تو گروہ منافقین کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ منافقت کا مسئلہ تحریک کے ریاستی دور ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔

(۳) تحریک کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ کتاب کی مختلف تعبیریں ہوتی جاتی ہیں۔ مرکزی شخصیتوں کا اقتدار کم سے کم تر ہوتا جاتا ہے۔ پھر تاریخی، جغرافیائی، سیاسی، معاشی، نفسیاتی وجود سے مختلف فرقے پیدا ہو جاتے ہیں

(۴) پھر پارٹی یا برہمنوں اور مولویوں کی جماعت کا حکومت سے گٹھ جوڑ ہو جاتا ہے۔ اور فرد کی آزادی کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب تک یہ گٹھ جوڑ قائم رہتا ہے آزادی قریب قریب ناممکن ہو جاتی ہے۔ اور سخت سے سخت ظلم ممکن ہو جاتے ہیں۔ لارڈ ایکٹن جو خود رومن کیتھولک فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لکھتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ میں چرچ اور ریاست میں جو تصادم ہوا، شہری آزادی ہیں اسی تصادم کے طفیل حاصل ہوئی۔ امریکہ میں بھی آزادی اسی وقت ممکن ہوئی جب مذہب اور ریاست علیحدہ ہو گئے۔

(۵) یقین عمل کے لئے بہت ضروری ہے۔ اسی لئے ایسے معاشروں اور ریاستوں میں کارکردگی کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن یقین بہت آسانی سے تعصب میں تبدیل ہو جاتا ہے، اگر کوئی اتھارٹی ظلم کرے اور ظلم کا احساس بھی موجود ہو تو یہ احساس خود اس ظلم پر ایک حد بن جاتا ہے لیکن اگر کوئی اتھارٹی اس یقین کے ساتھ ظلم کرے کہ یہ بہت نیک کام ہے تو پھر اس ظلم کی کوئی حد نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی اچھا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے تو اس کی بہت قیمت دینی پڑتی ہے۔ اگر مساوات بھی حاصل ہوتی ہے تو ایسی جیسی جیلخانوں میں قیدیوں کو مساوات حاصل ہوتی ہے۔

(۶) کبھی نظریاتی ریاست کا مقصد یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ کسی تحریک یا دین کی تجدید کی جائے یا اس کا احیا کیا جائے۔ ایسی صورت میں

(۱) فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی ایک جذباتی وابستگی کو کچھ سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن لوگوں میں صحیح شعور اور فکر و عمل کی آزادی اسی حد تک کم ہوتی جاتی ہے جب ہم فخر یہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان تو بس اسلام کے نام پر ابھارا جا سکتا ہے۔ بس اسلام کے نام پر جان دے سکتا ہے تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان کا اسلام سے محض جذباتی تعلق رہ گیا ہے۔ اور جذباتی لگاؤ اور صحیح شعور متقابل (INVERSE) تناسب میں ہیں۔ ایک نام کی خاطر وہ آخری قربانی دینے کے لئے تیار ہے لیکن اگر انسانیت، حق، انصاف کا واسطہ دیا جائے اور ظلم کا احساس اس میں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا اور یہ نہیں سمجھتا کہ اسلام کا تقاضہ یہی ہے۔ اس سے زیادہ انفرادی آزادی کے منافی کیا صورت حالات ہو سکتی ہے۔ آزادی کا تعلق عقل سے ہے جذبات سے نہیں۔

(۲) ماضی کا شعور ایک بات ہے وہ تو خود آگاہی کا ایک حصہ ہے۔ لیکن تجدید و احیا کے تصورات کو اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل کی طرف چلنے والا مسافر اپنی نگاہیں ماضی کی طرف لگائے ہوئے ہے۔ ماضی جس

معنی میں زندہ ہے اس کو سیاست اور ریاست کے ذریعہ زندہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس معنی میں مردہ ہے اسکو زندہ کیا نہیں جا سکتا، خواہ سیاست اور ریاست کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے مذہب کے نام پر جتنی سیاسی تحریکیں چلائی گئیں ان میں سے اکثر میں رجعت پسندانہ رجحانات نمایاں ہو گئے۔

(۳) ماضی اور حال کے بنیادی تضاد سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس فرد مت پر زور دیا جاتا ہے کہ دین کو زمانۂ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اس سے زیادہ احمقانہ اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ اور اس طرح اپنے زمانہ کے سماجی اور معاشی مسائل پر غور کرنے میں بہت سی دور از کار بحثیں اور لایعنی دلائل داخل ہو کر اس مسئلہ ہی کو مسخ کر دیتی ہیں اور ایسا الجھاؤ پیدا کر دیتی ہیں کہ انسانی فکر بجائے آزادانہ عمل کرنے کے معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں مسئلہ سود۔ خمر۔ عائلی قانون۔ فیملی پلاننگ وغیرہ وغیرہ

(۴) اگر کسی معاشرہ یا ریاست سے عقیدہ مندی کا لگاؤ نظریہ کا ایک جزو بن جائے تو اس حد تک تنقیدی شعور جو فرد کی آزادی کے لئے بمنزلۂ جان ہے بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ تاویلات لے لیتی ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے لئے ان کی تاریخ کے کچھ زمانے اور کمیونسٹوں کے لئے روس یا چین۔

میں ہر قسم کی نظریاتی ریاست سے بہت ڈرتا ہوں۔ وہ ہرے رنگ کی ہو یا سرخ رنگ کی۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ریاست اپنے مقاصد کی وضاحت کر دے، عدل اور فلاح کی تعریف کرے۔ ظاہر ہے کہ اس توضیح و تعریف میں معاشرہ کا دینی شعور بنیادی طور پر کارفرما ہو گا۔ ان مقاصد اور ان کو بروئے کار لانے کی تدابیر کے متعلق آزادانہ طور پر بحث و تنقید ہو۔ ہر فرد اس فکر و عمل میں آزادی سے حصہ لے۔ یہ نہیں ہے کہ مجھے مذہب کے حقائق میں یقین نہیں ہے، مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ نعرہ کہ ہمارا دین اور سیاست ایک ہی ہیں۔ دین سے گہرائی کو اور ریاست سے آزادی کو ختم کر دیتا ہے۔ دین اور ریاست کے عمل کا دائرہ زندگی ہی ہے۔ لیکن جس سطح پر وہ کام کرتے ہیں اور ان کا طریق کار مختلف ہیں۔ دین اور سیاست کا ایک گہرا تعلق ہے۔ لیکن وہ تعلق یہ نہیں ہے کہ دین اور سیاست ایک ہیں، نہ مسلمانوں کے متمدن معاشرہ میں وہ ایک رہے ہیں، ریاست چند مخصوص مقاصد کے لئے معاشرہ کی ایک تنظیم ہے منجملہ اور تنظیموں کے، مذہب معاشرہ میں روح کی حیثیت رکھتا ہے، ریاست کو مطلق اخلاقی اور روحانی برتری کا درجہ دینا آزادی کے لئے نیک شگون نہیں ہے۔ اسلامی معاشرہ کا ذکر تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اسلامی حکومت کی کوشش کرنا کچھ زیادہ مفید یا بامعنی کام نہیں ہے۔ ریاست پوری زندگی نہیں ہوتی، پورا کلچر نہیں ہوتی۔ بلکہ ریاست کا آرٹ، لٹریچر، مذہب میں دخل دینا، اور ریاست تو سرپرست ہی کی حیثیت سے دخل دے سکتی ہے اکثر مضر نتائج ہی پیدا کرتا ہے۔ میں اس نکتہ پر اس لئے زور دے رہا ہوں کہ مجھے مذہب بھی عزیز ہے اور انسانی آزادی بھی۔

(۷) آزادی اور مساوات

انیسویں صدی کے مغربی مفکرین میں انفرادی آزادی کا بڑا علمبردار تھا یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوا کہ انفرادی آزادی کے نتیجہ میں مسابقت اور مقابلہ شدید تر ہو گیا اور سرمایہ دار مالدار ہوتے چلے گئے اور محنت کش زیادہ بدحال ہوتے چلے گئے اور چونکہ دولت کی غیر مساوی تقسیم سے زندگی کے مواقع کی تقسیم بھی غیر مساوی ہو جاتی ہے اس لئے یہ رجحان بڑھتا ہی چلا گیا، انفرادی آزادی پر سے جتنی پابندیاں ہٹائی گئیں اتنی ہی سرمایہ دار اور محنت کش طبقہ میں عدم مساوات بڑھتی گئی۔

گویا آزادی کے معنی محض یہ ہوگئے کہ بقول اس کے خوش قسمت آدمیوں کو بد قسمت آدمیوں پر ظلم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ ایک کلیہ سا قایم ہوگیا کہ غیر مقید انفرادی آزادی ہمیشہ مساوات کی دشمن ثابت ہوتی ہے۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "مستقبل کا معاشرتی مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آزادئ عمل کو کس طرح دنیا کی خام دولت کی مشترکہ ملکیت اور مشترکہ محنت کے فوائد کی مساویانہ تقسیم کے ساتھ ملایا جائے"

اس عدم مساوات کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی محض نام نہاد آزادی بن کر رہ گئی ہے۔ اگر کسی ملک میں امیر اور غریب آدمیوں کا تناسب نکالا جائے اور اس ملک کی انتظامیہ یا نمائندہ مقننہ میں امیروں اور غریبوں کا تناسب نکالا جائے اور ان دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ پیٹ کا غلام حق رائے دہندگی پا کر آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ ایسے معاشرہ میں احترام انسانیت ممکن ہے۔ جو شخص کسی جائز یا ناجائز طریقہ سے، لوٹ کھسوٹ یا چوری کے کسی ذریعہ سے مالدار ہو گیا وہی معاشرہ میں معزز بن گیا آج کل دنیا میں کچھ ملک ترقی یافتہ سمجھے جاتے ہیں اور بہت سے ملک پسماندہ یا ترقی پذیر ممالک سمجھے جاتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کا خاص مرض افلاس بتایا جاتا ہے یہانتک کہ تعلیم کا جواز بھی یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ دانشمندانہ سرمایہ کاری [illegible] ہے۔ افلاس کو دور کرنے کے لئے پیداوار بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے، پیداوار بڑھانے کا وہ ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے جس میں سرمایہ کی فراہمی پر زور ہوتا ہے جس کی پسماندہ یا ترقی پذیر ممالک میں کمی ہوتی ہے اور محنت کی فراہمی کی قدر کم ہوتی ہے جس کی پسماندہ ممالک میں بہتات ہوتی ہے۔ سرمایہ کی فراہمی کی صورت یہ پیدا کی جاتی ہے کہ ترقی یافتہ ممالک سے جن میں فاضل دولت اور سرمایہ ہوتا ہے قرض لیا جائے یا عطیات حاصل کئے جائیں یا اپنے ملک میں سرمایہ کاری کا موقعہ دیا جائے اور اپنے ملک کے سرمایہ داروں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ اس صورت حالات کی معذرت یہ پیش کی جاتی ہے کہ بغیر قرضہ کے کام نہیں چلتا اور کاروبار میں تو قرضہ سب ہی لیتے ہیں۔ ہاں یہ دیکھ لو کہ قرضہ کو عیاشی میں خرچ نہ کیا جائے۔ قرضہ میں دُہری برکت ہے، قرضہ دینے والے کا بھی فائدہ ہے، اور قرض لینے والے کا بھی۔ قرضہ سے ہماری نسل بھی خوشحال رہے گی اور آیندہ نسلیں اور بھی زیادہ خوشحال ہونگی۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ فی کس اوسط آمدنی بڑھ رہی ہے۔ یہ فی کس اوسط آمدنی بھی شماریات کا بڑا ظالم مذاق ہے) یہ بات ذمہ دار آدمی دیکھ رہے ہیں کہ اس قرضہ کے عوض کوئی چیز گرو نہیں رکھی گئی ہے۔ قرض دینے والے کو کچھ فائدے ضرور ہوتے ہیں سو یہ تو دنیا کا قاعدہ ہے کہ کچھ نہیں فائدہ ہو کچھ دوسرے کو فائدہ ہو۔ جب ہی تو سودا پٹتا ہے۔ مفلس لوگوں کے متعلق یہ ہے کہ جب ملک میں کاروبار پھیلیگا قومی پیداوار میں اضافہ ہوگا تو ان کی حالت یقیناً بہتر ہوگی۔

مجھے اس استدلال پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ یہ جتانا ہے کہ سرمایہ اور محنت کے مقابل میں سرمایہ پر زور دینا انسان کی توہین ہے، ظلم عظیم ہے، نہ اس بات پر زور دینا ہے کہ قوم کے مستقبل کی تعمیر کی خاطر ایک نسل کو اپنی قربانی دینی پڑتی ہے اور قربانی ڈرنے کی چیز نہیں ہے، نہ اس یقین دہانی کی ضرورت ہے کہ بھوکے پیٹ والے ایک امید وار یقین پر بہت خوشی سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھنے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں، مجھے اس سلسلہ میں صرف دو باتیں عرض کرنی ہیں۔

(۱) پہلی یہ کہ افلاس کو دور کرنا ایک بات ہے اور معیار زندگی کے بڑھانے، اور بڑھانے، اور بڑھانے کے چکر میں پڑنا مختلف بات ہے۔ ان کو آپس میں خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ پہلے افلاس کو دور کرنا ہے۔ پھر اس کے بعد معیار زندگی کی تعریف اور اس کو بڑھانے کی تدابیر پر غور کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اب لوگوں میں بے چینی کی وجہ محض افلاس کی موجودگی نہیں ہے بلکہ عدم مساوات کا احساس ہے۔ اب مفلس آدمی خیرات لیکر شکر گذار نہیں ہوتا کہ اس کی کچھ حاجتیں پوری ہوگئیں۔ اس کے لئے زیادہ تکلیف دہ بات یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس اشیائے صرف کی کمی ہے بلکہ یہ ہے کہ دوسرے شخص کے پاس جس کی اہلیت اس کے مقابلہ میں کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہے اشیائے صرف کی اسقدر بہتات کیوں ہے کہ وہ خیرات دے سکتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ معاشرہ میں اتنا معزز ہے۔ اب اس کو یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ کسی آدمی کو اللہ نے مالدار پیدا کیا ہے اور کچھ بہت سوں کو غریب۔ سائنس کی ترقی نے اسے یہ یقین دلا دیا ہے کہ اس کی تمام ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ اور اس کے افلاس کے اسباب قدرتی نہیں ہیں۔ اب اس کے دماغ میں ایک بڑا انقلاب آفریں سوال پیدا ہو چکا ہے کہ آخر یہ کیوں ہے کہ ایک آدمی خیرات دینے کی استطاعت رکھتا ہے اور دوسرا خیرات لینے پر مجبور ہے۔

اس سے اگر یہ بات کہی جاتی ہے کہ کچھ پیدا ہو جب ہی تو تقسیم ہوگی، جب تقسیم کرنے کے لئے ہی کچھ نہیں ہے تو کیا مفلسی کو تقسیم کیا جائے۔ افزائش پیداوار کے لئے پوری تن دہی سے کوشش کرو تو تمہارا حصہ بھی بڑھ جائیگا تو اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ نہ ان باتوں سے اس کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو ان باتوں میں یقین نہیں ہے۔

اب اس سوال کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ اگر ابھی یہ سوال تکلیف دہ طریقے سے سامنے نہیں آیا تو عنقریب آئیگا۔ سوال صرف افزائش پیداوار کا نہیں ہے بلکہ تقسیم پیداوار کا ہے۔ ممکن ہے سرمایہ کی فراہمی پر اس کا برا اثر پڑے۔ لیکن محنت کی کارکردگی میں اضافہ یقینی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ آزادی کا مسئلہ احساس ظلم سے پیدا ہوتا ہے۔ آزادی کا جواز یہ ہے کہ فرد ایک ذمہ دارانہ حیثیت سے سماجی ماحول میں جدوجہد کر کے اچھا انسان بن سکے۔ ان بڑی بڑی تنظیموں کے زمانہ میں جب تک ایک فرد تنقید اور احتساب کی صلاحیتوں کی تربیت نہیں کرتا اس وقت تک وہ صحیح معنی میں آزادی کی نعمت نہیں پا سکتا۔ سماجی زندگی میں فرد کے سامنے یا ریاست کے سامنے اہم ترین مقصد قیام عدل ہے۔ اس سے عظیم تر کوئی مقصد نہیں ہے۔ قیام عدل ہی آزادی کا معیار ہے، بغیر کسی معیار کے آزادی بے معنی اور بے حقیقت ہے۔ عدل کی تعریف میں لوگوں کے احساس و شعور کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ترمیم اور اضافے ہوتے رہے ہیں، اور آزادی کی جدوجہد ہر زمانہ میں ایک خاص عنوان سے جاری رہی ہے۔ ہمارے زمانہ میں عدل کی تعریف میں کم از کم اس درجہ معاشی مساوات شامل ہو چکی ہے کہ معاشرہ میں انسان بلا کسی طبقاتی امتیاز کے ایک دوسرے سے مل جل سکیں۔ اب ہر فرد کی اپنے آپ سے وفاداری یہ ہے کہ وہ عدل کی تعریف پر غور و فکر کرے اور اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں وضاحت کرے۔ اس کے حصوں کے ذرائع متعین کرے اور اختیار کرے۔ اس کو اپنی تنقید اور احتساب کا معیار اور اپنے عمل کا محرک جذبہ بنائے۔ عدل کے بعد ہی فلاح ممکن ہے۔ بغیر عدل کے آزادی ناممکن ہے اور فلاح کا ذکر کرنا عیاری یا حماقت ہے۔ بنتھم نے "زیادہ سے زیادہ افراد کے لئے زیادہ سے زیادہ خوشی" کا نعرہ رائج کیا تھا۔ اب اس نعرہ کی ترمیم شدہ صورت "زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ عدل ہے" اسی سے وہ معاشرہ تعمیر ہوگا جس کی خاطر زندہ رہنا "اچھا آدمی" بننا ہے اور جس کی خاطر مرنا زندگی کی تکمیل ہے۔ یہی انفرادی آزادی کی تلاش ہے۔ اسی طرح انفرادی آزادی بجائے ایک مسئلہ کے ایک ملکیت بن سکتی ہے۔

(اردو مجلس کی ماہانہ نشست میں پڑھا گیا)

انجم اعظمی

میر کا لہجہ

میر کے لہجہ پر کچھ لکھنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شاعری میں جس چیز کو ہم لہجہ کہتے ہیں وہ گفتگو کے لہجہ سے مختلف ہے
مثلاً میر کے حسب ذیل شعر میں

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

"میاں" کے لفظ سے انداز تخاطب بے حد منفرد ہو گیا ہے لیکن شعری لہجہ صرف لفظ میاں سے عبارت نہیں ہے بلکہ پورے شعر میں میر تقی میر جس طرح سموئے ہوئے ہیں اسے آواز میں پالینے کا نام لہجہ کا پانا ہے۔ جب کوئی شاعر اپنی پوری شخصیت اور انفرادیت کے ساتھ آواز میں ڈھل جائے تو ہم کہیں گے کہ اس نے اپنا لہجہ پالیا ہے۔ اشعار میں شاعر بکھر جاتا ہے لیکن لہجہ میں شاعر کے "کل" کی بازیافت ہوتی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ انسان اپنی تخلیق آپ کرتا ہے وہ اس دعویٰ کے ثبوت میں کسی بھی منفرد شاعر کا لہجہ پیش کر سکتے ہیں کیونکہ شاعر آواز کے روپ میں اپنی ہی تخلیق کرتا ہے۔

اس سلسلے میں اسلوب اور لہجہ کے اصطلاحی معنی کے فرق کو بھی سمجھ لینا چاہیئے اسلوب کی اصطلاح نثر و نظم دونوں کے لئے مستعمل ہے جبکہ لہجہ صرف شاعری کی اصطلاح ہے۔ اس کی موجودگی میں اسلوب کی اصطلاح عموماً نثر کے لئے اور صرف کبھی کبھی لہجہ کے بجائے شعری اسلوب کی ترکیب استعمال ہوتی ہے۔

چونکہ شاعری میں جا بجا گفتگو کا انداز شامل ہوتا ہے اس لئے بعض حضرات یہ غلطی کر سکتے ہیں کہ شعری لہجہ کو گفتگو کا اتار چڑھاؤ سمجھ لیں اس کے علاوہ شعری اسلوب کی ترکیب کے استعمال سے یہ ممکن ہے کہ وہ اسلوب اور لہجہ کو شعر کی دو مختلف خصوصیات تصور کریں اس لئے دونوں کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

اردو میں لہجہ کے اعتبار سے تین طرح کے شاعر ہیں بعض شاعر ایسے ہیں جنھوں نے اساتذہ کے رنگ میں بہت لکھا ہے اور ہر استاد سے فیض اٹھایا ہے مثلاً مصحفی اور حسرت۔ ان دونوں کے کلام کے صرف ایک مختصر حصہ میں ان کا اپنا لہجہ جھلکتا ہے۔ شاعروں کی دوسری قسم وہ ہے جن کا اپنا لہجہ ہے لیکن ان شاعروں کے لہجے میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ملتی جس کی بنا پر ہم کہہ سکیں کہ وہ صرف اپنی "آواز" کے بل بوتے پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ مہدی افادی نے محمد حسین آزاد کی انشا پردازی کے متعلق لکھا ہے کہ سرسید، شبلی،

بنیادی عناصر کی کھوج میں ان کے زمانے اور ذات کا پورا پورا سراغ لگانا ہوگا اور دونوں کے باہمی تعلق کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔

زمانے کی گردشوں کے ردعمل میں انھیں جو کچھ ملا وہ اختصار کے ساتھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کے ہم عصروں کے یہاں میں سادگی، نرمی اور درد کی آمیزش ہے اس عہد کی سب سے بڑی انسانیت، گوشہ نشینی، درویشی اور قلندری ہے اور یہ لہجہ اسی کی غمازی کرتے ہیں۔ نظیر کا لہجہ بھی اس عہد کی قلندرانہ زندگی ہی کا ایک رخ ہے۔ اس کی رندی اور پھکڑپن آدمی کو ہر حال میں خوش رکھ کے غم کے تذکرے سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ اس کے یہاں ذات کی جگہ ہجوم اور "مرگ انبوہ کا جشن" لے لیتا ہے۔ لیکن میر، درد، قائم وغیرہ ہجوم سے گھبرا کر ذات میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

باہر قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے روہیلے مرہٹے اور افغان کبھی دلی کو لوٹ لیتے ہیں کبھی بادشاہ کی آنکھیں نکال لی جاتی ہیں خزانے میں روپیہ نہیں ہے سپاہیوں کو تنخواہیں نہیں ملی ہیں سپاہی شہر کے سوداگروں کی دوکانیں لوٹ کر اپنا گزارا کرتے ہیں ایسے میں سوائے ذات کے زندگی کی قدروں کا تحفظ اور کہاں ممکن تھا۔ میر اپنے دور کے دوسرے شاعروں کی طرح اپنے زمانے کی قدروں کے محافظ تھے یہاں تک میر اپنے زمانے کے حوادث سے پیدا ہونے والی عام دردمندی میں دوسروں کے شریک ہیں لیکن اس کے آگے میر کی انفرادیت کی وہ وسیع فضا ہے جس میں خواب سے خیال تک سارے رنگ میر تقی میر کے اپنے ہیں۔

میر کے والد نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ وہ عشق کرے زندگی کی سربلندی صرف عشق سے ہی ہے۔ میر کے والد صوفی منش انسان تھے ظاہر ہے کہ عشق کا لفظ ان کی نگاہ میں کتنا مقدس اور پاکیزہ رہا ہوگا ورنہ بیٹے کو اس طرح کی ہدایت کیوں کرتے۔ اور جب بیٹے ہی کی تحریر سے باپ کی اس حکیمانہ گفتگو کا پتہ چلے تو یہ رمز آشکار ہوتا ہے کہ میر نے اپنے باپ کے بتائے ہوئے راستے ہی کو اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ اسی لئے شروع سے ان کی عشقیہ شاعری میں ایک عنصر زائد ملتا ہے کہ ان کا عشق کسی شخص سے بھی ہے اور شخص سے ماوری بھی ہے۔ یہ عشق کبھی معرفت و خود آگہی، کبھی دردمندی اور انسانیت: اور کبھی تہذیب بن جاتا ہے۔

یہاں درد، تاثر اور سوز سے الگ ان کا اپنا لہجہ، خیال اور تصور ملتا ہے، جہاں تک میر کی انسانیت کا سوال ہے ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ درد، قائم اور ان کے دوسرے ہم عصر شعرا کے فن کی بنیاد بھی کم و بیش وہی انسانیت ہے جو میر کے یہاں ملتی ہے کیونکہ فن کی بنیاد بہرحال انسانیت ہی کی اشاعت ہے لیکن میر کی انسانیت اتنی سچی، الگ تھلگ ایسی انوکھی، اتنی عظیم، اتنی سادہ اور فطری ہے کہ اس کو اپنانے کے لئے میر ہی بننا پڑے گا۔ اسی کی طرح تصنع کے سارے خول اتارنے ہوں گے عشق میں سب کچھ کھونا پڑے گا اور یہ جان جوکھوں کا کام ان کے ہم عصر نہیں کر سکتے تھے میر درد کی زندگی میں خانقاہی آداب اور صاف ستھری تہذیب ملتی ہے لیکن میر کی انسانیت آدمی کے سوا اور کسی چیز کو قبول نہیں کرتی۔ یہ ایک خالص شے ہے۔ اس میں ابتدائی انسان کی سادگی اور معصومیت ہے جو فطرت کی گود میں پلا ہے اور میر کا عشق دوسرے شخص کا ہی شناسا نہیں ہے بلکہ خود اس کی معرفت کی منزل ہے۔ اس میں زندگی کے دکھوں کی معرفت بھی شامل ہے۔ یہ عشق اس کی انسانیت کو خود آگہی کا درجہ عطا کرتا ہے دوسرے لفظوں میں اس عشق نے جو خود آگہی اور ذات کی معرفت بن چکا تھا انسان کی ازلی سادگی اور معصومیت سے ہم آہنگ ہو کر میر کی اس بے پایاں اور گہری انسانیت کو جنم دیا جو ہمارے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ جنم جنم کی دوستی کو جگاتی ہے اور گہرے دکھوں سے آشنائی کے سبب، تمام تر دردمندی میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی انسانیت میر کی شخصیت کا سب سے بنیادی عنصر ہے۔ اسی کی بدولت میر کا لہجہ منفرد صورت اختیار کرتا ہے اور میر کی شخصیت، لہجہ اور انسانیت کا وہ دائرہ بنتا ہے جس میں گاہے گاہے آفاق بھی سمٹ جاتا ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

اس شعر میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا کام بہت نازک ہے اور یہاں آدمی سانس بھی آہستہ لے۔ اب دونوں باتوں کو ملا دیجئے۔ معلوم ہوا ــ کہ آدمی اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنے کی احتیاط میں آفاق کو بھی سنبھالے رہتا ہے اور آدمی ذرا بگڑ جائے تو آفاق کی ساری عمارت ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائے۔ یہی وہ نازک لہجہ ہے جس کی سادگی میں آفاق کا جلال و جمال اور آدمی کی تقدیر حل ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کے حل ہونے کے بعد میر کا لہجہ وہ نہیں رہا جسے صرف دردمندی یا انسانیت کہہ کر سمجھا یا جا سکے بلکہ دردمندی اور انسانیت سے آدمیت کے نصب العین اور انسان اور آفاق کے رشتے تک اس لہجہ میں نرمی اور گداز کے ساتھ عجیب وزن اور وقار پیدا ہوتا چلا گیا ہے۔ اب یہ میر کے عہد کے دوسرے شاعروں کے سیدھے سادے لہجے سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔

خدا ساز تھا آذر بت تراش
ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں
کہاں ہے آدمی عالم میں پیدا
خدائی صدقے کی انسان پر ہے
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان اشعار میں میر کا لہجہ دردمند نہیں ہے بلکہ ایک پر وقار آواز آفاق کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے یا خاک کے پردوں کو چاک کر کے انسان ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔

جو لوگ شاعری میں انسان اور خدا کا رشتہ ڈھونڈتے ہیں۔ ان سے ویسے تو سارے ہی اردو شاعروں نے مذاق کیا ہے۔ میر نے بھی شغل کیا ہے۔ ع

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

رندی اور آزادمنشی کی تبلیغ کا سہارا لیکر ہماری شاعری میں یہ مذاق برابر جاری رکھا گیا لیکن اسے ناکافی جان کر سنجیدگی سے بھی کہا

الہٰی کون ہیں، ہوتی ہے جن کو بندگی خواہش
یہاں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

میر کا انسان آفاق کو سنبھالتا ہے۔ زمانے کی گردشوں سے ٹکراتا ہے خدائی سے رشتہ استوار کرتا ہے اس کے عشق کا فرہاد اس تہذیب کی تخلیق کرتا ہے جس کی بنیاد آدمیت کے سچے احترام پر رکھی گئی ہے۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

صوفیاء نے جب انسان اور خدا کے رشتہ کو جمال کل اور عشق حقیقی کا تعلق بتایا تھا تو عشق کے بہانے یہ کہا تھا کہ خدا کو اپنی ذات میں تلاش کرو جو بندگی کرتے ہیں وہ خدا کو اپنی روح میں تلاش کرنے کے بجائے دنیاداری کی دہلیز پر طوف کے ان اسباب کو سجدہ کرتے ہیں جو مکر و فریب کا اس دنیا میں ننگ

گزارنے کا ایک قدیم ردعمل ہے۔ لیکن اس سلسلے میں میر نے جبر و اختیار کے مسئلے سے قدم آگے نہیں بڑھایا کیونکہ ان کا لہجہ احترامِ آدمیت سے عبارت ہے یہاں زندگی بے ثبات تو ہے اور آفاق کی منزل کے ہر سفری کا مال و اسباب بھی لٹ جاتا ہے۔ لیکن بس۔ آگے میر نے آدمی کو آفاق کی منزل کا مسافر کہا ہے۔ انسانی عظمت کا یہ تصور میر کو آدمیت کے اعلیٰ ترین نصب العین تک لے جاتا ہے جہاں آدمی کا خدا خود اس کے اندر کا آدمی ہے جس کی دریافت وہ عشق کرتا ہے جو انسانی روح میں گہری دردمندی اور انسانیت کی کھوج لگاتا ہے خارج میں یہی آدمی آفاق بن جاتا ہے اور اس داخلی سیاحی اور خارجی وسعت کو اپنا کر میر کا لہجہ اردو شاعری کی محدود فضا سے نکل کر دنیا کی شاعری میں اپنے لئے مناسب جگہ کا مطالبہ کرتا ہے۔

میر کے لہجہ کے تجزیہ میں اب تک عشق، دردمندی، انسانیت، آفاق، سپردگی، اور رندی کی روایت کو تلاش کیا جا چکا ہے لیکن شاعری انسان اور انسان کے درمیان ایک ایسا رشتہ بھی ہے جو صرف عشق کے لفظ سے سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میر جس معاشرہ میں رہتے تھے اس کا حال سودا نے اپنے "شہر آشوب" میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ میر نے بھی "شہر آشوب" لکھا۔ لیکن ان کا یہ مصرع۔

مژگاں تو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا

دلی کے بادشاہوں کی نااہلی اور افغانوں، مرہٹوں اور روہیلوں کے حملے کی ہوبہو تصویر بن جاتا ہے اس مصرع میں "مژگاں تو کھول" کا ٹکڑا شعور کی بیداری کی ایک عام دعوت کے علاوہ اس شدید کرب کا اظہار تھا کہ حادثوں کے سیل میں شہر کے بہہ جانے کے باوجود سارا شہر سوتا رہ گیا۔

میر کے لہجہ کا ایک اہم منفرد جمالیات ہے جس میں شاعر بہ حیثیت شاعر اپنے وجود کو قائم رکھتا ہے۔

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

یہ میر کا ایک بے حد عام شعر ہے۔ لیکن اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میر کو حسن سے کتنی گہری وابستگی تھی۔ سارے جہاں کی سیر کے بعد بھی حسن سے جب میر کا جی نہ بھرا اور نہ حسن کو نت نئے رنگ میں دیکھنے کا سودا ہی کم ہوا تو وہاں بھی تاک جھانک شروع کر دی جہاں رسائی ممکن نہ تھی (اور اجازت کا سوال نہ تھا) اس امید میں کہ شاید یہیں حسن کا کوئی انوکھا روپ نظر سے گزرے حسن کی اسی تلاش میں شاعر معاشرہ کی بندشوں کو توڑ دیتا ہے تاک جھانک کے اس نرالے کھیل میں خطرناک سے خطرناک موڑ پر بھی میر بڑا البیلا اور شوخ نظر آتا ہے کیونکہ یہاں خطرات اور اندیشوں سے قوی تر احساس اپنے خواب کے پورے ہونے کا ہے کہ جس اچھی صورت اور زندگی کے انوکھے حسن کے لئے وہ دربدر کی خاک چھانتا رہا ہے اس کا دیدار نصیب ہوگا۔ "تاک جھانک" میں یہ رمز پنہاں ہے کہ جو انسان اپنے خوابوں کی تکمیل چاہتا ہے اس کی سرشت میں حسن کی تلاش کے جذبے کے ساتھ ساتھ بے باکی اور نڈر ہونا بھی شامل ہوتا ہے۔ اسی لئے فن کا منصب انسان کی اس بے خوفی، جرأت اور جد و جہد کا مرقع کھینچنا ہے جو حسن کے سورج کے سامنے سے کالی بدلیوں کو ہٹا کر اس کی کرنوں کو ہم تک پہنچنے کی مکمل آزادی بہم پہونچانے کے لئے ہوتی ہے۔ "تاکنا جھانکنا" میں چوری کی چیز اور گناہ کی جو لذت ہے وہ میر کے اس شعر میں گناہ اور حسن کے گہرے تعلق کا ثبوت ہے بقول مجاز

زندگی کیا ہے گناہ آدم   زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

اور بالواسطہ اس بات کا اظہار ہے کہ معاشرہ سے حسن کے باب میں انسان کو اب تک کیا میسر آیا ہے اسی لئے کسی کا یہ سمجھنا کہ میر کا لہجہ صرف اس کی ذات کا نمائندہ ہے اور معاشرہ سے کٹا ہوا ہے اس بات کا غماز ہوگا کہ اسے شاعری کی زبان اور رمز و کنایہ کی نزاکتوں سے آگاہی نہیں ہے۔

ڈبلو۔ بی ایٹس کے حوالے سے مجھے یہ بتانا مقصود ہے کہ شاعری کی زبان جس احساس، جذبہ، خیال یا معنی کو پیش کرتی ہے اسے نثر میں نہ پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ شاعری ہئیت و معنی دونوں ہی کے امتیاز سے منفرد ہوتی ہے۔ اس کی کمی نثر سے پوری نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس کے مضامین اور معیار الگ ہوتے ہیں۔ شعر کی جمالیات ہی میں ادب اور زندگی اور ادیب اور معاشرہ کے وہ رشتے پروے ہوتے ہیں کہ شعر کے حسن سے واقفیت نہ ہو تو زندگی کے گہرے اور بنیادی رشتے بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے بے شمار افراد ساری زندگی گزارنے کے بعد بھی نہیں جانتے کہ انسانی رشتے کیا ہوتے ہیں اور شعر کی سمجھ کیا چیز ہے۔ جس طرح کی زندگی ہم لوگوں کے حصے میں آئی ہے اس میں انسانی رشتوں کے علم اور بشری لطافتوں کی حس کی کوئی خاص حاجت بھی نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمارے معاشرے میں انسان کی بے باکی، حسن کی پسند اور تلاش کا بڑا فقدان ہے۔

یہاں شاعر بڑا اہم رول ادا کرتا ہے اس کی جمال پسندی زندگی کو نئی توانائی بخشتی ہے میر کی شاعری اور لہجہ میں اس کی جمال پسندی کے ہزار رنگوں نے مل کر زندگی کی اسی توانائی کی مسلسل تخلیق کی ہے۔

درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

اس مصرع کو غور سے پڑھیئے۔ یہاں ایک غم نہیں ہے بلکہ ایک خواب کے پورے نہ ہونے کے بعد تھک کر بیٹھ جانے کے بجائے میر دوسرے خواب کی تعبیر ڈھونڈھنے نکل جاتا ہے اور اگر وہ بھی پورا نہ ہوا تو پھر یہ دنیائے ادب کا سندباد تیسرے خواب کی تعبیر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اس طرح زندگی کی جد و جہد مسلسل جاری ہے اور ہزار غم جمع ہوتے جاتے ہیں میر انھیں غموں کا گلدستہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس میں اتنا حوصلہ ہے کہ ساری زندگی تھکن سے عاری رہ کر اپنی مسلسل ناکامیوں کی داستان پورے ضبط سے سنا سکے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حوادث کے ہزار طوفان سر سے گزر گئے لیکن میر ان کے سامنے ساری زندگی ایک چٹان کی طرح جما رہا یہ انسانی حوصلہ اور ضبط کی شاعری ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غم زندگی کی کتنی بڑی قدر ہے اور اس میں کتنا حسن اور کتنی قوت ہے۔ یہ وہی توانائی ہے جسے میر کے احساس جمال نے تخلیق کیا ہے۔

شعر کی جمالیات مبہم اور غیر واضح نہیں ہوا کرتی یہ ایک اعلیٰ تر سطح پر زندگی گزارنے سے گہرے طور پر منسلک ہے۔ دراصل شاعری کا اپنا ایک نصب العین ہے وہ اتنی ہی عظیم ہوتی ہے جس قدر زندگی کی توانائی اور حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ میر کے لہجہ کا پیکر شاعری کے اسی نصب العین اور زندگی کے جمال نے مل کر تراشا ہے۔ اس لہجہ نے 'زندہ رہنے' 'حسن کو اپنانے' اور زندگی سے رشتہ استوار رکھنے کی شدید ترین خواہش کا بیک وقت ابلاغ ہوتا ہے۔ یہی جمال پسندی میر کو ایک کھویا ہوا شخص بنا دیتی ہے جس کی خوابناک زندگی کا افسانہ اردو شاعری کی تاریخ میں بڑا مشہور ہے۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں

کون سی نیم باز آنکھیں۔ کیا یہ بچھڑے ہوئے محبوب کی ادھوری بازیابی ہے۔ میر کسے یاد کر رہا ہے۔ کیا کسی کی آنکھیں سچ مچ اتنی ہی خوبصورت تھیں جیسی میر کے خواب و خیال کے آئینہ میں نظر آتی ہیں۔ دراصل یہ "نیم باز آنکھیں" جمال کی مرئی اور محسوس

صورت تھی جسے میر کے تخیل نے جنم دیا تھا اور پھر ساری زندگی میر اسے ڈھونڈھتا رہا۔ یہ اپنے محبوب کی تلاش تھی فن کے معیار کی تلاش تھی زندگی کے حصول کی تمنا تھی۔

ان نیم باز آنکھوں کی خواب جیسی کیفیت میر کی زندگی اور لہجہ پر چھائی ہوئی ہے اس کے لہجہ پر انھیں آنکھوں کے خواب کا پرتو ہے جس سے میر کی جمال پسندی، بے خودی، رعنائی خیال، سپردگی، دردمندی اور انسانیت کی خبر تول جاتی ہے لیکن اس میں ایک خرابی بھی ہے کہ میر کا یہ "نیم باز آنکھوں کا خواب" یاد رہ جاتا ہے لیکن اس خواب کے پیچھے میر کے لہجہ کی قوت اور توانائی کو لوگ بھول جاتے ہیں میں نے ان نیم باز آنکھوں کے حصار کو توڑ کر ہی میر کے لہجہ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جس میں انفس و آفاق ایک ہو گئے ہیں جیسا کہ میر کے اس مصرع سے بھی اظہار ہوتا ہے۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا

غالب نے اپنی پختگی کے زمانے میں میر کے لہجہ کی اس قوت کو پہچان کر ہی اس کی شعری روایت کو اپنا لیا تھا۔

اقبال

اپنے خطوط کے آئینہ میں

(صفحہ ۳۰ سے آگے)

مولانا ابوالکلام کا بڑی عزت ہے۔ اور ان کی تحریک سے ہمدردی۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے بنے گئے۔ ان میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے"، معلوم نہیں انہوں نے کیا سنا تھا اور سنی سنائی باتوں پر اعتبار کرکے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ کسی طرح ان لوگوں کے شایان شان نہیں۔ جو اصلاح کے علمبردار ہوں"۔

اقتباس ذرا طویل ہو گیا۔ مگر اس سے بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ جب دل دکھتا ہے تو تلخ بات زبان سے نکل جاتی ہے۔ لیکن اقبال نے حفظِ مراتب اور لہجہ کی سنجیدگی کو برقرار رکھا ہے۔ شکایت برحق ہے۔ اس لئے وہ سخت الفاظ استعمال کرتے تو بھی جائز ہوتا۔ لیکن ان کی فراخدلی کا یہ حال ہے کہ اس کے بعد کہتے ہیں۔ "مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین احمد کہاں ہیں ورنہ یہ موخر الذکر شکایت براہ راست ان سے کرتا۔ اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہنچا دیجیے۔"

غرض اقبال کے خطوط ان کی شخصیت اور سیرت کے پوری طرح آئینہ دار ہیں۔ اور ان میں بہت سے علمی، تاریخی، مذہبی اور فلسفیانہ مسائل پر بھی اچھی بحثیں کی گئی ہیں۔ اس لئے اقبالیوں کے لئے ان کا مطالعہ ازبس مفید اور لازم ہے۔

عتیق احمد

ادیب اور معاشرے سے وفاداری

ادب کے مقصدی اور افادی تصورات کے آغاز ہی سے ادیب کی وفاداری کا مسئلہ ہر جگہ زیر بحث رہا ہے۔ یہ مسئلہ ایک بڑی حد تک رشتے کی بحث ہے۔ یہ رشتہ ریاست کے وجود اور نظریات، اُس کی انتظامی قوتوں اور اُس کے اداروں کی صلاحیتوں اور ادیبوں کے درمیان کا رشتہ ہے۔ اس رشتے میں ابتدا ہی سے جگہ جگہ کچھ ایسی گرہیں پڑی ہوئی ہیں جو ریاستوں کی سیاسی اور معاشروں کی ثقافتی تاریخ کے ہر نئے موڑ پر نئی سے نئی الجھنیں پیدا کرتی رہی ہیں۔ اس الجھاؤ کی سب سے بڑی وجہ جہاں اس مسئلے کی نزاعی نزاکت رہتی چلی آئی ہے وہاں ابہام و تفہیم کے دو راستے بھی ہیں جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہیں اور جن کو سمجھنے سمجھانے میں درمیانی فرد کے لئے اپنا ہی نہیں دوسروں کا بھی وزن سہار کر کچے سوت کی ڈوری پر چلنے کی مہارت اور ریاض کی ضرورت ہے۔

یہ مسئلہ چونکہ ہمیشہ ہی سے قریب قریب عالمگیر نوعیت کا رہا ہے اور ہر جگہ ادیب سے وفاداری طلب کی جاتی رہی ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں گفتگو اصولی بحث کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اپنے یہاں بھی یہ مسئلہ نزاعی رہا ہے اور پاکستانی ادیب سے بھی کچھ کھلے اور کچھ دبے الفاظ میں وفاداری کی فرمائش کی گئی ہے لہٰذا اس صورت حال نے کہ ہماری ثقافتی تاریخ میں پہلی بار کھُل کر ادیب کی اہمیت اور ادب کے اثباتی رویے کا اقرار ذمہ دار حلقوں میں کیا جا رہا ہے۔ ہماری ثقافتی زندگی میں ادب اور ادیب سے معاشرے کی بے تعلقی کی گہری کائی کے نیچے گم سم سطح آب پر کچھ ایسے ارتعاش پیدا کئے ہیں جن کے سہارے اپنے ملک کے ادبی ماحول کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ پھر ایک بات یہی ہے کہ یہ کام ایک آدھ لکھنے والے کا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں لکھنے والے اس مسئلہ پر غور و فکر کر کے مسئلے کی اُلجھنوں کو سلجھانے کا دردِ سر مول لیں اس لئے کہ یہ مسئلہ اپنے اپنے ادبی آدرش کی معقولیت اور مقصدیت کو سمجھنے سمجھانے کا مسئلہ بھی ہے۔ اپنے آدرش سے لگاؤ کا تقاضہ یہی ہے کہ اس مسئلے کو پوری سنجیدگی اور دیانتداری سے سمجھنے سمجھانے کا یہ موقع ہم اپنی شانِ بے نیازی کے ترکش میں کند تیر سمجھ کر نہ رکھ لیں۔ مانا یہ تیر بہت سفاک انی کا تیر ہے مگر لکھنے والے کو آخر کوئی نہ کوئی تیر تو اپنے سینہ پر کھانا ہی پڑتا ہے پھر کیا ایسے تیر کا انتخاب کسی کمتر درجے کے تیر کا انتخاب ہے جو سینے کے داغ کو اس حد تک وا کر دے کہ ارباب وطن اس زخم کی مہک پا جائیں جسے آپ برسہا برس سے کسی چھوت پھیلانے والے زخم کی طرح چھپائے پھر رہے ہیں

اس مسئلہ کی سمتیں متنوع بھی ہیں اور متضاد بھی ہر چند کہ اس کی ساری سمتوں کو ایک مختصر مضمون میں سمیٹنا مشکل ہے۔ پھر بھی کچھ ایسی اہم سمتوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو اس مسئلے کی نوعیت کو کسی حد تک واضح بنا سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک سطح پر یہ تقاضہ اس بات کا اظہار

ہوسکتا ہے کہ عالمی معاشروں میں ادب کی روایات کا نئے معاشرتی اور ثقافتی رجحانات سے جو رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے اُسے دوبارہ جوڑا جاسکے۔ دوسری سطح پر یہ مسئلہ ادیب کے آدرش کو ملک و ملت کے انتظامی ڈھرے اور مزاج سے بلا شرط ہم آہنگ کرنے کی خواہش کا اظہار ہوسکتا ہے۔ تیسری سطح پر یہ مسئلہ ادیب کو ایسی غیر مشروط آزادی تحریر دینے کا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ معاشرے کی ذہنی اور جذباتی تہذیب کا پوری طرح سے ذمہ دار بنا دیا جائے۔ مختصر ترین الفاظ میں گویا سارا مسئلہ ادیب کی معاشرے، سیاست اور حکومتوں اور اُس کے اپنے آدرش سے بے لوث وفاداریوں کا مسئلہ ہے چنانچہ زندگی، معاشرہ، سیاست، حکومت اور ادبی آدرش سب ہی سے ادیب کے رویئے اور مسلک کی بحث اس موضوع کی وہ اہم سطحیں اور سمتیں بن کر سامنے آتی ہیں جن کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کیا جاسکتا ہے۔ زندگی چونکہ اس تمام بحث میں اہم ترین قدرِ مشترک ہے اس لئے اسی کے تعلق سے ادبی رویّوں، مسلکوں اور وفاداری کا تجزیہ اس بحث کا نقطۂ آغاز ٹھہرتا ہے۔

عام افرادِ معاشرہ کے مقابلے میں لکھنے والے کا شناختی نشان چونکہ اس کی وہ تحریریں ہوتی ہیں جن میں وہ اپنا فکری مسلک منضبط کرتا ہے اس لئے لکھنے والے کی ادبی وفاداری کا مسئلہ اُس کے اُس نقطۂ نظر کی چھان بین سے متعلق ہوتا ہے جسے بنیاد بنا کر وہ اپنی تحریروں کی افادیت اور فعالیت کا تعین کرتا ہے۔ ادب میں زندگی کے برتنے کے سوال کا جواب عام طور سے اسی روشنی میں سوچا جاتا ہے کہ لکھنے والا کیوں لکھتا ہے؟ یہ سوال چونکہ اور بہت سے ضمنی سوالات کو زیرِ بحث لاکر ہمیشہ ہی سے خلطِ مبحث کا سبب بنتا رہا ہے اس لئے اگر اس مسئلے کو یوں سوچا جائے کہ ادب کیوں پڑھا جاتا ہے؟ اور پڑھنے والا اس سے کیوں متاثر ہوتا ہے؟ تو اصل مسئلہ کو بہت سے ضمنی مباحث کے بغیر بالراست آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

ادب کیوں پڑھا جاتا ہے اس کے متعلق ایک سیدھی سی بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ ادب اپنے پڑھنے والے کے لئے کسی نہ کسی مقصد برآری کا وسیلہ ضرور بنتا ہے مثلاً قاری ادبی تحریروں سے جذباتی آسودگی اور تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے۔ یہ تحریریں اس کے خوابوں، خواہشوں اور تصورات کی تعبیر اور تصویر دکھاتی ہیں اس سے بھی بہت نچلی سطح پر ادب وقت گذاری کا بہتر اور سستا ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت بلند سطح پر ادب کے توسط سے زندگی کے مسائل اور اُن کے مختلف رُخوں اور رویّوں سے آگہی حاصل کی جائے۔ ادب خواہ کسی مقصد کے تحت پڑھا جائے ایک بات یہ طے ہے کہ ادب کا MEDIUM (یعنی الفاظ) دوسرے فنون یعنی رقص، موسیقی، تصویر کشی، مجسمہ سازی وغیرہ کے ذرائع MEDIA کے مقابلے میں اپنے تلازمات کی قوت کے بل پر جلد اور گہری اثر اندازی کی اہلیت رکھتے ہیں یہی ادب کی گہری اثر انگیزی کا سبب بھی ہے اور اس سوال کا جواب بھی کہ ادب اپنے پڑھنے والے کو کیوں جلد متاثر کرتا ہے۔ اور یہی وجہ وہ سبب بھی ہے کہ ادبی تحریریں ادیب اور قاری کے درمیان جب اعتبارِ باہمی کا ایک رشتہ بن جاتی ہیں تو دوسرے تمام جذباتی اور عقلی رشتوں کی طرح منفی یا مثبت مقصدیت کے معیار پر پرکھی جانے لگتی ہیں۔ چنانچہ ادب کی مقصدیت بھی ادبی وفاداری کے سلسلے میں خالص انسانی رشتوں کی سی افادیت اور مضرت کے پیمانوں سے ناپی جاتی ہے۔ ادب چونکہ ہر سطح پر انسان سے انسان (ادیب اور قاری) کے تعلق مسلسل کا رشتہ بناتا ہے اس لئے زندگی سے کبھی کٹ ہی نہیں سکتا۔ گویا زندگی ہر صورت میں ادب کا سرچشمہ رہتی ہے لہٰذا زندگی کو جس زاویئے سے برتا جائے گا اُسی قسم کی ادبی مقصدیت بھی اُبھرے گی اور اس کی تاثیر بھی ویسی ہی ہوگی۔ یہی تعلق ادب اور زندگی کا رشتہ استوار کرنے کا خشتِ اوّل ہے۔ لہٰذا ادب کی مقصدیت یا مضرت پر حکم لگانے سے پہلے لکھنے والے کے یہاں اُس رشتے کی تلاش اہم تر ہے جو اُس نے زندگی سے قائم کیا ہے۔

ادیب ایک عام فردِ معاشرہ کی حیثیت میں زندگی گذارنے کے اسباب اور وسائل سے بے نیازی نہیں برت سکتا۔ اُسے معاشرے کے افراد سے تعلقات اور روابط بہر حال رکھنا پڑتے ہیں۔ زندگی گذارنے کا یہ وسیلہ اُس سے بہر حال کوئی نہ کوئی عقلی رویّہ چاہتا ہے یہ رویّہ اُن ہی کی طرزِ زندگی پر غور و فکر سے تشکیل پاتا ہے جن کے ساتھ لکھنے والا مل جل کر ایک مشترک ماحول میں زندگی گذارتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بہت سی ٹھوس حقیقتیں تو بیک وقت جھٹلا کر کوئی بھی ایسی بے تعلق زندگی نہیں گذار سکتا کہ پوری زندگی محض وقت گذاری بن کر رہ جائے۔ بھرپور معاشرتی زندگی گذارنے کے لئے آدمی کو ایسے تعلقات اور روابط اپنے ماحول سے برتنا پڑیں گے جن کی روشنی میں اپنے ماحول، افراد اور معاشرے کو جانچ پرکھ کر لوگوں سے گفتگو کرے اور ان کے بارے میں دوسروں سے بھی گفتگو کر سکے۔ یہی گفتگو تحریر میں آنے کے بعد لکھنے والے کے اُن نظریات زندگی کا سراغ لگانے میں مدد کرتی ہے جن کے تحت وہ زندگی سے تعلق، لاتعلقی یا غیر جانبداری کا اظہار کرتا ہے۔

بعض حضرات ادب کے بارے میں سمجھاتے ہیں کہ ادب انسانی خواہشات اور مسائل سے متعلق ہو کر صحافت یعنی غیر معیاری اور ہنگامی رہ جاتا ہے لہذا ادب کو معاشی، اخلاقی، علمی یا ثقافتی مسائل یا تحریکات کے تابع کرنا گویا ادب کی شان میں بے ادبی کرنا ہے۔ ان کی نظر میں اس طرح کا ادب پروپیگنڈا بن جاتا ہے جس سے ادب میں شعریت اور "ادبیت" مجروح ہوتی ہیں۔ گویا ادبی دیانتداری کا تقاضہ یہ ہوا کہ شعر، افسانے اور ناول کو زندگی کے مسائل اور مصائب سے بچا کر رکھا جانا چاہیئے۔ پھر اسی سانس میں یہ حضرات ادب میں زندگی کا نام لینے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ لکھنے والا جسے اپنے ادب کی اساس بناتا ہے وہ اُس زندگی سے مختلف شے ہے یا ہونی چاہیئے جسے معاشرے کے افراد (بشمول ادیب) فی الواقع گذارتے ہیں۔ یہ صورتِ حال تو خاصی مضحکہ خیز ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی تو بہر حال وہی ایک ہے اسی کے لئے ادیب — MEDIUM (الفاظ) تلاش کرتا ہے۔ چونکہ ادب میں زندگی کے مصائب و مسائل کو برتنا ادیب کی بھاری ذمہ داری ہے اس لئے غیر جانبداری کے اس نعرہ کی تمامتر نوعیت ذمّے داری سے بچنے کی بد طینتی ہے۔ ادب میں یہ رویّہ اس لئے بھی عام ہے کہ اِسے اپنا کر لکھنے والا ہر قسم کی ذمہ داری سے آزاد ہو کر زندگی میں ہر طرح کی خیریت ہونے کی اطلاع بے دھڑک فراہم کر سکتا ہے۔ اس کے بعد جو کام لکھنے والے کا رہ جاتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ اپنے پڑھنے والے کے لئے سرابی طلسمات کے دل کش اور منظر آفریں نخلستان اُگاتا رہے جہاں عافیتوں کے خنک اور سایہ دار کنج ہوں اور قاری اور ادیب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے ہوں۔ یہیں کہیں وہ کاغذی معشوق بھی محوِ خرام ہوتا ہے جس کی محرابی بھنوئیں۔ حنائی پوریں، شب دیجور زلفیں، گوری کلائیوں میں جھنکتی چوڑیاں، لبنتی جوڑے اور اس میں سے بیت نکل چلنے والی بُو، سیمیں ساق اور گلابی تلوؤں کا ایک بازار سجا ہوتا ہے۔ انکی تحریر میں سستی رومانیت ان مظاہرِ حسن کی دلکشی کو بھی کاغذی پھولوں کی طرح پیش کرتی ہے جہاں کبھی ایک عاشق نامراد ہوتا ہے کبھی رقیب شاد کام اور کبھی لباما بالکل الٹ جاتی ہے تو کوئلوں کے دلّال کی طرح رقیب کا مُنہ اور ہاتھ دونوں ہی کالے —
اور سب باتیں تو چھوڑیئے یہی سوچ لیجئے کہ ہم میں ایسے کتنے ہیں جو کاغذی معشوق کی اس رام کہانی ہی کے سہارے زندگی کے دہکتے سلگتے الاؤ کے گرد بیٹھے بیٹھے ہی پوری عمر بتا سکتے ہیں؟ زندگی کے کڑے کوسوں کی مسافت اس قسم کی نظر بندیوں اور شعبدہ بازیوں کے بل پر آخر کیسے کاٹی جا سکتی ہے؟ ادب آخر نظر بندی کا کھیل تو نہیں ہے کہ معمول کو چوبِ خشک پر گلاب کھلے دکھا کر عارضِ محبوب پر جان صدقے کرا دی جائے۔ ہوش و خرد کی قوت باطل ستیز و سحر شکن پر ڈاکہ زنی کا یہ مسلک لکھنے والے کو ایسا تیسرا آدمی بنا دیتا ہے جو شاہ اور چور دونوں سے نمک حلال کا حق جتا کر دونوں ہی کی نیندیں حرام کرتا ہے ایک وقت آتا ہے جب خود بھی

بنا چھنتا ہے۔ ادب کا یہ مسلک ایک طرح سے چائے دانی کے سرپوش کا مسلک ہے۔ سرپوش جو چائے دانی پر ڈھکا جاتا ہے اس کا
مصرف یہ ہوتا ہے کہ چائے کی مہک، اس کا ذائقہ اور حرارت دیر تک قائم رکھے۔ لیکن اگر یہی چائے پوش چائے دانی پر مستقل ڈھکا
رہے تو چائے میں وہ مہلک سیاتی تاثیر پیدا ہو جائے گی جو سانس کی نالی میں ورم پیدا کر کے ذریعۂ اجل بن جائے گی۔ خالص ادب
اور خالص جمال کے نام پر اچھالے جانیوالا یہ مسلک ایسی ہی مہک اور ذائقہ رکھتا ہے اور دعووں کے باوجود یہ کبھی جھوٹی قناعت، تصنع،
بے عملی، اور توہم پرستی سے آگے کچھ نہ دے سکا اس مسلک کے ادیبوں سے معاشرہ، ریاست یا حکومت آخر کس قسم کی وفاداری کا تقاضہ
کر سکتے ہیں؟ وہ تو خود اپنی اس روش سے کہ وہ کسی کے خلاف نہیں ہیں ہر کسی کے (شاہ اور چور دونوں ہی کے) ساتھ ہیں، اس کا
ایک اور مطلب بھی نکلتا ہے کہ ادب زندگی کا نہیں خود پرستی کا اظہار ہے جس کی اساس لکھنے والا ذاتی پسند یا ناپسند کے نام پر رکھتا
ہے اور دعویٰ زندگی کی رہنمائی کا کرتا ہے وہ جب تک زندگی کے مسائل کو اپنی تحریر میں نہیں لاتا حقِ وفاداری کرتا ہے۔

لکھنے والا معاشرے میں پلتا اور بڑھتا ہے اُس کی رگوں میں ماضی کا خون گردش کرتا ہے اور "حال" اُس کی ذہنی اور
جذباتی نشو و نما میں حصہ لیتا ہے۔ ذاتی مسائل اور مصائب سے اُسے بھی دن رات سابقہ رہتا ہے۔ ذاتی خوشی اور ناخوشی کا احساس
اُسے بھی ہوتا رہتا ہے۔ ذاتی پسند اور ناپسند کا حق اسے بھی پہنچتا ہے لیکن لکھنے والے کی حیثیت میں اُس کا مزاج، ذاتی پسند اور
ناپسند سے نہیں بنتا۔ اُس کے ادبی مزاج کا اساسی عنصر خود پرستی یا خود پسندی نہیں بلکہ خود شناسی ہوتا ہے۔ اُس کی یہی خود شناسی
زندگی کے عرفان کا ذریعہ ہوتی ہے جو زندگی کے حقائق اور ان حقائق کے توسل سے زندگی کی تلخیوں، آسودگیوں اور رنج و راحت
سے آگہی بن کر ابھرتی ہے وہ زندگی کی تہہ در تہہ پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں ذاتی پسند اور ناپسند نہیں برت سکتا۔ لکھنے والا
شعر، نغمہ، افسانہ، ناول، تنقید اختیار کرنے میں ضرور آزاد ہے اور اپنی پسند کا مالک بھی ہے لیکن ادب میں زندگی سے رشتہ
متعین کرنے میں ذاتی پسند یا ناپسند برت کر خود زندگی اور اُس کے مسائل کو نظر انداز کرنے اور ادب کے نام پر ہیجان انگیزی یا
مقصدیت کے نام پر نفی پسندی کو رواج دینے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔

کسی لکھنے والے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ معاشرے کو اس کے بنیادی ڈھانچے سے ہٹ کر سمجھے یا برتے یا اپنی تحریروں میں
ذاتی اغراض و مقاصد کی برآری کے لئے اُس کی شکل مسخ کر دے معاشرہ تو اپنے بنیادی ڈھانچے میں ایک ایسا متمدن اجتماع ہوتا
ہے جو عوام کے معاشی، اقتصادی، مذہبی، علمی اور سیاسی تعلقات اور رشتوں سے تشکیل پاتا ہے۔ لہٰذا ادیب کا مسلک
دیانتداری اور دردمندی کے ساتھ اِن رشتوں کو سمجھنا سمجھانا یا ان رشتوں میں ٹوٹ پھوٹ کے رجحانات کی نشاندہی کرنا ہوتا ہے
اور ان رشتوں کو مثبت رجحانات پر لانا اور استوار کرنا ہوتا ہے۔ اپنے اس عمل میں اُسے نہ صرف ایسی ثقافتی روایتوں، معاشی،
علمی، روحانی اور سیاسی قوتوں کو اپنا وسیلہ بنانا ہوتا ہے جو ماضی کی شکست و ریخت کو سہہ کر اُس کے عصر معاشرے کی تعمیر میں حصہ
لینے کی سکت رکھتی ہیں بلکہ اُن رجحانات پر بھی نظر رکھنا پڑتی ہے جو معاشرے کے حال میں جاری و ساری رہ کر اُس کے مادی اور روحانی
نظام میں تصادم کا سبب بن رہے ہوں یا بننا چاہتے ہوں۔ زندگی کی اسی پیچیدگی ہی کے سبب لکھنے والا ایسے رجحانات اور عناصر کو
اپنی بے درد تنقید کا نشانہ بناتا ہے جو استحصالی اور جبری قوتوں کی مطلب برآری کا آلۂ کار بن کر افراد کے باہمی تعلقات کو ناہموار
بناتے ہیں اور جبر و ستم کو عدل و انصاف کا نام دیتے ہیں۔ لکھنے والے کا فعل معاشرے اور زندگی کی شناخت ہی کا نہیں بلکہ جبر و ستم
کی قوتوں کے چہروں پر سے حریر و پرنیاں کی نقاب دری کا بھی ہے۔ یہی وہ لگن اور چاہت ہے جو اُس کے مسلک میں زندگی شناسی

اور فرد آشنائی کے عرفان کی دین ہوتی ہے۔ زندگی، معاشرے اور فرد سے ادیب کا یہ رشتہ اُس کے مسلک کو کسی منزل پر غیر جانبدار نہیں بنا سکتا۔ غیر جانبدارانہ رویہ رموز و اسرارِ زندگی سے آشنائی اور آگہی کے بجائے فرار اور گریز کی راہیں کھولتا ہے۔ بہت سیدھے الفاظ میں زندگی کو سمجھنے سمجھانے اور افرادِ معاشرہ کے ساتھ زندگی گزارنے اور اُن سے ربط و ضبط رکھنے میں لکھنے والے کو اُن اداروں کے خلاف جو معاشرہ اور افراد کے تعلقات میں سم آمیزی کرتے رہتے ہیں کھل کر قلم اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر لکھنے والا اپنے پڑھنے والے کے لئے کبھی معتبر نہیں بن سکتا۔ لکھنے والے کا یہی مسلک ہے جس کے سبب ہر قدم پر اُس سے وفاداری کا اعلان طلب کیا جاتا ہے۔ وفاداری کی بات تو اپنی جگہ درست لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس چیز سے وفاداری کا اعلان کرے؟ ادب سے؟ زندگی سے؟ اپنے معاشرے اور اُس کے افراد سے؟ اپنے ادبی آدرش سے؟ یا پھر اُن سے جو اُس سے وفاداری طلب کرتے ہیں؟

زندگی، ادب، معاشرہ اور افراد یہی کچھ لکھنے والے کے ادبی آدرش کے بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔ ان معنٰی میں لکھنے والے کا ادبی آدرش ان بنیادی عناصر کی جزوی اکائیوں کا نقطۂ رجوع اور مقامِ مراجعت ہے۔ زندگی وہ محور ہے جس سے ہٹ کر لکھنے والے کا ادبی آدرش بھٹک جاتا ہے۔ لہٰذا ادیب زندگی سے وفاداری کا ہر لمحہ پابند رہتا ہے۔ جب باہر سے اُس سے وفاداری طلب کی جاتی ہے تو اس کے ایک معنٰی تو یہ ہوتے ہیں کہ وفاداری طلب کرنے والے اُس زندگی ہی کو نہیں پہچانتے جو وہ گزارتے ہیں اور دوسرے معنٰی یہ ہیں کہ اُن کے ذہن میں کوئی دوسری زندگی ہوتی ہے جس سے ادیب کی وفاداری کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دونوں کا آدرش ایک ہوگا ورنہ وفا طلبی طرح طرح کا حیلۂ ستم رانی ہوگا یہ دوسری صورتِ حال سوال بے معنی نہیں ہے اس کے بہت سے معنی ہیں اور ہر معنی سوچنے والے کی راہ میں مانندِ صلیب نصب ہو جاتا ہے۔

یقیناً یہ سارا مسئلہ دو زندگیوں کا مسئلہ ہے۔ ایک وہ زندگی جس کے خواب لکھنے والا سوتے جاگتے دیکھتا ہے اور جس میں وہ اپنے کرداروں کو چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، آسودہ ذہن، آسودہ قلب اور آسودہ حال رہتے بستے دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسری زندگی وہ ہے جسے ایک طرح طرح جو گزارتی ہے اور ادیب سے بھی حسب الحکم وہی زندگی گزارنے کی توقع رکھتی ہے ہمارے عہد میں یہ دوسری زندگی نہ جانے کتنے معاشروں میں حسب الحکم ہی گزاری جا رہی ہے۔ یہ حکم نہ جانے کتنے ملکوں اور کتنے شہروں میں DO OR DIE بن چکا ہے۔ اس عہد میں ایک طرف وہ ادیب یا شاعر ہے جو جیتے زندگی کی روانی اور وسعت کی خاطر اس کی موجوں میں اپنے احساسات تصورات، خواب اور خواہشات کا گرم ہو مسلسل اور مستقلاً شامل کر رہے ہیں دوسری طرف وہ ہیں جو اسیری کی راہیں بند باندھتے ہیں اور جوئے بے آب بنا کر رکھدینے پر مُصر رہتے ہیں۔ یہی وہ مقام تصادم ہے جہاں پہنچ کر لکھنے والا نوکِ قلم پر انی چڑھا لیتا ہے۔ یہ سنم آرائی اُس کا ادبی آدرش ہوتی ہے اُس آدرش میں اس کا ثقافتی ورثہ اور مستقبل کی اُس زندگی کے امکانات شامل ہوتے ہیں جسے وہ روحانی اور مادی اقدار کے ورثے کے طور پر آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑنا چاہتا ہے۔ اس انداز فکر پر تحریر کی اساس ادیب کا ذاتی مسئلہ یا اُس کی نجی لپسند اور ناپسند کے معیاری پیمانوں سے بالاتر ہوتی ہے لہٰذا یہ تحریر ادیب اور اُس کے قاری کے درمیان احترام باہمی کا وہ معاہدہ بن جاتی ہیں جس کے ایک ایک لفظ پر پڑھنے والا اپنی غیر جانبدارانہ نمائندگی کے بدلے لکھنے والے کی زندگی کا ایک ایک سانس لکھوا لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھنے والا کوئی عطار کی دکان نہیں کھولتا جس میں اپنے معاشرے اور عہد کی ثقافتی تاریخی، تہذیبی قدروں اور زندگی کو تابندگی دینے والے جذبات اور خیالات

کو رنگین پانی سے بھری ہوئی بوتلوں کی طرح سجاوٹ کے لئے استعمال کرنے لگے۔ وہ تو بہر حال ان تمام عناصر کو اپنے آدرش کی جدوجہد کی بنیاد ہی بنائے گا۔ جو اس کے قاری کی آنکھوں کی سوئیاں بن کر رہ گئے ہوں۔

ادیب پہلے اس رول میں اقلیم جذب وجذبات کا وہ شہنشاہ بے تاج ہوتا ہے جو "احوال رعایا" کی ٹوہ میں رات رات بھر بھیس بدلے دوسروں کے دکھ درد کی گدائی کرتا ہے۔ وہ اپنا عہد نبھانے کے لئے اپنی جان اور عزت وناموس کو بھنائی کی دار پر چڑھاتا ہے۔ چین و آرام کا چھن جانا اس کے لئے کوئی مرحلہ نہیں ہوتا بلکہ راہ طلب کی وہ منزلیں بھی سینے کے بل طے کر جاتا ہے جن تک پہنچنے کے لئے کتنے ہی فولاد پا بھی تھک ہار کر بیٹھ رہتے ہیں۔

بہ وادی کہ در آں خضر را عصا خفتست
بہ سینہ می سپرم راہ، گرچہ پا خفتست (غالب)

لکھنے والے کی یہ شاہی اور قلندری ہی اُس کے مسلک میں وارفتگی اور پختہ کامی کی کلید ہے جس میں نیازمندی اور بے نیازی کا امتزاج ہوتا ہے پاس عہد کی خاطر تیغ عریاں سے سینہ ٹکرا دینا اور ساطور کو بوسہ دینا اُس کی شانِ بے نیازی کے لئے وصالِ محبوب اور بوسۂ لبِ جاناں بن جاتا ہے۔ اُس کی یہ جرأت اور رندی معاشرے کے دوسرے افراد اور اداروں کی طرح "دیوانگی بکار خویش ہشیار" نہیں بلکہ اُسی کے آدرش کی لگن اور اس کی نیازمندی کا وہ ادنیٰ عکس ہوتا ہے جس کی سرشاری اور سرمستی اُسے خوف تعزیر اور طمع اکرام دونوں ہی سے اس طرح آزاد کر دیتی ہے کہ جھوٹی اور کھوٹی زندگی سے وفاداری کی طلب پر وہ اس خاک سے بے نیاز ہو جاتا ہے کہ جس پر چاہتا ہے قہقہہ مار کر ہنس پڑتا ہے۔

رازدارِ خوئے دیرم کردہ اند ٭ خندان بر ملا او نامی زنم (غالب)

اقلیم جذب وجذبات کا یہ خاک نشین یہاں سے وہ رول اپناتا ہے جسے معاشرے کے دوسرے سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور انتظامی ادارے اپنا حق محفوظ سمجھتے ہیں لہذا یہیں سے وہ کشمکش اور ٹکراؤ شروع ہوتا ہے جو لکھنے والے سے اُن نظریات اور تصورات کے لئے مطالبۂ وفاداری کرتا ہے جن کے خلاف وہ نبرد آزما رہتا ہے۔

ہر معاشرہ چونکہ مختلف پیشوں کے افراد کا اجتماع ہوتا ہے اس لئے ضروریاتِ زندگی کے حصول میں بھی ایسے مختلف النوع افکار وخیالات اور طرز عمل کا اپنایا جانا بالکل منطقی ہوتا ہے جو معاشرے کے طبقاتی مزاج میں متنوع بلکہ متضاد کیفیتوں اور نظریات کو جنم دیتے ہیں اور طبقاتی کشمکش کی بنیاد ڈالتے ہیں کہ معاشرے کے ذہنی وجود میں چونکہ ماضی اور حال کی اقدار وروایات اور بہت سی مثبت اور منفی فکری رو باہم ستیزہ کار رہتی ہیں اور معاشروں کی ثقافتی اور تمدنی ترقی میں بار بار ماضی کی طرف لوٹنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے جو گہری اور دیرپا ثقافت کو جنم دینے کا فطری عمل ہے لہذا یہ پیچیدہ کشمکش اور لوٹ لوٹ کر آگے بڑھنے کا عمل معاشرے کے انتظامی اور اصلاحی اداروں کے لئے مثبت رجحانات کی افادیت اور منفی رجحانات کے تباہ کن مضمرات میں فرق اور تمیز کو مشکل تر بنا دیتا ہے۔ ادیب چونکہ اس سارے تماشے کو نہ صرف سمجھتا بلکہ برتتا بھی ہے اس لئے اس کا بے ریا خلوص، بے لاگ تنقید اور بے غرض دیانتداری ان اداروں کی سوجھ سے بالاتر ہوتی ہے اور اس کے مسلک کو مشکوک بنا دیتی ہے حالانکہ یہی وہ منزل بھی ہے جہاں پہنچ کر ادیب جو کچھ اپنے پڑھنے والے کو دیتا ہے وہ اس کے اور قاری کے درمیان اعتبار اور احترام باہمی کی دستاویز بن جاتی ہے جس میں دونوں ہی اپنے اپنے دکھ درد کا مداوا

ڈھونڈتے ہیں۔ لکھنے والے کے ایک ایک لفظ میں پڑھنے والے کے دُکھ درد کو پوری درد مندی اور احترام سے پیش کیا جاتا ہے اور پڑھنے والا اس لفظ میں پورے اعتبار اور اعتماد سے لکھی ہوئی اپنے درد کی سرگزشت پاتا ہے۔ ادیب جیسا بھی غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھ کر زندگی کے اس محترم رشتے سے منہ موڑتا ہے تو اس کے معنی اُس کے اپنے آدرش ہی سے کھلی غداری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے۔ یہ مسلک ادب اور زندگی دونوں ہی کی بے آبروئی کا مسلک ہوتا ہے۔ مسلک کی پرکھ تو وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے لکھنے والا مسائل، مصائب اور دکھ درد کے بلاخیز صحراؤں میں قانونِ باغبانی کی داغ بیل ڈالتا ہے۔

دقت یہ ہے کہ ادیب کے مسلک کو پرکھتے ہوئے جو بات بھلا دی جاتی ہے وہ دوسروں کی غم خواری اُن کے لئے جگر کاوی، اور ان کے دکھ درد کے کانٹوں کو اپنے خونِ دل میں ڈبو لینے کا حوصلہ ہے اور جس بات کو یاد رکھا جاتا ہے وہ صرف اُس کی مبارزت طلبی کا رویّہ ہے۔ یہی وہ طرزِ عمل ہے جو معاشروں کے انتظامی اور اصلاحی اداروں کو احترام طلبی کی جگہ احتساب طلبی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر عہد اور ہر معاشرے کے خواجگانِ بندہ پرور کی ایک روش یہ بھی رہتی چلی آتی ہے کہ وہ لکھنے والے کی وفاداری "بشرطِ مُزد" خریدی جانیوالی کوئی شے تصور کرتے ہیں۔ اس سودے میں جہاں لکھنے والے کی مبارزت طلبی کا خدشہ ہے وہاں ایک گھاٹا اور بھی ہے وہ یہ کہ ادیب کی وفاداری چاہے احتسابی پھندوں سے حاصل کی جائے یا سکے کے داموں، کیا یہ خریداری معاشرے اور افراد کے وقار کی خریداری نہیں کیا یہ خود ریاست اور اس کے انتظامی اور اصلاحی اداروں کو بے وقار نہیں بناتا؟ اگر لکھنے والا معاشرے اور اس کے افراد کے مسائل کو نظر انداز کر کے ریاست کی انتظامی مشینری کے کہنے پر وفاداریوں کا اعلان کرتا ہے تو اُس کا یہ رویّہ ادبی مسلک اور رویّے کی نشاندہی کے بجائے بھونڈی خوشامد کی تصویر بن کر سامنے آئے گا۔ اس ضمن میں غور طلب امر یہ ہے کہ تغیّر اور تبدّل ہر اس انتظامی مشینری کا مقدر ہے جو ایک دفعہ معرضِ وجود میں آ گئی ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہر نئی حکومت اپنے آپ کو اپنی پیش رو حکومت کے مقابلے میں ممتاز ثابت کرنے کے لئے انتظامی مسائل کا ایک نیا گورکھ دھندا بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے بعد سے اب تک ہر جگہ معاشرے چونکہ زبردستوں کی چیرہ دستی کا شکار رہتے چلے آئے ہیں اس لئے اس رجحان نے لازمی سا کر دیا ہے کہ ہر عہد میں زبردست طبقے کا مفاد ہماری آزاد دنیا کی ہر حکومت کے لئے اہم انتظامی صلاحیت کا تمغہ بن جائے اب ادیب اگر ہر نئی حکومت سے اپنی وفاداری کا حلف نامہ پُر کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہر بار معاشرے کی فلاح و بہبود اور اپنے ادبی نصب العین کو بھی خواہشات اور ذاتی خوشنودی کے نیلام پر چڑھاتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے اپنے مسلک سے وفاداری کا جذبہ تو لکھنے والوں کو قومی تاریخ کے ہر نئے موڑ پر اُن اداروں اور حکومتوں کا مدمقابل بناتا رہا ہے جو اپنے مفادات کی پرورش کرتے رہنے پر مصر ہوتے ہیں چونکہ حکومتیں اور ریاست کے اصلاحی اور انتظامی ادارے معاشرے سے کمتر درجے کے ادارے ہوتے ہیں اور ادیب چونکہ ایک بڑے اور بنیادی اہم تر ادارے (یعنی معاشرے) کا وفادار ہوتا ہے اس لئے وہ کسی قیمت پر بھی معاشرے اور اس کے افراد جذبات کی پامالی اور بے حُرمتی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے اس آدرش کو جذباتی اقدام کہہ کر بے معنی ثابت نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ ادیب کا مسلک نہ کسی کمتر درجے کے ادارے سے بغض للّٰہی ہو سکتا ہے اور نہ کسی انتظامی ادارے سے حُبّ طلبی۔ یہ بات ضرور ہے کہ جب معاشرتی ادارے اور حکومتیں شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ ایسے اقدامات پر اُتر آتی ہیں جن سے معاشروں میں استحصالی ہتھکنڈوں کے ساتھ من مانی کارروائیاں شروع ہو جاتی ہیں تو ٹکراؤ کا جواز از خود منطقی ہو جاتا ہے ورنہ یہ ممکن ہی نہیں

کہ ایسے انتظامی اور اصلاحی اداروں سے ادیب برسرِ پیکار ہو جو خود معاشرے اور افرادِ معاشرہ کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرتے ہوں۔

ادیب کے مسلک میں دوسرے قسم کی کشمکش کو سیاسی نقطۂ نظر اور سیاسی عقائد جنم دیتے ہیں جہاں لکھنے والے اپنے مسلک اور ادبی عقیدے کی جنگ میں مصروف ہیں وہاں کی حکومتیں صرف اُس سیاسی مسلک ہی کو واجب الاحترام سمجھتی ہیں جسے وہ خود اپنائے ہوئے ہیں۔ لکھنے والا بھی اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتا ہے کہ ہر وہ سیاسی عقیدہ واجب التحقیر نہیں ہوتا ہے جسے کوئی حکومت اپناتی ہے لیکن اس کی ہر بات سمجھنے کے لئے کوئی حکومت تیار نہیں ہوتی۔ افراط و تفریط کی اس کشمکش پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ بچار کی فرصت ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر کہ ہر سیاسی مسلک جو معاشرے اور عوام کے حقوق کی حفاظت اور ان کے مسائل و مصائب کا بے لوث مداوا کرتا ہے معقول اور واجب الاحترام ہے یہ مان لینے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے کہ ایک سیاسی مسلک، جزوی اختلافات کے باوجود اپنے ماننے والے کے لئے ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جو عقیدہ عقلی اور منطقی جواز کے ساتھ اپنایا جاتا ہے ایک سطح پر پہنچنے کے بعد اپنے ماننے والے کے لئے ایک جذباتی رشتہ اُس کے جسم اور ذہن کے درمیان بن جاتا ہے۔ حیرت کی بات اس ضمن میں یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک ہی میں بیک وقت مختلف مذہبی عقیدے ماننے اور برتنے والے ہوتے ہیں اور حکومتیں اور معاشرتی ادارے اِن عقائد کا احترام بھی کرتی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سیاسی عقائد کے احترام کا اس درجے اہتمام نہیں کیا جا سکتا؟ کیا کوئی ایک ملک بھی اس تجربے میں پہل کرنے کو تیار نہیں ہے کہ مخالف سیاسی مسلک کا احترام بھی مذہبی عقائد کے احترام ہی کی سطح پر کرنے لگے۔ اگر وسیع المشربی کا یہ تجربہ اُن حکومتوں کے اندازِ خسروانہ کا جزو بن جائے جو محض اپنے سیاسی نظریات کو ٹھیس پہنچنے کے سبب ادیب سے وفاداری کی دستاویز کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں تو شاید اُن کی یہ پریشانی تو جلد از جلد دور ہو جائے۔ اس سلسلے میں جو بات بہت بنیادی طور پر نظر انداز ہوتی رہی پائی جاتی رہی ہے وہ اُن اداروں کا کردار بھی ہے جو اپنی منفعت خوری کی خاطر نہ صرف معاشرے میں منفی رجحانات کو فروغ دیتے ہیں بلکہ لکھنے والے اور معاشرے کے انتظامی اداروں کے درمیان لگائی بجھائی کر کے دونوں کے باہمی رشتوں کو پیچ پیچ بناتے رہتے ہیں۔ ان اداروں میں وہ پیش پیش ہیں جو قومی صنعتوں میں روپیہ لگا کر گویا قوم، معاشرے، افراد اور حکومتوں پر احسان جتاتے ہیں۔ زیادہ تر چونکہ ایسے ہی ادارے مثبت مقصدیت پسند ادیبوں کی قلم کی زد میں رہتے ہیں لہٰذا یہی سب اپنی ہوسِ زرگری کی طلب بجھانے کی خاطر اخلاقی، اصلاحی اور روحانی اداروں پر سیم و زر کے... جال ڈالتے ہیں اور لالچ اور خوف کے حربے استعمال کرتے ہیں اور ان ادیبوں پر سازشوں کے اتہام تراشی کا ذریعہ بنتے ہیں جو ان کے مکر و فریب کی قبائیں چاک کر کے اُن کے عفریتی ذہن اور وجود کو بے نقاب کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جن ممالک میں یہ صورت حال ہے لکھنے والوں سے ان کی وفاداری کی طلب ان سے قلم چھیننے والی طبعِ حیلہ جُو کی چغلی کھاتی رہے گی۔ اس لئے کہ ادیب نہ اُس زندگی سے وفاداری برت سکتا ہے جو برسرِ اقتدار طبقہ حسب الحکم گذروانا چاہتا ہے اور نہ اُن اداروں سے وفاداری برت سکتا ہے جن کی گھٹی میں حق غصبی اور استحصالیت ڈالی جاتی ہے۔

بیگم فضل کاظمی

رسوا کی حقیقت نگاری

رسوا نے جو وقت ناول نگاری شروع کی اردو ناول اپنے تمام تر اہم عناصر ترکیبی سے کافی حد تک آراستہ ہو چکا تھا۔ نذیر احمد اور سرشار نے کردار نگاری اور مکالمہ نویسی میں اچھے نمونے پیش کئے تھے۔ اور شرر نے پلاٹ کی تعمیر کا سلیقہ عطا کر دیا تھا۔ فنی تکمیل کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ رسوا نے ناول کو فنی طور پر تکمیل کو پہونچایا۔ رسوا کی کامیابی بڑی حد تک ان کی واقعیت اور حقیقت نگاری میں پوشیدہ ہے۔ افسانہ میں جس حقیقت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اس سے مراد وہ حقیقت نہیں جس کا تقاضہ سائنس سے کیا جاتا ہے۔ افلاطون نے یہ کہکر کہ "سارا تخلیقی ادب باطل ہے" ایک عظیم غلطی کی ہے۔ لیکن ارسطو نے اپنی بصیرت کی بنا پر افلاطون کی نشاندہی کی ہے اور بتلایا ہے کہ تمام تخلیقات میں تخیل کی شاعرانہ صداقت ہوتی ہے۔ اور یہ شاعرانہ صداقت اس حقیقت سے جس کی توقع ہم ایک مورخ کی تصنیف میں کرتے ہیں زیادہ گہری اور زیادہ جامع ہوتی ہے۔ کیونکہ مورخ بند ہے ان چیزوں سے جو وقوع میں آچکی ہوں۔ گوئٹے نے کیا خوب کہا ہے . . . . . .

"فنکار کا کام حقیقی ہے اس حد تک کہ ہمیشہ سچ ہوتا ہے۔ مثالی ہوتا ہے اس حد تک کہ کبھی واقعی نہیں ہوتا"۔

ادب کا موضوع واقعیت ہے نہ کہ واقعات۔ زندگی اور زندگی کے امکانات سے ملکر جب ناول کا پلاٹ بنتا ہے اور کردار تخلیق کئے جاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ناول میں واقعیت ہے یہی واقعیت سچی اور صحیح حقیقت نگاری ہے۔ ادب میں حقیقت نگاری کے معنی ہیں کہ ان عظیم بنیادی محرکات۔ جذبات۔ حسیات اور اصولوں کی پیروی کریں جو انسانوں کی زندگیوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ سائنس جیسے جیسے قدم آگے بڑھاتی ہے اسکا تقویم پارینہ ہوتے جانا ناگزیر ہے۔ اس لئے ہمکو نہ صرف سائنس بلکہ اکثر تاریخ کی کتابوں پر بھی نظر ثانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن وہ ادب جس میں حقیقت نگاری کا عنصر موجود ہوتا ہے وہ خواہ کتنا ہی قدیم ہو جائے انسانی دلچسپی کے لئے اتنا ہی اہم رہتا ہے جتنا کہ اپنے زمانہ تصنیف میں تھا۔

واقعیت کیلئے صرف یہ ضروری ہے کہ مصنف جو کچھ بیان کر رہا ہے اس کا ذاتی تجربہ رکھتا ہو۔ چنانچہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ انھوں نے برسوں فیض آباد کی محلسراؤں میں اپنا وقت گنوایا اور نواب سالار جنگ کے عہد کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو مثنوی میں پیش کیا۔ میر انیس نے اپنے مرثیوں میں واقعیت کا رنگ بھرنے کے لئے فن سپہ گری میں مہارت پیدا کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ میر انیس نے اپنے کمرے کو مروجہ ہتھیاروں سے آراستہ کر رکھا تھا۔

یوں تو یہ اوصاف یعنی حقیقت نگاری اور واقعیت ادب کے تمام اصناف میں اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ناول میں اس کی اہمیت

زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ ناول کا مقصد زندگی کی تصویر پیش کرنا ہوتا ہے۔ فطرت نگاری جسے کچھ عرصہ پہلے حقیقت نگاری کہا جاتا تھا جس میں زندگی کے واقعات کی تصویر جوں کی توں اتاری جاتی تھی۔ حقیقت نگاری وہ شے نہیں ہے کہ زندگی اور زندگی کے امکانات کے علاوہ ایک سمت کا تعین ہوتا ہے۔ اور زمانے کے بہاؤ کا پتہ چلتا ہے اس لئے فطرت نگاری کا ادب کمتر درجہ کا ادب ہے کیونکہ اس میں ادیب وقت کی قید سے باہر نہیں نکل پاتا۔ رسوا اس رمز سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ ایک مقام پر واقعیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں ......

"ناول نویس ان واقعات کو علی العموم بیان کر دیتا ہے جو اس نے اپنے زمانے میں دیکھے ہیں۔ یا یوں سمجھو دوسری عبارت میں یوں کہئے کہ تصویریں ہیں کہ دل و دماغ کے مرقع میں موجود ہیں انھیں کی نقل اتار کر ناظرین کو دکھاتا ہے"

یہاں رسوا نے اپنا نظریہ فن واضح کر دیا ہے۔ انہیں بتا دیا ہے کہ واقعیت اور حقیقت نگاری کی ان کے نزدیک کتنی زیادہ اہمیت تھی۔ دوسری جگہ "ذات شریف" کے دیباچہ میں وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ....

"جو چیزیں ہماری نظر سے گزر چکیں اور ان سے ہماری طبیعت خود متاثر ہوئی ہم اسے ناول میں لکھ دیتے ہیں۔ ہمارا تخیل اس قدر وسیع نہیں کہ ہزاروں برس پہلے کے واقعات کے نقشے دکھا سکے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم اسے معیوب بھی جانتے ہیں کہ اگلے پچھلے واقعات میں غلط بحث کر کے ایک نئی چیز پیدا کریں جو نہ اُس زمانہ کے موافق ہو اور نہ اس زمانہ کے مطابق ......

رسوا نے یہاں نہ صرف اپنا فنی نقطۂ نظر بیان کر دیا ہے بلکہ شرر جیسے ناول نگاروں کے فن پر لطیف طنز بھی کیا ہے۔ جن کے تاریخی ناولوں میں تاریخی شعور کی سب سے بڑی کمی ہے۔ اور جنھیں حقیقت نگاری سے اسی قدر بُعد تھا جتنی رسوا کو قربت۔ رسوا حقیقت نگار ہیں۔ وہ اصل کو دکھانے کے قائل ہیں۔

رسوا کے دو ناول "شریف زادہ" اور "ذات شریف" میں آپ بیتی کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ اکثر لوگ اسے ناول ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ "امراؤ جان ادا" میں رسوا نے ماضی کو اپنا موضوع بنا کر لکھنؤ کے رنگین دور کی عکاسی کی ہے۔ "ذات شریف" میں انھوں نے حال کی تباہ حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ "شریف زادہ" ان دونوں سے الگ ہے۔ اس میں انھوں نے مستقبل کا راستہ سجھایا ہے۔ اور چند ایسے مثالی تصورات پیش کئے ہیں جو اب تک حقیقت تو نہیں بن سکے البتہ آج کے ادیبوں کے خواب کا جزو ضرور بن گئے ہیں۔ یہ ناول اس وجہ سے زیادہ مقبول نہ ہو سکا کہ اس کے نظریات وقت سے آگے ہیں۔ اس ناول میں فنی پختگی اس وجہ سے پیدا نہ ہو سکی کہ اس کے خیالات اتنے بڑے، گہرے اور نئے ہیں کہ قصہ اس کے آگے ماند پڑ جاتا ہے۔ اس میں نظریات فن پر غالب آ گئے ہیں۔ اپنے نئے خیالات کی وضاحت کی خاطر قصہ کو پس پشت ڈال دینا پڑا۔

"امراؤ جان ادا" جوان کا شاہکار ہے ...... کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا پلاٹ کسی بے بنیاد قصہ پر قائم کیا گیا ہے۔ رسوا نے "امراؤ جان ادا" کے دیباچے میں جو تمہید اٹھائی ہے کہ ....

"امراؤ اپنی داستان کہتی جاتی تھی اور میں لکھتا جاتا تھا"

یہ محض زیب داستان نہیں بلکہ اس ناول کو پڑھ کر حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ جس میں امراؤ جان کا کردار پوری تکمیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ فی الواقع یہ کسی امراؤ جان ادا کی تصویر تو نہیں۔ کیونکہ رسوا نے ایک طوائف کا کردار جس فنی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ کھینچا ہے اس نے اسے جیتا جاگتا بنا دیا ہے۔ اس وقت ناول کی لوح پر لکھا ہوا شعر بڑا معنی خیز معلوم ہونے لگتا ہے ؎

ہنس کے کہتا ہے مصور سے وہ غارت گر ہوش
جیسی صورت ہے مری ویسی ہی تصویر بھی ہو

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ ناول ایک غارت گر ہوش کی جیتی جاگتی تصویر بن گیا ہے۔ مرزا کے ایک دوست سید تمکین علی کاظمی نے تحقیق کے بعد ایک چھوٹا سا رسالہ تلاش کیا ہے جس کا نام ہے "جنون انتظار" یعنی "فسانہ مرزا رسوا" یہ رسالہ ۱۹۲۲ء میں چھپا۔ اور اس کی مؤلفہ ہیں امراؤ جان ادا۔ اس میں وہ اس رسالہ کا سبب تصنیف بیان کرتی ہیں کہ. . . . .

"مرزا نے جو میری سرگزشت تحریر کی وہ غالباً آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ غرض میں یہ نہیں کہتی کہ اچھا کیا یا برا۔ لیکن اس کا پہلے اقرار نہ تھا۔ اس لئے اس کا کسی قدر ملال ہے۔ اگر میں یہ جانتی کہ میری آوارگی کا افسانہ چھاپ دیا جائے گا میں اس کے بیان پر راضی نہ ہوتی۔ واقعی مرزا صاحب کا کلیجہ جل گیا۔ لطف یہ ہے کہ فرماتے ہیں "میں نے تجھ پر احسان کیا" اگر در حقیقت یہ احسان ہے تو میں تشکر عرض کرتی ہوں ؎

دشنام دے کے مجھ کو بہت خوش نہ ہوئیے
کیا کیجئے گا آپ جو میری زباں کھلے

اس تمہید کے بعد امراؤ جان ادا نے رسوا کی مثنوی "جنون انتظار" کی شان نزول بیان کرتے ہوئے رسوا کی خزاں گوں مجبوری کی داستان عشق بیان کی ہے۔ اس طرح رسوا سے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔ اس رسالہ سے گمان ہوتا ہے کہ امراؤ جان ادا کا کردار تخیلی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی کردار ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو رسوا کے فن کی کامیابی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے کردار امراؤ جان نے لوگوں کو اتنا مسحور کر لیا ہے کہ لوگ اسے بالکل حقیقی سمجھنا چاہتے ہیں۔

انگریزی ناول نگار جین آسٹن سے رسوا کی گہری مماثلت ہے۔ دونوں اپنے گرد و پیش کے حالات اور واقعات سے ہی اپنے ناول کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں انھیں باتوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا وہ ذاتی طور پر مشاہدہ کر چکے تھے۔ واقعہ کے بیان میں آدمی عموماً جذباتیت اور فن کے کچے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ خامی رتن ناتھ سرشار جیسے دیوزاد کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن رسوا نے معروضیت کو پوری طرح برتا ہے جو واقعیت کی روح ہے۔

"امراؤ جان ادا" میں انھوں نے نگار خانے کا انتخاب کیا ہے جس کی مکمل اور واضح تصویر انھوں نے پیش کی ہے۔ رسوا اور سرشار دونوں نے ۱۸۵۷ء سے ذرا پہلے اور بعد کی معاشرت کا نقشہ پیش کیا لیکن دونوں کے درمیان جو بنیادی فرق ہے وہ بقول آل احمد سرور . . . .

"ایک کے یہاں دیوزادوں کی سی وسعت ہے اور دوسرے کے یہاں جوہریوں کی سی مینا کاری"

سرشار کے یہاں تفصیل کے باوجود تکمیل کا وہ احساس نہیں ملتا جو رسوا کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ یہ رسوا کا اعجاز ہے کہ انھوں نے چند خطوط کھینچ کر زندگی کی مکمل تصویر پیش کر دی ہے۔ سرشار کی "فسانہ آزاد" اگر ایک مثنوی ہے تو رسوا کی امراؤ جان ادا ایک خوبصورت غزل جس میں حسن اور نفاست کے ساتھ تکمیل بھی موجود ہے۔ فن اپنے خالق کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لیکن کسی بھی کامیاب ناول کے لئے لازمی ہے کہ فنکار اپنی تخلیق سے خود کو ظاہر نہ ہونے دے۔ فنکار کی شخصیت قاری کی نظر سے اوجھل رہے اور فنکار تماشا نہیں بلکہ تماشائی بن جائے۔ رسوا نے اس مرحلہ پر بھی کامیابی حاصل کر کے اپنے فن میں عظمت حاصل کر لی ہے۔ مگر

سرشار کے یہاں یہ بات نہیں ملتی۔ سرشار اپنے "فسانہ آزاد" میں مداری بنکر رہ گئے ہیں۔ اور کسی موقعہ پر بھی ان کی شخصیت نظر سے اوجھل نہیں ہو پاتی۔ بیان کے فن کی خامی ہے۔

رسوا کا بنیادی مقصد یہ نہیں کہ وہ ضمیر یا شعور سے کسی ایک کی نمائندگی کریں۔ بلکہ زندگی سے تجربات حاصل کرکے زندگی کے ہر رخ کو پیش کر دینا ہی ان کا مقصد ہے۔ خواہ وہ رخ روشن ہو یا تاریک وہ نذیر احمد کی طرح معلم اخلاق بنکر سامنے نہیں آتے بلکہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی زندگی کے نبض شناس اور اس کی دھڑکنوں کو گن لینے والے ہیں۔ اس وصف نے ان کو فنی اعتبار سے نذیر احمد سے بڑا فنکار بنا دیا ہے۔ وہ "ذات شریف" کے دیباچے میں لکھتے ہیں ....

"ہم صرف اصل واقعہ کو ہو بہو دکھانا چاہتے ہیں اور اس سے جو نتائج پیدا ہوں ان کے تجزیے سے ہمکو مطلب نہیں"

"ہم کوئی مصلح قوم ہیں جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں"

رسوا کی حقیقت نگاری اور ماننان دوستی کا اندازہ ہمیں اس بات سے ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے شاہکار ناول میں جس کردار کو بطور ہیروئن پیش کیا ہے وہ معاشرے کے سب سے زیادہ معتوب اور مجبور طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کردار کو انھوں نے ایسی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ طوائف ہوتے ہوئے بھی قاری کی تمامتر ہمدردیاں اس کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہیں۔ یوں تو طوائف کا کردار سرشار نے "فسانہ آزاد" میں اللہ رکھی کے نام سے اور نذیر احمد نے اپنے ناول "فسانۂ مبتلا" میں "ہریالی" کے نام سے پیش کیا ہے لیکن جتنا جیتا جاگتا کردار رسوا کی "امراؤ جان ادا" کا ہے ان سے پہلے کوئی دوسرا ناول نویس پیش نہیں کر سکا۔ اردو میں "امراؤ جان ادا" پہلی تصنیف ہے جس میں طوائفوں کے بدنام طبقہ سے بڑی جرأت مندانہ اور گہری ہمدردی برتی گئی ہے ــــ امراؤ جان ادا ① طوائف بھی ہے ② عورت بھی ہے ③ اور لکھنؤ کی تہذیب کی علامت بھی۔ اتنا مکمل کردار ہمارے افسانوی ادب میں دوسرا کوئی موجود نہیں۔

جسطرح شیکسپیر نے پرانی روایات اور شخصیتوں سے پلاٹ اخذ کرکے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے کام لیکر اپنے ڈراموں کو لافانی شاہکار بنا دیا۔ اسیطرح رسوا نے ایک طوائف کی زندگی سے واقعات لیکر ایسی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے کہ آج بھی اس داستان میں ہمکو ایک تمدن کے زوال کی تصویر نظر آتی ہے۔ "امراؤ جان ادا" کے آغاز میں ہی رسوا قاری سے یہ سوال کرتے نظر آتے ہیں ؎

لطف ہے کونسی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

اور جب ہم پورے ناول کا مطالعہ کرکے اختتام تک پہونچتے ہیں تو بخوبی جان جاتے ہیں کہ رسوا نے در حقیقت آپ بیتی کے پردے میں جگ بیتی سنانے کی کوشش کی ہے۔ جسکی توضیح اس شعر سے بھی ہو جاتی ہے ؎

کسکو سنائیں حال دل زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانہ کی سیر کی

گویا یہ ناول صرف امراؤ جان ادا کا حال نامہ نہیں بلکہ اس کے ذریعہ ہم زمانہ کی سیر بھی کر سکتے ہیں۔ رسوا نے اس ناول کے ذریعہ ہمیں اس زمانہ کی پوری معاشرت سے روشناس کرانا چاہا ہے۔ واجد علی شاہی دور ہے گھر گھر شعر و سخن کا چرچا ہے۔ شاعری معاشرہ کا جزو اعظم بن چکا ہے۔ چنانچہ رسوا نے آغاز قصہ ہی میں مشاعرہ کی محفل منعقد کی ہے۔ اس دور کا تعارف اس سے بہتر انداز میں ہو ہی

نہ سکتا تھا۔ اس معاشرے میں ہر طبقہ کے افراد شامل ہیں۔ اس میں نواب صاحب ۔ خانصاحب ۔ منشی جی ۔ پنڈت جی اور لکھنؤ کے بانکے ـــ سبھی شامل ہیں اور حالت یہ ہے ....

"ایک اُدھر واہ واہ کرتا ہے ۔ ایک اِدھر آہ آہ کرتا ہے۔ منہ سے وہ شعر ادھر نکالتے ہیں یہ ادھر ٹوپیاں اچھالتے ہیں لوٹے جاتے ہیں"

ان چند جملوں میں لکھنؤ کے مشاعروں کا پورا نقشہ پیش کر دیا ہے۔ امراؤ جان ادا کے پلاٹ کی تعمیر کا سب سے بڑا حسن یہ ہے کہ آغاز قصہ ہی سے ناول کے مرکزی کردار کے ساتھ دلچسپی اور پھر ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ ناول کا آغاز انوکھے انداز سے ہوتا ہے مشاعرے کی محفل گرم ہے اسی دوران میں برابر کے مکان سے واہ واہ کی آواز آتی ہے۔ اس آواز کو سن کر صرف حاضرین مشاعرہ ہی نہیں چونکتے بلکہ ہمارے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ آخر یہ پراسرار ہستی کون ہے۔ اور یہیں سے قاری کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ اور کہانی اٹھان کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور بالآخر وہ مقام آتا ہے جہاں امراؤ جان فیض علی کے ساتھ بھاگ نکلنے پر آمادہ ہوتی ہے یہی مقام کہانی کا نقطۂ عروج ہے۔ اور یہی مقام ہے جہاں لکھنؤ کا زوال بھی اپنے انتہائی عروج پر نظر آتا ہے

رسوا کا نظریۂ حیات انسان دوستی ہے۔ اور ان کا موضوع لکھنؤ کا زوال پذیر معاشرہ ہے۔ اس لحاظ سے وہ نذیر احمد سے کہیں زیادہ مکمل اور واضح ہیں۔ رسوا کے یہاں غزل کا اختصار اور غزل کی تکمیل دونوں موجود ہیں۔ اور امراؤ جان ادا کی یہی شان تغزل ہے جو اسے دوسرے ناولوں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ رسوا چند اشاروں میں معاشرے کی کسی بہت بڑی خامی کی طرف ہماری توجہ مبذول کر دیتے ہیں۔ ان کے اکثر کردار علامت بن کر سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر ایک مولوی صاحب کو نیم کے درخت پر چڑھا لیا ہے اس زمانہ میں مولوی صاحبان کا شمار بہت ہی محترم اور مقدس ہستیوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ـــ

"سن ۷۰ سال سے زیادہ ۔ جبائے شریف ۔ عصائے مبارک ۔ ان کی صورت دیکھ کر کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک چھٹی ہوئی شوخ ۔ نوجوان رنڈی پر عاشق ہیں۔ اور اس طرح عاشق ہیں"

اس کے بعد امراؤ جان کی زبانی کہلایا ہے ـــ

"یہ تو کچھ ایسا واقعہ ہے کہ مجھ کو ہنسی بھی نہیں آتی ۔ اچھا غور کرلوں تو ہنسوں ... نا صاحب مجھکو تو ہنسی نہیں آتی ...... مولوی صاحب کی حماقت پر رونا آتا ہے"

یہ چند جملے لکھ کر رسوا نے اس زمانہ کی معاشرت پر مکمل اور بھرپور تنقید کی ہے تنقید کے ساتھ ساتھ رسوا کی انسان دوستی کے نظریہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے ۔ یہ کہہ کر ـــ مجھکو تو ہنسی بھی نہیں آتی ۔ مولوی صاحب کی حماقت پر رونا آتا ہے ـــ رسوا نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ معاشرے کا زوال ان کا سب سے بڑا دکھ تھا جسے اس ناول میں پیش کیا گیا ہے

رسوا نے اپنے ناول میں جتنے کردار پیش کئے ہیں وہ سب کسی نہ کسی طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ گویا ان کے کردار انفرادیت رکھتے ہوئے کسی نہ کسی تہذیبی زندگی کے کسی رنگ یا طرز کی علامت بھی ہیں۔ اور اس طرح رسوا نے انفرادیت کو اجتماعیت میں سمو دیا ہے۔ یہی ان کے فن کا کمال ہے۔ رسوا کے ہاں نہ تو نذیر احمد کے سے محاورے ہیں اور نہ سرشار کی سی ظرافت۔ روزمرہ اور لیک جھپک۔ مگر ان سب کا ایک حسین امتزاج ان کے یہاں موجود ہے۔ جسنے ان کو نذیر احمد ۔ سرشار۔ غرض دونوں کی ادبی روایت کا امین بنا دیا ہے۔

حقیقت نگاری نے رسوا کے یہاں نفسیاتی بصیرت پیدا کر دی ہے جس سے ان کے مشاہدے کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے،

علی عباس حسینی نے لکھا ہے کہ رسوا سے اردو ناول نگاری میں نفسیاتی نگاہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ امراؤ جان ادا کا کردار رسوا کی اس نفسیاتی ژرف نگاہی کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ وہ جب خانم کے یہاں آتی ہے تو بوا حسینی کی ہمدردی اور محبت آمیز رویہ کی بناء پر وہ جلدی ہی اپنے ماں باپ کو بھول کر عیش و آرام میں پڑ جاتی ہے۔ اس کی توضیح اس طرح کی ہے ـــــ

"بوا حسینی بڑی نیک ذات عورت تھی۔ اس نے مجھ پر شفقت کی کہ چند روز میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی . . . . . اول تو مجبوری۔ دوسرے نئے ڈھنگ نئے رنگ، اچھے سے اچھا کھانے کو وہ جس کے ذائقہ سے بھی واقف نہ تھی۔ اور کپڑے وہ خواب میں بھی نہ دیکھے تھے"

یہاں ایک بچہ کی نفسیات کی اچھی عکاسی کی ہے۔ گویا اچھے کھانے اور اچھے کپڑے نے اسے لبھایا اور وہ ماں باپ کو بھول گئی ـ

امراؤ جان ادا کو شروع ہی سے اچھے کپڑوں کا شوقین دکھایا گیا ہے۔ خود رسوا کی کا خیال اسے بچپن سے تھا اپنے ابا سے اس طرح فرمائش کرتی تھی

"دیکھو میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے۔ ابھی تک میرا زیور سنار کے گھر سے نہیں آیا ـ عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی۔ ہاں نیا جوڑا پہنوں گی ـــــ"

ان جملوں کو لکھ کر رسوا نے پہلے سے زمین ہموار کر لی ہے۔ اور دکھایا ہے کہ ایک طرف تو امراؤ جان کو بچپن سے اچھے کپڑے اور زیور کا شوق تھا تو دوسری طرف باپ کی عسرت کی وجہ سے اچھے کپڑے میسر نہیں تھے۔ لہٰذا خانم کے یہاں جب اس کو ایسے کپڑے ملے جیسے اس نے خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں تو اس کا ماں۔ باپ کو بھول جانا حقیقت اور واقعیت کے خلاف نہ تھا۔ بلکہ عین مطابق تھا۔ اس کے بعد امراؤ جان کہتی ہے۔

"آنے کے ساتھ ہی مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ اب میں یہاں سے نہیں جا سکتی جیسے نئی دلہن سسرال جا کر سمجھ لیتی ہے کہ میں یہاں دو ایک دن کے لئے نہیں بلکہ مرنے اور رہنے کو ہوں" ـــــ

اس مجبوری نے بھی اسے یہاں دل لگانے پر مجبور کر دیا۔ آگے چل کر امراؤ جان اپنے ہم مکتب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں ـــــ

"جب صبح مکتب میں آتا کبھی چھوٹی چھوٹی نارنگیاں لاتا۔ کبھی حلوہ سوہن کی ٹکیاں لا کر دیتا۔ ایک مرتبہ ایک روپیہ لایا۔ ہزاروں روپئے میں نے اپنی زندگی میں اٹھائے ہوں گے۔ اس ایک روپئے کے پانے کی خوشی کبھی نہ بھولوں گی"۔

ان چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بیان کر کے انھوں نے نفسیاتی باریکیوں کو کامیابی سے بیان کیا ہے۔ کہیں اور کسی مقام پر بھی حقیقت نگاری سے انحراف نہیں کیا ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی نیا موڑ آنے والا ہوتا ہے۔ رسوا اس کے لئے پہلے سے زمین ہموار کر لیتے ہیں۔ اور قاری کو اس آنے والی تبدیلی کے لئے تیار کر دیتے ہیں۔ مثلاً جب دلاور خان امراؤ جان کو بچپن میں گھر سے اٹھا لیجا رہا ہے اس وقت پہلے سے رسوا بتا دیتے ہیں کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس طرح شادی کا ذکر کر کے وہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ آنے والا ہے۔ اس طرح جب امراؤ جان تائب ہوتی ہے۔ تو یہ تبدیلی بھی اچانک نہیں ہوتی بلکہ پہلے سے اس کی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ اسے کربلائے معلیٰ کی زیارت کرائی جاتی ہے اور ایسے واقعات اکٹھا کئے جاتے ہیں کہ یہ تبدیلی فطری معلوم ہوتی ہے۔

امراؤ جان ادا میں جہاں کہیں منظر نگاری سے کام لیا گیا ہے وہاں اس کا مقصد صرف افراد قصہ کی سیرتوں کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اور اس طرح ان کے مناظر ان کی سیرتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

اکثر مناظر استعارے کے طور پر بھی لائے گئے ہیں۔ مثلاً امراؤ جان جب گھر سے نکلتی ہے اور دلاور خان اسے گاڑی میں ڈال کر روانہ ہوتا ہے اس وقت کا منظر ہے۔

"چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے۔ ڈنڈے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی"

اس کے بعد جب اسے خانم کے روبرو لایا جاتا ہے۔

"دیا ٹمٹما رہا ہے۔ میں کانپ رہی ہوں۔ خانم کے دالان کے سامنے ایک جانب بوا حسینی کی کوٹھری دکھائی دیتی ہے۔ تنگ و تاریک چراغ میں سوت کی بتی پڑی۔ موا چراغ اندھا اندھا جل رہا ہے"۔

رسوا کے مناظر ان کے کرداروں کے لئے پس منظر کا کام کرتے ہیں۔ انھوں نے مناظر کے بیان سے وہ کام لیا ہے جو اصل واقعہ کی تفصیل سے نہیں لیا جا سکتا تھا۔ "امراؤ جان ادا" میں جا بجا ایسے واقعات بکھرے ہوئے ہیں جو لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کی عکاسی کر کے حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی قاری کی دلچسپی میں اضافے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ مثلاً وہ موقعہ جب نواب صاحب اور خان صاحب میں دو دو ہاتھ ہوتے ہیں۔ اور نواب صاحب خان صاحب کو گولی مار دیتے ہیں۔ یا وہ موقعہ جہاں فیض علی اور جھان سنگھ کی لڑائی ہوتی ہے۔ یہ انتہائی سنسنی خیز واقعہ ہے۔ یہ انتزاعِ سلطنت سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے جبکہ لکھنؤ اور اس کے اطراف میں سخت بدامنی پھیلی ہوئی تھی ٹھگوں کا دور تھا۔ ایسے زمانہ کے حالات کو پیش کرنے کے لئے اس قسم کے واقعات کا بیان از حد ضروری تھا۔ اس سے رسوا کی فنی باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ہم جان جاتے ہیں کہ وہ فن کی لطافت اور باریکی سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے اکثر بہت ہی لطیف اور بظاہر معمولی سے اشاروں کے ذریعہ بڑی پتہ کی باتیں کہی ہیں اور بڑے اہم کام نکالے ہیں۔ مثلاً آغاز قصہ میں جس نیم کے درخت کا ذکر کیا ہے بظاہر یہ ذکر معمولی ہے۔ اور ہم اس کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ قصہ اپنے پورے نقطۂ عروج پر پہونچ جاتا ہے اور امراؤ جان مجرے کے لئے اس گاؤں میں پہونچتی ہیں جو کبھی اس کا آبائی وطن تھا اس وقت یہ راز کھلتا ہے کہ یہ نیم کا درخت۔ معمولی سا نیم کا درخت قصے کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اس کا بچپن کا ساتھی اور فیض آباد کی یادوں کا محافظ ہے۔ اور وہ امراؤ جان کی فطری دردمندی، معصومیت، نیکی اور انسانیت کا گواہ بن جاتا ہے۔ یہ رسوا کے فن کا کمال ہے۔ اسی کمال نے ناول کو غیر فانی عظمت کا مالک بنا دیا ہے۔

حکیم عبد اللطیف

ریسرچ کی بیماری

آپ نے بیماریوں کے تو بہت سے نام سنے ہونگے لیکن یہ نیا نام یعنی "ریسرچ کی بیماری" آپ پہلی مرتبہ سن رہے ہونگے؟ یہ مرض جو وبا کی طرح پھیل رہا ہے اس کی جانب کبھی آپ کی توجہ منعطف نہیں ہوئی ہوگی اور اس کے عواقب اور نتائج بھی آپ کی نظر سے اوجھل ہوں گے؟

انسان کے تمام افعال و اعمال جب تک طبعی حالت یعنی حد اعتدال پر رہتے ہیں تو ان کو صحیح اور تندرست کہا جاتا ہے اور جب یہی افعال و وظائف حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں یعنی گھٹتے اور بڑھتے ہیں اور غیر طبعی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو ان کو بیماری کے نام سے موسوم کرتے ہیں مثلاً چلنا پھرنا، کھانا، پینا، جاگنا، پیشاب، پاخانہ، پڑھنا، لکھنا، رونا، ہنسنا، بولنا، چپ رہنا، یہ ساری چیزیں جب تک معتدل اور طبعی حالت پر رہتی ہیں تو انسان کو اپنی بیماری کے متعلق خیال نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن اگر انھیں چیزوں میں کمی و بیشی واقع ہو جاتی ہے تو انسان اپنے کو بیمار تصور کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح کیفیات نفسانیہ مثلاً غیظ و غضب، غم، فکر، حسد، بغض وغیرہ ان سب کیفیات کا اعتدال صحت کی علامت اور ان میں افراط و تفریط مرض کی نشانی ہے۔

انسان کے دماغی حالات بھی کبھی معتدل اور کبھی اعتدال سے متجاوز ہوتے ہیں مثلاً رعونت، حماقت، ذہانت، بلادت، ضعف حافظہ، قوت حافظہ، نئی چیزوں کی کھوج اور دھن، پرانی چیزوں کی کھوج اور دھن، پرانی چیزوں پر تکیہ یہ سب دماغی حالات کم و بیش ہوتے ہیں۔

دماغ میں تحصیل علوم کے متعلق مختلف صلاحیتیں ہوتی ہیں کچھ لوگوں کے دماغ میں رٹنے اور محنت کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ کثرت سے امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن حرکت فکریہ اور ذہانت سست ہونے کی وجہ سے نئے نئے نتائج نکالنے اور مجہول چیزوں کو معلوم کرنے کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے بعض لوگوں میں کثرت تحریر نقل حوالہ جات اور تراجم کرنے کی صلاحیت اچھی خاصی ہوتی ہے لیکن قوت فکریہ اسی میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور اجتہاد و مسائل سے یہ لوگ قاصر رہتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرنے سے قاصر اور سلیقہ و تراجم سے عاجز ہوتے ہیں لیکن نئی چیزوں کو معلوم کرنے کی اپج کافی پائی جاتی ہے اور اپنے اشتغال ذہنی کی وجہ سے نئے نئے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت اچھی خاصی رکھتے ہیں۔

پھر ایک دماغ کو کسی خاص علم و فن سے مناسبت ہوتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ جو دماغ ایک خاص علم و فن میں پھل پھول سکتا ہے تو وہ دوسرے علم و فن میں بھی نمایاں ترقی کر سکے، اسی طرح کسی کا دماغ مختلف زبانیں سیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں نمایاں ترقی

کر سکتا ہے، تو یہ ضروری نہیں کہ وہ دوسرے علوم و فنون مثلاً منطق، فلسفہ، کیمیا، حیوانات، نباتات وغیرہ میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کر
غیر ممالک میں جہاں آئے دن ہر ایک علم و فن میں تحقیقات ہوتی رہتی ہے اور ہم سب کو محو حیرت بناتی رہتی ہے وہاں ہر کس
و ناکس کو ریسرچ کا کام سپرد نہیں کیا جاتا بلکہ طلباء کا داخلہ بھی ان کی دماغی صلاحیت کے مطابق مناسب علم و فن میں کیا جاتا ہے۔ لیکن
ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اس کا لحاظ بالکل نہیں رکھا جاتا۔ ایسی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ ایک طالب علم بی، اے تک سائنس کا طالب علم تھا
جس کو فارسی کا ایک حرف بھی نہیں آتا تھا۔ وہ شعبۂ فارسی میں ملازمت کی قوی امید پر ایم، اے میں داخلہ لے لیتا ہے اور بجائے سائنس کے فارسی
میں ایم، اے کر کے لیکچرار مقرر ہو جاتا ہے، یہاں مضامین کی تبدیلی دماغی صلاحیت کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ روزی کا دروازہ جدھر کھلا ہوا
نظر آتا ہے، اسی طرف جبراً و قہراً کسی صلاحیت اور ذوق کے بغیر طلب زر کی خاطر دوڑ پڑتے ہیں۔ مغربی علوم خصوصاً شعبہائے سائنس کے
متعلق یہ غیر ممکن ہے کہ بغیر ترتیب مدارج اعلیٰ درجہ میں چھلانگ مار کر داخل ہو جائے۔ لیکن علوم مشرقیہ۔ خصوصاً عربی، فارسی وغیرہ کے
لئے کوئی قید نہیں بلکہ ایک دم چھلانگ مار کر ایم، اے میں کود سکتا ہے، پھر چونکہ اعلیٰ تنخواہ کا دارومدار ریسرچ پر رکھا گیا ہے لہذا ہر کس و
ناکس ترقی تنخواہ کی خاطر جبراً و قہراً ریسرچ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، فارسی نہ جاننے والے فارسی زبان میں لکھی ہوئی تاریخ کی کتاب کا ترجمہ
فرماتے اور عربی نہ جاننے والے عربی زبان کی کتابوں پر ریسرچ فرماتے ہیں اور اپنی اعانت کے لئے کوئی ڈاڑھی والا پیش امام یا نام کا مولوی
قلیل مشاہرہ پر اس حسن ظن کے ساتھ منتخب فرما لیتے ہیں کہ ہر ڈاڑھی والا فارسی اور عربی کا عالم ہوگا، اردو ترجمہ مولوی صاحب کا اور انگریزی
مقالہ خود موصوف کا، اب ظاہر ہے کہ اس میں جتنی غلطیاں ہو جائیں کم ہیں۔

پھر متعین کو ایسی کیا پڑی ہے کہ ایک قلیل رقم کے معاوضہ کے لئے وہ اپنی جان کھپائیں اور ایک ایک لفظ اور سطر کا اصل
سے مقابلہ کریں۔ یہ تو حقیقت تھی مشرقی علوم کے ریسرچ کی۔

اب ذرا جدید علوم اور سائنسی تحقیقات کا جائزہ لیجئے۔ ایک آراستہ زیارت گاہ پر چند مجاور چراغ جلا کر بیٹھ گئے۔ وہاں کا
کا تجزیہ ہوتا رہا کچھ تیل، کچھ پانی، کچھ سفوف تیار ہوا، اسلائڈ نکلے، شیشوں میں محفوظ کئے، لوگوں نے زیارت کی، ریٹائرڈ ہوئے اپنے
تبرکات جانشینوں کے لئے چھوڑے، جان بچی لاکھوں پائے۔

جس شخص کے دماغ میں ریسرچ کرنے کی صلاحیت ہو، نئی چیزوں کے معلوم کرنے کی اپج، پرانی چیزوں کی رہنمائی میں نیا اجتہاد، بلکہ پرانی
چیزوں کی خرابی ہو اور صرف ترقی تنخواہ کے لالچ میں ریسرچ کے اہم کام میں پانچویں سوار میں وہ شامل ہو تو اس سے صحت مند نتائج کی کہاں
تک امید ہو سکتی ہے، ہندوستان میں تو ریسرچ فیشن میں داخل ہو گئی ہے جس طرح ہر مکان کی زینت کے لئے فرنیچر، پردے، اسٹینڈ، پلنگ، پکچر
وغیرہ فیشن میں داخل ہیں اسی طرح تمام تعلیمی اداروں میں ریسرچ ڈیپارٹمنٹ بھی فیشن میں داخل ہو گیا ہے اور ہر کس و ناکس کا موضوع سخن
لفظ ریسرچ بن گیا ہے۔ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اس جبری اور قہری ریسرچ اور فیشن ایبل ریسرچ کو سائنس نے آرٹ میں تبدیل کر دیا۔ جس طرح ذوق، غالب، اقبال اور
مختلف شاعروں پر ریسرچ کے مقالے لکھے جاتے ہیں، اسی طرح سائنس کے کسی موضوع پر شاعری کی جاتی ہے۔ اور سینکڑوں کی تعداد میں

حکیم عبداللطیف

ریسرچ کی بیماری

آپ نے بیماریوں کے تو بہت سے نام سنے ہونگے لیکن یہ نیا نام یعنی "ریسرچ کی بیماری" آپ پہلی مرتبہ سن رہے ہونگے؟
یہ مرض جو وبا کی طرح پھیل رہا ہے اس کی جانب کبھی آپ کی توجہ منعطف نہ ہوتی ہوگی اور اس کے عواقب اور نتائج بھی آپ کی نظر سے اوجھل ہوں گے؟

انسان کے تمام افعال و اعمال جب تک طبعی حالت یعنی حد اعتدال پر رہتے ہیں تو ان کو صحیح اور تندرست کہا جاتا ہے اور جب یہی افعال و وظائف حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں یعنی گھٹتے اور بڑھتے ہیں اور غیر طبعی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو ان کو بیماری کے نام سے موسوم کرتے ہیں مثلاً چلنا پھرنا، کھانا، پینا، جاگنا، پیشاب، پاخانہ، پڑھنا، لکھنا، رونا، ہنسنا، بولنا، چپ رہنا، یہ ساری چیزیں جب تک معتدل اور طبعی حالت پر رہتی ہیں تو انسان کو اپنی بیماری کے متعلق خیال نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن اگر انھیں چیزوں میں کمی و بیشی واقع ہو جاتی ہے تو انسان اپنے کو بیمار تصور کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح کیفیات نفسانیہ مثلاً فرحت، غم و فکر، حسد، بغض وغیرہ ان سب کیفیات کا اعتدال صحت کی علامت اور ان میں افراط و تفریط مرض کی نشانی ہے۔

انسان کے دماغی حالات بھی کبھی معتدل اور کبھی اعتدال سے متجاوز ہوتے ہیں مثلاً رعونت، حماقت، ذہانت، بلادت، ضعف حافظہ، قوت حافظہ، نئی چیزوں کی کھوج اور دھن، پرانی چیزوں کی کھوج اور دھن، پرانی چیزوں پر تکیہ یہ سب دماغی حالات کم و بیش ہوتے ہیں۔

دماغ میں تحصیل علوم کے متعلق مختلف صلاحیتیں ہوتی ہیں کچھ لوگوں کے دماغ میں رٹنے اور محنت کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ کثرت سے امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن حرکت فکریہ اور ذہانت سست ہونے کی وجہ سے نئے نئے مسئلے نکالنے اور مجہول چیزوں کو معلوم کرنے کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے بعض لوگوں میں کثرت تحریر نقل حوالہ جات اور تراجم کرنے کی صلاحیت اچھی خاصی ہوتی ہے لیکن قوت فکریہ اسی میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور اجتہاد و مسائل سے یہ لوگ قاصر رہتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرنے سے قاصر اور سلیقہ تراجم سے عاجز ہوتے ہیں لیکن نئی چیزوں کو معلوم کرنے کی اپج کافی پائی جاتی ہے اور اپنے اشتعال ذہنی کی وجہ سے نئے نئے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت اچھی خاصی رکھتے ہیں۔

پھر ایک دماغ کو کسی خاص علم و فن سے مناسبت ہوتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ جو دماغ ایک خاص علم و فن میں پھل پھول سکتا ہے تو وہ دوسرے علم و فن میں بھی نمایاں ترقی کر سکے، اسی طرح کسی کا دماغ مختلف زبانیں سیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں نمایاں ترقی

کرسکتا ہے، تو یہ ضروری نہیں کہ وہ دوسرے علوم و فنون مثلاً منطق، فلسفہ، کیمیا، حیوانات نباتات وغیرہ میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کر
غیر ممالک میں جہاں آئے دن ہر ایک علم و فن میں تحقیقات ہوتی رہتی ہے اور ہم سب کو محو حیرت بناتی رہتی ہے۔ وہاں ہر کس
وناکس کو ریسرچ کا کام سپرد نہیں کیا جاتا بلکہ طلباء کا داخلہ بھی ان کی دماغی صلاحیت کے مطابق مناسب علم و فن میں کیا جاتا ہے۔ لیکن
ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اس کا لحاظ بالکل نہیں رکھا جاتا، ایسی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ ایک طالب علم بی۔ اے تک سائنس کا طالب علم
جسکو فارسی کا ایک حرف بھی نہیں آتا تھا۔ وہ شعبۂ فارسی میں ملازمت کی توی امید پر ایم۔ اے میں داخلہ لے لیتا ہے اور بجائے سائنس کے فارسی
میں ایم۔ اے کرکے لکچرار مقرر ہو جاتا ہے، یہاں مضامین کی تبدیلی دماغی صلاحیت کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ معدے کا دروازہ جدھر کھلا ہوا
نظر آتا ہے۔ اسی طرف جبراً و قہراً کسی صلاحیت اور ذوق کے بغیر طلب زر کی خاطر دوڑ پڑتے ہیں۔ مغربی علوم خصوصاً شعبہائے سائنس کے
متعلق یہ غیر ممکن ہے کہ بغیر ترتیب مدارج اعلیٰ درجہ میں چھلانگ مار کر داخل ہو جائے۔ لیکن علوم مشرقیہ۔ خصوصاً عربی، فارسی وغیرہ کے
لئے کوئی قید نہیں بلکہ ایک دم چھلانگ مار کر ایم۔ اے میں کود سکتا ہے، پھر چونکہ اعلیٰ تنخواہ کا دار و مدار ریسرچ پر رکھا گیا ہے لہٰذا ہر کس و
ناکس ترقی تنخواہ کی خاطر جبراً و قہراً ریسرچ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، فارسی نہ جاننے والے فارسی زبان میں لکھی ہوئی تاریخ کی کتاب کا ترجمہ
فرماتے اور عربی نہ جاننے والے عربی زبان کی کتابوں پر ریسرچ فرماتے ہیں اور اپنی اعانت کے لئے کوئی ڈاڑھی والا پیش امام یا نام کا مولوی
قلیل مشاہرہ پر اس حسن ظن کے ساتھ منتخب فرما لیتے ہیں کہ ہر ڈاڑھی والا فارسی اور عربی کا عالم ہوگا، اردو ترجمہ مولوی صاحب کا اور انگریزی
مقالہ خود موصوف کا، اب ظاہر ہے کہ اس میں جتنی غلطیاں ہو جائیں کم ہیں۔

پھر ممتحین کو ایسی کیا پڑی ہے کہ ایک قلیل رقم کے معاوضہ کے لئے وہ اپنی جان کھپائیں اور ایک ایک لفظ اور سطر کا اصل
سے مقابلہ کریں۔ یہ تو حقیقت تھی مشرقی علوم کے ریسرچ کی۔

اب ذرا جدید علوم اور سائنسی تحقیقات کا جائزہ لیجیے۔ ایک آراستہ زیارت گاہ پر چند مجاور چراغ جلا کر بیٹھ گئے۔ وہ اُن
کا تجربہ ہوتا رہا کچھ تیل، کچھ پانی، کچھ سفوف تیار ہوا، اسلکا انڈ نکلے شیشوں میں محفوظ کئے، لوگوں نے زیارت کی، ریٹائرڈ ہوئے اپنے
تبرکات جانشینوں کے لئے چھوڑے، جان بچی لاکھوں پائے۔

جس شخص کے دماغی ریسرچ کرنے کی صلاحیت ہو، نئی چیزوں کے معلوم کرنے کی اپج، پرانی چیزوں کی رہنمائی میں نیا اجتہاد، بلکہ پرانی
چیزوں کی خبر ہی نہ ہو اور صرف ترقی تنخواہ کے لالچ میں ریسرچ کے اہم کام میں پانچویں سوار میں وہ شامل ہو تو اس سے صحت مند نتائج کی کہاں
تک امید ہو سکتی ہے، ہندوستان میں تو ریسرچ فیشن میں داخل ہو گئی ہے جس طرح ہر مکان کی زینت کے لئے فرنیچر، پردے، اسٹیل، پلنگ پر ٹر
وغیرہ فیشن میں داخل ہیں اسی طرح تمام تعلیمی اداروں میں ریسرچ ڈیپارٹمنٹ بھی فیشن میں داخل ہو گیا ہے اور ہر کس و ناکس کا موضوع سخن
لفظ ریسرچ بن گیا ہے۔ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اس حیرت اور فخری ریسرچ اور فیشن ایبل ریسرچ کو سائنس نے آرٹ میں تبدیل کر دیا۔ جس طرح ذوق، غالب، اقبال اور
مختلف شاعروں پر ریسرچ کے مقالے لکھے جاتے ہیں، اسی طرح سائنس کے کسی موضوع پر شاعری کی جاتی ہے۔ اور سینکڑوں کی تعداد میں

مقالے تیار ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کی افادی حیثیت کیا ہے؟ ـــــ یا دنیائے سائنس میں کیا انقلاب پیدا ہوا؟ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے ۔

ایسی دوائیں بھی ایک طویل مدت سے جدید ماہرین سائنس کے غور وفکر کا شغلہ بنی ہوئی ہیں، لیکن اب تک مادہ کو بیا میں کوئی مجرب اور زود اثر دوا کا اضافہ نہ ہو سکا ـــــــــــــــــــــــ اور کسی بھی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ یا میڈیکل کالج کو اس وقت تک کسی دوا، کسی مرض، کسی آلے کی ایجاد کا فخر حاصل نہ ہو سکا ۔

ریسرچ کی بہتی ہوئی گنگا میں ہمارے اطباء کو بھی ہاتھ دھونے کا شوق پیدا ہوا اور ریسرچ کے اس سیلاب میں وہ بری طرح بہہ گئے، کیمیاوی ریسرچ تو وہ کیا کرتے شاعری انہوں نے بھی شروع کر دی اور وہی اصول اور وہی راستہ اختیار کیا جو غدر کے بعد بعض ماڈرن قسم کے ریفارمر مولویوں اور مجتہدوں نے کیا تھا۔ یعنی اپنے خیالات کے مطابق آیات قرآنی اور احادیث کو منطبق کرنے کی کوشش کی، قرآن کریم اور حدیث شریف کی ہر آیت اور قول جو مغربی عقائد کے خلاف دیکھا اس میں تاویل اور توجیہہ کر کے . . . . . مطابقت کی کوشش کی، اب ہمارے اطباء بھی اسی لکیر کے فقیر بن کر آنکھ بند کر کے ہر ایلوپیتھک تحقیق کے مطابق طبی نظریات میں ترمیم و تنسیخ فرما دیتے ہیں اور جن فلسفیانہ نظریات کے اوپر طب کی بنیاد قائم ہے ان سے ناواقفیت کی بنا پر اس کے صحیح اصول قابل ترمیم سمجھتے ہیں" موجز، نفیسی ـــ شرح اسباب، اس قسم کی چند کتابوں پر طب کو محدود دیکھ کر ریسرچ کی جرأت کی جاتی ہے حالانکہ ان کتابوں میں طب کی ابتدائی معلومات اصول موضوعہ کے طور پر بیان کئے گئے ہیں ہر مسئلہ کے متعلق حکماء کے اختلافات ان کے دلائل کی تفصیل سے یہ کتابیں خالی ہیں ایسے طبیب محض اور ڈاکٹر صرف تو ریسرچ کا اہل ہی نہیں ہو سکتا جب تک اس سائنس اور علوم سے واقف نہ ہو جن پر طب قدیم اور طب جدید کی بنیاد قائم ہے یہی وجہ ہے کہ متقدمین میں ریسرچ کرنے والے اطباء نہیں ہوتے تھے بلکہ حکماء ہوتے تھے جو طب کے ساتھ اس کے بنیادی علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے، اسی طرح اس دور میں بھی وہی سائنٹسٹ ریسرچ کر سکتے ہیں جو ایلوپیتھک کے بنیادی علوم میں دست گاہ رکھتے ہیں اس قسم کی ریسرچ تو بہت سستی ہے کہ دوسرے فن کی مسلمہ چیزیں آنکھ بند کر کے اپنے فن میں اضافہ کر دی جائیں، ہماری ریسرچ صرف مانگے کا ٹٹو ہے جس پر آنکھ بند کر کے سوار ہو رہے ہیں، لیکن یہ خبر نہیں کہ یہ کہاں لے جائیگا؟ یہ تو آپ کو اسی مقام پر پہونچائے گا؟ جس سے آپ پناہ مانگتے ہیں۔ اور آپ کی زبان پر ہمہ وقت جس کے شکوے و شکایات جاری رہتے اور چار چار آنسو روتے رہتے ہیں بارش سے تو آپ بھاگ رہے ہیں لیکن اسی بارش کے پرنالے کے نیچے اپنا سر دھر رہے ہیں، زبان سے تو آپ اقرار نہیں کرتے لیکن دل سے آپ اسی فن کی تصدیق کر رہے ہیں جس کے مقابلے کے لئے آپ ہمہ وقت صف آرا رہتے ہیں یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ کتب وسیلہ کے تراجم میں بھی ایسی ماڈرن ترمیمیں کی گئیں کہ جو حد ترجمہ سے نکل کر مترجم کی بے اعتدالیوں کا مجموعہ بن گئی ہیں اور جس کو ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ تحریفات کا ایک مجموعہ ہے جو مترجم کی خیالی لن ترانی کی پیداوار ہے۔ تمام فلسفیانہ نظریات کو اپنی نافہمی یا یورپ کی کورانہ تقلید کی بنا پر تراجم سے خارج کر دیا گیا اور جدید نظریات کا اضافہ کیا گیا جو دیانت ترجمہ کے بالکل منافی ہے ترجمہ تو مکمل ہونا چاہیئے تھا۔ اور اگر وہ نظریات غلط تھے تو اختلافی نوٹ سے اس کی غلطی ثابت کی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ کون سا طریقہ ہے کہ کسی تصنیف کے ترجمہ میں مصنف کے منشاء کے خلاف اور اس کی عبارتوں کے منافی ترمیم و تنسیخ کر دی جائے یہ تو کھلی ہوئی تحریف ہے جو کہ شان ترجمہ کے بالکل منافی ہے ۔

ہمارے سامنے کوئی بھی نظریہ آئے خواہ قدیم ہو یا جدید اس کے متعلق "امنا و صدقنا" کا نعرہ ریسرچ نہیں ہے بلکہ ایک کورانہ تقلید ہے اسی طرح ہاروے، نیوٹن، ہیگر کے ملفوظات پر جان نثار کرنا بھی ایک اندھی تقلید ہے۔

خُذ ما صَفَا وَدَعْ ما كَدِر۔ کا مقولہ اپنی جگہ کتنا ہی درست کیوں نہ ہو لیکن سائینسی دنیا میں اس پر عمل آسان نہیں۔ تحقیقات کی کسوٹی پر ہر مسئلہ کو پرکھنا اور اس دھن میں اپنی زندگی کو وقف کر دینا ایک دشوار گزار منزل ہے اور یہ راستہ بہت کٹھن ہے۔ اس راستے پر چلنے کے لئے مرد آہن کی ضرورت ہے جس کا قحط ہے۔

کتابوں میں ہم نے علم و حکمت کی غرض و غایت استکمال نفس پڑھی تھی کہ اس حکمت کے ذریعہ انسان کی دونوں قوتیں (عملی و نظری) کمال حاصل کر لیتی ہیں لیکن طلب زر اس کا مقصد کسی کتاب میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ استکمال نفس کی ایک دھن اور ایک والہانہ شوق ایسا پیدا ہوتا ہے جو اس دشوار گزار منزل کو آسانی کے ساتھ طے کرا دیتا ہے یہ خوب یاد رکھئے کہ ہر حرکت اپنے مقصد اور غائت کی جانب ہوتی ہے نظر و فکر بھی ایک حرکت ہے جو معلومات میں ترتیب دے کر ایک مجہول چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور یہ تحصیل مجہول نفس کا ایک کمال بن جاتا ہے اب اگر مقصد تحصیل مجہول ہو تو قوت نظر و فکر کی حرکت اسی مقصد کی تحصیل میں جاری رہے گی لیکن اگر مقصد تحصیل زر یا حصول جاہ و حشمت ہو تو قوت نظر و فکر کے تمام حرکات اصل مقصد سے روگردانی کر کے اسی غرض و غایت کی تحصیل کی جانب جاری ہوں گی اور ایسے معلومات ایسی ترتیب دینے لگیں گے کہ جس سے لمبی تنخواہ کوئی ٹھیکہ العام اور کوئی بڑا عہدہ حاصل ہو جائے اگرچہ اس میں سیاسی چالوں کی ضرورت پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔

آخر میں اطباء کی ریسرچ کے متعلق اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر نظریات ایلوپیتھک پر ایمان بالغیب اور تصدیق بالقلب ہے تو کھلم کھلا اقرار باللسان بھی کر لیا جائے اور اس فرسودہ طب کو دیگر ممالک کی طرح ہندستان سے بھی ختم کر دیا جائے اور وہ ماڈرن طریقہ علاج جاری رکھا جائے جس کی آمیزش کو آپ اپنے لئے مایۂ فخر و ناز سمجھتے ہیں لیکن یہ اقرار باللسان آپ کریں تو کیونکر کریں کیونکہ ایلوپیتھک کی تعلیم کے لئے بیالوجی میں ایف ایس سی پھر مقابلہ کا امتحان پھر پانچ سال کی محنت شاقہ یہ آپ کو کہاں گوارہ ہو سکتی ہے؟ اگر یہ سب کچھ آپ گوارا کرتے ہوتے تو آپ ہی کے فن کی یہ زبوں حالی کیوں ہوتی، پہلے آپ اپنے بنیادی علوم سے سبکدوش ہوئے پھر آؤٹ ڈور مریضوں کی ڈیوٹی سے دامن جھاڑا، سرجری کو گندا سمجھ کر چھوڑا، میڈوائفری کے کاموں سے شرمائے اور امراض نسواں سے حیا آئی ایسی حالت میں آپ کے واسطے یہ بڑی مصیبت ہے۔ ان تن آسانیوں کی وجہ سے اپنا کھو چکے اور پرایا حاصل کرنے کی قابلیت اور ہمت نہیں نہ وہ محنت گوارا تھی اور نہ یہ مشقت گوارا ہے۔ اب بغیر محنت و مشقت اور بغیر علمی قابلیت کے ڈاکٹر بننے کی یہی ایک راہ ہے جو آپ نے اختیار کی ہے اور سوائے اس کے اور کیا چارہ ہے۔

اب آپ خود ہی ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ آپ اپنے قدیم یونانی طب کو ترقی دے رہے ہیں یا ایلوپیتھک کا پرچار کر رہے ہیں۔

وکالت کرتے لیکن ان کی نظر میں مورخ کا منصب خوب جانا پہچانا اور دیکھا بھالا تھا وہ سچائی اور غیر جانبداری کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ عملاً انہوں نے ایسا نہ کیا۔ بقول مولانا حالی۔ "ذکاء اللہ نے کسی کی تقلید یا مخالفت سے اپنے دلی خیالات کو نہیں چھوڑا ہے"(۱) ان کے یہاں "تعصب اور طرف داری کو دخل نہیں۔"(۲)

یہ حقیقت ہے کہ مورخ ذکاء اللہ سچ بات کہنے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اس بات سے پوری طرح آشنا ہیں کہ تاریخ کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ مستقبل کو درخشندہ بنانے میں مدد کرے۔ یہ رہنمائی ظاہر ہے اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ پڑھنے والوں پر یہ پوری طرح واضح اور آشکارا کر دیا جائے کہ ماضی میں کسی کام کے کرنے سے اچھائی یا برائی کی کیا صورت نکلی اور مستقبل میں اسی نتیجے کو سامنے رکھتے ہوئے کیا اقدام کرنا چاہئیے۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب تاریخ کو بلا کم و کاست اور بلا کاٹ چھانٹ کے بیان کیا گیا ہو۔

ذکاء اللہ نے سچائی کی اس اہمیت کو سمجھتے ہوئے لکھا ہے "مورخ جو کچھ لکھے وہ بیان واقعہ ہو، کل حالات کو قید کتابت میں لائے یعنی جیسے کہ اکابر و اعیان کے فضائل اور خیرات و عدل و انصاف تحریر کئے ہیں ایسے ہی مقابح و رذائل اس کے ذکر کرے اور کسی بات کو چھپائے نہیں"(۳)

انہوں نے اس تقاضے کو جزو ایمان سمجھ کر پورا کرنے کی کوشش تو ضرور کی ہے لیکن کہیں کہیں ان کا ایمان تزلزل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ سچائی کی اہمیت کا نعرہ تو بلند کرتے ہیں لیکن اس کی خاطر اپنی جان کو عذاب میں مبتلا کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں سچ بات کہنی مصلحت کے خلاف ہو وہاں مورخ کو دامن بچا کر نکل جانا چاہئیے۔ اس سلسلے میں ایک جگہ مورخ کی وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اگر مورخ کسی خوف و ہراس کے سبب سے ہم عہد و ہم عصر کی برائیاں نہ لکھ سکے تو اس میں وہ معذور ہے"(۴) لیکن اس معذوری کی حالت میں بھی انہوں نے عمل کی ایک صورت نکالی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں اگر "مورخ صاف صاف کوئی بات نہ لکھ سکتا ہو تو اسے اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر ضرور کر دینا چاہئیے"(۵) معذوری

بعض بعض جگہ ذکاء اللہ کی یہ احتیاط پسندی کھلنے لگتی ہے، اسی احتیاط کے سبب انہوں نے ان غلط سلط واقعات کی تصحیح بھی ضروری نہیں سمجھی جنہیں ہندوؤں اور انگریز مورخین نے مسلمانوں کے خلاف پھیلایا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر جگہ وہ اس ڈر اور خوف سے دبے رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے "تاریخ لکھتے وقت ان کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کے خلاف پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی تصحیح کی جائے"(۶) ظاہر ہے ان کی یہ خواہش مندرجہ بالا احتیاطی تقاضوں کے ساتھ پوری نہیں ہو سکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان کی اس خواہش نے احتیاط پسندی کو شکست دے کر نہیں

---

(۱) الطاف حسین حالی۔ مضامین حالی مرتبہ وحید الدین سلیم۔ ص ۱۱۵
(۲) ایضاً " " "

(۳) ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان۔ ج۔ اول۔ ص۔ ۴ (۵) ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان۔ ج۔ اول۔ ص۔ 8
(۴) " " " ص۔ ۴ (۶) " " " " ص۔ ۴

تحقیق وتدقیق اور جستجو پر آمادہ کر لیا ہے۔

تحقیق و تدقیق کی اہمیت بھی وہ خوب سمجھتے ہیں جس کا اظہار ان کے اس بیان سے ہو رہا ہے۔ لکھتے ہیں کہ کسی بات پر ایمان اس وقت لانا چاہیئے جبکہ "کہنے والا ثقہ اور صداقت گو ہو اور جو کچھ وہ کہے اس پر عقل بھی گواہی دیتی ہو کہ ضرور درست ہے۔"(۱) تاریخ اور تحقیق کے رشتہ کی اس قربت کو سمجھنے کے باوجود جانے کیوں تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے، ذکاء اللہ کنی کاٹ جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ تحقیق و تدقیق کے بعد کوئی بات طے کریں فوراً فیصلہ دے دیتے ہیں۔ مثلاً متعصب مورخین کے ہاتھوں اورنگ زیب کی جو گت بنی اس کا اور تاریخ نویسی کی ضروریات کا تقاضا تھا کہ ذکاء اللہ مورخ کے صحیح منصب کو پہچانتے ہوئے کوشش کر کے سچ اور جھوٹ کو علیحدہ علیحدہ کر دیتے۔ جیسا کہ شبلی نعمانی نے کیا لیکن جب ذکاء اللہ کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تو انہوں نے تحقیق سے ناپ تول کرنے کے بجائے پورا قصہ اپنی مرضی سے بیان کرنے کے بعد فیصلہ دے دیا کہ "اصل حال تو یہ ہے جو لکھا گیا اب آگے جھوٹی کہانیاں بنائی گئی ہیں۔"(۲)

وہ تحقیق کا مرتبہ جانتے تو ضرور ہیں لیکن "محققانہ تاریخ نگاری ان کے بس کی بات نہ تھی"(۳) اگر وہ تحقیق کرنا بھی چاہتے تو نہ کر سکتے تھے شاید اس لئے کہ وہ کسی بات پر ایمان لانے کے لئے صرف اسی بات کو کافی سمجھتے تھے کہ "عقل اس کی گواہی دیتی ہو"(۴) اس عقل کی گواہی کی بدولت بعض بعض جگہ تحقیق و تدقیق کے بغیر بھی ذکاء اللہ نے ایسی باتیں کہہ دی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اس کی بھی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

حالانکہ یہ بات اب تحقیق نے ثابت کر دی ہے کہ محمد تغلق کا اپنے باپ غیاث الدین تغلق کی موت میں ہاتھ نہ تھا لیکن اس کے باوجود اب بھی کچھ لوگ اس پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر لکڑی کا ایسا محل تیار کرایا تھا جو اس کے منصوبہ کے مطابق غیاث الدین پر آگرا اور وہ نیچے دب کر مر گیا۔ "تاریخ ہندوستان" لکھنے میں یہ مقدمہ ذکاء اللہ کے سامنے پیش ہوا تو وہ فوراً بول اٹھے۔ "یہ امر عقل سے بعید معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ الغ خاں دستر خوان پر موجود تھا۔ یہ کرامت اس میں کہاں سے آئی تھی کہ جس وقت وہ وہاں سے اٹھکر باہر آئے اسی وقت مکان گر جائے۔"(۵)

مورخین نے تاریخ نویسی کے لئے جو چیزیں ٹھہرائی ہیں انہی میں ایک خاص قسم کا وہ طرز تحریر ہے جس کے لئے شرط یہ رکھی گئی ہے کہ وہ انشا پردازی کی حدوں سے دور اور سادگی بیان سے قریب ہو تاکہ پڑھنے والا بھول بھلیوں اور جھمیلوں میں پھنسنے کے بجائے سیدھی سادی راہ کی طرف رہنمائی پائے، اس پر مورخ کی کہی ہوئی ہر بات پوری طرح روشن ہو۔ تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے بھلے برے کی تمیز کر سکے۔

ذکاء اللہ کی اس اصول سے بھی پوری طرح شناسائی ہے۔ وہ ادھر ادھر بھٹکنے اور زبان و بیان کی نوک پلک سنوارنے کے بجائے اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو ان کا انداز بیان بڑا خشک معلوم ہوتا ہے لیکن جیسا کہ مولانا حالی نے کہا ہے، ان کے یہاں "ہر جگہ دو چار صفحوں کے بعد دس پانچ سطریں ایسی دلچسپ اور دلکش آتی ہیں جن کو

(۱) ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان۔ ج۔ اول۔ ص۔ ۱۵ (۲) ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان۔ ج۔ ۸ — ص۔ ۸۹
(۳) ڈاکٹر سید عبداللہ۔ سرسید اور ان کے رفقا ص۔ ۱۴۴ (۴) ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان۔ ج اول ۔ ص ۵
(۵) ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان ج ۔ ۸ ص ۔ ۱۸۰

پڑھکر با مذاق آدمی سر دھننے لگتا ہے"(۱) اس سلسلے میں ان کے طرز تحریر کے دو ٹکڑے ملاحظہ فرمائیے۔

"داراشکوہ صف آرائی کرکے جنگ کے عزم سے سوار ہو کر اپنے لشکر سے آگے بڑھا۔ توپیں آگ برسا رہی تھیں۔ زمین شعلے اٹھا رہی تھی، گرمی کے غلبہ سے اور پیاس کی شدت سے اور یکبارگی آب سے آدمی سراب عدم میں چلے جاتے تھے(۱)

ایک اور جگہ محمد تغلق کی شان میں قصیدہ خوان ہیں۔ "یہ بادشاہ عجائب روزگار تھا اس کی ذات جامع اضداد تھی، بھلائیاں برائیوں پر پردہ ڈالتی تھیں اور برائیاں بھلائیوں کو خاک میں ملاتی تھیں . . . . اسلام اس کو وراثت میں ہاتھ لگا تھا۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا۔ کبھی رمضان کے روزے ناغہ نہ کرتا۔ نشہ کو کبھی نہ چھوتا۔ حرام کاری سے کوسوں بھاگتا۔ قمار بازی کے پاس نہ جاتا۔ حضرت سلیمان کی طرح چاہتا تھا کہ پیغمبری اور سلطانی دونوں اس کی ذات میں جمع ہو جائیں اور جن و انس پر فرمانروائی کرے۔ شیریں گفتار ایسا کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ خوش نویس ایسا کہ جس کو استادان خط استاد کہتے تھے، اپنے وقت میں تحریر و تقریر میں بے نظیر تھا۔" (۲)

ہمارے یہاں ایک زمانے تک تاریخ کو محض بادشاہ، اس کے دربار اور جنگوں کے حالات کے ذکر تک محدود سمجھا گیا ہے لیکن حقیقت میں یا یوں کہہ لیجئے کہ فنی اعتبار سے یہ بات ٹھیک نہیں ہے، تاریخ دراصل پیش آنے والے ہر واقعہ کا نام ہے چاہے وہ واقعہ کتنا ہی معمولی سے معمولی کیوں نہ ہو۔

ذکاء اللہ اس بات سے بھی باخبر ہیں چنانچہ ان کی لکھی ہوئی تاریخیں صرف شاہان مملکت کا روز نامچہ اور حالات جنگ کی کہانی نہیں ہوتیں بلکہ وہ تہذیب انسانی کے ہر پہلو کی نمائندگی کرتی ہیں جیسا کہ واقعتاً ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ان کے یہاں کہیں کہیں ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں جن کا ذکر اور کسی کے یہاں ڈھونڈے نہیں ملتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انہوں نے جنگوں اور بادشاہوں کے ذکر کو نظر انداز کیا ہے۔ بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ انہیں اہمیت تو دیتے ہیں لیکن اتنی نہیں کہ وہ تاریخ کے دوسرے تقاضوں پر چھا جائیں چنانچہ ان کا قلم صرف محلوں اور جنگ کے میدانوں ہی میں محو تماشہ نہیں رہتا بلکہ ادھر ادھر کی خبریں بھی مہیا کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہمیں غربا اور عوام کا ذکر بھی ملتا ہے اور مشہور عمارتوں کے بارے میں تفصیلات کا علم بھی ہوتا ہے۔ مختلف چیزوں کے بھاؤ بھی معلوم ہوتے ہیں اور مذہب کی نشو و نما کا بیان بھی نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود رہ رہ کر ان کا قلم انہیں میدان جنگ کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ ان کے یہاں ذکر کسی بھی چیز کا ہو بات ٹوٹ تان جا کر میدان جنگ پر ٹوٹتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ ملک، رعایا اور شاہ کی بقا اور ترقی صرف وسعت سلطنت میں سمجھتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے خود بھی ان الفاظ میں کیا ہے۔ "ہمیشہ اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ جس وقت کوئی نیا بادشاہ ہو تو دل میں سوچیں اور نقشہ میں دیکھیں کہ اس وقت کس قدر ملک اس کے تصرف میں تھا اور جب مرا تو کس قدر چھوڑ مرا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سلطنت کا کیا نتیجہ ہوا۔" (۱)

---

(۱) ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان۔ ج۔ ۲ صفحات ۱۰۹ - ۱۰۸۔

(۲) ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان جلد دوم۔ صفحہ ۱۳۹ (۳) ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان۔ ج۔ ۲، ۱۰۸ - ۱۰۹
(۱۴) " " "

فن تاریخ نویسی کا بڑا صحیح مذاق رکھنے اور اس کے لوازمات کو سمجھنے کے باوجود کہیں کہیں ذکا اللہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں، جو کسی بھی محتاط مورخ کو زیب نہیں دیتیں۔ مثلاً تاریخ اور مذہب دونوں ساتھ نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ اگر مذہب بیچ میں آجائے تو مورخ کو اس کی خاطر کئی حقائق سے آنکھ بچانی پڑتی ہے۔ اس صورت میں نہ تو وہ غیر جانبدار رہتا ہے اور نہ سچا لیکن ذکا اللہ مورخ کے لئے "سالم العقیدت اور پاک مذہب ہونا بنیادی شرط رکھتے ہیں (۱) اسی بات کی وضاحت انہوں نے ایک اور جگہ یوں کی ہے" جب مورخ متدین اور امین ہوگا۔ اس سے اطمینان قلبی ہوگا کہ ایسا شخص دین کو دنیا کی غرض سے نہیں بیچے گا" (۲)

ایسی ہی چند جگہوں پر لوگوں کو انگلی اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے ورنہ ذکا اللہ نے بہت کم فن تاریخ نویسی کے لوازمات سے تغافل برتا ہے، وہ فن تاریخ نویسی کی ضروریات کی اہمیت پوری طرح سمجھتے بھی ہیں اور ان کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنا اپنے پر فرض بھی ٹھہراتے ہیں۔ اسی احساس فرض نے انہیں ایک بڑا مورخ بنا دیا ہے۔

---

(۱) ذکا اللہ، تاریخ ہندوستان جلد اول۔ صفحہ ۱۴   (۲) ذکا اللہ تاریخ ہندوستان جلد اول صفحہ ۱۵۔

۲

صادق الخیری

ادبی محفلیں

(شاہد بھائی کے نام)

برادرم، سلام مسنون

سچ تو یہ ہے کہ میں نے لکھنا لکھانا عرصہ ہوا، ترک کر دیا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ باتیں جن سے لکھنے کی تحریک ہوتی تھی، ناپید ہو گئیں اور پیشہ ور ادیب بننا مجھے پسند نہیں آیا، لیکن خیر، یہ الگ موضوع ہے کہ مجھ جیسے لوگ جنہوں نے اوائل عمر میں خوب بڑھ چڑھ کر ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا، کیوں جیتے جی خاموش ہو گئے ورنہ ادبی چسکا تو ایسی شے ہے کہ جسے لگ جائے وہ پھر کہیں کا نہیں رہتا۔ ایک بات البتہ قائم ہے اور وہ یہ کہ ادیبوں اور شاعروں کی منتخب صحبت اب بھی بھلی لگتی ہے۔ ادبی چرچے اب بھی طبیعت کو خوش آتے ہیں۔ ایک مدت سے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم لوگوں نے دو زمانے دیکھے ہیں۔ ایک وہ جو ربع صدی پہلے کا تھا جب زندگی کو قرار تھا، فراغت تھی، قناعت تھی، ایک یہ زمانہ جب زندگی برق رفتار ہے، صبح سے شام تک مصروفیت ہے، ہر دم نئی خواہشیں جنم لیتی ہیں اور ہر وقت نئے نئے مسائل سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے میں میرا دل چاہتا ہے کہ کچھ اور نہیں تو گاہے گاہے ادبی محفلیں ہی آراستہ ہوں اور کم از کم ان کے لئے کچھ وقت ضرور نکل آئے۔ یوں کچھ تو ذہنی آسودگی حاصل ہو، کچھ تو ادب سے رشتہ برقرار ہو۔

ایک دفعہ میرے ہاں ایک صحبت منعقد ہوئی۔ بڑے اچھے اچھے صاحب ذوق اور نئے پرانے لکھنے والے جمع ہوئے اور شاہد بھائی (مولوی شاہد احمد دہلوی) نے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ ہر چند کہ وہ ایسی محفلوں کے قائل نہیں تھے مگر اس تعلق کی بنا پر جو انہیں ہمیشہ مجھ سے رہا، وہ بخوشی تشریف لائے۔ ادبی محفلوں میں یہ ان کی آخری شرکت تھی اور اس کے لئے انہوں نے میری خواہش پر ایک اعلیٰ درجے کا مضمون بھی لکھا تھا۔ (مولوی عبدالسلام مرحوم پر) جسے ہم لوگوں نے ان کی زبان سے سُنا۔ اس موقع پر شرکت کے لئے انہوں نے یہ شرط رکھی تھی (انہی کے الفاظ میں) "ارے میاں، اس شرط پہ آؤں گا کہ تم بھی کچھ سُناؤ۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

ذیل کا مضمون گویا شاہد بھائی نے لکھوایا تھا جو ہمارے گروپ کے "قافلہ سالار" تھے اور جو آخر آخر بظاہر ادب سے بیزار ہو گئے تھے مگر دل سے ادب کی زندگی اور اس کی بوقلمونیوں کے تمنائی تھے۔ اس مضمون میں شاہد بھائی

کا ذکر ضمناً آیا تھا اور میں ان کی وہ ہنسی کبھی نہیں بھول سکتا جو اپنا نام اس طور سے سُنکر انہیں بے ساختہ آگئی تھی۔

مخلص

صادق الخیری

مجھے ایسی ادبی نشستوں سے بڑی چڑھ ہے جو دنگل کا نقشہ اختیار کرلیتی ہیں۔ ورنہ صاف ستھری محفلوں میں شرکت کو میرا فرود دل چاہتا ہے، کیونکہ ان کا اپنا ایک مقام ہے اور ذہن کی تربیت اور فرحت کے لئے ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ ان محفلوں میں ہم ادیب کو بہ نفس نفیس دیکھتے اور سنتے ہیں، اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے خیالات، دوسروں کے خیالات کو مہمیز دیدیتے ہیں اور پھر تبادلۂ خیال کی بدولت، خود مصنّف اور شرکاء محفل دونوں اصل موضوع کے نئے نئے زاویوں سے آگاہ ہوجاتے ہیں اور فکر و خیال کی نئی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ اس طرح یہ محفلیں، مطالعۂ کتب پر، گویا اضافہ ہیں۔

تصانیف پڑھنا نسبتاً مشکل کام ہے۔ ان پر تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مطالعہ اور بھی دِقت طلب۔ پھر اتنا کچھ پڑھنے کے لئے وقت الگ درکار ہوتا ہے جو آج کل کے زمانے میں تو ملتا نہیں۔ اُن لوگوں کو جانے دیجئے جن کا پیشہ ہی لکھنا پڑھنا ہے، یا جنہیں ادبی چسکا ہے۔ وہ تو خیر پڑھیں گے ہی۔ پڑھیں گے نہیں تو کریں گے کیا؟ مگر اُن لوگوں کے لئے ادبی محفلیں بڑی غنیمت ہیں جنہیں کشمکش حیات ذرا دم نہیں لینے دیتی، جن کے لئے زندگی ایک تیز رفتار دوڑ بنی ہوئی ہے، جو سوچنے تک کو ترستے ہیں، لیکن جنہیں ادبی چسکا ہے۔ اچھے لوگ میسر آجائیں تو سامعین بہت کم وقت میں بہت سی نئی باتیں سمیٹ لیتے ہیں اور ادیبوں کی منتخب چیزوں، نیز ان پر نقد و تبصرہ سے کافی ذہنی آسودگی حاصل کرلیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی نشستیں اگر سلیقے سے آراستہ ہوں اور ہم مذاق و ہم خیال احباب تک محدود رہیں تو ادب کے لئے نیک فال ہے اور ان لوگوں کے لئے تو نعمتِ غیر مترقبہ ہے جو وقت کی کمیابی بلکہ نایابی کا مرثیہ خواں ہیں۔

ادبی محفلیں اگلے زمانے میں بھی ہوتی تھیں۔ اردو کے خاص خاص مرکزوں اور شہروں میں، خاص خاص بزرگ انہیں بڑے اہتمام سے منعقد کیا کرتے تھے۔ اُن کی بیٹھکوں اور دیوان خانوں میں ادب کا خوب چرچا ہوتا تھا اور اردو بڑی سج دھج سے وہاں پروان چڑھتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان محفلوں میں نثر اور نظم کی مشترک صحبتیں ہوتی تھیں یا نہیں، کیونکہ شاعروں نے تو ہمیشہ ہی اپنا گروہ الگ رکھا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ شاعری، مشاعرے اور بھرے پُرے جلسے ہی کو زیب دیتی ہے۔ مگر نثر اپنی داخلی خصوصیات کی بنا پر، غیر محدود تماشائیوں اور ذرا کم فہم مجموں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے خیال غالب ہے کہ پہلے زمانے کی ادبی محفلوں میں زیادہ تر نثر نگار شریک ہوتے ہونگے اور ایسے بہت کم ہونگے جو خود نہ لکھتے ہوں اور محض سننے کے شائق ہوں۔ میری تمنا ہے کہ کوئی باہمت دانشور، اُن پرانی ادبی محفلوں کا حال قلمبند کردے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تذکرہ، ایک دلکش افسانے سے کم دلچسپ نہیں ہوگا۔

کچھ عرصہ ہوا، انگلستان سے ایک صاحب، ایم لن ولیمز (M. Emlyn Williams) تشریف لائے۔ برٹش کونسل نے انہیں بڑے طمطراق کے ساتھ کراچی کے اہل ادب اور صاحب ذوق حضرات کے سامنے ہوٹل کراچی انٹرکونٹی نینٹل میں پیش کیا۔ یہ صاحب چارلز ڈکنز کے ناول پڑھکر سنانے کے ماہر تھے۔ اور مزے کی بات یہ کہ اس کے ناول پڑھتے وقت، ڈکنز کا روپ دھارلیتے تھے۔ چنانچہ اس شام انہوں نے پہلے شکل و صورت، وضع قطع، چال ڈھال، لباس اور لہجہ بالکل ڈکنز کا اختیار کیا، پھر ڈکنز کے

ناولوں کے اقتباسات سنانے شروع کئے۔ اللہ غنی کیا استغراق کا عالم تھا! اور سامعین کا یہ حال کہ وہ ہمہ تن گوش تھے۔ یہ ادبی محفل واقعی بڑے پائے کی تھی۔ میرے برابر ایک بڈھا انگریز عالم بیٹھا تھا۔ اس پر ایم لن ولیمز کی پیدا کی ہوئی فضا اس قدر طاری تھی کہ اُسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وقفہ ہو گیا ہے اور ولیمز صاحب اب کچھ دیر کے بعد دوبارہ نمودار ہوں گے۔ بعد میں ان صاحب نے مجھے بتایا کہ ڈکنز اپنے ناول پڑھنے میں کمال رکھتا تھا۔ اپنی آواز کے زیر و بم، لہجے کی کارفرمائی، چہرے کے اتار چڑھاؤ، آنکھوں اور ہاتھوں کی جنبش، بلکہ سارے جسم کی حرکات و سکنات سے ایسی ڈرامائی کیفیت پیدا کرتا کہ سماں بندھ جاتا تھا اور اس کے کردار بالکل جیتے جاگتے آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے معلوم ہوتے تھے۔ انہی صاحب سے جو انگریزی ناول کے محقق تھے، معلوم ہوا کہ ڈکنز نے آخر آخر، اپنے ناول پڑھنے کا پیشہ ہی اختیار کر لیا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ ادبی محفلیں سجا کر اپنے ناول سنایا کرتا، اور وہ لوگ بھی جو اس کے بڑے بڑے موٹے موٹے ناول نہیں پڑھ سکتے تھے یا جنہیں اس کے ناول پڑھے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا، بڑے اشتیاق سے ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ کوئی سو برس بعد، ایم لن ولیمز نے ڈکنز کی نقل اتاری اور اب وہ ملکوں ملکوں دورہ کرکے، ایک باکمال مصنف اور اس کے ناولوں کی دھوم مچا رہے ہیں۔

میں نے ڈکنز اور ولیمز کا ذکر جملۂ معترضہ کے طور پر نہیں کیا۔ ہمارے ادیبوں میں (اور شاعروں میں بھی) ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی گذری ہے جن کے پڑھنے کا خاص الخاص انداز تھا۔ وہ جیسے اپنی تحریر میں منفرد تھے، اسی طرح ان کی شخصیت اور ان کے پڑھنے کا بھی الگ اسلوب تھا۔ ان کا لباس، ان کی وضع قطع، ان کا لب و لہجہ، ان کی آواز، ان کا تلفظ، سب کچھ خاص انہی کا تھا لیکن اب کتنے لوگوں کو ان کا انداز معلوم ہے؟ برصغیر پاک و ہند میں میر باقر علی جیسا داستان گو پھر پیدا نہیں ہوا۔ داستان گوئی ختم تو خیر ہو ہی گئی ہے مگر یہ فن واقعی ان پر تمام ہو گیا۔ مجھے صرف ایک دفعہ ان کی داستان سننے کا اتفاق ہوا مگر وہ میری کم سنی کا زمانہ تھا اور مجھے کوئی تفصیل یاد نہیں آتی، سوائے اس کے کہ عجیب تماشہ دیکھا تھا۔ لیکن جن لوگوں نے میر صاحب کی داستانیں سنی ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ داستان کہتے کہتے وہ خود سراپا داستان بن جاتے تھے۔ آواز تو آواز، ان کا سارا جسم، داستان کے مختلف النوع مواقع اور الفاظ و بیان کی تصویر بن جاتا تھا۔ میں سوچتا ہوں اگر ہمارے ہاں ادبی محفلیں زندہ ہوتیں تو کیا عجب سوانگ بھرنے کا رواج بھی ہو جاتا اور کسی دن بلاوا آتا کہ آج کی صحبت میں شاہد احمد، ڈپٹی نذیر احمد کے انداز میں توبۃ النصوح سنائیں گے، یا ممتاز حسن، علامہ اقبال کے اسلوب میں ارمغانِ حجاز پڑھیں گے۔

آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ میں ادبی محفل سے مراد کوئی خاص قسم کی نشست لے رہا ہوں؟ ایسا نہیں ہے۔ ادبی محفلوں کا دامن بہت وسیع ہے۔ ان میں شعر و شاعری بھی ہو سکتی ہے اور نثر کی مختلف اصناف بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان پر بحث و تبصرہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ کسی منتخب موضوع پر سٹرکاٹ مخفل زبانی اظہار خیال بھی کر سکتے ہیں۔ خود اپنا کلام اور مضمون بھی سنایا جا سکتا ہے اور کلاسیکی شہپارے بھی پڑھ کر سنائے جا سکتے ہیں بلکہ ان کو تمثیلی طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں تو ناٹک فرحت کے مشاعرے "دلی کی آخری شمع" کو بھی ادبی محفل سمجھتا ہوں جو ایک دفعہ دلی میں اسٹیج کیا گیا تھا اور اُس مقدمے کو بھی، جو امراؤ جان ادا اور مرزا غالب سے متعلق چند سال ہوئے کراچی کی ایک ادبی عدالت میں پیش ہوا۔ میرا خیال ہے، یہ چند اشارے ادبی محفلوں کی تعریف کے لئے کافی ہیں۔ بس اتنی گذارش اور کرنی چاہتا ہوں کہ جب اس قسم کے اجتماع میں گروہ بازی شامل ہو جائے، اخلاص اور مروت، کو بالائے طاق رکھ دیا جائے ادب کے پردے میں کوئی غرض یا مصلحت داخل ہو جائے تو پھر اسے "ادبی محفل" مت کہیئے اُس کے لئے ہماری لغت میں بہت سے گفتنی اور ناگفتنی نام موجود ہیں۔

عمل: قرۃ العین حیدر



اسٹوڈیو اور ماڈل



پاکستان
رائٹرز کنونشن
منعقدہ کراچی
۲۹ر تا ۳۱ر جنوری
سنہ ۱۹۵۹ء میں
شرکت کرنے والے
کراچی کے ادیبوں کا
ایک یادگار
گروپ فوٹو
بتقریب نویں سالگرہ
پاکستان
رائٹرز گلڈ
۳۱ر جنوری ۱۹۶۸ء

☆

دائیں سے (بیٹھے ہوئے) :۔ اقبال شوقی، قمر جمیل، غلام عباس، فرید جاوید، ع س مسلم، ساقی فاروقی، تابش صدیقی، حمید کاشمیری، میجر ابن الحسن، ضمیر الدین احمد، ضیاء الحسن موسوی۔ (کھڑے ہوئے) عابدی جعفر، یونس احمر، شریف عنایت اللہ، صہبا لکھنوی، مسلم ضیائی، عباس احمد عباسی، مسرت جہاں تیموری، حفیظ جالندھری، جمیل جالبی بیگم جمال، جمیل الدین عالی، ابن انشا، شوکت صدیقی، قرۃ العین حیدر، ابراہیم جلیس، شاہد احمد دہلوی، عبدالعزیز خالد، شمس زبیری، ابن سعید، منظور عارف، ممتاز حسین پہچانے جاتے ہیں



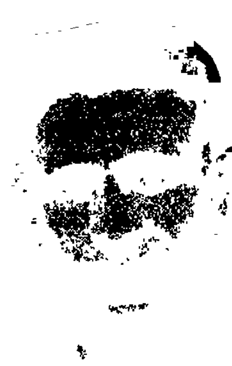
فیض احمد فیض



علی عباس حسینی



شاد عارفی



پروفیسر سید وقار عظیم



رشیدہ رضویہ



انجم اعظمی



جیلانی بانو



ڈاکٹر حسن منظر



سحر انصاری


رضیہ فصیح احمد


اختر جمال

سیّد فیضی


جوگندر پال


عبدالحمید عدم



فارغ بخاری


امّ عمارہ


قمر ہاشمی

زکی انور



رفعت





سیّد رضا کاظمی



رام لعل

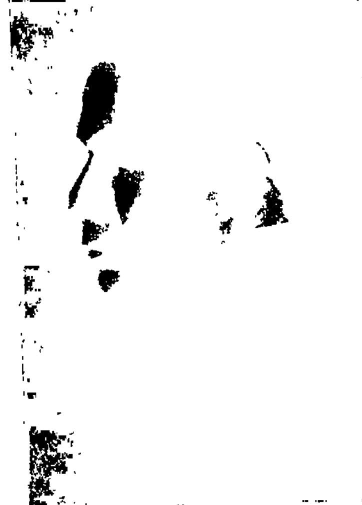
خالدہ شفیع



احمد جمال پاشا



ابراھیم یوسف



کرنل مسعود احمد

ضمیرؔ جعفری - ایک تعارف

پہلے تو یہ بات مجھے مہمل سی لگی کہ دانشوروں کے اجتماع میں ضمیرؔ کا تعارف کراؤں ۔ مجھے تو اس میں دونوں کے استحقاق کا خاصا بڑا خاشہ دکھائی دے رہا تھا ۔ یہ گمان کہ دانشوروں کے کسی طبقہ کو ضمیرؔ اور ضمیرؔ کے کلام کی ہمہ جہت رنگینیوں سے روشناس کرانے کی ابھی ضرورت ہے ، یہ کہنے کے مترادف ہوگا کہ اردو ادب کی اہم تحریکوں سے عام آگاہی ابھی مفقود ہے ۔ ادھر ضمیرؔ بھی تو نہ تخت بائی میں تعارف کا محتاج ہے ۔ نہ ٹنڈو آدم میں ۔ نہ شکار پور میں ۔ نہ بیدو شریف میں اور نہ مقامان نہ سمرقند میں ۔ پھر پنڈی میں رہتے ہوئے تو ضمیرؔ کے ساتھ تعارف سے کوئی مفر ہی نہیں ۔ پنڈی سے بھاگ کر آپ زیادہ سے زیادہ اسلام آباد چلے جائیں گے ۔ یہ وہاں بھی موجود ہوگا ۔ بہر حرف البدلیعنی " ٹونٹی فور پیرال " اسکے شمال میں کوئی مشاعرہ یا ادبی محفل نہیں ہوسکتی جس کے لطف درجن باتوں اور دو درجن سگریٹوں پر ضمیرؔ کے نام کی مُہر دی گئی ہو ۔ حفیظ کے ساتھ شام ہو تو وہاں ضمیرؔ موجود ہوگا ۔ شیخ نذیر کے ساتھ شام ہو تو ضمیرؔ موجود ہوگا ۔ فطرت کے ساتھ شام ہو تو وہاں بھی ۔ . . . . خیر یہاں تو ان کی موجودگی کا کافی جواز بھی ہے ۔ اب تو ضمیرؔ ایک زینہ اوپر چڑھ گیا ہے ۔ اب اسکولوں اور کالجوں میں تقسیم انعامات کے فرائض کے لئے بھی اس نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں میں سے وقت نکالنا شروع کر دیا ہے ۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ آل پاکستان قسم کے شاعروں کے خلیفہ شجاع الدین بنے چلے آ رہے ہوں گے ۔ آپ سے اس ضمیرؔ کا میں کیا تعارف کراؤں ۔۔ پھر ابھی تو پوری ایک شام آپ کو ضمیرؔ کے ساتھ گزارنی ہے ۔

خود مجھے ضمیرؔ کے ساتھ کئی شامیں گزارنے کا موقع ملا ہے ۔ ایسی شامیں جن کے لئے پہلے سے کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا ۔ ایسی شامیں جو بس ہو جاتی ہیں اور پھر شعور و لاشعور میں اس طرح رچ جاتی ہیں کہ کچھ پتا نہیں رہتا کب تک ہوتی چلی گئی تھیں ۔ بے ساختہ ، بلا عنوان سی شامیں جو بارہا غزل کا عنوان بن گئیں ۔

موت سے کہدو ذرا بیرونِ در ٹھہری رہے
زندگی کی محفلِ رعنا ہے میرے سامنے
پرورش کرتے رہے جس کو میرے خواب و خیال
وہ خیال و خواب کی دنیا ہے میرے سامنے

اور پھر ۔۔ وہ رُخ پہ سیم و شفق ، امتزاجِ شام و سحر . . . . . خوابِ آغازِ جوانی پیکروں میں ڈھل گیا

— نظر شراب، جبیں چاند، ہونٹ برگِ گلاب . . . . . . اور جانے کیا کیا کچھ !!

یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ تاریخ کے ایک اور ہی دور کی جس کا شاہد اس محفل میں میرے سوا شاید اور کوئی نہیں۔ آپ اور ضمیر کے درمیان جو آج مجھے واسطہ بنایا گیا ہے تو اس کی یہی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ آج اس مرتب اور نستعلیق شام کے ضمیر پر سے نقاب ذرا سا سرکا کر اُن الھڑ شاموں کے ضمیر کی کوئی ایک آدھ جھلک آپ کو دکھا سکوں۔

جنگ کے فائدے یا نقصانات جو بھی ہوں، اُس کا ایک نفسیاتی اثر بہت ہی جاں افروز ہوتا ہے۔ فوجی جب فیلڈ سروس کی وردی پہنتا ہے تو وہ باقی سب چولے اتار دیتا ہے۔

کیجیے گا جفائیں اب کس پر
ہم تو جاتے ہیں فیلڈ سروس پر

اپنے گھر اور اپنے ماحول سے دور ہٹ کر بہت سی ذہنی بندشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ تصنع کا ملمع اتر جاتا ہے — چھوٹی چھوٹی غرضوں اور چھوٹی چھوٹی مصلحتوں سے، جو ہماری شخصیتوں کو بھینچے رکھتی ہیں، انسان بالکل چھٹکارا پا جاتا ہے۔ یوں کہیے کہ وہ بہت "اصلی" ہو جاتا ہے۔ اور جنگ کے دوران بہت سے اصلی انسانوں کو دیکھنے کے بعد، میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں ——
—— کہ اصلی انسانوں میں کچھ دلنوازیاں ہوتی ہیں جو تہذیبی اور تمدنی سہاروں تلے عام طور پر دبی ہی رہتی ہیں۔

پہلی مرتبہ میں نے ضمیر کو دیکھا تو اصلی ضمیر کو — پھر میل ہوا تو دُور پورب میں۔ جب میں پہنچا ہوں تو — "دور دیس کے جزیروں کے فسوں" نے اس کے تخیل کو بھڑکا رکھا تھا۔ اس پر مرشد — مولانا چراغ حسن حسرت کی نظر اسے کندن بنا رہی تھی۔ وہ پتہ نہیں کس کس سے کہتا پھر رہا تھا کہ ؎

ان سنہرے ٹاپوؤں کے گیت دہراؤں گا میں
اپنے خوابوں میں بنوں گا تیرے "گیسوؤں" کے جال

وہ "بعید شرق کے رنگین طلسم زاروں" کے ماحول میں رہتا، حسن سے کھیلتا، حسن کے گیت گا رہا تھا۔

آتشیں رخسار کی لَو، شربتی آنکھوں کی ضَو
اپنی راتیں ان ستاروں سے سجا لایا ہوں میں

بہت بعد، ضمیر نے کہیں لکھا تھا،

زندگی اپنے تسلسل میں تو اک الزام تھی
لوگ جی لیتے ہیں چند ایک منتشر لمحات میں

اور پورب میں، ہمارا قیام، ضمیر کی زندگی کا وہ دور ہے جب ان منتشر لمحات کا ایک ہجوم آ جمع ہوا تھا اور ضمیر جی بھر کر جی رہا تھا۔

اپنی آنکھوں سے مئے گلرنگ پینے دے مجھے
کل سمندر میں خدا معلوم کیا طوفان ہو

کون جانے کونسے ٹاپو میں یہ سمپان ہو
آج جینا چاہتا ہوں، آج جینے دے مجھے

تخلیقی اعتبار سے منیر کے تخیل کے سوتوں کو تنک آبی کا گلہ کبھی نہیں ہوا ۔ لیکن ملایا کے قیام کے دوران تو ان میں سے ایک طوفان سا ابل پڑتا تھا ۔ سنگاپور سے ہم ایک روزانہ اخبار نکالتے تھے ۔ اس کی مصروفیت ہی کم نہیں ہوتی ۔ مرشد کی مصاحبت میں کوچہ گردی اور شب نوردی بجائے خود ہمہ وقتی مشاغل تھے ۔ اس کے باوجود یا غالباً اس کے سبب منیر کی غنائیہ شاعری نے اسی دور میں وسعتیں اور گہرائیاں حاصل کیں ۔ "جزیروں کے گیت" اسی دور کی تخلیقات کا مجموعہ ہے جن پر کسی آنے والے دور میں، یقیناً تحقیقی مقالے لکھے جائیں گے اور تنقید نگار، اردو ادب میں اس کی منفرد حیثیت پر طویل بحثیں کریں گے، لیکن اس کے "ونیتوں" کے سادہ حسن میں اپنے آپ کو کھو کر آج بھی زندگی کی کلفتوں کو کئی لمحوں کے لئے بھلایا جا سکتا ہے ۔

تیری آنکھیں ذرا مسکرا دیں اگر دھان کی کونپلیں مسکرانے لگیں
تیرے ماتھے کا ہنستا طلوعِ سحر میری شب کو اگر روشنی بخش دے
میری راتوں کی یہ نرم تابندگی، زندگی کو نئی زندگی بخش دے
دیتا ہیں رس بھرے کھیت اگنے لگیں، سرسرانے لگیں، لہلہانے لگیں

نیم عریاں، شوخ، البڑ گلرخوں کی ٹولیاں
ادھ کھلے سینوں پہ "زلفِ تا کمر کے آبشار"
چاند کے ٹیلوں پہ کالی بدلیوں کے شاخسار
میٹھے میٹھے قہقہے، یہ پیاری پیاری بولیاں

ہنسنے والو! روتی ہوں میں جب سے گیا ساجن مرا بابا
قہقہے کے سوداگر کی کشتی میں بھرے سامان کے توڑے
چین کے ریشم، سیگاؤں کے بت، ایپو انکاک کے گھوڑے
کتنے جانے والے آئے لیکن اب تک وہ نہیں آیا

پیاری سہیلی جا کر کہہ دے ان سے ایک پہیلی تو
ہیروں کے سوداگر تو پا سروپ کی بولی بول گئے
بکنے والی جنس کے اس منڈی میں ادھیکے مول گئے
میرے آنسو لے جا ... لے جا! اچھی تو البیلی تو

عید کی شام مسرت ہے طاقوں میں چراغ جلاؤں گی
آج کی شام وہ شام ہے بچھڑی روحیں ملنے آتی ہیں
پیار ہو جن سے اُن پیاروں کو ساتھ اپنے لے جاتی ہیں
شاید وہ بھی آ جائیں، وہ آئے تو میں بھی جاؤں گی

پلکوں پہ جو آنسو رہتا ہے، تم سے بس اتنا کہتا ہے
یہ اِک قطرہ اِک ساگر ہے اور ساگر بھی طوفانوں کا
اس پانی میں دِل پگھلا ہے، کتنے جلتے ارمانوں کا
جب سب ٹیلا جل چکتا ہے، تب جا کر لاوا بہتا ہے

پنتون، انڈونیشیا اور ملایا کی شاعری کی مقبول صنف ہے۔ اور پورب کے سیدھے سادے لوگوں کے سیدھے سادے جذبات، ان کی خوشیاں اور ولولے، ان کے غم اور اندیشے، چار مصرعی پنتونوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ "جزیروں کے گیت" کا بیشتر حصہ انہیں پنتونوں پر مشتمل ہے۔ ضمیر نے انہیں، ان کے سوز و گداز، ان کی ساری مٹھاس، اور چاشنی اور تمام موسیقیت سمیت اردو زبان میں منتقل کر دیا ہے۔ اگر ضمیر کا نام ضمیر حسین شاہ کے بجائے ایڈورڈ فنز جیرالڈ ہوتا تو "جزیروں کے گیت" کی شہرت نہ جانے کہاں تک پہنچی ہوئی ہوتی۔ "جزیروں کے گیت" کے علاوہ سنگاپور ہی میں ضمیر نے "جنگ کے رنگ" اور "ہندوستان میدان میں" مرتب کر لی تھیں۔ "جنگ کے رنگ" زمانہ جنگ کے دلچسپ اور غیر معمولی واقعات کا مجموعہ ہے اور اردو زبان میں منفرد کتاب ہے۔ معلوم نہیں اس کی دوسری تصانیف یعنی "اُڑتے ہوئے خاکے" اور "ہوترنگ" کا مواد بھی انہی دنوں جمع ہونا شروع ہو گیا تھا یا بعد میں۔

سنگاپور ہی میں، میں نے دیکھا کہ ضمیر پر شعر وارد کیسے ہوتے ہیں۔ معلوم کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ شعر کا صوتی ہیولا پہلے اُن پر نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ گردن ایک طرف لٹکا کر بیٹھ جاتے اور کوئیں یا چرخے کی رُوں رُوں کی طرح کچھ کرب آمیز آوازیں نکالنا شروع کر دیتے۔ آہستہ آہستہ اُن آوازوں میں ترتیب سی پیدا ہونے لگتی جس کا زیر و بم ماتروں یا تال کی پیمائش میں آ سکے۔ اب ان میں الفاظ ابھرنے لگتے لیکن ان کی کوئی خاص ترتیب نہیں ہوتی تھی۔ کبھی ردیف قافیہ پہلے آ جاتے اور باقی مصرعہ آہستہ آہستہ شکل پکڑنے لگتا، کبھی ابتدائی حروف اور کلمے معلوم ایسا ہوتا تھا کہ الفاظ اور ترکیبوں کا جھرمٹ ان کے سامنے تیر رہا تھا؛ اور یہ خیالات کے تعاقب میں جھپٹ کر کسی ایک لفظ یا ترکیب کو پکڑ لیتے ہیں۔ اور سامنے دھرے ہوئے خاکے میں اسے اپنی جگہ پر جڑ دیتے ہیں۔

ضمیر کے تذکرے میں سنجیدگی کا اتنا طویل وقفہ اوپری سا لگ رہا تھا۔ اب میں اس کے دوسرے روپ کی طرف آ رہا ہوں۔ یہ ضمیر جس بزم میں ہوتا تھا وہاں قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتی تھیں۔ ویسے پورا گروہ ہی منچلوں کا گروہ تھا۔ خود مرشد یعنی مولانا چراغ حسن حسرت جب کبھی ایک شدید عشق اور دوسرے شدید عشق کے درمیانی مختصر سے وقفے میں، ترنگ پر ہوتے تھے تو ان کے منہ سے پھبتیوں کے آبشار اُبلتے رہتے تھے۔ لیکن ضمیر میں خوبی یہ تھی کہ اسے حاضر دماغی کے لئے کسی وقفے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ بات سے بات نکالتا، فقرے پر فقرہ چُست کرتا اور سب ہنسی سے لوٹ پوٹ جاتے۔ اس پر میں نے ایک روز ضمیر سے کہا

کہ جو کچھ تم بولتے ہو، اگر اسے لکھتے جاؤ تو مزاح نگاری میں نام پیدا کرلو۔ ضمیر نے بڑی سنجیدگی اور غور سے اس تجویز کو سنا اور اسے قبول کرتے ہوئے گویا ذہن میں محفوظ کرلیا۔ بعد میں اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے مزاح نگاری کی راہ پر لگانے میں "ماشو" کا بڑا ہاتھ ہے یعنی میرا۔ اور میں دل ہی دل میں خوش ہو لیا کرتا تھا۔ "ان پڑھ" ہونے کی وجہ سے مجھے یہ علم نہ تھا کہ شیراز میں مرشد سے منسلک رہ کر وہ اس سلوک کی کتنی منزلیں طے کر چکا ہے اور اپنے دیس میں اس کا نام جانا پہچانا ہے۔

سنگاپور کی رومانی فضا میں ضمیر نے مزاح نگاری پر سنجیدگی سے کوئی کاوش نہیں کی۔ مرشد جب ہم سے رخصت ہونے لگے تو ان کا مرثیہ، حالی کے مرثیۂ غالب کی زمین میں لکھا۔ پنجاب میں کانگرس، یونینسٹوں سے مل گئی، تو کانگرس کی شان میں نہایت گستاخانہ سی نظم لکھی۔ خود اپنے متعلق ایک بھونڈا سا قطعہ لکھا۔ لیکن اس کی مزاح نگاری کا اصل دور پاکستان میں واپسی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ "باد شمال" اور "غالب" کی ایڈیٹری کے دوران ضمیر نے صحافتی انداز کی ایسی چلتی ہوئی نظمیں لکھیں کہ ملک میں دھوم مچ گئی۔ وہ اپنے مزاح میں، طباعی کی ایک بڑی ہی تیکھی ادا کے علاوہ، فنی خوبصورتیوں کی ایک نئی خلاقیت لے کر آیا تھا۔ اس کے بعد ضمیر پھر سرکاری نوکری سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ اب اس کی مزاحیہ نظموں میں ایک ٹھہراؤ سا آ جاتا ہے اور ساتھ ہی ایک نئی گہرائی بھی۔ ضمیر کو بہت سے اور مزاح نگاروں پر ہمیشہ یہ فوقیت رہی ہے کہ اس نے محض بڑے آدمی کی پگڑی اچھال کر لوگوں کو ہنسانے کی کوشش نہیں کی، جو بہت ہی آسان کام ہے اور کئی مزاح نگاروں کی مقبولیت کا راز ہے۔ اس نے مسائل کو موضوع بنایا ہے اور غور و فکر کی طرف سننے والوں کو ابھارا ہے۔ ضمیر کے طنز کو آپ تعمیری طنز کہہ سکتے ہیں، جو اس کی سی شگفتگی کے ساتھ، طنز کی بہت ہی مشکل صنف ہے اور اس مشکل صنف میں کامیابی، ضمیر کی عظمت کا ثبوت ہے۔ میری یہ بات مثالوں کے بغیر کچھ ادھوری اور بے رنگ سی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ضمیر کے مزاحیہ اشعار ملک میں اتنے مقبول و مشہور ہیں، کہ اس کی سنجیدہ شاعری لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ دوسری طرف مجھے یہ احساس بھی ہے کہ آپ ضمیر سے ملنے اور اسے سننے کے لئے آئے ہیں۔ لہذا مجھے آپ کے اور ضمیر کے درمیان سے ہٹ جانا چاہیئے!!

سید ضمیر جعفری

ممتاز حسن کی باتیں

جناب ممتاز حسن، ہمارے ملک کے اُن چند اربابِ فضل و کمال میں سے ہیں جن کی شخصیت ایک علمی اور تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ علوم و فنون کے کتنے ہی مختلف شعبوں پر وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں اور صرف نظر ہی نہیں رکھتے بلکہ "سخنے سے کر" درمے اور قدمے" تک علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے لئے عملی طور پر ہمیشہ کوشاں بھی رہتے ہیں تحریکِ پاکستان کے نازک اور فیصلہ کن دور میں آپ حکومتِ ہند کے محکمہ مالیات میں ایک کلیدی عہدہ پر متعین تھے۔ سرکاری ملازموں میں سے جن چند سینئر مسلمان افسروں نے اپنے اپنے محاذ پر تحریکِ پاکستان کی تقویت کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگائے رکھی، اُن میں ممتاز صاحب کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی نئی مملکت کی نئی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں، آپ کی نظر دستی کا حصّہ بے حد قابل قدر ہے۔ ان کی زندگی معلومات و تجربات کا بیش بہا خزینہ ہے۔ قدرت نے ان کو حافظہ کی غیر معمولی صلاحیت عطا کی ہے۔ قلم پر بھی انہیں قدرت حاصل ہے۔ اے کاش وہ اپنی قیمتی یادداشتوں کو قلمبند کرنے کے لئے وقت نکال سکیں۔

ممتاز حسن صاحب کراچی میں رہتے ہیں لیکن میں نے ان کو زیادہ تر راولپنڈی میں دیکھا ہے۔ یہاں وہ جب کبھی تشریف لاتے ہیں مذاق و مشاغل کے مختلف واسطوں سے مختلف طبقوں کے نیاز مند اور ضرورت مند ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اہلِ کار، اہلِ کاروبار، اہلِ دل، اہلِ علم، اہلِ قلم، اہلِ نظر۔ سبھی طرح کے لوگ ان میں بھی آگئے، پاکستانی، ایرانی، ترک، جرمن، انگریز، فرانسیسی اور جانے کن کن ملکوں کے لوگ۔ آدمی اگر ان کی صحبت میں ایک دن گزارے تو حسبِ توفیق، مالیات کے علاوہ پانچ سات زبانوں کے مزاج، قدیم و جدید کئی مختلف علوم و فنون اور اُن کے آس پاس منڈلاتے ہوئے فکری و تہذیبی مسائل سے کچھ نہ کچھ آگاہی حاصل کر لیتا ہے ؎

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے دنوں میں

دن کا وقت عموماً اہلِ کار اور اہلِ کاروبار اصحاب کی نذر ہو جاتا ہے۔ دفتر، فائلیں، کانفرنس، علم و فن کا سورج، اکثر شام کے وقت طلوع ہوتا ہے اور شب کے ایک دو بجے تک غروب نہیں ہوتا۔ راولپنڈی میں نذیر احمد شیخ کرنل گلزار، اور راقم الحروف، ہم تینوں چونکہ یوں بھی عموماً یکجا رہتے ہیں اس لئے ان کی خدمت میں بھی ایک ساتھ ہی حاضر ہوتے ہیں۔ نذیر احمد شیخ اردو زبان کے منفرد مزاح نگار شاعر ہیں اور مشن کالج لاہور میں ممتاز صاحب کے

جیتے ہم سبق تھے۔ دونوں کی یگانگت کا یہ عالم ہے کہ عمر بڑھاپے کی دہلیز پر آ چکی ہے، مگر محبت اور بے تکلفی، نوجوانی کی اسی الھڑ پنے کے ساتھ، ہنوز مشن کالج کے سبزہ زاروں، ہوسٹلوں اور طعام گھروں میں گردش کر رہی ہے۔ کرنل گلزار آپ سے خطہ پوٹھوار کی عسکری روایات اور آثار قدیم کے رشتے سے پروئے ہوئے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں ممتاز صاحب کو بے حد عزیز ہیں۔ میں ادب و شعر کیواسطے سے ان کے نیازمندوں میں شامل ہوں۔ لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ میرے حال پر ان کی خصوصی شفقت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں جہلم کا رہنے والا ہوں جہاں ممتاز صاحب کا بچپن گزرا ہے جہلم شہر سے ان کی شیفتگی رضف صدی کا قصہ ہے نہ صرف یہ کہ راستوں اور گلیوں کے نقشے جوں کے توں ان کے ذہن میں کھچے ہوئے ہیں بلکہ ان کی بو باس بھی تازہ کی تازہ موجود ہے وہ جہلم کی بات کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا اپنے محبوب گلی کوچوں میں چہل قدمی کر رہے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ راولپنڈی تشریف لائے تو شام کے وقت ہم تینوں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ کا ارادہ تھا کہ پہلے ان سے پنڈت ہری چند اختر کے اشعار اور لطائف سنیں گے پھر کچھ دیر مرحوم رفتہ کو آواز دی جائیگی۔ مگر ہم لوگ غلط وقت پر پہنچے۔ ممتاز حسن اس وقت علم تاریخ کے تین چھکا کے ساتھ شیر شاہ سوری کی عظمت کا احاطہ کرنے میں مصروف تھے "قطب الدین ایبک مزار کمیٹی" کے ایک کارکن کا غذات کا پلندہ سنبھالے الگ بیٹھے تھے کہ ذرا شیر شاہ سوری ادھر ادھر ہوں تو وہ مزار ایبک کی نوک پلک سنواریں۔ تھوڑی دیر پہلے انہوں نے ہمارے سامنے اپنے سیکرٹری کو ہدایت کی تھی کہ وہ اگر از راہ کرم بارہ بجے تشریف لے آئیں تو فلسفہ کانگرس کا خطبۂ صدارت بھی آج ہی لکھوا دیں گے۔ شیر شاہ سوری کا مذاکرہ چل رہا تھا کہ سکریٹری صاحبہ بشارت لائے کہ اب سے کوئی بیس منٹ بعد جرمنی سفارت خانے کے مشہور مستشرق اور قونصل جناب ! وہم امان گوئٹے سوسائٹی کے سلسلے میں ملاقات کیلئے آ رہے ہیں ان حالات میں شب کے ڈیڑھ دو بجے سے پہلے پہلے پنڈت ہری چند اختر کی باریابی کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ اگلی صبح آپ مری جا رہے تھے۔ طے پایا کہ ہم بھی ساتھ چلیں کہ شعر و شاعری کی باتیں سفر میں ٹھیک رہیں گی

دوسرے روز، راولپنڈی سے نکلتے ہی کرنل گلزار نے قلعوں کا محاذ کھول دیا۔ بارہ چودہ میل تک روات، پھروالہ اور روہتاس کے قلعے اور ان کے کنگرے چلتے رہے۔ کرنل صاحب قلعہ اٹک عبور کر کے سمرقند و بخارا کے قلعوں کی طرف پیش قدمی کرنے لگے تھے کہ شیخ صاحب نے مشن کالج، لاہور میں اپنے استاد ڈاکٹر ولیٹی کی بات چھیڑ دی۔ مقصود یہ تھا کہ ممتاز صاحب ایک مرتبہ قلعے سے نکل کر مدرسے میں آ گئے تو پھر ہری چند اختر خود بخود سامنے آ جائیں گے۔ یہ نسخہ کارگر نکلا۔ ڈاکٹر ولیٹی کا نام سنتے ہی ممتاز حسن سنبھل کر بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر ولیٹی بھی ایک عظیم الشان قلعہ تھے۔ ہر عظیم استاد، سیرت و کردار کا عظیم قلعہ ہوتا ہے۔ بلکہ قلعہ ساز بھی! ڈاکٹر ولیٹی، باپ کی طرف سے جرمن اور ماں کی طرف سے اسکاچ تھے۔ قومیت امریکی تھی تعلیم انگلستان میں پائی تھی۔ طبیعت میں سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لباس سادہ تو ہوتا ہی تھا، اس پر ان کی بے نیازی گویا سونے پر سہاگہ تھی۔ پتلون کی کریز کبھی درست نہ ہوتی۔ نکٹائی کی گرہ اس بے دھیانی سے باندھتے تھے کہ کشتی عمر دواں کی طرح جس جگہ بھی جا لگی بس وہ کنارا ہو گیا۔ عمر بھر بائیسکل پر ہی آتے جاتے رہے۔ لیکن پورے انگریزی ادب پر عبور رکھتے تھے

شیکسپئر سے تو ان کو عشق تھا ہمارے وقتوں میں شیکسپئر کا ان سے بڑا عالم، محقق اور معلم کوئی دوسرا نہ تھا"

ممتاز حسن، خشت و سنگ کے قلعوں سے نکل کر فکر و نظر کے قلعوں میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ اپنے علم اور بیٹھے سکے کا تو بوجھ سہا وجود، ڈاکٹر ڈیلی بچوں کے ساتھ بچوں ہی کی طرح گھل مل جاتے کالج میں، ہم لوگ اگر کسی استاد کو اپنی سطح پر لا کر، ہنسی مذاق کی باتیں کر سکتے تھے تو وہ ڈاکٹر ڈیلی ہی تھے طلبہ کے لئے اُن کے گھر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا طلبا گھر پر چلے جاتے تو بہت خوش ہوتے ہر جانے، کافی سے تواضع کرتے، باتوں باتوں میں طلبہ کے مسائل کا اندازہ کر کے مفید مشورے دیتے۔ مسز ڈیلی بھی نہایت شفیق و خوش اخلاق خاتون تھیں۔

ڈاکٹر ڈیلی کالج میگزین کے ایڈیٹر بھی تھے کسی طالب علم کا مضمون پسند آتا تو اس پر ذاتی مسرت محسوس کرتے — مضمون کو امتیاز دینے کے واسطے خود اس کی سرخی لکھتے۔ شگفتہ طبع اتنے کہ کالج کے ڈراموں، کنسرٹوں میں پارٹ بھی ادا کرتے ایک مرتبہ پاک۔ اسمبلی شو میں دھوتی باندھ کر اور کچھ ایسی بے ہنگم سی داڑھی لگا کر اسٹیج پر نمودار ہوئے کہ محفل کشت زعفران بن گئی۔

شاید ۱۹۶۱ء میں، ریٹائر ہو کر امریکہ چلے گئے تھے۔ خوش قسمتی سے وہاں بھی ان سے ایک ملاقات ہو گئی۔ نیویارک کے قریب ایک درسگاہ میں پڑھاتے تھے اب مونچھیں موجود تھی مگر کچھ خوش نہ تھے ان کی روح مشرق ہی میں رہ گئی تھی۔

میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب لاہور اور نیویارک کے طالب علموں میں آپ نے کیا فرق محسوس کیا؟— فرمایا — امریکی طالب علم، استاد سے کچھ سیکھنا نہیں چاہتا ان کو ٹیلی ویژن ہو گیا ہے۔"— ڈاکٹر ڈیلی کی آواز سے ان کی روح کا کرب جھلک رہا تھا۔ ڈاکٹر ڈیلی کے والد بھی ایف سی کالج میں استاد رہ چکے تھے چونکہ ان کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے افسوس کر ان کے بعد ڈیلی ایف سی کالج میں نہیں آئے گا۔ تاریخ کا یہ موڑ کس قدر المناک ہے؟

جس طرح غالب کے ساتھ ذوق کا نام ضرور آتا ہے اسی طرح ایف سی کالج کے تذکرے میں ڈاکٹر ڈیلی کے ساتھ ڈاکٹر راٹس کا نام بھی ضرور آتا ہے۔ چنانچہ تین چار میل تک ڈاکٹر راٹس کا تذکرہ ہوتا رہا۔ آپ بھی، ڈیلی صاحب کی طرح سادگی پسند شگفتہ خو، اور علم و فن کی اَنمٹ پیاس رکھنے والے انسان تھے۔ انسانی ذہانت کو پرکھنے کے لئے سب سے پہلے آپ ہی نے ایف سی کالج میں ایک باقاعدہ لیبارٹری قائم کی تھی۔ ادبیات سے بھی بے پناہ شغف تھا۔ مجھے ایک روز کہنے لگے۔ ممتاز حسن اس بات کا تو مجھے اندازہ ہے کہ پڑھنے کا مشغلہ تم نہیں چھوڑ سکو گے، مگر لکھنے کا مشغلہ بھی برابر جاری رکھنا۔ آخری زمانے میں آپ کچھ مدت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ڈاکٹر راٹس ان استادوں میں تھے جن کی نظر انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے۔

استادوں کے معاملے میں اپنی خوش قسمتی پر جتنا فخر کروں کم ہے۔ مجھے زندگی میں ہر ہر مرحلے پر کوئی نہ کوئی مینار نور ملتا ہی رہا ہے۔" اُن کا یہ جملہ سن کر شیخ نذیر نے کہا —" تو پھر کسی اور مینار نور کا تذکرہ بھی ہو جائے۔ پہلی روشنیوں پر بھی تو کچھ روشنی ڈالئے"۔ "پہلی روشنی"؟ انہوں نے عینک اتار کر شیشوں کو صاف کیا پھر پہاڑ پر اطراف میں پھیلے ہوئے دیوداروں میں کچھ ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے وہ اپنی کسی گمشدہ روشنی کو ڈھونڈ رہے ہو۔" میری پہلی روشنی میرے ماں باپ تھے۔ میں نے اپنے ماں باپ کو ہمیشہ۔ ہر حالت میں، دین اور راستی اور صبر و شکر کے راستے پر کاربند پایا۔ میں نے اپنی والدہ کو کبھی کسی کی برائی یا شکایت کرتے نہ سُنا۔ میرے والد نے تمام عمر کسی سے ناانصافی یا زیادتی نہ کی بلکہ جہاں تک ہو سکا دوسروں کو بھی ناانصافی د

زیادتی کے ارتکاب سے باز رکھا۔ میں نے ان کی زندگی سے ہمیشہ قوت اطمینان اور روشنی حاصل کرتا ہوں"

گھر کی آغوش تربیت کے بعد، پہلا قدم گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کے زینے پر رکھتے ہوئے فرمایا — "اپنے استادوں میں سے جس شخص نے مجھے سب سے پہلے متاثر کیا وہ راجہ فاضل محمد خان کی شخصیت تھی۔ میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا والد ان دنوں جہلم میں منصف تھے اور راجہ فاضل محمد خان جو جہلم ہی کے باشندے تھے، گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ میرے والد جب مجھے لیکر ان کی خدمت میں گئے تو مجھے دیکھکر راجہ صاحب نے بڑی شفقت سے میری پیٹھ کو تھپتھپایا۔ اُس شفقت کی سنساہٹ آج بھی میرے ذہن میں موجود ہے۔ مجھے اپنا یہ تاثر بھی یاد ہے کہ راجہ صاحب کو دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میں برگد کے کسی گھنے تناور درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں آگیا ہوں۔

راجہ صاحب بے حد منتظم، بارعب اور جری الشان تھے۔ ان کی فطرت کا کھرا پن، ان کے لہجے میں بھی کھنکھتا تھا۔ جہاں اور جیسے بھی مدرسہ تو مدرسہ وہ شہر بھر میں سب سے "بڑے آدمی" معلوم ہوتے تھے۔ قسمتوں کے انسپکٹر مدارس استادوں کی قسمتوں کے مالک ہوتے تھے۔ مگر، ہمیں تو ان موقعوں پر بھی راجہ صاحب ہی کی شخصیت اہم اور بڑی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنی خودداری کی حفاظت انتہائی محنت و شفقت کے ساتھ کرتے تھے۔ ان کی درسگاہ، تعلیم، نظم و نسق، قرینے اور سلیقے کے اعتبار سے ایک مثالی درسگاہ سمجھی جاتی تھی۔ ضابطے کے دائرے میں، وہ نہ کسی کی رُو رعایت کرتے تھے، نہ اپنے لئے کوئی حاشیہ روا رکھتے۔ ایک مرتبہ ان کا اپنا بیٹا محمد افضل خان کوئی معمولی سی بے ضابطگی کر بیٹھا تو آپ نے پورے اسکول کو جمع کر کے اس کو بید کی سخت ترین سزا دی تھی۔ بظاہر وہ جابر و سخت گیر شخص معلوم ہوتے تھے لیکن دل کے اتنے شفیق و کریم کہ ہر شاگرد کو اپنی ذاتی امانت سمجھتے تھے۔ بچوں میں راستی، دیانت داری، محنت اور خودداری کے جذبہ و جوہر کو نکھارنا، ان کا نصب العین تھا خود ان کا ذاتی کردار، دلوں میں سچائی کی عظمت اور خودداری کے لئے رغبت پیدا کرتا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے، راجہ فاضل محمد خان کی ذات میں حضرت علامہ اقبال کے مرد مومن کا کتنا روشن پرتو موجود تھا۔

راجہ صاحب نے اپنی اس چھوٹی سی ریاست میں کئی "نورتن" بھی جمع کر رکھے تھے۔ جو اپنی اپنی جگہ جامع الصفات بزرگوار تھے۔ عربی کے مدرس، مولوی عبدالکریم صاحب عربی صرف و نحو کے منتہی تھے۔ بہت ہی باریک کتری ہوئی داڑھی تھی۔ سر تا پا سادگی کی تصویر۔ داڑھی کے باوجود چہرے پر بچوں کی سی معصومیت کا نور پھیلا رہتا تھا۔ مولوی صاحب ملازمت کے لئے عربی نہیں پڑھاتے تھے بلکہ عربی پڑھانے کے لئے ملازمت کرتے تھے۔ درس دیتے وقت سامنے کے عام ترجمے سے وہ کبھی مطمئن نہ ہوتے۔ بلکہ لفظوں کی چار دیواری کے اندر جا کر زبان و بیان کی خوبصورتیوں، اور بلاغتوں کے ستاروں سے شاگردوں کی جھولیاں بھرتے چلے جاتے۔ عربی کے بعض معروف قصائد انہوں نے ہمیں اسی زمانے میں پڑھا دیئے۔ درس اتنا میٹھا ہوتا۔ کہ پتھر کو پانی کر دیتے۔ شاعری کا چسکا بھی مجھے انہیں سے ملا۔ کہیں باہر جاتے تو مجھے جماعت میں اپنا نائب مقرر کر جاتے فرماتے۔ "انہیں کوئی سبق پڑھا دو"!

"کیا لڑکے آپ سے سبق پڑھ لیتے تھے؟" میں نے پوچھا!

"ہاں بھئی پڑھ ہی لیتے تھے" ممتاز صاحب قوس قزح کی طرح کی رنگین مگر بہت شرمیلی مسکراہٹ میں ڈوبتے، ابھرتے بولے "بعض اوقات تو میں لڑکوں کو سزا تک دے ڈالتا تھا۔ ان کو بنچ پر کھڑا کر دیتا تھا یہ سب، استاد کے احترام کا اعجاز تھا۔

ماسٹر نفیس احمد صاحب ہمارے انگریزی کے استاد تھے۔ پڑھاتے تو وہ انگریزی تھے مگر وضع قطع وہی عربی، فارسی والی تھی۔ طبیعت سادہ۔ لباس سادہ۔ آٹھ دس میل دور اپنے گاؤں سے روزانہ بائیسکل پر آتے۔ مگر کیا مجال کہ ایک منٹ بھی کبھی تاخیر سے پہنچے ہوں۔ دیکھنے میں اردو دان بھی معلوم نہ ہوتے۔ مگر انگریزی میں شعر بھی موزوں کر لیتے تھے۔ انگریزی اشعار کے معانی کو اردو فارسی اشعار کے حوالوں سے اُجاگر کرتے، جس سے سبق دلچسپ بھی ہو جاتا تھا۔ اور مؤثر بھی۔

پھر "مولوی ہری چند" تھے۔ مولوی یوں کہ آپ نے عربی میں ایم۔ اے کر رکھا تھا۔ پڑھاتے انگریزی اور ریاضی تھے۔ خیام۔ حافظ۔ سعدی کے سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ ہندو۔ مگر اسلامی تمدن میں رنگے ہوئے۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی طرف سے، اسی درسگاہ میں، پنڈت عبدالقادر موجود تھے۔ جو سنسکرت کے اجل عالم تھے۔ مولوی ہری چند؟ اور پنڈت عبدالقادر!

جہلم سے تبدیل ہو کر، ممتاز صاحب کے والد ماجد گوجرانوالہ میں متعین ہوئے تھے۔ "وہاں لالہ موہن لال ہمارے ہیڈ ماسٹر تھے۔ مجسم شفقت۔ ذہین اور مستحق طلبا کو اپنی گرہ سے کتابیں خرید کر دیتے۔ باغبانی سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ دن میں کئی کئی مرتبہ باغیچے کا راؤنڈ کرتے، کھرپا، کدال لے کر گھاس بھی چھیلتے، زمین بھی کھودتے۔ ان موقعوں پر اسکول کا مالی مکھن خان ان کے ہمراہ ہوتا تھا۔ لالہ جی کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ مکھن خان شاید پانچ فٹ پر آ کر رک گیا تھا۔ دونوں، ایک ایک پیڑ، پودے پھل، پھول کے پاس جا کر، ان کو پیار کرتے۔ اُن کا مزاج پوچھتے۔ اسکول بند ہوتا تو راؤنڈ کا دروازہ پھر کھل جاتا۔ باغبانی کے مسائل پر دونوں کے درمیان اتنی گرما گرم بحث ہوتی کہ سننے والے حیران رہ جاتے۔ دراصل وہ دونوں پودوں اور پھولوں کے معاملے میں عشق کی اس سطح پہ تھے، جہاں نہ موہن لال ہیڈ ماسٹر تھا اور نہ مکھن خان مالی تھا۔

مولوی عبدالغنی صاحب ایک اور غیر معمولی شخصیت تھے۔ دیوبند کے جید عالموں میں آپ کا شمار ہوتا تھا ۔۔۔ علامہ سید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ان کی ذات علم و اخلاق کا سرچشمہ تھی۔ صاحب علم۔ صاحب عمل ۔۔۔ صاحب نظر!!

گوجرانوالہ کے بعد "ممتاز حسن" دہلی کے سینٹ اسٹیفنز کالج سے ہوتے ہوئے لاہور کے ایف۔ سی کالج میں وارد ہوئے۔ دہلی میں آپ کو شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی شاگردی کی سعادت حاصل رہی۔

"مولانا ہندوستان بھر میں چوٹی کے چند علما میں ممتاز مرتبہ رکھتے تھے۔ اُن کا علم بے پایاں تھا۔ وہ اسلامی طرز زندگی کا نمونہ تھے عظیم استاد! عظیم انسان! ان کی عظمت کے سامنے سر ہی نہیں، دل بھی جھک جاتے تھے۔

ایف۔ سی۔ کالج لاہور میں مولانا سید مرتضیٰ حسین ادیب، روشنی کا ایک اور مینار تھے۔ ہمہ شفقت۔ ہمہ مروت ابتدا میں صرف عربی کے فاضل تھے۔ شدہ شدہ انگریزی میں بھی کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔ انگریزی سیکھنے کے واسطے وہ اپنے انگریزی دان شاگردوں سے بھی درس لینے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ آپ نگینہ کے رہنے والے تھے۔ ایک مرتبہ گرمی کی چھٹیوں کے بعد آئے تو میرے لئے "مثنوی بہار عشق" کا ایک قدیم و نادر نسخہ لیتے آئے جو آج بھی عزیز ترین متاع کے طور پر، میرے پاس محفوظ ہے۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے؟"

مری کی بلند چوٹیاں قریب آ گئی تھیں۔ امڈی ہوئی گھٹاؤں سے چھلکتی ہوئی ایک نمی فضا میں دوڑ رہی تھی اور ایک نمی ممتاز صاحب کی آنکھوں میں تیر رہی تھی!!

سحر انصاری

قمر ہاشمی اور ان کی شاعری

قمر ہاشمی کی شاعری کا آغاز اس دور میں ہوا جب ترقی پسند تحریک عروج پر تھی اور برطانوی سامراج کو ملک سے نکالنے، سیاسی اور معاشی آزادی کی جدوجہد نے ایک ایسی سوچی سمجھی فضا پیدا کر دی تھی جس میں نظمیں لکھنا اور ملک گیر شہرت حاصل کر لینا نسبتاً آسان تھا۔ قمر ہاشمی کی شاعری کا وہ ساحل جو قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۱ء تک قائم رہا، براہ راست سیدھی سادی شاعری سے عبارت تھا۔ جب انھوں نے انسان اور سماج کی آزادی کے گیت گائے تو ان کا لہجہ اُس وقت کے مروجہ لہجے کی محض ایک گونج تھا۔ پھر حالات بدلے۔ بہت سی آزادیاں کھو گئیں، بہت سی حاصل ہوئیں۔ اور زندگی ایک ایسے موڑ پر آ گئی جہاں ٹھہر کر انھیں اپنے گرد وپیش کا از سرِ نو جائزہ لینا پڑا۔ اس دور میں قمر ہاشمی نے شاید اظہار کی کوئی راہ نہ پا کر شعر لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اس میں ان کی ناکامی کا دخل نہیں تھا بلکہ ایک بیدلی اور بے کیفی تھی جس نے ان کے ذہن میں اپنا نشیمن بنا لیا تھا۔ یوں قمر ہاشمی کی نظمیں ادبی حلقوں کے لئے اس وقت بھی اجنبی نہیں تھیں۔ ان کی ایک نظم "الف لیلیٰ" بہترین ادب کے انتخاب میں شائع ہو چکی تھی۔ لیکن اس وقت کے قمر ہاشمی کے پاس سے اظہار کے سارے رنگ جیسے کھو گئے تھے۔ شاعری اور زندگی کے ہر سنجیدہ کام کے لئے حوصلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس وقت حوصلے کا چراغ غالباً بادِ مخالف کی تندی سے لرزنے لگا تھا۔ بادِ مخالف اگر کسی فرد کی سمت سے چلے تو اس کے اثر کو زائل کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ماحول کا سارا مجموعی انداز مخالفت کا رنگ اختیار کر لے تو خود کو سنبھالنا اور حوصلے کے چراغ کو ہوا کی زد سے بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔

پھر ایک خاصے طویل وقفے کے بعد قمر ہاشمی کو یوں محسوس ہوا جیسے بدلتے ہوئے حالات نے انھیں بھی بالکل بدل دیا ہے۔ ان کے ذہن میں نئی نئی مترنم سطریں خود بخود ابھرنے لگیں۔ جیسے موسم بہار میں درختوں کی شاخوں پر کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اب ان کی شاعری ایک الگ انداز، ایک بالکل مختلف اسلوب لئے ہوئے تھی۔ ان کی زندگی کے تجربے شاید اب یہ چاہتے تھے کہ انھیں زمان و مکاں کی وسعتوں میں لوٹا دیا جائے۔ یہ ایک بڑے صنعتی شہر کی اجنبی فضاؤں کا تقاضا تھا۔ آج کل بڑے شہر کی زندگی اور صنعتی عہد کے تضاد کا ذکر شاید ایک فیشن بنتا جا رہا ہے۔ جاننے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ جب تک بڑے شہر کی زندگی کا اپنا ایک الگ رویہ موجود ہے اور جب تک صنعتی عہد انسان کو کچل دینے کی سعی کرتا رہے گا اس وقت تک کسی نہ کسی عنوان اس کا ذکر بھی ہوتا رہے گا۔ کیونکہ اب یہ حقیقتیں ہماری زندگی کا جزو بن چکی ہیں۔ بڑے شہروں میں لکھنے اور سوچنے والوں کا اپنی انفرادیت اور میلانِ طبع کے ساتھ زندہ رہ جانا بڑا کام ہے اور پھر لکھنے سوچنے کی لگن کو ہاتھ سے نہ جانے دینا اور اپنے خوابوں کو ہوس زرگری اور مشینوں سے ٹکرا کر چور چور ہونے سے بچا لینا ایک ایسا کٹھن مرحلہ

جسے سر کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

قمر ہاشمی ایک سیدھے سادے آدمی ہیں۔ ان کی شخصیت کا تاثر کبھی خود بخود قائم ہو جاتا ہے اور کبھی لاکھ کوششوں کے باوجود قائم نہیں ہوتا۔ بظاہر۔ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ زندگی کی پیچیدگیوں کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہوں گے یا اپنے عہد کی بعض انتہائی عام حقیقتوں کو حیرت اور استعجاب کی ایک غیر معمولی فضا میں پیش کرنے پر قادر ہوں گے۔ لیکن ان کی شاعری اس امر کی دلیل ہے کہ وہ زندگی کے سفر کو "بسینہ سپرم رہ اگرچہ پا خفت" کے حوصلے کے ساتھ طے کر رہے ہیں اور اس سفر میں جب انھیں آنسوؤں، ناانصافیوں اور ہلاکتوں کے نشان ملتے ہیں تو وہ اداس ہو کر بہت نرم اور دھیمے لہجے میں انھیں اس طرح بیان کرتے ہیں گویا یہ سارے نشان خود ان کی ذات کا ایک حصہ ہوں۔ کبھی اس سفر میں وہ حسن، فطرت اور انسان کی جمالیاتی آرزوؤں سے دوچار ہوتے ہیں اور پھر ان کی ذات کا حسن الفاظ میں نکھرنے لگتا ہے۔ آدرش اور زندگی کی جد و جہد کے بعض مثبت اصولوں نے قمر ہاشمی کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ وہ زندگی کے عام لمحوں میں، بات چیت میں اور شاعری میں، غرض ہر جگہ ایک ایسے انسان نظر آتے ہیں جو خلوص، محنت، محبت اور صداقت کو کبھی ترک نہیں کرتا۔ اسی لیے ہمارے دور کی زندگی کا کوئی نمایاں عکس ایسا نہیں جو ان کی شاعری کے آئینے میں نظر نہ آتا ہو۔ وہ مشینوں کے ساز میں دل کی دھڑکنوں کے دب جانے کا ذکر کرتے ہیں۔ اور عسرت کی زندگی میں شعر لکھنے کو بھوک کے بازار میں شہنائیوں کے کاروبار سے تعبیر کرتے ہیں۔ کبھی تاریخ کے دور افتادہ لمحوں میں انھیں لاجونتی اور سجوگتا کا چہرہ نظر آتا ہے، کبھی وہ قلوپطرہ کے محل میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور کبھی ٹیکسلا میں تہذیب کی تہوں کو کریدنے لگتے ہیں۔

قمر ہاشمی زندگی کے تجربوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی شاعری اور ان کی فکر اکتسابی نہیں ہے۔ وہ شاعر محض ہیں اور صرف انہی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں جو ہوا کے جھونکوں، سورج کی کرنوں یا شفق کے رنگوں کی طرح ان کی زندگی میں در آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک طرف فارسی شاعروں کی روایت کا رچا ہوا مزاج ملتا ہے اور وہ خالص کلاسیکی طرز اختیار کر کے اپنی جدید عہد کی کیفیات کو یوں پیش کرتے ہیں ؎

گزرا مرے قریب سے کہتا ہوا کوئی
میں شیخ رہگزار و یار قیاس ہوں
اس دورِ آگہی میں دکھاؤ نہ آئینہ
اپنی برہنگی کا میں خود ہی لباس ہوں

اور کبھی ان کی نظموں میں بال روم، نیون سائن، سارتر، فوجی بارک، سگار، اسپوتنک، لپ اسٹک، جاز اور والز کی دھن اپنے عجیب و غریب پس منظر کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان کی فطرت میں بے باکی اور مہم جوئی کا عنصر یک گونہ بے ساختگی لیے ہوئے ہے۔ اسی لئے وہ اظہار کے وقت نہ شاعروں کے بندھے ٹکے اصولوں کی پروا کرتے ہیں اور نہ الفاظ کے رکھ رکھاؤ کی۔ اس عمل میں بعض اوقات ان کا کلام ابہام کی گتھیوں میں الجھ جاتا ہے اور بعض اوقات ایسے مصرعے اور ایسی تراکیب PHRASES ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ان کو پڑھ کر ہمارا ذہن خود بخود مسکرانے لگتا ہے بالکل اسی طرح جیسے صبح کی تازہ ہوا کا لمس محسوس کر کے ہم دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں۔ مزاج کی جولانی، بیباکی اور حوصلہ مندی ان سے ایسے مصرعے کہلوا دیتی ہے ؎

میز پر "شعلہ طور"

"دستِ صبا" ادھ کھلی
سارتر شیلف میں بند ہے

ذہن کے پردۂ روشن پہ ابھرنے کی رات

گماں کے لحافوں سنبھل جاؤ
اور حدِ نگاہ تک نکل جاؤ

یہ ابر کے ٹکڑے ہیں یا
پیوند ہیں تنہائی کے

رات نغموں کا تلاطم، خوشبوؤں کا سیل تھا
قامتوں کی یورشیں، پیراہنوں کا اک ہجوم
میں تنِ تنہا طرب کی آندھیوں میں گھر گیا

بساطِ جسم سے اُٹھ کر چلی سوئے انفاس
لطیف بوسے کہ مدہوش ہو اٹھے پیراہن

جلی امیدوں کی راکھ مٹھی میں بند کب سے یہ سوچتی ہے
کہ اس کی تاثیر کیمیا ہو۔

قمر ہاشمی کی ان حسی تصویروں، زندہ تشبیہوں اور متحرک علامتوں میں ہیئت کے نئے تجربوں کی شعوری کوشش کے ذریعے چونکانے کا رجحان کارفرما نہیں ہے بلکہ وہ پوری سچائی اور خلوص کے ساتھ اپنے تجربوں کے اظہار میں یہ بے ساختہ پن پیدا کرتے ہیں۔
قمر ہاشمی، اختر شیرانی کے ہم وطن اور ان کے شاگرد ہیں۔ اختر شیرانی کا رومانی مزاج قمر ہاشمی کے حصے میں بھی آیا ہے لیکن ان کے یہاں کسی سلمیٰ یا ریحانہ کا خیالی عکس نہیں ہے بلکہ بدن سے قریب اور بدن کے حسن سے لطف اندوز ہونے کا گہرا شعور ملتا ہے۔ ان کے یہاں ناآسودگی یا فرسٹریشن نہیں ہے بلکہ وہ جسم کو زندگی کا ایک اہم تجربہ سمجھتے ہیں اسی لیے مجسم کا ہر روپ ان کے سامنے رہتا ہے ؎

جسم قانونِ محبت، جسم نفرت کا چراغ
جسم پھولوں کا تعطر، بادِ صرصر کا سراغ

جسم حسرت کی تمازت، تشنگی کا اک سبو
جسم تعبیر تمنا، جسم شہر آشند

کبھی کبھی وہ اپنی شاعری میں "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے مقلد نظر آتے ہیں لیکن اس ایپکیورین نقطۂ نظر کو اس دور میں جزو زندگی بنانا ایسے حساس انسانوں کے بس کی بات نہیں جیسے قمر ہاشمی ہیں۔ جب وہ قلوپطرہ، سیتا اور سنجوگتا کا ذکر کرتے ہیں تو اس وقت بھی زندگی کے تضادات ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ شہنائیوں کے نغمے سن کر انھیں بھوک اور خالی پیٹ کا خیال آتا ہے۔ محبوبہ کو پاکر وہ کہتے ہیں۔

میں تم کو ابھی نہ پا سکوں گا
تم عسرِ معاش میں ملی ہو

وہ اپنے عہد کے اس تضاد سے بخوبی واقف ہیں کہ ایک طرف خوابگاہوں میں عیش وعشرت کے نعرے بلند ہو رہے ہیں ہوٹلوں میں شبینہ رقص ہو رہے ہیں اور دوسری طرف کسی کے گلو کا طوق تنگ ہوتا جا رہا ہے کسی کی پیٹھ پر تازیانوں کے نیل دمک رہے ہیں

اندرونِ حرم عیش کے نعرے
خلوت روز و شب
خوابگاہ مہ و کہکشاں
اک طرف پیٹھ پر نیل کوڑوں کے
انسانیت سرنگوں
ٹوٹتے جسم، گرتی ہوئی محفلیں

....

مالیوں کا خون
جسم کا مول تول
کچھ سبک سلسلے کچھ گراں طوق سے
آج کے ہاتھ میں جشن کی ساعتیں
وقت کے ساز میں
نغمۂ روح فرسا سیر

قمر ہاشمی کا موضوعِ سخن زندگی کا یہی تضاد ہے۔ اور اس کے اظہار کے لئے انھوں نے اپنا ایک الگ اسلوب بنالیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری تو صوت و صدا کی لہروں کا ایک سمندر ہے اور اس میں اپنی آواز کی لہر کو تلاش کر لینا شاعر کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ قمر ہاشمی کے لہجے کی انفرادیت اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ اپنی آواز کی لہر کو پانے میں اپنے دور کے کسی قابل ذکر شاعر سے پیچھے نہیں ہیں۔

محسن احسان

فارغ بخاری کی شاعری

فن کی لگن انسان کو زندگی کے اعلیٰ اقدار سے روشناس کراتی ہے۔ ادب و شاعری میں میری طالب علمانہ دلچسپی کا آغاز تھا کہ فارغ بخاری کی شاعری کی گونج سابق سرحد میں سنائی دی۔ یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک اپنے پورے عروج پر تھی ملک بھر میں یہ تحریک سرگرم عمل تھی۔ پشاور میں فارغ بخاری اس تحریک کے لفتیبوں میں سے تھے۔ اور ہر طرف انقلاب کے تیز و تند نعرے فضا میں گونج رہے تھے۔ میرے نوعمر ذہن کے لئے یہ نعرے اگرچہ اس وقت بہت بھاری بھرکم تھے۔ لیکن میں بھی ان کا ساتھ دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس وقت فارغ بخاری کی شاعری انقلاب کی آگ سے کندن ہو کر نکلی تھی۔ وہ نہایت تیز تیز نظمیں لکھتے غریبوں اور مزدوروں غرض سب کے لئے بہتر زندگی بہتر ماحول اور بہتر انداز حیات میں سرگرداں رہتے ان کی غزلوں میں بھی اسی انقلاب کی آگ بھڑکی ہوئی تھی وہ اپنے خاص انداز میں جب بھی شعر سناتے تو دل کی دھڑکنیں ان کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتیں۔ اسی زمانہ میں فارغ صاحب کا یہ خوب صورت شعر اکثر میں نے تنہائی میں اپنے نہایت ہی بھونڈے اور بھدے ترنم میں گنگنایا ہے ؎

تیرے فارغ کی جوانی ایک نغمہ تھا جسے
زندگانی کے سلگتے ساز پر گایا گیا

اب جب کہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں مجھے یکے بعد دیگرے وہ تمام تاثرات یاد آتے جا رہے ہیں۔ جو آج سے تقریباً سولہ سال پہلے فارغ صاحب کی شاعری سے حاصل کئے تھے۔ یہ میرے بچپن کی یادوں کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ابھی میں ان یادوں کو پوری طرح سمیٹ بھی نہ پایا تھا کہ زمانے نے کروٹ بدلی۔ اس وقت تک صرف تاثرات و کیفیات تھیں۔ اب سوالات پیدا ہونے لگے میرے اور آپ کے دیکھتے دیکھتے ادب و شعر کے بارے میں قطار اندر قطار سوالات و نظریات ابھر آئے۔ شاعری بے چاری کسی گوشۂ عافیت میں جا دبکی اور سوالات و نظریات کھلے بندوں اودھم مچانے لگے۔ شاعری اپنے اندر ایک معصوم لذت اور لگداز کیفیت رکھتی ہے جو ان خطرناک سوالات و نظریات کی یقیناً متحمل نہیں ہو سکتی۔

ہم چونکہ ملک کے دور افتادہ خطے میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے ہمیں یہ اطلاع خاصی دیر سے موصول ہوئی کہ شاعر کی دنیا بدل گئی ہے اقدار بدل گئی ہیں اور معیار ادب میں تبدیلی ہونے لگی ہے۔ ملک کے دوسرے حصوں میں فوراً اس تبدیلی

کو قبول کرنے کی کوششیں ہونے لگیں یہ اور بات ہے کہ وہ کوششیں اب تک بار آور نہ ہو سکیں لیکن اس تبدیلی کا اعلان اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ یہ انگلستان، فرانس اور امریکہ میں ہو چکی تھی سو ہم اپنے رہن سہن اپنی وضع قطع اپنا اقدار و روایات کو تو نہ بدل سکے لیکن اس اعلان کے تحت اپنی شاعری کو بدلنا ضروری سمجھا۔ بعض حلقوں میں یہ بھی کہتے سنا گیا کہ اب ہمیں ایسی شاعری کرنا چاہئے جو آج تک ہم سے پہلے کسی نے نہ کی ہو اور آئندہ کسی کو اتنی جرأت ہو کہ وہ ایسی شاعری کرے۔ بس اس اعلان کے بعد ہر ایسی نظم غزل گردن زدنی قرار پائی جس کے تاثر کو قاری قبول کر سکے۔ جس میں جذبات کے اظہار کی پہچان ہو سکے یا جسے پڑھ کر اپنی روایات کا سراغ مل سکے اور جسے آپ اپنے بزرگوں کی میراث گرداننے میں کوئی عار محسوس نہ کریں میر اور غالب کے قارئین کو یہ سمجھا دیا گیا کہ دنیا بدل گئی ہے پرانی ما بعد الطبیعیات ختم ہو گئی ہیں۔ اس لئے اب ایسی شاعری جو ماضی کی حامل ہو بے سود ہے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں فارغ بخاری ایسا فن کار اپنے فن کی مشعل جلائے کھڑے بلند ہاتھ اس نے ان تمام اعلانات کو سنا بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ اس پس ماندہ ملک کے فن کاروں کو بھٹکتے ہوئے دیکھا فارغ کی نظموں اور غزلوں کا آہنگ اس بات کا غماز ہے کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کا خاتمہ ہی ملک میں حقیقی آزادی اور خوشی کی لہر لا سکتا ہے۔ لیکن وہ حالات کی ناسازگاری اور زمانہ کی ناہمواری سے شکوہ گزار ہونے کے باوجود دل گرفتہ و دل برداشتہ نہیں ایسے مایوسی اور ناامیدی کی ظلمتوں میں بھی اجالے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملک کے مشہور نقاد ممتاز حسین فارغ کی شاعری پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "ان کی شاعری کی ابتدا ہی نغمۂ حیات سے ہوتی ہے ایک ایسا نغمہ جو فسردہ
> لے کی ہی تردید کرتا ہے اور منفی رجحانات لفی میں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ شاعری کا
> یہ جذبہ ایک شعوری کیفیت کا حامل ہے ایک سنجیدہ فکر اور سائنٹک تجربے کا مدعی
> ہے اور مجموعی اعتبار سے اپنے زمانہ کے غالب شعری رجحان کا ردعمل ہے۔"

یہی وہ دور تھا جب فارغ نے نہایت انقلاب انگیز تخلیقات پیش کیں وہ اس وقت کے حالات سے غیر مطمئن تھا اس آزادی کو بدیسی سامراج کا ایک ہتھکنڈہ تصور کرتا تھا۔ جس میں یہاں کے عوام کو فریب دینے کے لئے صرف مہرے بدلے گئے تھے۔

کرن کرن کو سیہ بدلیوں نے گھیر لیا ہے
تصورات کے دھندلے چراغو راہ دکھاؤ
عجیب ساعت ہے خرابات کے مکینوں کا قوت ملی
بھڑکتے شعلوں سے تپتے دلوں کی پیاس بجھاؤ

ایک دوسری نظم کا ایک بند دیکھئے جس میں ان کے اس نظریہ کی مکمل تائید کی گئی ہے۔

مل چکا ہے ہمیں آزادی کا پیغام مگر		انقلابات کا آغاز تو اب ہوتا ہے
اب بغاوت کے جنوں زار میں ڈھل کر ہم کو		باعث برہمی بزم طرب ہونا ہے

اسی زمانہ میں فارغ نے اپنی شاعری کی جڑیں سماجی رشتوں سے اور مضبوط کر لیں اور وہ روایتی حقیقت پسندی سے صحت مند بغاوت کا کھل کر اعلان کر کے حیات اور ارتقائے حیات کی جدوجہد میں شامل ہو گئے بقول احمد ندیم قاسمی۔

"وہ ان شاعروں میں سے نہیں جو آج تک اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکے۔

اس لئے کہ وہ اس طبقہ ہی کو نہیں پہچان سکے جس سے وہ متعلق ہیں۔ فارغ عوام میں سے ہے، وہ عوام کے لئے لکھتا ہے، اور عوام کی کامرانی و حکمرانی ہی اس کا منتہائے فن ہے۔ فن کی جمالیاتی قدروں کو بھی اس نے سماج کی حرکت اور محنت کشوں کی جدّوجہد سے مربوط کر دیا ہے۔ اس لئے اس کے کلام میں صفائی، سلاست اور ایسی روانی ہے جس سے انفرادیت پرست اور ماورائیت پسند شعراء ہمیشہ محروم رہے ہیں۔"

عوام کے دکھ درد کا شدید احساس فارغ کے ہاں ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باعث زیادہ نمایاں ہو گیا ہے، جیسا کہ میں نے لکھا ہے۔ فارغ کی شاعری ان نظریات کے تحت پروان چڑھی جنہیں ہم ترقی پسندی کا نام دیتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں یک رنگی اور یکسانیت نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک سے فارغ نے یہ بات سیکھی ہے کہ ادب زندگی سے ماورا کوئی چیز نہیں اور ایک ادیب کے لئے زندگی اپنے رنگ میں بجائے خود ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس لئے فارغ کی شاعری میں زندگی اور فن کا ایک ایسا خوش گوار توازن برقرار ہے جس کے باعث ایک کو دوسرے پر قربان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ خصوصاً ابتدائی جذباتی دور کے بعد ان کی شاعری جس موڑ پر پہونچی ہے وہ صحیح معنوں میں معتبر شاعری کی منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس میں اسلوب کی جدّت بھی ہے تاثر کی شدت بھی اور جذبات کی گرمی بھی ؎

کسی سے بھی غمِ حالات کا گلہ ہی نہیں
سب آشنا ہیں کوئی غیر اب رہا ہی نہیں
کوئی مَرے بھی تو موسم کی کس ادا پہ مَرے
گھِرا ابر نہیں سَر پھری ہوا ہی نہیں

فقیہہ وقت بھی، قاتل بھی، شہر یار بھی تم
غریب شہر کہاں جائے داد خواہی کو

فارغ کی موجودہ شاعری میں جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے اس کی تلخ نوائی نے اس کی شخصیت، ذہنی بلوغت اور فنی شعور کے زیرِ اثر ایک اثر انگیز اور خوش گوار نغمے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس نغمے کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی رجائیت اور حوصلہ مندی ہے۔ یہ چیزیں فارغ کو زندگی سے براہِ راست ملی ہیں، کیونکہ وہ زندگی سے دست و گریباں رہے ہیں انہوں نے فکرِ معاش اور یادِ رفتگاں کی صبر آزما منزلیں طے کی ہیں۔ غمِ روزگار اور غمِ یار کے زخم کھائے ہیں۔ جینے کی لگن میں موت کی خوفناک و خطرناک گھاٹیوں سے گذرے ہیں۔ جنسی و معاشی مسائل کی کڑی دھوپ میں تپتے رہے ہیں۔ انہوں نے زندگی کو دور سے ایک خاموش تماشائی کی طرح نہیں دیکھا بلکہ اس کے زخم اپنے سینے پر سہے ہیں۔

فارغ کی اس دور کی نظمیں بھی انسانی اقدار کی حامل ہیں، سابقہ گھن گرج کی جگہ ان میں وہ نرم و نازک اور کومل لہجہ لوٹ آیا ہے اور ان میں ایسی پہلوداری و معنویت آگئی ہے جو ایک عمر کی فنی ریاضت کے بعد ہی میسر آسکتی ہے۔ دستک، تعارف، کاکل جاں، دردِ نارسائی، منزلِ جاں، روگ، جمود، ہم اپنے ہی قاتل تو نہیں، میں سورج کے دیوتا سے کہیں بڑا ہوں،

جنگل اور خزاں کے نام پر" اس سلسلہ کی ان کی مشہور نظمیں ہیں جو ملک کے بلندپایہ جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہو کر خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں

تیری بے لوث تمنا سے تو انکار نہیں
عاشقی عزت و ناموس کی دیوار نہیں
اپنی ہی آگ میں جلنا کوئی ایثار نہیں　　(منصب)

جب غبار ذہنوں پہ چھایا تو درد جاگ اُٹھا
اندھیرا اُبھرا ہوا، کائنات بھری ہوئی
ابھر کے جسموں نے اک دوسرے کو پہچانا　　(تعارف)

سہمی سہمی غم کی بے آواز دستک
کونے کھدرے میں دلی خواہش کی ہے آئینہ دار
یہ سکوں آمیز پر تسکین جذبہ
آج بھی اے کاش ہو جائے
اسی بے اعتنائی کا شکار
لُٹ نہ جائے یہ بہار
بجھ نہ جائے یہ شرار　　(دستک)

یہ حادثہ ہے اس حادثے کا مگر مجھے کوئی غم نہیں ہے
ستم ہے لیکن مرے لئے یہ کوئی انوکھا ستم نہیں ہے
(میں سورج کے دیوتا سے کہیں بڑا ہوں)

موضوع کی رنگا رنگی نے فارغ کی نظم و غزل دونوں کو جمال بخشا ہے۔ لہجے کی دوشیزگی، آواز کی ندرت اور تغزل نے متنوع اور منفرد کر دیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں اتنی بات کہنے کی اُمنگ ہے

دیوار پھاند کر نہ یہاں آئے گا کوئی
رہنے دو زخم دل کا دریچہ کھلا ہوا

یوں تری بزم سے دُور اجڑے ہوئے بیٹھے ہیں
جیسے روٹھیں گے تو آئے گا منانے کوئی

اب کسی موسم کی بے رحمی کا کوئی غم نہیں
ہم نے آنکھوں میں سجالی ہیں تری انگڑائیاں

فلاکت کا شکار ہے، اور اُس نے غالباً اسی رعایت سے اپنے اشعار میں نشتر بھر دیئے ہیں ؂

دھواں تک بھی نہیں دیکھا کسی نے ـــــ یہ ہم کس آگ میں جلتے رہے ہیں

اپنی ویرانی پہ دل یوں شاد ہوا ـــــ جیسے کوئی دشمنِ جاں برباد ہوا

فارغ جس طرح حقائق حیات کو محسوس کرتا ہے اسی طرح پوری سچائی، دیانت داری اور خلوص سے انہیں بیان کر دیتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی کسی بھی خرابی یا بدعنوانی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی جرأت اس کے فنی طریقۂ اظہار کی نشاندہی کرتی ہے ؂

بے تیشۂ اظہار نہ چل راہِ وفا میں ـــــ ہر جادہ ہے سیبِ مہر رعایات کا ٹیلہ

دیکھو اہلِ چمن اپنی عقیدت کا مآل ـــــ باغباں کو یہ ہوس ہے کہ خدا ہو جائے

فارغ کے لب و لہجہ میں خیال کی رعنائی اور فکر کی تمکنت ہے۔ تخیل کی مینا کاری اور الفاظ کا رس ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کا درد ہے گرمی ہے۔ روشنی ہے اور خوفناک حقیقت پسندی ہے ؂

اتنا بھی کون ہو گا ہلاکِ فریبِ رنگ ـــــ شب اس نے مے جو پی ہے تو مجھ کو نشہ ہوا

کبھی جو چھیڑ دیا نقرئی بدن کا رباب ـــــ تو سر بسر تھے وہ نغمات میں نہائے ہوئے

ہم فارغ بخاری کی شاعری کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس میں مستقبل کی زندگی کا یقین ہے، فارغ کی آواز شاعروں کے اتنے بڑے ہجوم میں ہی پہچانی جا سکتی ہے ؂

غبارِ ظلمتِ شب ہے حنائے پائے سحر ـــــ چمن میں نقدِ تبسم کی قحط سالی ہے

باہر چلو اُٹھائیں ذرا بھیگنے کا لطف ـــــ کب تک چھپے رہیں گے یونہی سائبان میں

اُداسیوں میں گلے سے لگا لیا فارغ ـــــ کسی کی یاد نے اک دردِ آشنا کی طرح

یہ اشعار جیسا کہ اُن کے معنی سے ظاہر ہے مہذب اور باشعور ذہن کی تخلیق ہیں۔ یہ اشعار جذبات و احساسات کے نئے زاویوں کو پیش کرتے ہیں۔ خارجی حسن، معاملہ بندی، لذت اور تعیش سے بیگانہ یہ نیازِ عشق کی مختلف منزلوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ فارغ کا کلام پڑھ کر ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے جیسے کوئی تازہ فضا اور خوشگوار ماحول میں سانس لے۔ میں نے اس سے روشنی اور توانائی حاصل کی ہے۔

فارغ کی شاعری میں تنوع ہے۔ اس نے مختلف النوع موضوعات کو اپنے مزاج کا جزو بنا کر ان میں زندگی بھر دی ہے۔ وہ فارغ کے ہاں انسانی زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں کی کسک کا احساس اس کیفیت کے ساتھ شامل ہے جو حرکت و حیات سے عبارت ہے وہ تھک کر بیٹھ جانے یا شکستوں پر ماتم کرنے کا قائل نہیں اس میں عزم اور بلند حوصلگی ہے، جرأت اور ولولہ ہے انہیں سے فارغ کا شعری سرمایہ معتبر سے اور معتبر بنتا جا رہا ہے۔

بھڑک اُٹھے تو حرارت بھی روشنی بھی ہیں
سلگ رہے ہیں تو احساس کا دھواں ہیں ہم


نظم

فیض

علامہ عبدالحق

سید فیضی

سلیم احمد

انجم اعظمی

سحر انصاری

انور معظم

صلاح الدین محمود

محسن بھوپالی

فیض احمد فیض

سوچنے دو!

اک ذرا سوچنے دو
اس خیاباں میں جو اس لحظہ بیاباں بھی نہیں
کون سی شاخ میں پھول آئے تھے سب سے پہلے
کون بے رنگ ہوئی درد و تعب سے پہلے
اور اب سے پہلے
کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں
خون کا قحط پڑا
گل کی شہ رگ پہ کڑا
وقت پڑا

سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو

یہ بھرا شہر جو اب وادیٔ ویراں بھی نہیں

اس میں کس وقت کہاں

آگ لگی تھی پہلے

اس کے صف بستہ دریچوں میں سے کس میں اوّل

زہ ہوئی سرخ شعاعوں کی کماں

کس جگہ جوت جگی تھی پہلے

سوچنے دو

ہم سے اس دیس کا تم نام و نشاں پوچھتے ہو

جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے

اور یاد آئے تو محبوبِ گزشتہ کی طرح

روبرو آنے سے جی گھبرائے

ہاں مگر جب کوئی

ایسے محبوب کا دل رکھنے کو

آنکلتا ہے کبھی رات بتانے کے لئے

ہم اب اس عمر کو آ پہنچے ہیں جب ہم بھی یونہی

دل سے مل آتے ہیں بس رسم نبھانے کے لئے

دل کی کیا پوچھتے ہو

سوچنے دو

فیض

۱۰ جنوری ۷۶ء

عارف عبدالمتین

حلقۂ صد کامِ نہنگ

"ابو دیکھو کالے کالے بادل آئے!"
"دیکھو ابو — رم جھم رم جھم بارش آئی!"

"عمر گذری ہے مجھے دیکھتے، شب رنگ گھنیرے بادل،
میری ہستی کے مہ و سال ہیں بارش کی جلاجل کے اسیر،
جب بھی اٹھتی ہے گھٹا، دل میں اٹھا سیلِ تمنائے خرام،
جب بھی برکھا کی ترل رل سنی، بیدار ہوا روح میں نغموں کا ہجوم،
میں بھی افلاک سے اترے ہوئے طوفانِ مسرت میں کبھی
ایک تنکے کی طرح یونہی بہا کرتا تھا،
ابرو باراں کی خبر میں بھی دیا کرتا تھا،
اپنے ابو کو کچھ اس طرح کہ گویا ڈر ہو،
میں رہا چپ تو دبے پاؤں گذر جائے گی یہ روپ لٹاتی ہوئی رت،
اور رہ جائیں گے محرومِ نظارہ مرے پیارے ابو!"

"ابو دیکھو — آنگن میں پانی لہرایا،
اتنا پانی — اتنا پانی کوئی سمجھے گھر میں اک دریا چڑھ آیا!"

"ہم بہن بھائی بھی بارش کے رواں پانی کو،
اپنے آنگن میں یونہی روک دیا کرتے تھے،
اور کتنے ہی بپھرتے ہوئے دریاؤں کو
گھر کی دیواروں سے ٹکراتے ہوئے دیکھ لیا کرتے تھے،
کس بلاخیز تصور سے فروزاں تھا مرا ذہن کہ جب،
سوچتا ہوں تو آئینۂ حیرت بن جاؤں!"

"ابو دیکھو — ناؤ ہماری تیر رہی ہے پانی پر،
ناچ رہی ہے لہروں پر!"
"ابو ہم سب بھاگ رہے ہیں اپنی اپنی ناؤ کے ساتھ،
دیکھو کتنے چاؤ کے ساتھ!"
"ابو! ڈوب گئی ہے میری ناؤ
یہ لو کاغذ — جلدی سے اک اور بناؤ!"
"نئی نویلی ناؤ چلی ہے، دیکھو کیسی آن کے ساتھ،
بھاگ رہا ہوں میں بھی اس کے ساتھ ساتھ —
کس شان کے ساتھ!"

"میں نے بھی کھیلے ہیں بچپن میں کئی ناؤ کے کھیل،
کاغذی ناؤ کو پانی میں بہا کر اکثر،
سینہ تانے ہوئے بھاگا ہوں میں اُس کے ہمراہ،
میری ناؤ بھی کئی بار یونہی ڈوب گئی،
اور میں کھیل کے نشے میں مگن، وجد میں لہراتا ہوا،

اپنے ابو کی طرف لپکا، تو اک ناؤ نئی لے آیا،
جس کو آنگن کے سمندر میں بہا کر میں نے،
مسکراتے ہوئے پھر کشتی و امواج کے بازیچے کا آغاز کیا!

"آج بھی کھیل رہا ہوں میں وہی کشتیؑ و امواج کا کھیل،
آج لیکن میں کسی ناؤ کے ہمراہ نہیں بھاگتا ہوں،
اس میں بیٹھا ہوا کھیتا ہوں اُسے،
'دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ'،
اس سے بچتا بھی ہوں اور اس سے اُلجھتا بھی ہوں،
مجھ کو معلوم ہے یہ ناؤ اگر لقمۂ گرداب بنی،
مجھ کو بھی پانی کی سیّال لحد ہی میں اُترنا ہوگا،
پھر بھی ہونٹوں پہ مرے رقص کناں ہے وہ تبسّم جس سے
کاغذی ناؤ کا ہر کھیل ہوا کرتا تھا،
میری بے خوف مسرّت کا نقیب!

"آرزومند ہوں جب میرے یہ پیارے بچّے،
بحرِ ہستی میں سفینہ کو بہاتے نکلیں،
بادبانوں کو ہواؤں میں اُڑاتے گذریں،
کف اڑاتی ہوئی موجوں سے مسلسل اُلجھیں،
ان کے ہونٹوں پہ بھی لہراتی رہے ایسے تبسّم کی چمک،
سحر بے باکیٔ اظہار میں ڈھل کر جس نے
آج اِن چہروں کو کتنا رعنا رکھا ہے!"

سید فیضی

سایوں کی لکیر

وقت کا بوڑھا مسافر کب سے
راہ بے راہ گزرتا ہی چلا جاتا ہے
اور گزرتے ہوئے ہر لمحے میں
کوئی اَن جان چبھن ——— میرا کلیجہ چھلنی
کوئی بے نام جلن ——— میرا جگر پھنکتا ہے
کوئی موہوم شکن ——— میری جبیں کے اوپر
چھوڑ کر گردشِ ایام گئی ہتی جس جا
تیری باہوں نے وہیں تھام لیا تھا مجھ کو

زندگی شرط ہے، ان لمحوں میں
کبھی سورج کی حسیں کرنوں سے
دھوپ بھی پڑتی ہے اور سائے بھی لہراتے ہیں

تُو میرے دیدۂ پرشوق کا آئینہ ہے
میں ترا عکس ہوں اور کچھ بھی نہیں
شام و سحر کی تصویر
ایک سایوں کی لکیر
چاند اُبھرے تو یہی چاندنی بن کر لہرائیں
اور سورج کا عمل ہو تو اجالا بن جائیں

قمر ہاشمی

لغزشوں کے دائرے

ہر طرف سڑکوں کا سینہ شق
سیہ مٹی کے تودے راستہ روکے ہوئے
خامشی کے بھوت
اندھیروں کی تہوں میں ناچتے
نیم عریاں جسم ملبوسات کی تہمت اٹھائے
راستے کی ٹمٹماتی روشنی کے سائے میں
کچھ کاروباری عہد و پیماں
جاز کی ہلکی دھنوں میں دلفریبی کی کھنک
اک گلی کے موڑ پر پائے سفر آشام بھی آہو خرام
مے گساری کا تکدر۔ لغزشوں کے دائرے
دھرتی کی رفتار کی مانند اک بے ربط رخی چال
آدھی رات تک خاموش گلیوں کا طواف
کچھ دریدہ جھگیاں سوئے ہوئے ماحول کے دریا میں غرق
نیند سے بوجھل پپوٹوں کے لئے
سازِ نفس بھی طبلِ جنگ
سیٹیوں کی دور تک پھیلی صداؤں سے ہے
سناٹوں کا آنچل تار تار
ٹیکسیاں، رکشے، بسیں
ہر چیز خوابوں کے سمندر میں ہے غلطاں
شہر کی گردن میں تاریکی کی بانہیں
بار کا بدمست چوکیدار
خالی بوتلوں کے ساتھ محو خواب ہے

انجم اعظمی

مٹی کی مہک

میں خوابوں کا دیوانہ تھا، —
تم کوئی نہ تھیں،
میں کچھ بھی نہ تھا
خوابوں میں ملے اور خواب رہے
میں نے ہی تراشا، میں نے ہی
توڑا بھی اسے
پتھر کی وہ مورت ٹوٹ گئی

مورت ٹوٹی تو پاس چلا آیا کوئی
سیدھا سادا، بھولا بھالا
اور کتنے ادھورے خوابوں نے
سرگوشی کی
سب میں اور تو کا جھگڑا ہے
تم خود بھی ادھورے خواب ہو،
آنے والا بھی
بھولا بھالا ہے اور ادھورا سپنا ہے
اس بھولے بھالے، گورے چہرے
— کالی آنکھوں والے سے
پیمانِ وفا باندھو کوئی
اس لمحے میں
اس سے ہی نہیں، تم خود سے بھی
جینے کا کوئی اقرار کرو

جب جسم اور جان جدا ٹھہرے —
سب خواب رہا
پھر ایک ہوئے
مٹی کی مہک پھیلی ہر سو
پوچھا دل نے کس حیرت سے
کیا وصل کی ساعت آ پہونچی
تکمیل ہوئی سب خوابوں کی!
یہ سن کے ہمارے خواب ہنسے —
سرشار ہوئے
اور تنگ ہوا آغوشِ وفا
مٹی کی مہک بڑھتی ہی گئی

انجم اعظمی

اگلا موسم

وہ دن بھی آ کر چلے گئے

جب رنگوں نے
پھولوں میں بنایا تھا مسکن
جب کلیوں نے
پت جھڑ سے بچایا تھا دامن
جب دنیا تھی روشن روشن
وہ دن بھی آ کر چلے گئے

جب خوابوں کی اک جھیل میں میرے دل کا کنول کھلا تھا
وہ جھیل کہ جس میں برسوں تیرے من کا ہنس براجا
اوپر نیلا آکاش تھا، نیچے مٹی اور کیچڑ کو
سبزے کا روپ ملا تھا
جب رم جھم رم جھم تھا ساون
جب ہریالی اور پھولوں سے
یہ دنیا تھی روشن روشن
وہ دن بھی آ کر چلے گئے

دل چپکے ہی چپکے مجھ سے
یہ پوچھ رہا ہے، لوٹ کے اب
وہ دن کیا کبھی نہ آئیں گے

انجم اعظمی

لہو سے بھی ارزاں

روزِ اول ہی جھگڑا اُٹھا تان تر کا
جو طولِ سفر میں
نشانہ بناتا رہا ہے ہمیں اپنے دورِ ستم کا
سبھی اپنے خوابوں کی تعبیر کی آرزوئیں
ہمارے دلوں میں
طوقِ حسرت پہن کر سسکتی رہی ہیں
مسرت تو کیا، ہم نے ماضی سے دادِ وفا بھی نہ پائی
ہزاروں برس تک
روایت کی رخشندگی اور خوابِ تمنا کی خاطر
حرارت لٹاتے رہے ہیں ہم اپنے لہو کی
مگر اس صدی میں
جو شے آدمی کے لہو سے بھی ارزاں ملی ہے
وہ خود آدمی ہے
کہ ارزاں ہوا ہے

مگر اور ارزاں ہو، اس کا بھی یارا نہیں ہے

سمندر کے اس پار سے
آج تک صرف یہ نانِ تر کے غلام آئے ہیں
ہمیشہ جو آئے ہیں اس سمت ترجیح دیتے ہوئے
نسلِ آدم پہ اس نانِ تر کو
پیلے اور سانولے رنگ سے ان کو نفرت رہی
کالی نسلوں کا مقتل بنی سالہا سال تک حرص ان کی
یہی تو مسیحا تھے سارے جہاں کے
مسیحا کی صورت ہی آئے ہیں ان مشرقی ساحلوں پر
جہاں خیر مقدم میں پہلے جوانوں نے ان سے کہا ہے
کہ اے نانِ تر کے غلامو!
تمہارے لئے ہم گھنے جنگلوں کو اُگاتے رہیں گے
اُنہی چار سُو تیز بارود کی بُو سے، آگ اور دھوئیں سے
ہمارے وطن کی ہر اک اجنبی شام ڈستی رہے گی تمہاری ہوس کو
تمہارے لئے جابجا دلدلیں
اپنا آغوش کھولے ہوئے وصل کی منتظر ہیں
سمندر کے اُس پار گوری حسینائیں آنسو بہاتی رہیں گی
تمہاری مسیحائی سیلِ بلا ہے تو اس سے گزر کر
ہمیں نانِ تر کا یہ جھگڑا چکانا پڑے گا

انجم اعظمی

کایا پلٹ

گوشے گوشے میں چمن کے کل تلک
موسمِ گل کی تھیں زنجیریں بہت
بارگاہِ حسن کا محرم تھا عشق
وصل کی ہوتی تھیں تدبیریں بہت
ہر شبستاں شہر کا آباد تھا
خواب تھے اور ان کی تعبیریں بہت

یک بیک سب خواب رخصت ہو گئے
بستیوں میں اب نہ چاہت ہے نہ لاگ
روشنی تھی جن کے دم سے بزم میں
بجھ گئی ہے آج ان چہروں کی آگ
سو گئے دروازے، گلیاں چپ ہوئیں
آرزوئیں راکھ بن کر اُڑ گئیں
بے حسی سے درد کا سودا ہوا
روح سے تا روح سناٹا ہوا

سحر انصاری

ریزۂ وجود

خاردار تار کا حصار
مرے وجود کا مکان ہے
جس کے گرد
آدمی کا خون پینے والی زرد جھاڑیوں کے خاردار ہات ہیں
مری زمیں کے گرد
کہکشاں کے خاردار دائروں کا رقص ہے
زمیں سے آسمان تک
وجود اپنے ان گنت حواس کا گناہ ہے
شعور و لمس و لذت و مشام کے سراب میں
میں پوچھتا ہوں سنگ میں گداز پنبہ ڈھونڈنے سے کیا ملا

یہ زندگی یہی تو ہے
کہ ریزہ ریزہ جمع کی ہوئی متاعِ زیست کو
ہوائے تند پھینک آئے دشتِ بے سواد میں

مری نظر کے سامنے
نہ جانے کتنے جسم تھے کہ ٹوٹ کر بکھر گئے
میں ایسے ہولناک تجربوں کے بعد بار بار
خود کو یوں سنبھالتا ہوں جیسے اپنے ہات سے

میں گر کے ٹوٹ جاؤں گا
مرا بدن اذیتوں کا عنوان ہے
کبھی میں برف کی سِلوں کی ہوں غذا
کبھی میں تیرگی کا رزق ہوں
کبھی مرے لئے ہیں نوکدار خنجروں کا تختِ خواب
اور آج ان اذیتوں کے درمیاں
مرا وجود جیسے مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا
میں برگِ سبز تھا جسے
خزاں کا ہات شاخِ تر سے توڑ کر چلا گیا

میں ایک سمت فلسفے کے اَن گنت نکات کی پناہ ہوں
اور ایک سمت آگہی کے جبر کی کراہ ہوں
مسابقت کے دور میں وہ ساعتیں بھی آ گئیں
کہ حُسن اور عشق میں متاع اور مشتری کا رمز جاگنے لگا
نہ عشق اتنا بے خبر
نہ حسن اتنا معتبر
کہ بے دلیل قضیۂ وفا کی داد دے سکے

یہ کائنات بے حِسی کی اک بسیط شکل ہے
نہ زندگی کا کچھ اثر
نہ موت سے کوئی خطر
اب ایسی کائنات میں
اس ایک ریزۂ وجود کے حواس کیا کریں
اب ایسے سَرد جسم کی برہنگی کو دیکھ کر
شعور و مہر و لطف کے حسیں لباس کیا کریں

انور معظم

بازیافت

برق رفتار لمحوں کی بارش میں
جب ذرّہ ذرّہ بکھرتا ہوں
اور سوچتا ہوں
تو ہر کامرانی کی بخشی ہوئی مسکراہٹ
پگھلتے ہوئے درد کا ہر عطا کردہ آنسو
مجھے ایک ہی شکل و صورت کے لگتے ہیں
میں پوچھتا ہوں
کہ اب ایک کو دوسرے سے جدا کیسے کیجئے؟
کہ ان میں سے اک
ایک لمحے کو ابھری ہوئی موج ہے
دوسرے لمحے کھو جائے گی درد کے بیکراں بحر میں
موج کو بحر سے پھر جدا کیسے کیجے؟

اور جو یوں ہے
تو پھر موج سے ایک لمحے کی پہچان کی تشنگی
کیوں نہ میں بحر کی آشنا وسعتوں میں ڈبو دوں
بحر میں پھیل جاؤں، گھل جاؤں
اور پھر تھپکتے ہوئے ساحلوں سے بدن اپنا ٹکرا کے
اپنے کو محسوس کر لوں!

صلاح الدین محمد

اندھی رات

اندھی رات سیاہی سے بھی نالاں

جانے کون

سیاہی کے مرقد میں اب بھی

جینے کی اُمید لئے ہو۔

خاموشی ۔ گہری خاموشی

پھر بھی جانے کون، کہاں پر

مستقبل کی آس لگائے

اب بھی اپنے ہونٹ سیئے ہو

اندھی رات خموشی سے بھی نالاں ۔

محسن بھوپالی

یادوں کی راکھ

شبنم برساتی آنکھوں سے
ماضی کی تصویریں مت دیکھو
تم ان کو دھندلا دھندلا پاؤ گے!

اب ایسی تحریریں مت دیکھو
جو پہلے پہل کسی نے لکھی تھیں
جو پہلے پہل کسی نے بھیجی تھیں
ان تحریروں کا اب کوئی مفہوم نہیں!

شبنم برساتی آنکھوں کو معلوم نہیں
جن لمحوں کی یہ تصویریں ہیں
جن راتوں کی یہ تحریریں ہیں
ان میں کھلتے پھول چہکتے چاند کی چاہت سب کچھ تھی
ٹیڑھے میڑھے لفظوں کے موتی کل سرمایہ تھے
یہ تحریریں ــــ یہ تصویریں روشن تھیں!

اب تو آتی جاتی سانسیں
سونے کے تاروں پر رقصاں ہیں
سکوں کی دیوار کے پیچھے
ایک اک جذبہ سسک رہا ہے
پھولوں کی مہکار کے بدلے
آج فضا بارود کی بو سے بوجھل ہے!!!

ڈرامہ، طویل افسانہ

علی عباس حسینی

میرزا ادیب

ابراہیم یوسف

حسن منظر

زکی انور

ام عمارہ

سعیدہ ضیا

علی عباس حسینی

امیر نے آبِ نیساں برسایا

ذیل کے چند سین میری غیر مطبوعہ کہانی "امیر خسرو" سے ناظرین "افکار" کے تفننِ طبع کے لئے حاضر ہیں۔ یہ اس طرح لکھی گئی ہے کہ اسے بہ آسانی ناول اور ڈرامے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ امیر خسرو مجموعۂ کمالات تھے۔ وہ حضرت نظام الدین اولیاء کے سب سے بڑے مرید و معتقد تھے۔ درویش مزاج، بذلہ سنج، لطیفہ گو، شاعرِ بے عدیل، سات شاہی درباروں کے ملک الشعراء اور اپنے عہد کے سب سے بڑے مغنی، ستار اور طبلے کے موجد، چوبیس راگ راگنیوں کے موجد، باوجود امیر کے خطاب کے وہ عوام کے آدمی تھے۔ افسوس ہے کہ ان کا ہندی کلام جو لاکھوں کی تعداد میں تھا، مدوّن نہیں کیا گیا۔ بس صرف چند دوہے اور چھپّے، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ باقی رہ گئی ہیں۔ میری کہانی اس بزرگ ہستی کی بارگاہ میں گویا نذرِ عقیدت ہے۔ (حسینی)

پہلا سین

وقت : صبح، لگ بھگ دس بجے۔
مقام : شاہی محل کا ایک کمرہ۔

شہنشاہ کیقباد جو بیمار ہے مسہری پر لیٹا ہے۔ بیس بائیس برس کا جوان۔ چہرے سے کمزوری ہی نہیں گھبراہٹ اور پریشانی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ بڑے بڑے گاؤ تکیوں پر نیم دراز ہے۔

ستر برس کا بوڑھا جلال الدین فیروز خلجی پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔
اس کے پیچھے اس کا بیٹا ارکلیک خاں جس کے چہرے سے خونخواری اور عیش پرستی ٹپکتی ہے، اور
اس کا بھتیجا اور داماد علاء الدین خلجی، جس کے چہرے سے سنجیدگی و متانت ظاہر ہے، آنکھیں
بلا کی تیز اور عقابی ہیں۔ دونوں کھڑے ہیں۔
مسہری کے سامنے قالین پر محمد شہ، مہرافروز، نائک گوپال اور ان کے کچھ چیلے بیٹھے ہیں۔ کچھ اور
درباری ہاتھ باندھے شہنشاہ سے دور ایک قطار سے کھڑے ہیں)۔

حاجب : (آواز لگاتا ہے) حضرت یمین الدولہ، ملک الشعراء، امیر ابوالحسن خسرو حاضر ہوتے ہیں!
(سارے درباری تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خسرو داخل ہوتے ہیں)

نائک گوپال :۔ ارے یہ تو وہی فقیر ہے!

مہرافروز : (دانتوں سے انگلی دبا کر) اسے میں نام بتانے پر بھی نہ پہچان سکی!
(خسرو بادشاہ کے سلام کے لئے جھکتے ہیں)

کیقباد : بڑا انتظار کرایا خسرو۔

خسرو : جہاں پناہ! قرآن السعدین جیسا جواہر پارہ بھی تو نذر کے لئے ساتھ لانا تھا۔
(وہ گھٹنہ ٹیک کر کتاب دونوں ہاتھوں پر رکھ کر کیقباد کو پیش کرتے ہیں)

کیقباد : (کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر جگہ جگہ سے دیکھتے ہوئے) ہم اسے پھر دیکھیں گے۔ فی الحال تو ہم
آپ تینوں باکمال مغنیوں کا گانا سنیں گے!

خسرو : جہاں پناہ! میں اس قابل نہیں کہ ان استادانِ فن کے ساتھ ساتھ میرا نام بھی لیا جائے!

کیقباد : مابدولت واقبال تمہارے مقام سے واقف ہیں، امیر خسرو! ہم جانتے ہیں کہ تم نے ستار
ایجاد کیا ہے اور چوبیس کے قریب راگ راگنیاں۔ تم نے ایران و توران و عرب و ہندوستان
کی موسیقی کو یکجا کرنے میں کمال کیا ہے!

خسرو : جہاں پناہ کا دلِ آگاہ اور وصفِ بندہ پروری ذرّے کو آفتاب بنا رہا ہے۔

کیقباد : اچھا، اچھا، اب تم بیٹھو امیر! ہاں محمد شہ:

خسرو : (ہاتھ جوڑ کر) جان کی امان جہاں پناہ!

کیقباد : کہو کیا بات ہے؟

خسرو : میں ان استادوں کے بعد گانے کی بدتہذیبی نہیں کر سکتا۔ مجھے ان سے پہلے ہی اجازت
دی جائے!

کیقباد : دی گئی!
(امیر خسرو بیٹھ کر ستار کے تار ٹھیک کرتے ہیں اور پھر اپنا گانا "قول" سناتے ہیں۔

(اللّٰهم تُبتُ مِن قَولِ المَعَاصِی)[1]

(اللہ کا نام باللہ!

اللہ کا ....

در قوم تنا، در قوم قوم قوم تنا، نا، تنا، تا، نا، تا

در تا لالے نا، لالالے در تا، در تلے، تا نوم

تا نوم تنا در قوم، تنا، نا، نا، در قوم، قوم نا، تنا

نا، نا، الٰہی قبت ......)

نائک گوپال: (خسرو کی پیٹھ ٹھونک کر اپنی شال انہیں اڑھاتے ہوئے) تم واستو میں ہم سب سے بڑے نائک ہوا میر خسرو!

(کیقباد کچھ کہنا چاہتا ہے کہ یکایک ایک شور سنائی دیتا ہے)

شور: دُہائی ہے! دُہائی ہے، اَن داتا کی دُہائی ہے!

کیقباد: (جلال الدین خلجی سے) وزیر اعظم! یہ کاہے کی دہائی ہے۔ ان کی درد بھری فریاد سے ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ جلدی جاؤ! دیکھو انہیں کیا دکھ پہونچا ہے۔ اس کا مداوا کئے بغیر ہم پر خواب و خور حرام ہو جائے گا! جاؤ، پتہ لگاؤ، جلدی کرو!

جلال الدین: بسر و چشم جہاں پناہ!

(وہ چلا جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ارکلیک اور علاء الدین بھی جاتے ہیں۔ نائک گوپال کے چیلوں میں سے ایک اکتارہ بجانے لگتا ہے)

کیقباد: (ہاتھ کے اشارے سے روک کر) بند کرو! — میرے دل کے تار ان کے نالے سے اب تک جھنجھنا رہے ہیں۔ اس وقت اس آواز کے آگے ہر چیز بے سُری ہے!

دوسرا سین

وقت: وہی۔

مقام: قلعہ کی دیوار۔

(جلال الدین، علاء الدین اور ارکلیک قلعہ کی دیوار کے نیچے جھانک رہے ہیں۔ نیچے کسانوں کی بھیڑ ہے۔ ان کے ساتھ کچھ شہری بھی ہیں)

---

[1] اے میرے اللہ میں گناہگار بنانے والی بات کہنے سے توبہ کرتا ہوں۔ (یعنی بالکل سچ سچ کہتا ہوں) کہ قسم خدا سوائے تیرے کوئی اللہ نہیں ہے!

بھیڑ : دہائی ہے ! دہائی ہے : شہنشاہ کیقباد کی دہائی ہے !
علاء الدین : (ہاتھ اٹھاکر) خاموش : .....
(بھیڑ خاموش ہوجاتی ہے)
.......تمہاری فریاد کی آوازیں شہنشاہ کے مبارک کانوں تک پہونچ گئیں۔ اس رعیت پرور بادشاہ کا دل تمہارے نالوں نے ہلادیا۔ وہ جاننے کے لئے بے چین ہیں کہ تمہیں کیا تکلیف ہے۔
تمہارے ہر دل عزیز وزیر اعظم کو بھی دریافت کرنے کے لئے بھیجا ہے۔
(بھیڑ وزیر اعظم کو سلام کرنے کے لئے جھک جاتی ہے)
جلال الدین : بتاؤ، کیا تکلیف ہے ؟
ایک لیڈر : ہماری ساری فصل سوکھ رہی ہے۔ پانی نہ برسے گا تو کال پڑجائے گا۔
جلال الدین : ارے بھئی تو کنوؤں سے، نہروں سے، ندیوں سے، نالوں سے، دریاؤں سے سینچائی کرو۔
سرکاری عامل تمہاری مدد کریں گے۔
لیڈر : سرکار کنوئیں، ندیاں، نالے سب سوکھ گئے ہیں۔ بڑے بڑے دریاؤں کا پانی پایاب ہوگیا ہے۔
جلال الدین : (بڑی مایوسی سے) تو شہنشاہ کیا کرسکتے ہیں !۔۔۔ یہ تو صرف خدا ہی کے رحم و کرم کا فیضان ہے ! اسی سے مانگو !
لیڈر : اَن داتا : شہنشاہ کے دربار میں اس وقت ایران اور ہندوستان کے نائک موجود ہیں ہم نے سُن رکھا ہے کہ وہ ایسے راگ جانتے ہیں جن سے آگ بھی لگ جاتی ہے، اور پانی بھی برس جاتا ہے۔ ان کو شہنشاہ حکم دیں۔ آخر ان کا راگ کس دن کام آئے گا ؟
جلال الدین : مجھے یقین نہیں کہ کامیابی ہو! مگر میں تمہاری عرض شہنشاہ تک پہونچاتا ہوں۔ میں ان کے حکم سے ڈھنڈھورا پٹواکر اطلاع دوں گا !
(وہ ملک چھجو اور علاء الدین کے ساتھ چلا جاتا ہے)
بھیڑ : (چیخ کر) نائکوں کو حکم دیا جائے ! نائکوں کو حکم دیا جائے ! دہائی ہے ! دہائی ہے !

تیسرا سین

وقت : تقریباً گیارہ بجے۔
مقام : شاہی محل کا کمرہ۔
(کیقباد، امیر خسرو، محمد شاہ، نائک گوپال اور سارے درباری انتظار میں ہیں کہ جلال الدین، ملک چھجو اور علاء الدین داخل ہوتے ہیں)
کیقباد : بتاؤ، وزیر اعظم، کیا تکلیف ہے ہماری رعیت کو ؟ ہم کیا کرسکتے ہیں ان کے دکھ کی دوا کے

طور ہے؟

جلال الدین : جہاں پناہ! ان کی فصلیں کھڑی سوکھ رہی ہیں، اور پانی ایک بوند نہیں برستا۔ ندیاں نالے تالاب اور کنوؤں میں پانی نہیں ہے کہ ان میں سے سینچیں۔ وہ اسی کی فریاد لائے ہیں!

کیقباد : خدا کی پناہ! یہ تو قحط کے آثار ہیں! کیا کیا جائے؟ کوئی تدبیر ہے اس بلا کے ٹالنے کی؟

جلال الدین : انہیں کا کہنا ہے کہ یہاں جہاں پناہ کے دربار میں ایران، توران اور ہندوستان کے سب سے بڑے مغنی موجود ہیں۔ یہ ایسے راگ جانتے ہیں جن کے ذریعے پانی برسایا جا سکتا ہے۔ ان کو حکم دیا جائے کہ وہ اپنے کمال دکھائیں۔

کیقباد : کیا یہ ممکن ہے؟

(وہ نائک گوپال، محمد شاہ اور امیر خسرو پر نظر ڈالتا ہے)

محمد شاہ : جہاں پناہ! ایران کی راگ راگنیوں میں کوئی ایسی چیز نہیں!

نائک گوپال : ان داتا، میگھ راگ جانتا تو ادھیش ہوں، پرنتو اس کے لئے دو سپتاہ کی تپسیا رونک ہے!

کیقباد : امیر خسرو؟

خسرو : جہاں پناہ: بہت بڑی جرأت کا کام ہے اور بہت بڑا امتحان!

کیقباد : بہت بڑی بلا بھی تو ہے امیر خسرو! اب جان لڑا کر اسے کسی طرح ٹالو!

خسرو : جہاں پناہ کا جیسا حکم! لیکن اعلان کرا دیا جائے کہ ہر مسجد، ہر خانقاہ، ہر مندر، ہر مٹھ، ہر عبادت گاہ میں دعا کی جائے۔ شاید سب کا پالنے والا، سب کا رزق دینے والا ہم گنہگاروں کی بھی سن لے!

چوتھا سین

وقت : تین بجے دن۔

مقام : شہر کا چوک۔

(وہی جگہ ہے جہاں پہلے سین میں ڈگی پٹی تھی۔ اسی طرح کی بھیڑ یہاں بھی ہے)

ڈگی والا : کرم دھڑم! کرم دھڑم! کرم دھڑم! ملک اللہ کا! حکم شہنشاہ کا! دلی والو! سنو! سنو! شہنشاہ کیقباد کا حکم سنو! شہنشاہ نے ملک میں خشک سالی کا حال سن کر حکم دے دیا ہے کہ آج سے برابر بیل گاڑیوں، اونٹ گاڑیوں پر اناج اور پکا ہوا کھانا لاد کر گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے بھیجا جائے گا۔ تاکہ ان کی رعیت میں ہر ایک نئی فصل کٹنے تک پیٹ بھر کر کھائے اور کوئی شخص بھوک کی تکلیف نہ اٹھائے!

مجمع : شہنشاہ کیقباد زندہ باد! شہنشاہ کیقباد زندہ باد!

ڈگی والا : کرم دھڑم! کرم دھڑم! کرم دھڑم! ملک اللہ کا! حکم شہنشاہ کیقباد کا! ہمارے خدا ترس

بادشاہ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ آج پوری رات ہر مسجد، ہر مندر، ہر خانقاہ، ہر مٹھ اور ہر عبادت گاہ میں لوگ اکٹھا ہو کر دعا کریں کہ ہم سب کا پالنے والا ہم پر رحم کرے اور پانی برسائے۔

مجمع : ہم ضرور دعا کریں گے! ہم اوش پرارتھنا کریں گے۔ ہم ہون کریں گے۔ ہم کیرتن کریں گے!
(بھیڑ چھٹنے لگتی ہے)

ڈگی والا : کرم دھرم! کرم دھرم! کرم دھرم! ٹھہرو! ٹھہرو! پوری بات تو سن لو! شہنشاہ عالی جاہ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ کل صبح امیر خسرو پانی برسنے کے لئے میگھ راگ گائیں گے! ساری مسجدوں میں اس وقت دعائیں، سارے مندروں میں اس وقت پرارتھنا ہو!

مجمع میں سے ایک : سننے والی چیز ہوگی، امیر جو گائیں گے!

دوسرا : دیکھنے والا سماں ہوگا!

ایک قلندر : ارے ہمارے امیر گائیں گے تو پانی برس کر رہے گا!

دوسرا : ہو کے رہے گا! ہو کے رہے گا! برسے گا! ضرور برسے گا!

تیسرا : چلو، پیر کو خبر کر دیں۔ وہ بھی ساتھ ساتھ دعا کریں گے تو پانی برس کر رہے گا!

ڈگی والا : کرم دھرم! کرم دھرم! کرم دھرم! ملک اللہ کا! ......
(ڈگی والے کی آواز دور ہوتی جاتی ہے)

پانچواں سین

وقت : صبح۔

مقام : قلعہ کا صحن۔

(قلعہ کے وسیع صحن میں بھیڑ لگی ہے۔ شاہی محل کے سامنے پرے باندھے ہوئے فوجی سپاہی اور افسران شاہی کھڑے ہیں۔ بلند برآمدے میں تخت شاہی پر کیقباد بیٹھا ہے۔ جلال الدین، علاء الدین اور مختلف درباری امراء اپنی اپنی جگہ اٹل بنے کھڑے ہیں۔ پس منظر سے تکبیر اور گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ امیر خسرو ایک سفید تہمد باندھے، ایک سفید چادر لپیٹے ہاتھ میں ستار لئے بھیڑ میں سے ہو کر نکلتے ہیں، اور میدان کے بیچ میں سنگ مرمر کے اونچے چبوترے پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اپنا مشہور قلبانہ گاتے ہیں)

خسرو : مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ [1]
درتیلے، درتیلے، درمانی، ہم تم، تنانا، تنانا نارے، یلی یلی، یلا، یالے،

---

[1] میں جس کا مولا ہوں، پس علیؑ بھی اس کا مولا ہے۔ (قول رسولؐ)

مَنْ کُنْتُ ...."

دبھر وہ [illegible] ملہار میں ایک گیت گانے لگتے ہیں ......

کچھ ہی دیر میں آسمان پر بادل منڈلانے لگتے ہیں۔ بجلی چمکنے لگتی ہے۔ مندروں سے سنکھ اور مسجدوں سے اذان کی آوازیں تیز ہوتی جاتی ہیں — امیر خسرو کا جوش بڑھتا جاتا ہے —— یکایک موسلا دھار پانی برسنے لگتا ہے —— مجمع میں سے ہر ایک دوزانو ہو کر خدا کے شکر کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے —

امیر خسرو کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، اور وہ فاتحہ سماع والا قلبانہ گاتے ہیں)

خسرو: آلِ نبی صَلَّی اللّٰہُ سَلَامٌ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ [1]
فَاطِمَۃُ بِضْعَۃٌ مِنِّیْ [2]
آہو وا، بِضْعَۃٌ مِنِّیْ
قنا نُو دانی، دانی دانی، درا تلے، درا تیلے، تنت، تنت، تنت نا، درا تنے،
درا تل سے، لا، آ، آہ آ، آ، آ، آل نبی ......"

(مہرا فروز احد چھوپر، فَاطِمَۃُ بِضْعَۃٌ مِنِّیْ، سنتے ہی حال والی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ امیر خسرو کے سامنے رقص کرنا چاہتی ہیں — دھیرے دھیرے یہی حالت دوسرے سامعین کی بھی ہو جاتی ہے۔ محمد شاہ، نائک گوپال اور ان کے چیلے امیر خسرو کے ساتھ آ کر گانے لگتے ہیں اور میدان میں کھڑا سارا مجمع ناچنے اور گانے لگتا ہے — آخر میں خسرو تھک کر سجدۂ شکر میں گر پڑتے ہیں۔

چھٹا سین

وقت — دن۔

مقام: شاہی محل کا بلند برآمدہ۔

(کیقباد، جلال الدین، علاء الدین اور دوسرے درباری سوائے ارکلی کے سب اس منظر سے حد درجہ متاثر نظر آتے ہیں۔ مجمع اچھلتا، کودتا، خوشیاں مناتا، کپڑے اچھالتا، قلعے کے پھاٹک سے باہر نکل جاتا ہے۔

مہرا فروز، محمد شاہ، نائک گوپال برآمدے کی طرف واپس آتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن امیر خسرو

---

[1] نبی کی آل جن پر اللہ نے صلوٰۃ بھیجی، اس پر اور اس کی آل پر سلام ہو۔

[2] فاطمہ میرے ہی گوشت کا ٹکڑا ہے۔ (قولِ رسول)

اسی طرح برستے پانی میں سجدے میں پڑے رہو۔ بالآخر بجلی چمکتی ہے اور ان کے جسم اور چہرے کو چمکا دیتی ہے)

کیقباد : (آنکھ سے آنسو پونچھتے ہوئے، امیر خسرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علاء الدین سے کہتا ہے)۔
امیر کو اٹھاؤ!
(پھر درباریوں سے مخاطب ہو کر)
تم لوگ جا کر انہیں اپنے کندھوں پہ اٹھا کر لاؤ۔
(علاء الدین اور دوسرے کئی درباری حکم بجا لانے کے لئے بڑھتے ہیں اور اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر شہنشاہ کے سامنے جھکتے ہیں)

درباری : حکم شاہی سر آنکھوں پر!
(جلال الدین انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک کر آگے بڑھتا ہے)

جلال الدین : جہاں پناہ!

کیقباد : کیا بات ہے وزیر اعظم؟

جلال الدین : ظل اللہ! امیر کو ان کی حالت پر چھوڑ دینا ہی مناسب ہے!

کیقباد : کیوں؟

جلال الدین : وہ اس وقت ایسی بلندی پر ہیں کہ انسانی ہاتھ ان تک نہیں پہونچ سکتے!
(اچانک زور کی بجلی چمکتی ہے اور ایسا تڑاخا ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے قلعہ ہی میں کہیں بجلی گری)۔

جلال الدین : "یسبح الرعد بحمدہ!" [1]
(یہ کہہ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)
(امیر خسرو جیسے خواب سے چونک پڑتے ہیں، اور دستار لئے ہوئے لڑکھڑاتے چبوترے سے اترتے ہیں اور قلعے کے پھاٹک سے نکل جاتے ہیں)

---

[1] بجلی کی کڑک بھی اسی کے گن گاتی ہے۔

میرزا ادیب

شہید

(تمثیل ایک باب میں)

زمانہ :- ۶/ ستمبر ۱۹۶۶ء
مقام :- شہر قصور کی ایک نواحی بستی۔
جائے وقوعہ :- ایک دو منزلہ مکان کا نچلا کمرہ۔
وقت :- شام۔
منظر :- اسٹیج جس کمرے کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے، وہ ہمیں پہلا تاثر یہ دیتا ہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی بھارتی بمباری سے یہ مکان جس کا یہ کمرہ ایک حصہ ہے، کافی حد تک متاثر ہو چکا ہے۔ اور اب گھر والے اس کی آرائش و تہذیب کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

کردار :-
* رضیہ
* ماں
* باپ
* شاداں
○ اور
* ایک سایہ

کمرے کا سامان کسی ترتیب سے نہیں رکھا گیا۔ دیواروں میں کچھ دراڑیں دکھائی دے رہی ہیں — سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ ہے جس کا ایک پٹ کھلا ہے۔ اس پٹ میں سے اوپر جانے والی سیڑھیاں نظر آ رہی ہیں۔

دوسرا دروازہ دائیں دیوار میں ہے جس کے آگے صحن ہے۔ باہر اندر آنے کے لئے یہی دروازہ استعمال ہوتا ہے۔

کمرے کے درمیانی حصے میں ایک میز۔ اس پر پھولوں سے یکسر محروم دو گلدان۔ چائے کی ٹرے، چند خالی پیالیاں، ایک پلیٹ۔ پلیٹ پر روٹی کے کچھ ٹکڑے۔ ان کے علاوہ جا و بیجا کم و بیش ایک فٹ اونچی اور ایک فٹ سے کچھ کم چوڑی تصویر۔ تصویر کے رنگین فریم کے اوپر ایک سنہری ہار۔ یہ ہار فریم کے اوپر سے ہوتا ہوا میز پر پھیلا ہوا ہے۔

اِدھر اُدھر چار کرسیاں۔ ایک صوفہ سیٹ، صوفوں پر میلے کپڑے، کتابیں اور اخبارات، کونے کے بلب روشن ہیں۔

پردہ اٹھنے پر ہم رضیہ کو دیکھتے ہیں۔ جو میز کے پاس ایک کرسی پر اس انداز سے بیٹھی ہے کہ اس کا منہ میز کے سرے پر جھکا ہوا ہے۔ اور بازوؤں سے سر اور چہرے کو اپنے حلقے میں لے رکھا ہے۔ اس کا جسم مسلسل کانپ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سسکیاں بھر رہی ہے۔

صحن والے کمرے سے ماں آتی ہے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ۔ چہرہ اُداس اور ستا ہوا۔ لباس شلوار، قمیص اور دوپٹہ۔

وہ بیٹی پر نظریں جمائے آگے بڑھتی ہے۔ اُس کے پاس آتی ہے اور جھک کر آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔

رضیہ کی کپکپاہٹ بڑھ جاتی ہے۔

ماں : رجو! ـــ نہ بیٹی! نہ!

رضیہ : (سر اٹھائے بغیر) ام ـــ می ـــ ی!

ماں : اٹھو ـــ رجو! اٹھو نا بی بی رانی!

(ماں اُس کے دائیں بازو پر ہاتھ رکھ دیتی ہے)

شاباش! اٹھ بیٹھو!

(رضیہ اٹھنے لگتی ہے۔ بسکیاں ابھی تک بھر رہی ہے۔ رخسار آنسوؤں سے تر معلوم ہوتے ہیں آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ وہ اُٹھ کر نگاہیں جھکائے کھڑی ہے۔

ماں شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔

رضیہ کی عمر دس برس سے زیادہ نہیں ہے۔ لباس وہی جو ماں کا ہے۔ ایک لمحے کے لئے سر اٹھا کر ماں کو دیکھتی ہے اور پھر بے اختیاری کے عالم میں دائیں ہاتھ سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے۔ اور ایک قدم اور ماں کے قریب ہو جاتی ہے۔

ماں اِسے خود سے لپٹا لیتی ہے)

ماں : رجو! چپ بیٹی چپ!

رضیہ : (ماں سے الگ ہوتے ہوئے) امی :

ماں : جاؤ بیٹی! منہ ہاتھ دھولو!

(رضیہ صحن والے کمرے کی طرف جانے لگتی ہے۔ ماں اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے۔ جب وہ

دروازے میں سے گزر جاتی ہے، تو تصویر کو دیکھتی ہے۔ ایک آہ بھرتی ہے اور ٹرے میں پلیٹ اور خالی پیالیاں رکھنے لگتی ہے۔

صحن والے دروازے میں باپ آتا ہے۔

اُدھیڑ عمر کا آدمی، کمر کسی قدر جھکی ہوئی، چھدری داڑھی، آنکھوں پر عینک، ہاتھ میں چھڑی، پاجامے، کرتے اور واسکٹ میں ملبوس۔ دائیں شانے پر ایک پیلے رنگ کا پٹکا، چہرہ افسردہ مگر معلوم ہوتا ہے اپنی افسردگی پر قابو پانے کا ڈھنگ جانتا ہے۔

ماں اپنے کام میں مصروف ہے)

باپ : فاطمہ!

(ماں ٹرے وہیں میز پر رکھ دیتی ہے۔ اور شوہر کو دیکھتی ہے)

ماں : آپ کہاں چلے گئے تھے؟

باپ : یہیں تھا — رجو کہاں گئی!

ماں : میں آئی تو میز پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔

باپ : بچی ہے نا صبر آتے آتے آئے گا!

ماں : اور آج کے دن تو زخم ہرے ہو گئے ہیں — ہم سب کے!

باپ : آج کے دن .... (فقرہ مکمل نہیں ہے) اور اب کہاں ہے؟

ماں : میں نے کہا تھا: خود کو سنبھالو۔ منہ دھونے غسل خانے میں گئی ہے!

باپ : صبر کی تلقین کرو اسے۔

ماں : صبر کی تلقین! — کس طرح کروں؟

باپ : یہ ہار کس نے ڈالا ہے؟

(باپ آگے بڑھ کر چھڑی میز پر رکھ دیتا ہے۔ اور تصویر پر نظر ڈالتا ہے)۔

ماں : رجو نے — بھائی کے گلے میں تو نہ ڈال سکی۔ اس کی تصویر....

(ماں فقرہ مکمل نہیں کر پاتی۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگتی ہے)

باپ : اللہ کو یہی منظور تھا۔ اور فاطمہ!

ماں : جی؟

باپ :- یہ سعادت دنیا میں بڑے خوش قسمت ہی کے حصے میں آتی ہے۔ شہادت کو تم کیا سمجھتی ہو؟ وطن کی خاطر جان دینا۔ یہ شرف ہر ایک کو کب ملتا ہے؟

ماں : اچھا، اللہ ہمیں صبر دے! میں نے کہا رجو کے ابا!

(ماں سر اٹھا کر شوہر کو دیکھتی ہے)

باپ : کہو۔

ماں : تصویر اٹھا کر کہیں چھپا نہ دوں ؟

(ماں شوہر کے جواب کا انتظار کئے بغیر تصویر اٹھانے لگتی ہے۔ دروازے پر رضیہ آتی ہے)

رضیہ : امی!

(ماں شوہر کو دیکھتی ہے۔ جیسے پوچھ رہی ہے کہ تصویر لے جاؤں یا یہیں رہنے دوں)

باپ : (ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) رہنے دو۔

(ماں تصویر وہیں رکھ دیتی ہے۔ رضیہ آگے آتی ہے اور ہار کی ترتیب درست کرنے لگتی ہے ۔۔ ماں اور باپ ۔ دونوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں)

باپ : بیٹھو بیٹی!

رضیہ : جی اباجان!

(رضیہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہار کا جائزہ لینے لگتی ہے)

باپ : تم نے پرسوں ترسوں کہا تھا مجھ سے کہ واپسی پر تمہارے لئے ٹافیاں لیتا آؤں ! مجھے یاد ہی نہیں رہی یہ بات! چلو اب لے آئیں، جو ٹافیاں اچھی لگیں لے لینا۔ ٹھیک ہے نا!

(رضیہ نفی میں سر ہلاتی ہے)

ماں : کیوں رجو!

باپ : تم نے خود ہی تو ٹافیوں کے لئے کہا تھا۔

ماں : جاؤ بیٹی۔

رضیہ : نہ امی!

ماں : مگر کیوں؟

رضیہ : جی نہیں چاہتا۔

باپ : چلو تو سہی۔ بڑی دکان پر چلیں گے۔ وہاں بہت سی نئی چیزیں آئی ہوئی ہیں۔

(باپ دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ رضیہ ابھی تک وہیں کھڑی ہے)

ماں : جاؤ نا رجو! تمہارے اباجی کہہ رہے ہیں۔ کیا ان کا کہا نہیں مانو گی؟

(رضیہ دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگتی ہے۔ دونوں دروازے میں سے نکل جاتے ہیں۔

ماں تصویر کو دیکھتی ہے۔ اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلتا ہے: "میرے اللہ!"۔

وہ میز کے پاس کھڑی ہے کہ صحن والے دروازے سے آواز آتی ہے "رضیہ!" ۔۔ ماں مڑ کر دیکھتی ہے۔ اور کہتی ہے "آؤ شاداں بہن!"

دو تین لمحوں کے بعد شاداں آتی ہے۔

ماں کی ہم عمر — لباس وہی — شاداں آگے بڑھتی ہے۔ اُس کا چہرہ مسکرا رہا ہے۔ مگر جیسے ہی تصویر پر نظر پڑتی ہے اُداس سی ہو جاتی ہے)

شاداں: کیا بات ہے آج دن بھر اوپر نہیں آئیں۔ میں تو سمجھی تھی تم لوگ گھر پر ہو ہی نہیں، اتنی خاموشی!

ماں: ہم تو کہیں بھی نہیں گئے۔ یہیں رہے دن بھر!

شاداں: کوئی آواز نہیں آئی۔ نہ تمہاری نہ رضیہ کی!

ماں: کیا بتاؤں بہن!

شاداں: خیر تو ہے۔ کوئی خاص بات؟

ماں: آج جاوید کی چوبیسویں سالگرہ ہوتی۔

شاداں: چھ ستمبر کو!

ماں: یہی اُس کے پیدا ہونے کا دن ہے۔ اور یہی دن — ....

(ماں شدتِ تأثر سے خاموش ہو جاتی ہے)

شاداں: دکھ تو ہوتا ہی ہے ماں باپ کو —

(شاداں جھک کر تصویر دیکھتی ہے)

کتنا خوبصورت نوجوان تھا!

ماں: تصویر تو اس کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ تمہارا کنبہ پچھلے سال یہاں نہیں تھا۔ ورنہ تم اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتیں! اب تو چلا گیا ہمیشہ کے لئے!

شاداں: تصویر ہی کو دیکھا جا سکتا ہے!

ماں: یہی دن تھا — وہ چھٹی پر آیا ہوا تھا — صبح سے گھر میں بڑی رونق تھی۔ میری رجو نے یہاں رنگا رنگ جھنڈیاں لگا رکھی تھیں — سب عزیز ہمسائے، دوست جمع کر رکھے تھے۔ اتنی چہل پہل اتنا ہنگامہ تھا کہ لگتا تھا کسی کی شادی ہو رہی ہے — رجو کو بھائی کی سالگرہ منانے کا بڑا شوق تھا۔ کئی ماہ سے وہ اس دن کا انتظار کر رہی تھی۔ دوست احباب میرے جاوید کو تحفے دے رہے تھے۔ رجو نے ایک ایک پیسہ جمع کر کے جو ہار خریدا تھا وہ الماری میں سے نکال کر خوشی خوشی بھائی کی طرف لے جا رہی تھی کہ عین اُس وقت ....

(ماں ایک لمحے کے لئے رک جاتی ہے)

شاداں: کیا ہوا؟

ماں: دروازے پر دستک ہوئی۔ جاوید کو ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا حکم مل گیا تھا۔ حکم ملتے ہی وہ جانے لگا ہم نے روکا تو کہنے لگا: وطن نے مجھے پکارا ہے میں نہیں رک سکتا!

شاداں : اسی وقت چلا گیا۔

ماں : اسی گھڑی! اُسی لمحے! — بہن کہتی رہی بھائی جان یہ ہار تو گلے میں ڈال لو۔ مگر نہ مانا۔ بولا: واپس آ کر یہ ہار اپنے گلے میں ڈالوں گا — اور چلا گیا۔ رضو ہار ہاتھ میں لے کر گلی میں چلی۔ لیکن —

شاداں : اور وہ واپس نہ آیا۔

(ماں اس کے جواب میں منہ سے کچھ نہیں کہتی۔ صرف ایک آہ بھرتی ہے)

شاداں : میں یہی سوچتی تھی آج بات کیا ہے۔ رضیہ ہے کہاں؟

ماں : تمہارے آنے سے دو تین منٹ پہلے اپنے باپ کے ساتھ باہر گئی ہے۔

شاداں : کہاں؟

ماں : باپ مجبور کر کے لے گیا کہ آؤ تمہیں شادیانے دکھاؤں۔

شاداں : میرے یہاں کیوں نہیں بھیج دیا اُسے۔ ذرا دل بہلا لیتی اُس کا۔

ماں : میں نے تو کہا تھا مگر گھر سے باہر نکلی ہی نہیں۔ سارا دن چپ چاپ بیٹھی رہی!

شاداں : اب آئے گی تو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔

ماں : بڑی اُداس ہے۔

شاداں : اداس تو ہونا ہی ہے

(جاتے ہوئے) بھیج دینا اسے ہمارے ہاں!

ماں : اچھا۔

(شاداں صحن والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ شاداں چلی گئی ہے مگر ماں ابھی تک دروازے کو دیکھ رہی ہے — میز پر سے برتن اٹھاتی ہے۔ اس کے لیے پانی کا پیالیاں رکھنے لگتی ہے۔ رضیہ آتی ہے۔ ہاتھوں میں ایک لفافہ ہے۔ لفافہ وہ لا کر میز پر رکھ دیتی ہے)

ماں : تمہارے ابا جان کہاں ہیں؟

رضیہ : وہ اپنے کسی دوست سے باتیں کرنے لگے ہیں گلی میں۔

ماں : رضو!

رضیہ : جی!

ماں : شاداں نے تمہیں بلایا ہے۔

رضیہ : کل جاؤں گی۔

ماں : (بیٹی!) اُس نے بلایا ہے۔ اُس کی ماں کہہ کر گئی ہے کہ رضیہ کو ہمارے ہاں بھیج دینا۔

رضیہ : چلی جاؤں گی۔

سائرہ : جلدی جاؤ ــ یہ برتن صاف کر دوں ۔ صبح سے پڑے ہیں ۔
وہاں پلیٹ اور پیالیاں لے کر سیڑھیوں والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے ۔ ایک منٹ کے بعد وہ سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔
رضیہ وہیں کھڑی رہتی ہے ۔ آگے بڑھ کر تصویر کے قریب ہو جاتی ہے ۔ روشنی مدھم ہونے لگتی ہے ۔ ــ یہ روشنی اب اتنی مدھم ہو چکی ہے کہ اسٹیج پر اب جو کوئی بھی ہوگا وہ واضح طور پر نظر نہیں آئے گا ۔ صرف سایہ سا دکھائی دے گا ۔ صحن والے دروازے کی طرف سے ایک سایہ بڑھتا ہے ۔ یکایک رضیہ کی آواز اُبھرتی ہے)

رضیہ : بھائی جان آپ !
جاوید : رضیہ !
رضیہ : آپ ــ اوہ بھائی جان ! کہاں تھے آپ !
جاوید : یہاں ، وہاں ۔ جہاں تہاں ! ہر جگہ ، ہر مقام پر ! کہاں نہیں تھا میں !
رضیہ : آپ تو میدان سے لوٹے ہی نہیں تھے ۔ ابا جان کہتے تھے انھوں نے آپ کا لہو سے بھرا ہُوا جسم دیکھا تھا ــ اور بھائی جان ! آپ ــ بھائی جان آپ ہیں نا ۔
جاوید : تم دیکھ ہی نہیں رہیں مجھے !
رضیہ : ہائے ــ ہمیں آپ کا کتنا انتظار تھا ۔
جاوید : مجھے معلوم تھا میری پیاری بہن میرا انتظار کر رہی ہے ۔
رضیہ : معلوم ہے آج کون سا دن ہے ؟
جاوید : چھ ستمبر میری سالگرہ کا دن !
رضیہ : پچھلے سال اسی دن میں نے گھر کتنا سجایا تھا ۔ کتنی رونق تھی ہمارے یہاں ۔ کتنے لوگ آئے تھے اور آپ کو معلوم ہے ....
جاوید : مجھے سب کچھ معلوم ہے !
رضیہ : میں کتنا خوبصورت ہار آپ کے لئے لائی تھی بڑے بازار سے خرید کر !
جاوید : وہ ہار میں اب بھی دیکھ رہا ہوں ۔
رضیہ : دیکھ رہے ہیں نا ! ــ اپنی تصویر کے گرد ۔
جاوید : ہاں !
رضیہ : میری کتنی آرزو تھی کہ یہ ہار آپ کے گلے میں ڈالوں ــ مگر آپ چلے گئے !
جاوید : اسی لئے تو آیا ہوں ۔
رضیہ : کس لئے ؟

جاوید: وہ ہار تم اب بھی میرے گلے میں ڈال سکتی ہو!

رضیہ: اچھا!

جاوید: کیوں نہیں!

رضیہ: تو — اُتار دوں ہار!

جاوید: کیوں نہیں۔

(ہار فضا میں لہراتا ہے)

رضیہ: اوہ بھائی جان!

جاوید: اب تو خوش ہونا!

رضیہ: (ہنستے ہنستے) پسند ہے نا یہ ہار آپ کو؟

جاوید: میری رضیہ کا ہار مجھے پسند نہیں ہوگا تو اور کس کا ہوگا۔ یہ ہار تو شفق اور قوسِ قزح کو گوندھ کر بنایا گیا ہے — کتنا پیارا — کتنا خوب صورت ہار ہے۔

رضیہ: میں نے بیسیوں ہاروں میں اسے پسند کیا تھا۔

جاوید: تم جو ہار بھی لے آتیں مجھے بے حد پسند آتا!

رضیہ: بھائی جان!

جاوید: ہاں رضیہ!

رضیہ: آپ دروازے کی طرف کیوں دیکھ رہے ہیں؟

جاوید: مجھے جانا ہے۔

رضیہ: نہیں بھائی جان!

جاوید: دیکھو میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی اب مجھے جانا چاہیئے۔

رضیہ: آپ کیوں جائیں گے!

جاوید: کیونکہ مجھے جانا ہے — اور جانا کہاں ہے: پہلے کی طرح یہیں رہوں گا۔ تمہارے آس پاس، صبح کی روشنی میں — دوپہر کی دھوپ میں — رات کے اندھیروں میں ہر وقت تمہارے قریب — تم مجھے نہیں دیکھ سکتیں مگر میں تمہیں دیکھا کرتا ہوں۔ صبح سویرے جاگتے ہوئے، اسکول جاتے ہوئے — گھر لوٹتے ہوئے — ابا جان امی سے باتیں کرتے ہوئے، سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے — سنا رضیہ۔

رضیہ: بھائی جان نہ جائیں آپ — نہ جائیں!

(سایہ پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ دوسرا سایہ اس کی طرف بڑھتا ہے)

(بھائی جان کہتی ہوئی آواز بلند ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسٹیج پر روشنی آجاتی ہے۔ روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ رضیہ دروازے سے کچھ دور کھڑی ہے۔ باپ دروازے میں سے بڑھ رہا ہے)

باپ : کیا ہوا رقو!

رضیہ : بھائی جان!

باپ : بھائی جان ——؟

رضیہ : وہ آئے تھے۔ (ماں آتی ہے)

ماں : کون آئے تھے؟

رضیہ : بھائی جان —— ابھی یہیں تھے۔ میں نے اُن کے گلے میں ہار ڈالا تھا۔

ماں : اچھا؟

(ماں اور باپ دونوں کی نظریں ہار پر جاتی ہیں جو تصویر کے گرد بدستور دکھائی دے رہا ہے)

باپ : بیٹی! جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں!

رضیہ : کہتے تھے کہ تم میرے گلے میں ہار ڈالنا چاہتی تھیں، اس لئے آگیا ہوں۔ اب میرے گلے میں ہار ڈال دو' اور میں نے ہار اُن کے گلے میں ڈال دیا۔

ماں : بھائی کے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھیں نا! (شاداں آتی ہے)

شاداں : (ماں سے) رضیہ کو تم نے بھیجا کیوں نہیں؟ عذرا انتظار کر رہی ہے۔ (حیران ہو کر) کیا ہوا! معاملہ کیا ہے؟

ماں : کہتی ہے بھائی جان آئے تھے، اور میں نے اُن کے گلے میں ہار ڈالا۔

شاداں : خواب دیکھا ہوگا۔

رضیہ : نہیں چاچی! میں نے اپنے ہاتھوں سے اُن کے گلے میں ہار ڈالا تھا۔

شاداں : ہار تو وہ پڑا ہے بچی۔

(شاداں آگے بڑھ کر ہار اٹھانے کی کوشش کرتی ہے کہ یکایک چیخ مار کر ہاتھ پیچھے ہٹا لیتی ہے)

ماں اور باپ : (ایک ساتھ) کیا ہوا؟

شاداں : لہو!

ماں : لہو؟

شاداں : ہار پہ لہو——

(ماں جلدی سے ہار اٹھا لیتی ہے)

ماں : سچ —— لہو!

(ماں' باپ اور شاداں حیرت سے ہار کو دیکھ رہے ہیں۔ رضیہ کی نگاہیں دروازے پر جمی ہیں' اور اسی حالت میں جلدی سے پردہ گرتا ہے)۔

(زیرِ اشاعت ڈراموں کے مجموعے "پس پردہ" میں سے)

ابراہیم یوسف

سلگتی روحیں

منظر :- ایک صاف ستھرا کمرہ جس میں درمیانی درجے کا فرنیچر ہے جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو عفت اور صدیق کمرے میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیق ابھی ابھی کمرے میں آیا ہے۔

صدیق :- (کمرے کو چاروں طرف سے دیکھکر مسکراتے ہوئے) آپ نے تو سارے کمرے کی کایا ہی پلٹ دی۔

عفت :- (مسکراکر) آج دفتر سے چھٹی لے لی تھی سوچا یہی کام کیا جائے آپ نے تو کمرے کو کباڑ خانہ بنا رکھا تھا

صدیق :- شکریہ۔ دفتر سے آنے کے بعد ایک تو تھکان ہوتی ہے اور دوسرے یہ اوٹ پٹانگ کام مردوں کے بس کے ہیں بھی نہیں۔

عفت :- (صدیق کے ہاتھوں میں پھول دیکھکر) کس قدر حسین پھول لائے ہیں آپ ـــ مجھے پھول بچپن سے پسند ہیں۔

صدیق :- (پھول عفت کی طرف بڑھاتے ہوئے) آپ ہی کے لئے ہیں کل آپ اسلم کے یہاں پھولوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں میں نے سوچا شاید آپ کو پسند ہیں۔ آج بازار میں نظر آگئے تو لیتا آیا۔

عفت :- (پھول سونگھتے ہوئے) آپ نے بلا وجہ تکلیف کی (مسکراکر) آپ ہمیشہ یونہی غیر ضروری مصارف

افراد تمثیل

- عفت
- صدیق
- اسلم
- انوری

} ایک دفتر کے ملازم

- مختار :- ایک لورنگ آفیسر عفت کا شوہر
- ایک دھوبی
- اور • کچھ آوازیں

کرتے رہتے ہیں۔

صدیق :- کیا غیر ضروری مصارف ہیں! اب میں روز روز تو لاتا نہیں ہوں (ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ عفت پھول لیجاکر میز پر رکھے ہوئے گلدان میں سجانے لگتی ہے۔

عفت :- اب یہ کمرہ کباڑ خانہ کب بن جائیگا۔

صدیق :- مگر یہ پھول تو میں آپ کے لئے لایا ہوں۔

عفت :- (پھول سجاتے ہوئے) مجھے اس سے کب انکار ہے۔

صدیق :- اپنے کمرے میں لے جائیے۔

عفت :- میرے کمرے میں ہوئے یا آپکے کمرے میں بات ایک ہی ہے اور دیکھئے تو آپنے گرم کپڑوں کو کس بے دردی سے ڈال رکھا ہے۔

(اشکر کرنے میں مدد کی میرے پاس جاتے ہوئے)

صدیقی :- خیر آپ نے انہیں سنبھال کر رکھدیا۔

عفت :- اسقدر قیمتی کپڑے بار بار تو نہیں بنتے۔ آپ تلاش کیا کر رہے ہیں؟

صدیقی :- اسٹو جانے کدھر گیا؟

عفت :- میز کے نیچے چیڑ کے صندوق میں رکھا ہے۔ آپنے تو اسے میز پر یوں سجا کر رکھا تھا جیسے عہد مغلیہ کا کوئی قیمتی گلدان ہو۔ (صدیقی صندوق میں سے اسٹو نکال کر جلاتا ہے) آج صبح مسٹر اسلم آئے تھے۔

صدیقی :- (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) اچھا۔ پھر؟

عفت :- آپکو پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہدیا کہ آپ ابھی ابھی دفتر گئے ہیں۔

صدیقی :- آج وہ دفتر بھی نہیں پہنچا۔

عفت :- ضرور نہیں گئے ہونگے۔ ایک گھنٹے تک تو ہمارا دماغ چاٹتے رہے (طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) انہیں شاید اس کا غم تھا کہ میں آپ کے کمرے کی صفائی کیوں کر رہی ہوں۔ خود کو امپوز (IMPOSE) کرنے کی اُن کی عادت بہت بُری ہے۔

صدیقی :- (نفرت آمیز لہجہ میں) میں انہیں خوب جانتی ہوں۔ (صدیقی پھر ادھر اُدھر کوئی چیز تلاش کرتا ہے)۔

عفت : عفت مسکرا کر الماری میں سے چائے بنانے کے برتن اور سامان نکالکر دیتے ہوئے، یہ لیجئے۔

صدیقی :- ایک اُدھ کیس اور بنا دیجئے کہ کونسی چیز کہاں رکھی ہے۔ (پاس والے کمرے میں جاتے ہوئے) اسلم ایک گھنٹے کیا باتیں کرتا رہا۔

(صدیقی دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ عفت اپنی آواز کو اسقدر بلند کر لیتی ہے کہ وہ دوسرے کمرے میں سنائی دے سکے۔)

عفت :- وہی ہمیشہ کی طرح اوٹ پٹانگ — (صدیقی دوسرے کمرے سے آتا ہے اور کیتلی اسٹو پر رکھتا ہے۔ عفت آواز آہستہ کر کے) آج اپنے ان معاشقوں کی داستانیں سنا رہے تھے جن میں لڑکیاں ان پر عاشق ہوتی رہی ہیں۔

صدیقی :- (مسکرا کر) اچھا؟

عفت :- جی ہاں — اور وہ بھی اس طرح جیسے کوئی اپنی بلیوں کے فضائل بیان کر رہا ہو۔

صدیقی :- ذرا یہ اور بتلا دیجئے کہ چائے کا دوسرا سامان کہاں رکھا ہے۔

عفت :- (مسکرا کر) اسی الماری میں!

صدیقی :- (الماری کھولکر سامان نکالتے ہوئے) بیچارے کے ساتھ عجیب ٹریجڈی ہے۔ جب بھی اس کی کسی لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے۔ بس کچھ دن بعد ہی اس سے کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔

عفت :- (ہنستے ہوئے) اور پھر وہ کسی دوسری جگہ عشق آزمانا شروع کر دیتے ہیں۔

صدیقی :- (ہنستے ہوئے) آپنے شاید کسی دن کہا تھا کہ چاکلیٹ کلر کا سوٹ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

عفت :- (مسکراتے ہوئے) اسی لئے آج کل وہ اس رنگ کے سوٹ میں نظر آ رہے ہیں؟

صدیقی :- بس سمجھ لیجئے نزلہ آپ پر گرنے والا ہے۔

عفت :- (نفرت سے) ان کا نزلہ تو ہم پر بہت پرانا گرا ہوا ہے (کچھ دیر خاموش رہکر) ویسے وہ آج کل نگار کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں بلکہ آفس کی تمام ملازم خواتین میں اس سلسلہ میں کانا پھوسی بھی شروع ہو گئی ہے

صدیقی :- آفس کی ملازم خواتین کا کچھ نہ کہیئے۔ انہیں تو وقت گزارنے کے لئے کوئی موضوع چاہئیے (کچھ دیر خاموشی طاری رہتی ہے) کل جب آپ کینٹین سے میرے ساتھ

واپس آرہی تھیں تو ارملا کیسی شرارت بھری نظروں
سے دیکھ کر مسکرائی تھی ۔
(کیتلی اسٹو پر سے اٹھانا چاہتا ہے لیکن ہاتھ جل
جاتا ہے اور وہ کیتلی کو وہیں چھوڑ کر جیبوں میں رومال
تلاش کرنے لگتا ہے)

عفت :۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) عورتوں کا کام عورتیں ہی خوب
کر سکتی ہیں (کیتلی اسٹو پر سے اٹھالیتی ہے اور دودھ
کا برتن اسٹو پر رکھ کر) ارملا کو تو شگوفے چھوڑنے میں مزا
آتا ہے اب آجکل یہ اڑا رکھا ہے کہ ارشد صاحب کی بیوی
ان سے ناراض ہو کر میکے چلی گئی ہیں اور ارشد صاحب انتقاماً
انوری سے شادی کرنے والے ہیں ۔

صدیقی :۔ اچھا یہ خبر ارملا کی اڑائی ہوئی ہے میں تو اسکو حقیقت
سمجھے ہوئے تھا ۔

عفت :۔ کل ہی میں ارشد صاحب کے گھر گئی تھی ان کی بیوی مع
اپنے چھ عدد بچوں کے صحیح و سالم گھر پر موجود تھیں ۔

صدیقی :۔ لیکن اگر ارشد صاحب کو پتہ چل گیا کہ وہ یوں بے پر کی
اڑاتی پھرتی ہے تو پھر کیا ہوگا ۔

عفت :۔ وہ کوئی بھی بہانہ کر دیگی۔ سینکڑوں جھوٹے بہانے اسکی
مٹھی میں رکھے رہتے ہیں (دودھ کا برتن اسٹو پر سے
اتارتے ہوئے) چائے تیار ہوگئی ہے اب جلدی سے
منہ ہاتھ دھو ڈالیئے ۔ (صدیقی مسکرا کر عفت کو دیکھتا
ہے اور پاس والے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ عفت چائے
کا سامان ایک میز پر لاکر رکھتی ہے ۔ کچھ دیر بعد صدیقی
تولیے سے منہ پونچھتا ہوا پھر واپس کمرے میں آتا ہے عفت
کمرے سے باہر جاتے ہوئے) میں ابھی آتی ہوں ۔
(کمرے سے چلی جاتی ہے ۔ صدیقی آئینہ کے سامنے
کھڑے ہو کر بال برابر کرتا ہے اور سیٹی سے کسی فلمی گانے
کی دھن بجاتا ہے ۔ کچھ دیر بعد عفت ایک پلیٹ میں کیلے
لاتی ہے اور پلیٹ میز پر رکھ کر) ادھر سے ایک کیلے والا
گزر رہا تھا اس سے خرید لیئے تھے ۔

صدیقی :۔ آپ بھی کافی فضول خرچ ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر آپ مجھے
یونہی پھل کھلاتی رہیں تو میری صحت قطعی خراب ہو جائیگی۔

عفت :۔ (مسکرا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے) صحت بگڑ جائے گی!

صدیقی :۔ جی ہاں (عفت کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) روز
روز پھل کھانے سے انسان کی صحت کچھ زیادہ اچھی ہو
جاتی ہے اور زیادہ صحتمندی بیماری کا پیش خیمہ ہے ۔

عفت :۔ (چائے بناتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے) یہ نظریہ کس
اناڑی ڈاکٹر کی ہے ۔ (چائے کی پیالی صدیقی کی طرف
بڑھاتی ہے ۔ صدیقی چائے کی پیالی پیتے ہوئے عفت
کا چہرہ غور سے دیکھتا ہے ۔ عفت نظریں جھکا کر کسی
قدر شرماتے ہوئے) یہ آپ مجھے یوں کیوں گھور رہے ہیں؟

صدیقی :۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں آپ بغیر چشمے کے اچھی لگتی ہیں۔

عفت :۔ مسکرا کر کیلے کی پلیٹ اسکی طرف بڑھا کر) لیجیئے خوردہ
خوشامد مجھے پسند نہیں ! ۔

عفت :۔ یہ آپ مسٹر اسلم کی طرح باتیں کب سے کرنے لگے؟

صدیقی :۔ جی چاہتا ہے کہ آج میں آپ سے ایک ایسی بات کہوں جس کے
متعلق سوچتا ہوں کہ کہوں یا نہ کہوں ۔

عفت :۔ دیکھیئے چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے (میز پر سے مکھیاں اڑاتے
ہوئے) آج کل اسقدر مکھیاں ہیں کہ خدا کی پناہ!

صدیقی :۔ بات سننے سے پہلے اسے یوں نہ ٹالیئے ۔

عفت :۔ (مسکرا کر) اگر پروگرام کے مطابق اتفاقاً آپ کچھ کہنا
چاہتے ہیں تو کم از کم کچھ دن کے لئے ملتوی کر دیجئے ۔

صدیقی :۔ آپ ہمیشہ یونہی میری امیدوں، آرزوؤں اور خواہشوں
پر پانی پھیر دیتی ہیں آخر کبھی تو موقع دیجئے کہ میں آپ سے
کچھ کہہ سکوں ۔

(باہر دستک ہوتی ہے صدیقی اٹھ کر دروازے کے پاس

جاتا ہے اور باہر جھانکتا ہے پھر پلٹتا ہے) آپ
کا دھوبی آیا ہے۔

عفت :۔ (اٹھکر دروازے کے باہر جاتے ہوئے) میں ابھی
آتی ہوں۔

صدیقی :۔ اس کم بخت دھوبی کو بھی اسیوقت آنا تھا۔ (عفت
مسکراتی ہوئی کمرے میں چلی جاتی ہے) ذرا جلدی آ
جائیگا۔ چائے ٹھنڈی ہو جائیگی۔ (صدیق کھڑکی کے
پاس کھڑا ہو کر باہر دیکھنے لگتا ہے کچھ دیر بعد دھوبی
کمرے میں آتا ہے) جناب! وہ شرٹ کہاں ہے؟

دھوبی :۔ سرکار جانے کس کے کپڑوں میں چلا گیا ہے۔

صدیقی :۔ یہ تو آپ ایک مہینے سے کہہ رہے ہیں یہاں ایک
شرٹ کم ہو گیا

دھوبی :۔ دھوکے سے ادھر ادھر ہو گیا مل جائے گا تو پیش کر دوں گا

صدیقی :۔ ذرا مہربانی فرما کر جلد ہی تلاش کریجئے۔

دھوبی :۔ تلاش تو کر ہی رہا ہوں سرکار۔ بابو لوگ بھی آرکسی کا کپڑا
دھوکے سے چلا جائے تو واپس نہیں کرتے چاہے کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو
وہ شرٹ پرانا تھا؟ آجکل کپڑا کتنا مہنگا ہے یہ آپکو پتہ ہے۔

عفت :۔ (کمرے میں آتے ہوئے) کیا بات ہے؟

صدیقی :۔ کوئی بات نہیں۔ (دھوبی سے) ہمارے کپڑے
کب لاؤگے؟

دھوبی :۔ کل لے آؤنگا سرکار۔

صدیقی :۔ اچھا۔ بھئی ذرا احتیاط سے کام کیا کرو۔
(دھوبی سلام کر کے چلا جاتا ہے) بے حد سست اور
کام چور ہے۔

عفت :۔ مگر کام اچھا کرتا ہے (میز کے پاس جاکر) ارے
آپ نے چائے نہیں پی دیکھئیے ٹھنڈی ہو گئی۔

صدیقی :۔ (میز کے پاس آکر ایک کرسی پر بیٹھکر) بعض وقت
آپ بہت بد اخلاق ہو جاتی ہیں۔ (عفت مسکرا کر)

پر بیٹھ جاتی ہے) کسی کی بات نہ سننا کونسا اخلاق ہے؟

عفت :۔ میں نے سننے سے کب انکار کیا ہے۔ (مسکرا کر)
صرف پروگرام ملتوی کرنے کے لئے کہا ہے۔ اچھا چائے
پی لیجئے ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔

صدیقی :۔ اس کم بخت دھوبی کو بھی اسیوقت آنا تھا جیسے تاک
لگائے بیٹھا تھا (سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر)
لائیے اب چائے بھی زہر کی طرح حلق سے اتارنا ہی جائے

عفت :۔ آپ تو بہت جلد ناراض ہو جاتے ہیں۔ (مسکرا کر)
ویسے مجھے بھی آپ سے کچھ عرض کرنا تھا۔

صدیقی :۔ اجی بس رہنے دیجئے اچھا یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے
سے کچھ عرض نہ کریں۔

عفت :۔ آپنے پھر بے مروتی برتنا شروع کر دی۔ آخر مجھے
بھی تو کچھ کہنے کا حق ہے۔

صدیقی :۔ جی ہاں بولتے رہنے کا حق عورتوں نے اپنے لئے مخصوص
کر لیا ہے مردوں کا حق صرف یہ ہے کہ وہ سنا کریں۔
میں بھی انتقاماً آپ کی کوئی بات سننے کیلئے تیار نہیں!

عفت :۔ میں جب بھی آپ سے کوئی بات کہنا چاہتی ہوں آپ
یونہی منہ پھلا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ (کھڑکی کے پاس
جاکر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس میں سے باہر دیکھنے
لگتی ہے۔ صدیق خاموشی سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔
کچھ دیر بعد پلٹکر) یہ چائے کی ہڑتال کیوں کر رکھی
ہے؟

صدیقی :۔ مجھے زہر پینے کا شوق نہیں ہے۔

عفت :۔ زہر!

صدیقی :۔ جی ہاں زہر جب آپ وہاں جاکر یوں منہ پھلا کر
کھڑی ہو جائیں گی تو کیا چائے میرے لئے زہر نہ
بن جائے گی۔

عفت :۔ (مسکرا کر صدیق کے پاس آتے ہوئے) میں نے تو اپنی

چائے ختم کرلی ہے۔

صدیقی :۔ بس آپ مسکرا دیتی ہیں تو میرا سارا غصہ کافور ہو جاتا ہے۔

عفت :۔ ٹھہریئے میں دوسری بنائے دیتی ہوں۔ یہ تو بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے (دوسری پیالی میں چائے دیتے ہوئے) جب آپ غصہ کرتے ہیں تو مجھے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

صدیقی :۔ (پیالی عفت کے ہاتھ سے لیکر) جی ہاں اور غصہ کرنے سے یہاں سیروں خون خشک ہو جاتا ہے (عفت قہقہہ مار کر ہنستی ہے، صدیقی بے حد سنجیدگی سے) اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے بالکل حقیقت ہے (باہر دستک۔ صدیقی برا سا منہ بنا کر پیالی میز پر رکھ کر دروازے کی طرف جاتا ہے، اب شاید دودھ والا ہوگا (دروازہ سے باہر جھانکر) اوہ ادھر آؤ انوری — عفت یہاں ہیں۔ (انوری کمرے میں آتی ہے۔ ایک کرسی کی طرف اشارا کرکے) تشریف رکھئے!

انوری :۔ (کرسی پر بیٹھ کر عفت سے) آج دفتر کیوں نہیں گئیں

عفت :۔ (مسکرا کر) موڈ نہیں تھا۔

انوری :۔ (کمرے کا چاروں طرف سے جائزہ لیکر) مسٹر صدیقی کیا بات ہے آج تو کمرہ بڑا صاف ستھرا نظر آرہا ہے۔

صدیقی :۔ (مسکرا کر عفت کی طرف اشارا کرکے) یہ سب ان کی مہربانی ہے۔

انوری :۔ اوہ جب ہی تو —

عفت :۔ (ایکدم بات کاٹ کر) کہو اسوقت ادھر کیسے بھٹک پڑیں؟

انوری :۔ آج دن بھر دفتر میں بور ہوتی رہی سوچا تمہارے یہاں چلوں یہ کہو پکچر چل رہی ہو۔

عفت :۔ نہیں بھئی۔ آج تو بالکل موڈ نہیں ہے۔

انوری :۔ آج میں کہہ رہی ہوں نا۔ (کسیقدر طنزیہ لہجہ میں) کام زیادہ کیا ہے۔ تھک بھی گئی ہوگی۔ (عفت اور صدیقی ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہیں) ویسے مسٹر اسلم بھی چل رہے ہیں انہوں نے ہی مجھے مدعو کیا ہے۔

عفت :۔ اگر مسٹر اسلم چل رہے ہیں تو پھر میں اور بھی نہیں چل سکتی

انوری :۔ کیوں ؟ وہ تو تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں۔

عفت :۔ اسی لئے تو ان سے دور رہنا اچھا ہے (چائے کا پیالہ انوری کی طرف بڑھاتے ہوئے) دل پھینک عاشق ذرا خطرناک ہوتا ہے۔

انوری :۔ (ہنسکر) اور اگر وہ تم پر عاشق ہو چکے ہوں پھر!

عفت :۔ یوں تو وہ جانے کب کے عاشق ہیں (صدیقی سگریٹ نکالکر منہ میں لیتا ہے عفت اس کے منہ سے سگریٹ نکالکر) آپ اسقدر سگریٹ نہ پیا کیجئے (مسکرا کر) میں اتنی سی بات آپ سے کہنا چاہتی تھی جس پر آپ روٹھ گئے تھے۔

صدیقی :۔ (ہنسکر) میں سمجھا تھا آپ کوئی ایٹم بم چھوڑنے والی ہیں۔

انوری :۔ (چائے کی پیالی میز پر رکھکر) تم پکچر نہیں چل رہی ہو؟

صدیقی :۔ کونسی پکچر دیکھنے کا ارادہ ہے!

انوری :۔ دلیپ کمار کی نئی پکچر لگی ہے اسی کو دیکھنے کا ارادہ ہے (طنزیہ لہجے میں) آپ بھی پکچر دیکھنے کیوں چلتے نگے

صدیقی :۔ آپ نے مجھے مدعو کیا نہیں ہے (عفت کی طرف اشارا کرکے) آپ تو انھیں مدعو کرنے آئی تھیں۔

انوری :۔ اچھا تو میں چلتی ہوں۔ (عفت سے) کل دفتر آؤ گی!

عفت :۔ کیوں نہیں۔ اس کمرے کی صفائی تو ہو گئی (انوری

میز پر رکھے پھولوں کی طرف دیکھتی ہے) یہ پھول
مسٹر صدیق میرے لئے لائے ہیں۔

الوری :۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اچھا تو میں چلی
مسٹر اسلم میرا انتظار کر رہے ہونگے۔ کل دفتر
ضرور آنا۔ خدا حافظ :۔

عفت :۔ خدا حافظ (الوری چلی جاتی ہے عفت مسکرا کر)
عجیب شے ہے یہ الوری بھی!

صدیق :۔ بیچاری کی زندگی میں طنز ہی طنز بھرا ہے!

عفت :۔ جس کے نشتر وہ دوسروں پر آزماتی رہتی ہیں۔
(سنجیدہ ہو کر) بیچاری کی زندگی میں عجیب مایوسی
ہے۔ مجھے اس سے بے حد ہمدردی ہے۔

صدیق :۔ اسے کسی کی ہمدردی کا احساس نہیں ہوتا ہمیشہ
اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ دوسرے اسے
سمجھیں مگر وہ کبھی کسی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی۔
(عفت چائے کے برتن اٹھا کر دوسرے کمرے کی
طرف جاتی ہے) اب کیا ہو رہا ہے۔

عفت :۔ انہیں دھو کر صاف کر دوں۔ (مسکرا کر) ورنہ
کل صبح تک مکھیوں کی دعوت ہوتی رہیگی۔ عفت
پاس والے کمرے میں چلی جاتی ہے) صدیق کچھ دیر بعد
پاس والے کمرے کے پاس جا کر جس میں پانی گرنے اور
برتن دھونے کی آواز آ رہی ہے)

صدیق :۔ کل اتوار ہے ہم لوگ بھی آج پکچر کیوں نہ چلیں۔

عفت :۔ (اسی کمرے میں سے) کوئی معقول پکچر تو چل نہیں رہی
ہے،

صدیق :۔ وہی دلیپ کمار والی پکچر ہے۔

عفت :۔ (دوسرے کمرے سے آتے ہوئے) جس میں وحیدہ
رحمٰن بھی ہے۔

صدیق :۔ (کسی قدر شرمندگی سے مسکرا کر) یونہی کہہ لیجئے۔ لوگ
اس کی تعریف کر رہے ہیں ۔۔۔ مگر اس میں تو اسلم
اور الوری جا رہے ہیں۔

عفت :۔ چائے کے برتن کپڑے سے پونچھتے ہوئے، جانے دیجئے
(مسکرا کر) پورا ہال تو بک نہیں کرا لیا ہوگا۔

صدیق :۔ مگر۔

عفت :۔ (ہنس کر) زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا الوری طنز
کے دو چار نشتر اور چلائیگی اور اسلم دل ہی دل میں تھوڑا
اور جل بھن لینگے (سامان الماری میں رکھتی ہے)

صدیق :۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) تو پھر آپ جا کر تیار ہو لیجئے
ورنہ دیر ہو جائے گی (عفت دروازہ کی طرف
جاتی ہے) اور ہاں وہی کاہی ساڑی پہنئے گا
مجھے اچھی لگتی ہے۔

عفت :۔ بہت اچھا۔ (صدیق قہقہہ لگاتا ہے) کیا بات
ہے؟

صدیق :۔ میں آپ سے صرف اتنی سی بات کہنا چاہتا تھا جس کے
لئے آپ ہمیشہ پروگرام ملتوی کرتی رہی ہیں۔ (عفت
مسکراتی ہے صدیق اس کا ہاتھ پکڑ کر) آپ کی
مسکراہٹ اسقدر خوبصورت ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے
اسے چرا لیا جائے

عفت :۔ (بے حد سنجیدگی سے) کیا بدتمیزی ہے میرا ہاتھ
چھوڑئیے (اسی وقت اسلم داخل ہوتا ہے اور صدیق
کو عفت کا ہاتھ پکڑے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ صدیق
ہاتھ چھوڑ دیتا ہے عفت مسکراتی ہوئی چلی جاتی ہے اسلم
کچھ دیر صدیق کو دیکھتا رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ
آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

اسلم :۔ صدیق! بیٹھو۔ (طنزیہ مسکراہٹ سے) تم
اسقدر گھبرا کیوں گئے؟

صدیق :۔ تم تو الوری کے ساتھ پکچر دیکھنے جا رہے تھے۔

اسلم :- جا تو رہا تھا مگر غلطی سے ادھر آ گیا۔
(طنزیہ لہجے میں)
تمہیں کچھ اعتراض ہے؟

صدیقی :- اعتراض تو کیا ہوگا۔ مگر وہ تو کہہ رہی تھی کہ ——

اسلم :- کون کہہ رہی تھی؟ عفت یا انوری؟
(صدیقی خاموش رہتا ہے)
تم عفت کی بات کہہ رہے ہوگے۔ ہاں صبح خود آیا تھا اور جب تو قع محترمہ نے دھتکارا بھی تھا۔ بھئی ہو خوش قسمت —— کہو تمہاری بیوی کا بھی خط آیا کہ نہیں۔

صدیقی :- اکثر آتا رہتا ہے!

اسلم :- اب طبیعت کیسی ہے؟

صدیقی :- کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ مگر اسلم۔

اسلم :- عفت کی بات چھوڑو۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔

صدیقی :- برسوں سے!

اسلم :- تم سمجھتے ہو کہ ہماری ملاقات دو چار دن کی ہے۔ برسوں کی پہچان ہے۔
(مسکراتے ہوئے)
آخر تم شرمندہ کیوں ہو، اماں چھوڑو یہ سب چلتا رہتا ہے۔ ابھی تک مسٹر نثار ٹور سے نہیں لوٹے۔

صدیقی :- ایک مہینے کے قریب ہوگیا ہے انہیں ٹور پر گئے ہوئے یہ مسٹر نثار کی سراسر بے انصافی ہے۔ انہیں اپنی بیوی کا خیال تو رکھنا چاہیے۔

اسلم :- اور تم کس مرض کی دوا ہو!

صدیقی :- (کسی قدر تلخ لہجہ میں) اس کا علاج تو میں نہیں کر سکتا۔ وہ تو مسٹر نثار ہی کو کرنی ہوگی۔

اسلم :- (صدیقی کا چہرہ دیکھ کر)
تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ اس کے گھر کا ماحول ایسا رہا ہے کہ اس کو ہمیشہ سب سے ملنے جلنے کی آزادی رہی ہے۔ مسٹر نثار ایسا ہی سوچتے ہونگے کہ اسے تنہا رہنے سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

صدیقی :- کسی کے گھر کا ماحول کیسا ہی رہا ہو مگر شادی کے بعد اس کے کچھ اور جذبات ہوتے ہیں کچھ اور خواہشات ہوتی ہیں کچھ اور امنگیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں۔

اسلم :- (ہنستے ہوئے)
اچھی تقریر کی۔ مگر شادی کے بعد فطرت نہیں بدل جاتی۔

صدیقی :- سب کچھ بدل سکتا ہے اگر ——
(عفت کمرے میں آتی ہے۔ اس نے کاہی ساڑی پہن رکھی ہے۔ وہ اسلم کو دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے)

عفت :- پھر تو آپ بھی چل رہے ہیں؟

اسلم :- جی! میں؟
(طنزیہ مسکرا کر)
آپ کا تو آج پروگرام نہیں تھا۔

عفت :- اب مسٹر صدیقی نے کہا تو ماننا پڑا (صدیقی کی طرف دیکھ کر) اسے آپ تیار نہیں ہوئے۔ بس آپ کی یہ بے پروائی بہت کھلتی ہے۔

صدیقی :- مگر ابھی تو ——

عفت :۔ (بات کاٹ کر)
اب وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔ ایک ٹیکسی یا
رکشا بلا لیجئے۔
(اسلم کی طرف دیکھ کر)
کیوں آپ چل رہے ہیں نا؟
اسلم :۔ معاف کیجئے گا میں تو نہ چل سکوں گا۔
عفت :۔ کیوں؟۔ اوہ آپ کا پروگرام تو انوری
کے ساتھ ہے۔
(صدیق کی طرف دیکھ کر)
ذرا جلدی کیجئے کوئی رکشا یا ٹیکسی بلا لیجئے۔
(صدیق کمرے سے چلا جاتا ہے)
آج تو انوری بڑی خوش نظر آ رہی تھی!
اسلم :۔ (سگریٹ جلا کر)
اچھا۔
(مسکرا کر)
لیکن کیوں؟
عفت :۔ آپ کے ساتھ پکچر جو جا رہی ہے۔ (اسلم خاموش
رہتا ہے) یا اللہ کیا بہت ناراض ہیں؟
اسلم :۔ ناراض؟ کس بات پر!
عفت :۔ یہی کہ میں نے آپ کے ساتھ پکچر جانے سے انکار کر دیا
تھا۔
اسلم :۔ (ہنس کر) آپ مجھے اسقدر گیا گزرا کیوں سمجھتی ہیں۔
میں کافی فراخ دل ہوں۔ کہئے کونسی پکچر دیکھنے کا
ارادہ ہے؟
عفت :۔ وہی جسے آپ انوری کے ساتھ دیکھنے جا رہے ہیں۔
اسلم :۔ اوہ (مسکراتا ہے۔ چند سیکنڈ رک کر) اگر
مسٹر نثار کو پتہ چل جائے کہ آپ ان کی عدم موجودگی
میں یوں تفریح کرتی پھرتی ہیں پھر کیا ہو؟

عفت :۔ (غور سے اسلم کو دیکھتے ہوئے) زندگی میں جو تلخی
ہے اس میں تھوڑا اور اضافہ ہو جائے گا۔ (عفت
چند سیکنڈ رک کر) کل پارٹی میں آپ کی بیگم صاحبہ
نظر نہیں آئیں۔
اسلم :۔ آج کل وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہیں۔
عفت :۔ (مسکرا کر طنزیہ) جب ہی تو یہ پارٹیوں کا بازار
گرم ہے۔ نگار بھی نظر نہیں آئی۔
اسلم :۔ اسکو کوئی ضروری کام تھا پہلے ہی معذرت لی تھی۔
عفت :۔ اور آپ نے معذرت قبول بھی کر لی تھی۔ جب ہی
انوری اسقدر چہک رہی تھی۔
اسلم :۔ انوری کے چہکنے کا کیا۔ ایک دو لفظ ہمدردی
کے کہہ دو وہ چہکنے لگے گی ـــــ آپ تو کافی
عرصے سے اپنے گھر نہیں گئیں۔
عفت :۔ جی ہاں تین سال ہو گئے۔
اسلم :۔ گھر کی یاد تو آتی ہو گی۔
عفت :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) زندگی میں کبھی کبھی ایسا
وقت بھی آجاتا ہے کہ انسان سب کچھ بھول جاتا ہے
آپ کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھئے!
اسلم :۔ جی میں ٹھیک ہوں (کھڑکی کے پاس جا کر اس میں
سے باہر دیکھتے ہوئے) مگر مسز نثار زندگی میں
کبھی کوئی ایسا حادثہ بھی ہو جاتا ہے جسکو بھلایا
نہیں جا سکتا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) کوئی
زندگی میں ایسا سما جاتا ہے جو نکالے نہیں نکلتا
عفت :۔ آج تو آپ بڑی فلسفیانہ باتیں کر رہے ہیں
اسلم :۔ جب دل کو دکھ پہنچتا ہے تو انسان ایسی ہی باتیں
سوچتا ہے۔
عفت :۔ (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) کبھی کبھی ہمکو زندگی اور
حالات سے سمجھوتہ کر لینا پڑتا ہے خیر چھوڑئیے

اگر آپ آج سینما چلتے تو مجھے خوشی ہوتی ۔ انوری بھی ساتھ چلتی ۔

اسلم:۔ (طنزیہ) میں آپکی اور صدیقی کی تنہائی میں مخل ہونا نہیں چاہتا ۔ (عفت کے چہرے پر ناگواری کے اثرات پیدا ہوتے ہیں) مسز نشاط کافی عرصے ٹور پر گئے ہیں ۔

عفت:۔ جی ہاں ۔ (انتہائی تلخ لہجہ میں) ان کا گھر پر رہنا نہ رہنا اب برابر ہے (طنزیہ) میں نے ایک مرتبہ ان سے تنہائی کی شکایت کی تھی تو انہوں نے نوکری کرلینے کا مشورہ دیا تھا

اسلم:۔ مگر ان جیسے معقول آدمی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا تو بڑی بے انصافی ہے ۔

عفت:۔ (کچھ دیر خاموش رہکر) مسٹر اسلم ! دل کے زخموں کو کرید کر کیا کیجئے گا ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) بہرحال میں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہے ۔

اسلم:۔ (طنزیہ) کہیں بگڑا ہوا مزاج بھی سدھرا ہے ۔

عفت:۔ (نفرت سے اسلم کو دیکھکر) کبھی کبھی بگڑا ہوا مزاج بھی سدھر جاتا ہے ۔

اسلم:۔ (طنزیہ) اس کی مثال تو میرے سامنے ہے ۔

عفت:۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) عورت کو اگر زندگی میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی نہ ملیں تو پھر اس کی زندگی میں رکھا ہی کیا ہے ۔

اسلم:۔ اگر یہی عورت کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں تو پھر اس سے بڑی خوشیاں کیا ہیں !

عفت:۔ (کچھ دیر خاموش رہکر) کبھی کبھی عورت کسی مرد سے بے حد نفرت کرکے بھی مسرت حاصل کرتی ہے ۔ مسٹر اسلم ! کیا اچھا ہوتا کہ آپ پرانی باتوں کو بھول کر ایک اچھے دوست بنے رہتے ۔

اسلم:۔ مگر مسز نشاط دل کی اس دیوانگی کا کیا کروں جو جھوٹ کی بات اب قبول کرنے کو تیار نہیں ۔

عفت:۔ (نفرت سے) اس دل کی قلعی تو اسیوقت کھل گئی تھی جب آپ نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا

اسلم:۔ اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں تھا ۔

عفت:۔ آج تو آپ ایک بیوی کے شوہر اور ایک بچے کے باپ ہیں ان کی موجودگی میں یہ عشق بازی کچھ عجیب سی لگتی ہے (طنزیہ) آپ صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ ایک بدنام لڑکی سے شادی کرکے سوسائٹی کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے ۔ اسوقت میرے ماں باپ میرا ہاتھ کسی بھی لڑکے کو دینے کو تیار تھے ۔

اسلم:۔ (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) مسٹر نشاط آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بڑا اسکھ پا رہے ہیں ۔

عفت:۔ (دکھ بھرے لہجہ میں) انہوں نے کبھی اس سکھ کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جو ایک عورت انہیں دے سکتی ہے (نفرت سے) انہیں میرے خاندانی نام کی ضرورت تھی میری نہیں انہیں پیسوں کی ضرورت تھی بیوی کی نہیں ۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) نہ وہ خود یہ بھولتے ہیں کہ میں ایک بدنام لڑکی رہ چکی ہوں اور نہ مجھے بھولنے دیتے ہیں ۔ یہ میری زندگی کی کس قدر بڑی ٹریجڈی ہے کہ جب بھی میں بیوی بنکر ان سے قریب ہونے کی کوشش کرتی ہوں تو ان کی نگاہوں میں ایک ایسا خوف جھانکتا نظر آتا ہے جو صرف نفرت سے پیدا ہوتا ہے ۔

اسلم:۔ مگر مسز نشاط آپ کے دل میں میری طرف سے جو بدگمانی پیدا ہوگئی ہے وہ . . . . .

عفت:۔ (بات کاٹ کر) مسٹر اسلم ! میں گذشتہ زندگی کو بھول جانا چاہتی ہوں آپ بھی بھول جائیے ۔ (کچھ دیر

خاموش رہکر) دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔۔۔ زندگی کی غلطیاں بار بار نہیں دہرائی جاتیں۔ مناسب ہے کہ آپ مجھ سے ملنا جلنا ترک کردیں۔

اسلم:۔ مگر مسز نثار میرے دل میں جو آگ لگی ہے وہ.. (صدیقی کمرے میں آتا ہے۔ عفت اسے دیکھکر اسلم کی بات کاٹ کر)

عفت:۔ مسٹر صدیقی! آج کا پروگرام ملتوی کر دیجئے میں نہ جا سکونگی (جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے چلی جاتی ہے۔ صدیقی چند سیکنڈ خاموشی سے اسلم کو دیکھتا رہتا ہے؟)

صدیقی:۔ اسلم! کیا بات ہے؟

اسلم:۔ (چونک کر) کچھ نہیں۔ (طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) محترمہ نے ہمکو نوٹس دیدیا ہے۔

صدیقی:۔ کیسا نوٹس؟

اسلم:۔ یہی کہ میں ان سے ملنا جلنا چھوڑ دوں۔

صدیقی:۔ آخر کیوں؟

اسلم:۔ اسلئے کہ وہ دودھ کی جلی ہوئی ہیں اور چھاچھ کو پھونک پھونک کر پینا چاہتی ہیں اس لئے کہ انہیں مجھ سے نفرت کرکے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہکر) محترمہ اتنا نہیں جانتیں کہ مایوسی سے ہی جذبۂ انتقام پیدا ہوتا ہے۔

صدیقی:۔ لیکن اسلم تم اس کے ہاتھ دھوکر کیوں پیچھے پڑ گئے ہو؟

اسلم:۔ اس لئے کہ میں اسکو چاہتا تھا اور اب بھی اس کے لئے انتہائی بے چین ہوں اگر میں نے اس سے شادی سے انکار کردیا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اسے بھول بھی جاؤں۔

صدیقی:۔ شادی سے انکار کر دیا تھا۔

اسلم:۔ ہاں۔ اسلئے کہ وہ شادی سے پہلے ماں بنچکی تھی۔

صدیقی:۔ ماں بن گئی تھی! کس کے بچے کی؟

اسلم:۔ (طنز اور شکست خوردگی کے لہجہ میں) میرے سپنے کی اپنے باپ کے اردلی کے بچہ کی ماں۔ اور میں ایسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔

صدیقی:۔ عجیب محبت تھی تمہاری بھی۔ شادی کر لی ہوتی۔ زندگی کی ایک غلطی سے کوئی کاکردار نہیں بن جاتا۔ اب اسے بھول جاؤ وہ کسی اور کی بیوی ہے۔

اسلم:۔ یہ ممکن نہیں ہے اسنے میرے ذہنی توازن کو درہم برہم کر دیا ہے وہ میرے لئے دوسرے کی بیوی ہے تمہارے لئے نہیں۔

صدیقی:۔ (غور سے اسلم کا چہرہ دیکھکر) میرے لئے بھی مسٹر نثار کا جو کچھ رویہ اس کے ساتھ ہے وہ ایک ٹریجڈی ہے اگر وہ میرے ساتھ رہکر چھوٹی چھوٹی خوشیاں حاصل کر لیتی ہے تو اس میں کیا برائی ہے

اسلم:۔ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا جو فرشتوں کی دنیا کی ہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہکر) اگر اسے مجھ سے نفرت کرکے مسرت حاصل ہوگی تو میں اس سے انتقام لیکر خوش ہونگا۔

صدیقی:۔ (پرسکون لہجہ میں) اس سے تم کو کیا ملیگا؟

اسلم:۔ سکون۔ ممکن ہے انتقام کی مسرت جذبات کی اس آگ کو ٹھنڈا کر دے جو میرے دل میں سلگ رہی ہے (نثار کمرے میں داخل ہوتا ہے) یہ لو مسٹر نثار آگئے۔ (نثار ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے؛) اس مرتبہ تو آپ کافی عرصے باہر رہے۔

نثار:۔ جی ہاں کام کی بے حد زیادتی تھی اور پھر ٹورنگ آفیسر کی زندگی ہی کیا ہے (مسکراکر) صرف۔

راستوں کی پیمائش کرتے رہنا۔ (صدیق کی طرف دیکھکر) کہئے مسٹر صدیق! آپ کا مزاج؟

صدیق:۔ مہربانی ہے آپکی۔ تقریباً ایک مہینے باہر رہے آپ؟

نثار:۔ جی ہاں۔ کہئے ابھی بچوں کو نہیں بلایا؟

صدیق:۔ بیوی کی طبیعت ٹھیک ہونے میں نہیں آتی۔ اب یہاں بلا بھی لوں تو ایک درد سر اور بڑھ جائیگا۔ کوئی ٹھیک سے دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں۔ وہاں کم از کم ماں باپ تو ہیں۔

نثار:۔ یوں تنہا رہنے سے تو آپکو بڑی تکلیف ہے؟

صدیق:۔ جی ہاں۔ کیا کیا جائے عادت سی ہوگئی ہے۔ میری شادی کو چار سال ہوگئے ہیں مگر بیوی کی بیماری نے مجھے کبھی وہ مسرت حاصل نہیں ہونے دی جو ایک بیوی اپنے شوہر کو دے سکتی ہے۔

نثار:۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) جی ہاں۔ سب قسمت کے کھیل ہیں۔

اسلم:۔ اجی چھوڑئیے مسٹر نثار اسے تو ہوٹل کی روٹیاں ہضم ہونے لگی ہیں۔ ویسے اور اسے کیا تکلیف ہے۔ جب ہماری بیوی گھر پر ہوتی ہے تو ہم خود کو قیدی سا محسوس کرتے ہیں اب آجکل دیکھئے کس قدر آزاد ہیں۔

صدیق:۔ تمہاری بیوی تو صرف خانہ پُری کے لئے ہے۔ پھر تم اس سے اس سکھ کی کیوں امید رکھتے ہو جو ایک بیوی اپنے شوہر کو دیتی ہے۔

(باہر سے آواز "بابو جی۔ بابو جی۔" صدیق دروازے کے پاس جاتا ہے، کون ہے بھائی؟

آواز:۔ رکشا والا۔ چلئے نا دیر ہو رہی ہے۔

صدیق:۔ (دروازہ کھولکر باہر دیکھکر) اب ہمیں نہیں جانا

آواز:۔ واہ بابو جی۔ ہمارا وقت یونہی کھوٹا کیا ایک آدھ سواری اٹھا لیتے۔

صدیق:۔ (جیب سے کچھ پیسے نکالکر دیتے ہوئے) یہ لو اپنے وقت کی قیمت!

اسلم:۔ (نثار سے مخاطب ہوکر) صدیق کا سینما کا پروگرام تھا ملتوی کر دیا۔

نثار:۔ (صدیق سے) آپ نے میری وجہ سے تو ملتوی نہیں کیا؟

صدیق:۔ جی نہیں۔ (مسکرا کر) یکایک بنا تھا یکایک ملتوی ہوگیا!

نثار:۔ (کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے) آج تو کمرے میں بڑی معقولیت نظر آرہی ہے (مسکرا کر) اس سے پہلے تو آپ اس معقولیت کے قائل نہیں تھے۔

اسلم:۔ یہ سب مسز نثار کی مہربانی ہے۔ آج دفتر سے چھٹی لیکر دن بھر یہی کرتی رہیں (رہتا ہے، پیر پٹانے کے انداز میں) کم از کم وہی اس نامعقول کو انسانوں کی طرح رہنا سکھا دیں تو کس قدر اچھا ہو۔

(باہر سے آواز۔ "مسٹر صدیق مسٹر صدیق")

صدیق:۔ (دروازہ کھولکر باہر دیکھکر) اوہ مسٹر سیٹھی۔ آئیے آئیے کیا بات ہے!

آواز:۔ آپکا فون ہے!

صدیق:۔ آپنے کیوں تکلیف کی کسی بچہ کو بھیج دیا ہوتا۔ (اسلم اور نثار سے) میں ابھی آتا ہوں۔

(صدیق کمرے سے چلا جاتا ہے۔ نثار نظریں جھکائے اس طرح بیٹھا ہے جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ اسلم کچھ دیر خاموشی سے نثار کو دیکھتا رہتا ہے)

اسلم:۔ مسٹر نثار آپ کیا سوچ رہے ہیں؟
نثار:۔ (نظریں اٹھا کر اسلم کو دیکھتا ہے پھر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) مسٹر اسلم! کبھی انسان مجبوری میں کسی برائی کو قبول کر لیتا ہے مگر بعد میں اسے تمام زندگی پچھتانا پڑتا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہکر) میں نے عفت کو ایک برائی سمجھ کر قبول کیا تھا اس وقت یہ احساس نہیں تھا کہ تمام زندگی دوزخ کی آگ میں سلگنا پڑیگا۔ (کمرے کو چاروں طرف سے دیکھتے ہوئے) محترمہ نے کبھی مجھے یوں خوش کرنے کی کوشش نہیں کی۔!
اسلم:۔ (سوچتے ہوئے) ممکن ہے انہیں آپ سے یہ شکایت ہو کہ آپ نے انہیں کبھی کھلے دل سے قبول نہیں کیا؟
نثار:۔ یہی کیا کم ہے کہ جسے کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا اُسے میں نے قبول کر لیا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں اس کے خاندان والوں نے مجھے کبھی کھلے دل سے قبول نہیں کیا!
اسلم:۔ (حیرت سے) جی کیا مطلب؟
نثار:۔ (مایوسی کے لہجے میں) اس گھر میں مجھے وہ عزت اور خلوص نہیں ملا جو ملنا چاہیئے تھا۔ میری حالت انہوں نے اس بھکاری کی طرح سمجھی جو ایک روٹی کی لالچ میں ہر ذلت برداشت کرنے کو تیار رہتا ہے۔ میں اس سب سے اکتا کر یہاں آگیا مگر یہاں آکر مجھے عفت سے ڈر معلوم ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن اس کی نگاہیں مجھے نگل جائیں گی۔
اسلم:۔ آپ اس کی گذشتہ زندگی کو بھول کر اسے خود سے قریب کیجئے۔ اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیجئے۔
نثار:۔ مجھے اس سے دور رہنے میں سکون ملتا ہے۔ مجھے اس سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں جانے کونسی پیاس جھانکتی ہے۔
اسلم:۔ (سگریٹ جلا کر کش لیتے ہوئے) آپ اسے اپنی محبت دیجئے پیاس خود بخود بجھ جائے گی (کچھ دیر خاموش رہکر) اس کا صدیق سے اسقدر قریب ہو جانا کچھ ٹھیک نہیں!
نثار:۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اگر اپنا ہی سکہ کھوٹا ہو تو پرکھنے والے کا کیا قصور۔ میں نے ایک مرتبہ اس سے یہ بات کہی تھی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اسکا جواب غیر متوقع بلکہ حوصلہ شکن تھا۔
اسلم:۔ حوصلہ شکن؟ غیر متوقع؟؟
نثار:۔ جی ہاں اس نے کہا آپ اکثر ٹور پر رہتے ہیں اگر میرے دل میں برائی پیدا ہو جائے تو آپ مجھے روک نہیں سکتے (ٹھنڈی سانس بھر کر) اب اسکو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اسکے سوا چارا کیا ہے۔
اسلم:۔ مگر مسٹر نثار۔
نثار:۔ (بات کاٹ کر) میں ہر ذلت کو خاموشی سے برداشت کروں بس یہی ایک راستہ ہے۔ کسی برائی کی تشہیر سے کوئی فائدہ نہیں۔
اسلم:۔ مگر برائی زیادہ عرصہ تک چھپی نہیں رہ سکتی۔ آج میں جانتا ہوں کل ساری دنیا جان جائیگی۔
نثار:۔ تو پھر دنیا یہی کہے گی کہ مسز نثار اچھی عورت نہیں ہے غم صرف اس کا ہوگا کہ اس کے نام کے ساتھ میرا نام بھی شامل ہوگا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں کسقدر بزدل تھا کہ تھوڑی سی پریشانیوں سے گھبرا کر اُسے قبول کر لیا۔
اسلم:۔ پریشانیاں!
نثار:۔ جی ہاں۔ میں پریشان تھا اور زندگی سے بیزار ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس کے خاندان والوں

سے سہارا مل جائیگا مگر ـــــ

اسلم:ـ مسٹر نثار قصور آپکا نہیں تھا بلکہ ـــــ

نثار:ـ سراسر میرا قصور اور بزدلی تھی ـ آپ تو اس سے محبت کرتے تھے مجھے اس کا علم تھا مگر آپ میں اتنی جرأت تھی کہ آپ نے شادی سے انکار کردیا ـ آپ میں خود اعتمادی اور ہمت تھی مگر میں بزدل تھا کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اُسے قبول کرلیا سوچا تھا مجھے سہارا ملیگا ـ نام ملیگا (طنزیہ مسکرا کر) مگر ذہنی ناآسودگی اور ذلت کے سوا کچھ نہ ملا (ٹھنڈی سانس بھر کر) خیر چھوڑیئے

اسلم:ـ آج تو انہوں نے مجھے بھی نوٹس دیدیا ہے ـ

نثار:ـ کیا نوٹس ؟

اسلم:ـ یہی کہ میں اُن سے نہ ملا کروں ـ (کچھ دیر رُک کر انتہائی تلخ لہجے میں) میں ایک آوارہ اور بدچلن جو ٹھہرا ـ (طنزیہ) جب عورت کسی کی محبت میں پاگل ہوجاتی ہے تو اسے سب مرد آوارہ اور بدچلن نظر آنے لگتے ہیں ـ

نثار:ـ محبت میں پاگل !

اسلم:ـ جی ہاں صدیقی کی محبت میں وہ پاگل ہوچکی ہے !

(نثار کے چہرے پر ایک غمگین اور اُداس مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ خاموش رہتا ہے ـ صدیقی کمرے میں آتا ہے اور ماحول کو انتہائی سنجیدہ دیکھ کر خاموش کھڑا ہوجاتا ہے)

نثار:ـ میں اس کے راستے میں ایک دیوار ہوں جسکو وہ گرا نہیں سکتی میں نے اکثر سوچا کہ اس کے راستے سے ہٹ جاؤں مگر یہ سوچکر خاموش ہوگیا کہ پھر میرے پاس کیا رہیگا ـ نہ میری ذلت ، نہ میری مایوسی نہ میری بدنامی نہ میری ناکامی ـ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) یہ میری زندگی کی کیسی المناک ٹریجیڈی ہوگی کہ میں کسی اور کی اولاد کو اپنی اولاد کہکر پرورش کرونگا

صدیقی:ـ (غصہ اور نفرت سے) اور اس نے عمر بھر کی محبت کی قسم کھائی ہے کہ اگر وہ کبھی ماں بنے گی تو تمہارے بچے کی ماں بنے گی (نثار اور اسلم حیرت سے صدیقی کو دیکھتے ہیں) جانے آپ لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ـ (نثار اور اسلم اس طرح خاموش رہتے ہیں جیسے کوئی بڑے مجرم ہوں ـ دونوں کی نظریں جھک جاتی ہیں ـ صدیقی کچھ دیر خاموش رہکر اسلم سے) فون تمہارے لئے تھا ـ انوری پکچر پیلس میں تمہارا انتظار کررہی ہے ـ

(صدیقی غصہ سے کمرے سے باہر چلا جاتا ہے)

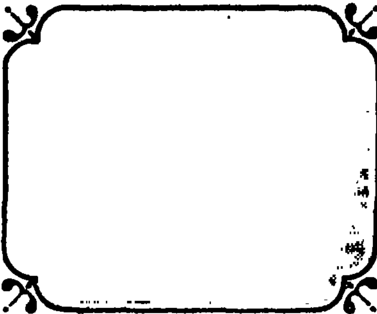
★ ـــ پردہ ★ ـــ







میں اپنے سانولے اور بے رونق چہرے کی وجہ سے پریشان تھی ...

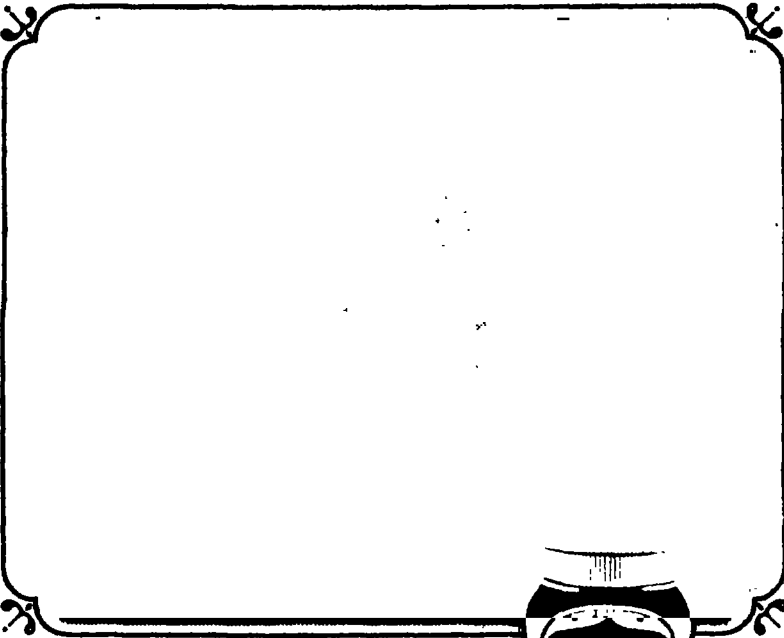


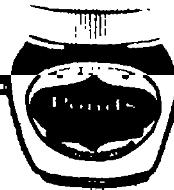
اس وقت مجھے پونڈز کے سات روزہ بیوٹی پلان کا خیال آیا!

صرف سات دن میں نہایت پُرکشش اور حسین تر چہرہ!

پونڈز

کولڈ کریم





اس کے ایک ہفتہ تک ہر رات میں نے پونڈز کولڈ کریم اپنے چہرے پر دو بار لگائی۔ پہلی مرتبہ کریم سے جلد کا گرد و غبار اور میک اپ صاف ہو جاتا ہے۔ کریم کے دوسری مرتبہ استعمال میں اصل راز ہے! اس سے جلد کے گہرے مسامات سے میل نکل جاتا ہے جو صابن اور پانی سے نہیں نکلتا ہے



چیسبرو پونڈز انکارپوریٹڈ

ڈاکٹر حسن منظر

فائل نمبر ۷

جنگلات

جلد ۳

فائل نمبر ۷ / جنگلات - جلد ۳

(جنگلی جانوروں کے تحفظ کے قانون کے تحت دیئے جانے والے لائسنس اور پرمٹ مع چڑیوں کے شکار کے اجازت ناموں کے)

صفحہ ۱

از طرف ساکنان موضع ایڈعدو
۲۸ رجولائی سنہ ۱۹۶۷ء

بنام ڈیویژنل افسر صاحب بہادر
انگالا ڈیویژن

ایک درخواست

جناب عالی ۔

ہم موضع ایڈعدو کے ساکنان پچھلے چند سالوں سے انتہائی تکلیف اور پریشانی کے حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے علاقہ میں دریا پار سے ہاتھیوں کا ایک جھنڈ وقت بے وقت داخل ہو کر ہماری فصلوں کو تاراج کرتا ہے اور اکثر اوقات راہگیروں اور کھیت میں کام کرنے والوں کے درپے آزار ہوتا ہے۔

ان جانوروں کی تعداد اب اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ جز خدا کوئی نہیں جانتا کہ اس علاقے میں کل کتنے ہاتھی ہیں ۔

ایک موقعہ پر جب ایک لڑکے کا پیچھا ایک پاگل ہاتھی نے کیا تھا اور وہ جان بچانے کے لئے بھاگتا ہوا ایک اندھے کوئیں میں جا گرا تو گھبراہٹ میں اس کی عقل کئی دن کو گم ہو گئی ۔ بعد میں اس نے بتایا رات بھر ہاتھی ہر طرف سے چنگھاڑتے رہے اور جس ہاتھی نے اس کا پیچھا کیا تھا جھک جھک کر اسے سونڈ سے پکڑنے کی کوشش کرتا رہا اور ناکام ہونے پر اس نے کوئیں میں مٹی کے ڈھیلے بھی پھینکے تھے ۔

ہمارے گاؤں میں ایک بڑا تالاب ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہو جاتا ہے اور سوکھے مہینوں اور بت جھڑ میں یہ پانی ہم لوگ پینے کے کام میں لاتے ہیں ۔ ان موذیوں نے پچھلے سال اس تالاب کو پی پی کر خالی کر دیا یہاں تک کہ تالاب کا تلہ نظر آنے لگا تھا اور ہمارے گاؤں کی عورتوں کو پانی لینے کے لئے چار کوس سے زیادہ چل کر چڑھائی چڑھ کر نزدیک کی ندی تک جانا پڑتا تھا ۔ رات ہوتے ہی ہاتھی ہی ہاتھی ہمارے کھیتوں میں آ جاتے تھے اور گنے کھا کر اسی تالاب سے پانی پیتے تھے ۔ یہ سلسلہ چھ ماہ جاری رہا اور تالاب بالکل خشک ہو گیا

اب بارشوں سے تالاب پھر بھر لیا ہے اور خطرہ ہے اگر ان بدمعاشوں سے اب بھی چھٹکارے کی کوئی صورت نہ ہوئی تو پھر وہی ہوگا اور گاؤں بھر پانی کی بوند کو ترسے گا ۔

ہمارے علاقے میں کسی کے پاس بندوق نہیں ۔ یہاں کچھ عیسائی مشنری ہیں لیکن وہ گرام سدھار کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے اور نہ ان میں سے کسی کے پاس بندوق ہے ۔ رومن کیتھولک فادر نے کئی بار امریکن پیس کور والوں سے دو ایک ہاتھی مارنے کی درخواست کی تاکہ باقی ماندہ درندے خوف زدہ ہو کر بھاگ جائیں لیکن امریکن پیس کور والوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ان کے پاس ممنوعہ جانوروں کے شکار کے لائسنس نہیں ۔

دو ماہ ہونے آئے سارجنٹ محمود نے جو رٹائرڈ فوجی افسر ہے اپنی توڑے دار بندوق سے ایک ہاتھی کو جاس کے کپاڈ تک گھس آیا تھا اور دیوار سے اپنی پیٹھ کھجا رہا تھا نشانہ کیا تھا۔ لیکن بندوق کی نالی پھٹ گئی اور خود سارجنٹ محمود کا منہ جھلس گیا۔ خوش قسمتی سے ہاتھی موصوف نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی ورنہ کام بگڑ جاتا۔

آپ سے درخواست ہے ہم سکنان موضع ایڈورو کی حفاظت و بقا کے لئے کوئی موثر قدم اٹھایا جائے تاکہ جلد سے جلد ان شیطانوں سے نجات ہو اور ہم اطمینان سے اپنے کام پر جا سکیں، بچے اسکول جانے لگیں اور عورتوں کو کوسوں پانی کی کھوج میں نہ جانا پڑے۔ ہم سب اس علاقے کے آزاد باشندے ہیں اور آپ کی توجہ اور کرم گستری کے متمنی۔

(چند دستخط اور اٹھارہ دیہاتی انگوٹھوں کے نشان)

صفحہ (۲)

صوبائی دفاتر   بنام ڈویژنل افسر
لکوجا   اکالا ڈویژن
۲ راگست ۱۹۶۴ء

اس وقت تمہارا ۳۰ جولائی ۱۹۶۴ کا خط زیر حوالہ ہے جس میں تم نے ایڈورو کے جنگلوں میں ایک نر ہاتھی کو مارنے کی اجازت طلب کی تھی۔

اس باب میں تمہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ تمہاری یہ درخواست میں محکمۂ جنگلات کے صوبائی افسر اعلیٰ کو بھیج چکا ہوں جو کہ اس پرمٹ کو جاری کرنے کا اہل ہے اور جس کے پاس وزارت حیوانات وجمادات کے مستقل سیکریٹری کے احکامات کے تحت اوّلاً یہ درخواست جانی چاہیئے۔

وہاں سے جواب آتے ہی تمہیں اطلاع دی جائے گی۔

(دستخط) ٹی۔ فرگیوسن کورٹ لینڈ

ڈویژنل افسر کا حاشیہ

محکمہ جنگلات کے صوبائی افسر اعلیٰ سے میری ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی۔ اُس نے اپنی وزارۃ کو فون کیا ہے اور وہاں سے جواب ملتے ہی مجھے فون پر آگاہ کرے گا۔

(دستخط) بابا یو امرتی   ۳ اگست ۱۹۶۴ء

ایک اور حاشیہ

ایڈورو کو مطلع کیا

(کسی نامعلوم کلرک کے دستخط)

صفحہ (۳)

ایک تار

تار کا پتہ " درخت کوجا "

ڈی ۔ او ۔ اکالا کے نام

تمہنے جو درخواست صوبائی سیکرٹری کو بھیجی تھی اس کے حوالے سے تمہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ اس اجازت نامے کی تاریخ اجراء سے تین ماہ کے اندر اندر کوئی معقول شکاری ایڈورڈ کے جنگلوں میں ایک نر ہاتھی کا شکار کر سکتا ہے۔

وقف ۔ یہاں تمہاری توجہ قانون کے سیکشن ۴۵ کی طرف مبذول کی جاتی ہے ۔ وقف ۔ مزید کارروائی سے آگاہ رکھا جائے۔

ڈویژنل افسر کا حاشیہ ؛ مسٹر اوڈانگ   سیکشن ۴۵ میرے مطالعے کے لئے پیش کیا جائے ۔

متعلقہ کلرک کا حاشیہ :۔ فرودی سرکلر کے لئے صفحہ ۴ دیکھئے ۔

(دستخط اوچ اوڈانگ)

صفحہ ۴

جنگلی جانوروں کا قانون مجریہ ۱۹۶۳   (۱۹۶۳ کا نمبر ۱۹)

حکومت کی ملکیت کو ٹھکانے لگانے سے متعلق ہدایات

اس قانون کی ایک شق کے ماتحت بغیر لائسنس بعض مخصوص حالات میں ایک ممنوعہ جانور کا شکار کیا جاسکتا ہے ۔ لائسنس کی قید سیکشن ۷ کے تحت ہے لیکن سائنسی تحقیق، نظم ونسق کی برقراری اور جان ومال کی حفاظت کے لئے سیکشن ۱۱ ، ۵ اور ۴۴ کے تحت محفوظ اور ممنوعہ جانور بھی پکڑے یا مارے جاسکتے ہیں ۔

اسی قانون کے تحت ایسے ممنوعہ اور محفوظ جانور کی لاش پانے والے فرد یا افراد کے لئے بھی احکامات موجود ہیں یعنی ان تمام مخصوص حالات میں جب شکار کا لائسنس حاصل نہ کیا گیا ہو یا مندرجہ بالا مقاصد میں سے کوئی ایک پیش نظر ہو تو پائی جانے والی یا شکار کئے ہوئے جانور کی لاش حکومت کی ملکیت متصور ہوگی (سیکشن ۴۰)

نظم ونسق کی برقراری کے لئے مارے ہوئے جانور کی لاش حکومت کی ملکیت متصور ہوگی اور شکار کا محافظ اہل کار اُسے فروخت کر کے رقم سرکاری خزانے میں داخل کرے گا (سیکشن ۵۰)

سیکشن ۱۱ ، ۴۲ اور ۴۳   شکاری سیکشن الف کی رو سے اور لاش پانے والا فرد ۴۲ اور ۴۳ کے تحت اگر لائسنس یافتہ نہیں ہیں اور ان میں سے کوئی سیکشن ۵ کی رو سے بھی شکار کھیلنے کا مجاز نہیں تھا تو کشتہ جانور کی لاش حکومت کی ملکیت متصور ہوگی جیسا کہ اوپر سیکشن ۴۰ کے تحت درج کیا گیا ہے اور مندرجہ بالا طور ہی سے فروخت ہوگی ۔

سیکشن ۴۴   اگر مرنے والا ہاتھی نہیں تھا اور مارنے والا سرکاری ملازم نہیں ہے تو لاش بلا تکلف مارنے والے کو دی جاسکتی ہے ۔ بصورت دیگر حکومت لاش کی قیمت کا ۵۰ فیصدی تک مارنے والے کو انعام دے کر لاش خود رکھ سکتی ہے ۔

اگر کشتہ جانور ہاتھی تھا تو دانت سیکشن ۵۴ کے تحت جنگلات کے صوبائی محافظ شکار کے حوالے کئے جائیں گے اور لاش مندرجہ بالا طریقے سے ٹھکانے لگائی جائے گی ۔ بحالیکہ مارنے والا سرکاری ملازم ہے تو یہ کام اس کے فرائض میں شمار ہوگا اور لاش کی قیمت سرکاری خزانے میں داخل ہوگی ۔

سیکشن ۵ یا ۱۴ کے تحت پکڑا ہوا جانور حکومت کی ملکیت متصور ہوگا اور کسی چڑیا گھر یا تحقیقاتی ادارے کے سپرد کیا جائے گا۔
سیکشن (۳) ۱۴ لاش پانے پر انعام کی رقم لاش کی قیمت فروخت کے نصف سے متجاوز نہیں ہونی چاہیئے۔

(دستخط) جون ہیورسیک
چیف کنزرویٹر محکمۂ جنگلات

۲ جون ۱۹۶۳ء

صفحہ ۔ ۵

از طرف مسٹر بولاولال
معرفت انورگنگم پرائمری اسکول
انورگنگم
اگالا ڈیویژن

۱۶ اگست ۱۹۶۴ء

بنام ڈیویژنل افسر صاحب بہادر
اگالا ڈیویژن
(عالیجناب بابا یوامرتی کی توجہ کے لئے)

جناب عزیز ۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میری بیویاں اور بچے اور کنبے کے جملہ افراد جو سب کے سب آپکو آپکے بچپن سے جانتے ہیں آپکے حق میں دعاگو ہیں کہ آپ، میڈم اور پانچوں بچے خیریت سے ہوں ۔

اگر آپ مجھے بھول گئے ہیں تو میں آپ کو یاد دلا سکتا ہوں کہ آپ اور میں دونوں ایک ہی گاؤں اور ضلع کے باشندے ہیں اور آپ کی والدہ مرحومہ کو میں آپکے باپ کے لئے بیاہ کر لایا تھا ۔ اور آپ کا باپ اور میں حالاں کہ مختلف قبیلوں سے تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کو ایسا جانتے تھے گویا ایک باپ اور ایک ماں سے ہوں ۔

مجھے معلوم ہے آپ بہت مصروف آدمی ہیں اور آپ کا وقت ضائع کرنے کا مجھے اختیار نہیں لیکن اسوقت میں مجبور ہو کر یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ہمارے اطراف میں چیتو پوٹیس بہت بڑھ گئے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے اکیلے دریائے انمبرا میں کچھ نہیں تو کئی سو ہونگے ۔ خود میں نے ایک بھی چیتو پچھلے چند سالوں میں دریا میں نہیں دیکھا ہے لیکن اس کی وجہ دوسری ہے ۔ میرا عرصہ سے دریا کے نزدیک یا پار جانے کا اتفاق نہیں ہوا ۔ البتہ میری سب سے چھوٹی بیوی، جب کینو میں دریا پار کر رہی تھی تو اس نے ایک سیاہ چیتو کو پانی کی سطح سے سر اٹھائے دیکھا تھا ۔ گاؤں کے دوسرے افراد بھی مجھے معلوم ہے مجھ سے کہنے میں اتفاق کریں گے کہ دریا میں چیتو اتنے ہی ہیں جتنی مچھلیاں ۔

ان چیتوؤں سے ہم سب کی جان ضیق میں آگئی ہے ۔ کیونکہ رات ہوتے ہی یہ درندے پانی سے نکل نکل کر ہمارے مکئی کے کھیتوں میں آن پڑتے ہیں اور رات بھر ہمیں مکئی کے ڈنٹھلوں کے چٹخنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں ۔ اس کے علاوہ ان کے فضلے سے جو کہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں ہمیں ڈر ہے کہ کوئی منحوس بیماری جلد ہی پھیلنے والی ہے مثلاً چیچک یا طاعون ۔

پچھلے سال ایک شکاری نے جو کسی اور علاقے سے اس طرف آیا تھا اور جس کے پاس محفوظ جانوروں کو مارنے کا لائسنس بھی تھا ایک بڑے سے نر چیتو کو انورگنگم کے دلدلی علاقے میں شکار کیا تھا ۔ یہ چیتو اتنا بڑا تھا کہ اگر کسی خشک جگہ پر بھی مارا گیا ہوتا تو اس کی لاش اٹھانے کے لئے کرین اور لیجانے کو ٹرک درکار ہوتی ۔ میرا خیال ہے اس چیتو میں (جو ہماری مکئی کھا کھا کر پلا تھا) کئی مکانی بیلوں

جتنا گوشت تھا۔ چنانچہ جب اس شکاری نے گوشت بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے گاؤں کے امن پسند لوگوں اور بلا نہ جانے والی عورتوں نے ایک خفیہ میٹنگ کی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ چیتو ہمارے بچے کھا کر فربہ ہوا تھا اس لئے اس کا گوشت ہمیں ملنا چاہیئے اور شکاری چاہے تو کھال ورنہ حکومت اس کی کھال جیسا کہ کہا جاتا ہے بطور ٹرافی لیجائے ہمیں اعتراض نہ ہوگا کیونکہ کھال بہرحال نمائش کی چیز ہے اور ہمارے نزدیک غیر ضروری۔

اس لئے جب شکاری نے گوشت بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہم سب نے کہا جب تک میڈیکل افسر آکر پاس نہ کر دے ہم گوشت نہیں خرید سکتے مجبوراً شکاری نے اپنے لڑکے کو میڈیکل افسر کے پاس دوڑایا جو یہاں سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر رہتا ہے۔ اس کے آنے جانے میں کئی گھنٹے لگ گئے اور لاش پر مکھیاں گرنے لگیں۔ دوپہر کے بعد یورپین ڈاکٹر انورگنگم اپنی موٹر میں پہنچا اور وہاں سے آگے سائیکل پر دو میل کھیتوں میں لیجایا گیا۔ پھر دلدل شروع ہو جاتی ہے اور آگے اس میں بوٹوں سمیت جانا پڑا۔ چنانچہ جب وہ لاش کے پاس پہنچا تو ہانپا ہوا تھا اور پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں درخت اتنے بلند اور گنجان ہیں کہ دن میں بھی اندھیرا رہتا ہے اور جھینگر کاٹ کاٹ کر بوٹیاں اڑائے دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر کو لاش ٹھیک سے نظر بھی نہیں آرہی تھی بہرحال اس نے شکاری سے کہا جب تک گوشت ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے سامنے کسی خشک جگہ پر نہ رکھا جائے وہ سرٹیفکیٹ نہیں دے گا۔

جبراً قہراً شکاری کو وہیں قصاب بننا پڑا اور اس کام میں بہت سے آدمیوں اور لڑکوں نے خوشی خوشی اس کا ہاتھ بٹایا۔ اب مسئلہ گوشت کو سڑک تک لیجانے کا تھا۔ یہاں پھر ہمارے گاؤں والوں کی خوش خلقی کام میں آئی اور ہر آدمی رضاکارانہ گوشت کے بُچّے اٹھانے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ جب یہ قافلہ دلدل میں روانہ ہوا تو سوائے ڈاکٹر کے ہر فرد کے سر پر گوشت کا ایک بُچّا تھا۔ اور قافلہ سالاری کے فرائض خود اجنبی انجام دے رہا تھا۔ لیکن جب ہم سڑک پر پہنچے تو سوائے مجھ سمیت دو ایک بڈھوں میڈیکل افسر اور شکاری کے وہاں کوئی اور نہ تھا اور چیتو کا نشان مٹ چکا تھا۔

چنانچہ ان حقائق کی روشنی میں یہ درخواست لکھ کر میں آپ سے دو نوازشوں کا خواستگار ہوں

۱۔ میرے بھتیجے یوسفو والا کو جو ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء کو یہاں ایک مہینے کی سالانہ چھٹی پر آئے گا اور جس کے پاس شکار کا لائسنس بھی ہے ایک عدد نر چیتو پوشیس مارنے کا اجازت نامہ عطا فرمایا جائے۔ اس درخواست کے ہمراہ ایک کراسڈ پوسٹل آرڈر ۲ پونڈ رقم کا جو کہ پہلا چیتو مارنے کی فیس ہے ملفوف ہے۔

۲۔ چونکہ شکار کے بعد میڈیکل افسر کے پاس اطلاع بھیجنے اور ان کے آنے میں کئی گھنٹے ضائع ہوتے ہیں اور آج کل سخت گرمی کی وجہ سے تھوڑی ہی دیر میں گوشت کے خراب ہو جانے کا احتمال رہتا ہے اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ مجھے گوشت کو فروخت کرنے کا پرمٹ بھی صادر کیا جائے۔ بسا اوقات میڈیکل افسر کے دورے پر چلے جانے کی بنا پر اُن سے رابطہ ناممکن ہو جاتا ہے اس لئے اس پرمٹ کا پہلے سے لے لیا جانا اور بھی ضروری ہے۔

ان درخواستوں کی منظوری اور اس خط کو توجہ سے پڑھنے پر میں میری بیویاں اور بچے تاعمر آپ کی درازئ عمر اور میڈم اور بچوں کے لئے دعائے خیر مانگیں گے اور میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کی بیویوں اور بچوں کی تعداد میں مستقل اضافہ ہوتا رہے اور آپ کا کنبہ ایک دن آپ کے باپ کے کنبے سے بھی بڑھ جائے جو اپنے زمانے میں دور و نزدیک سب کے لئے باعث رشک تھا۔

آپ کا مخلص اور تابعِ فرمان
مسٹر یعقوبو لامانی
معرفت افورگنگم پرائمری اسکول
افورگنگم براستہ ایڈورو
اگالا ڈویژن

ڈویژنل افسر کا نوٹ :- فوری کارروائی کی جائے
(دستخط) بابا یوامرتی ۱۲ اگست ۱۹۶۲ء

صفحہ - ۶

"ڈویژنل افسر کا خط صوبائی افسر جنگلات اور قومی محافظ شکار کے نام"

اگالا ڈویژن
۱۲ اگست ۱۹۶۲ء

مجھے یہ لکھنے میں مسرت ہے کہ کل یہاں ایک ہاتھی کا بچہ ایڈورو کے جنگلوں میں پکڑا گیا ہے جس کی ماں حادثاتی طور سے شکار کے دوران ماری گئی تھی۔ یہ اقدام محکمۂ جنگلات کے صوبائی افسر اعلیٰ سے اجازت مل جانے پر کیا گیا ہے۔ بچہ خیریت سے ہے اور فی الوقت یہاں کے سردار معطا گالا کے محل میں رکھا گیا ہے جہاں اس کی دیکھ بھال پولیس کے سپاہی میڈیکل افسر کی نگرانی میں کر رہے ہیں۔ مناسب انتظام ہو جانے پر بچے کو قومی چڑیا گھر جوس بھیج دیا جائے گا۔ اس باب میں صوبائی سیکرٹری پہلے ہی وزارۂ حیوانات اور جمادات کو ایک مراسلہ بھیج چکے ہیں۔

آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ قومی چڑیا گھر کے نگراں سے مشورہ کر کے مجھے بچہ کی خوراک سے متعلق ہدایات بذریعہ تار بھیجی جائیں

(دستخط) بابا یوامرتی
ڈویژنل افسر

صفحہ - ۷

ایک تار

تار کا پتہ "جانور" جوس
ہاتھی کے بچے کو تین پائنٹ پانی دقف تو آونس دودھ کا پاؤڈر دقف پاؤ پاؤنڈ مکھن اور چٹکی بھر پوٹاسیم سلفیٹ چار چار گھنٹے کے وقفہ سے دیا جائے۔

صفحہ - ۸

"محکمۂ جنگلات کے صوبائی افسر اعلیٰ کا خط ڈویژنل آفیسر اگالالا کے نام"

سارجنٹ سیسن باگانانے جو مقامی لشکر پولیس میں سپاہی کی حیثیت سے پچھلے ۴ سال سے کام کر رہا ہے دو سیلنے ہاتھی مفرور کرنے اور مارنے اور ایک بچے کو پکڑنے کا اقرار کیا ہے۔ یہ بچہ ۱۷ اگست ۱۹۶۴ء کو مطا اگالالا کے محل میں لیجایا گیا تھا جہاں اس کی پرورش میڈیکل آفیسر کے سپرد ہوئی تھی۔ اسوقت میری اطلاع کے مطابق وہاں تماشائیوں کا ایک ٹھٹ لگ گیا تھا اور دارالخلافہ سے شائع ہونے والے چند اخبارون نے جو ہمیشہ ایسے ہی موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں اس خبر کو "اگالالا میں ہاتھی کے بچے کی نمائش" کے عنوان سے چھاپا تھا۔ یہ خبر وزارۂ حیوانات اور جمادات کے بعض حلقوں میں خاصی تشویش سے پڑھی گئی کیونکہ بچے کے پکڑے جانے کا مطلب یہی لیا جاسکتا ہے کہ اس کی ماں مرنے والے ہاتھیوں میں سے ایک تھی۔ اگر واقعات یوں ہی ہیں تو سارجنٹ سیسن باگانا ایک خلاف قانون حرکت کا مرتکب ہوا ہے۔

مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس بچے کو "قومی چڑیا گھر جوس" کے حوالے کرنے کا پروگرام تھا اور چونکہ اگالالا سے براہ راست کوئی ریل گاڑی جوس نہیں جاتی اور ایڈورڈ کے جنگلوں سے مطا گالالا کے محل تک لینڈ روور میں لیجائے جانے پر بچے نے الٹیاں شروع کردی تھیں اس لئے اس کے سفر کے لئے ہوائی جہاز کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ اس اثناء میں بچے کو ایک خالی مکان میں رکھا گیا جہاں میڈیکل آفیسر کی اطلاع کے مطابق اُسے سپاہیوں نے ٹھنڈا دودھ پلا پلا کر اور رات بھر سردی میں سکڑا کر مار ڈالا اور بعد میں بچے کی کھال قومی عجائب گھر جوس کو بھیجی گئی۔

ہاتھی کا بچہ قانون کی رو سے محفوظ جانور ہے اور سوائے سیکشن ۵ ۱۱ اور ۴۴ جنگلی جانوروں کے قانون مجریہ ۱۹۶۳ء کے کوئی اُسے پکڑنے یا مارنے کا مجاز نہیں۔

ایڈورڈ کے جنگلوں میں ایک ہاتھی کا بچہ پکڑ کر سارجنٹ مذکور نے قانون شکنی کی ہے جس کی سزا سیکشن ۵۳ کے تحت ہے اور وہ اس سزا کا متوجب ہے۔

سیلنے ہاتھی بھی ممنوعہ اور محفوظ جانور ہیں اور سیکشن ۵ ، ۱۱ اور ۴۴ کے اجازت نامے کے کوئی شخص انہیں شکار کرسکتا ہے نہ صید جز سیکشن ، (۱) کے۔

سوائے اس کے کہ سارجنٹ مذکور اگالالا میں ہاتھی کے شکار کا ایک قابل منظور لائسنس پیش کرے اس کا یہ فعل خلاف قانون ہے اس کے علاوہ سارجنٹ سیسن باگانانے ایک بچے والی ہتھنی کو شکار اور بچے کو گرفتار کیا۔ یہ سیکشن ۹ کی خلاف ورزی ہے اور اس پر اُسے سو پونڈ تک جرمانہ یا چھ ماہ کی قید یا دونوں سزائیں ہوسکتی ہیں۔ صوبائی صدر مقام کے اندراجات سے پتہ چلتا ہے کہ اگالالا میں کسی کو پچھلے چند ماہ میں ہاتھی کے شکار کا لائسنس نہیں دیا گیا تھا۔ اس لئے سارجنٹ باگانا سے ایک ایک جُرم سرزد ہوا ہے۔

میں نے اپنے ۱۸ اگست ۱۹۶۴ء کے تار میں تمہیں اجازت دی تھی کہ کوئی معقول شکاری اجازت نامے کی تاریخ اجراء سے تین ماہ کے اندر اندر ایڈورڈ کے جنگلوں میں ایک نر ہاتھی کا شکار کرسکتا ہے اور تمہاری توجہ قانون کے سیکشن ۴۵ کی طرف مبذول کرائی گئی تھی۔ اگر سارجنٹ مذکور اسی فری پرمٹ کے بوتے پر ایڈورڈ ہاتھی مارنے گیا تھا جو تمہیں دی گئی تھی تو بہت بڑا ہوا۔ کیا تم مقامی لشکر پولیس کے ایک سپاہی پر بھروسہ کر بیٹھے تھے؟ اگر صاحب منصب لائسنس کے وہاں ہرگز جانا چاہیے تھا

تسے وضاحت کی جاتی ہے کہ مقامی پولیس سے رابطہ پیدا کرکے سارجنٹ سیمن باگانا کا بیان لو اور پھر میں کسی فیصلے پر پہنچ سکوں گا۔

(دستخط) الحسن زاویا
افسر اعلیٰ صوبائی محکمۂ جنگلات
صوبہ کاپا

ڈویژنل افسر کا حاشیہ :-

صوبائی محکمۂ جنگلات کے افسر اعلیٰ کے اس خط کی نقول مطاگالا اور دیہی زمین اور جنگلات کے مقامی کاؤنسلر کو بھیجی جائیں جو سارجنٹ سیمن باگانا کو طلب کرکے اس کا بیان لینے کے مجاز ہیں۔

(دستخط) بابا یوامرتی ۰
۲۷ اگست ۱۹۶۲ء

صفحہ - ۹

سارجنٹ سیمن باگا کی واردات سے متعلق ایک یاد دہانی

صفحہ - ۱۰

ایڈعدو کے جنگلات میں ایک بچے والی ہتھنی مارنے اور بچہ کو صید کرنے کی واردات سے متعلق ایک اور یاد دہانی ---- دیہی زمین اور جنگلات کے مقامی کاؤنسلر کا ایک نوٹ :-

"فائل بہت دن کی ہز ایکسیلینسی مطاگالا کے محل میں گئی ہوئی ہے جب تک وہاں سے جواب نہ آئے میں مزید اقدام سے معذور ہوں،

(دستخط) بابا ٹنڈے اوکفوراجی

صفحہ - ۱۱

محکمہ زراعت
پوسٹ بکس ۳۱
اکپا
۱۱ اگست ۱۹۶۲ء

ڈیئر جان

تمہارا خط لورا کے لندن سدھارنے سے ایک دن پہلے آیا تھا اس وقت میں سامان بندھوانے میں معروف تھا اور میرا خیال ہے وہ خط لورا کے ساتھ ہی لندن چلا گیا۔ بہرحال خط کا مضمون اب بھی میرے ذہن میں ہے۔

مجھے یاد تھا کہ تمہارا سوئمنگ پول کا کارڈ اور بوٹ کلب کے کاغذات میری میز کی دراز میں پڑے ہیں۔ اس وقت دوسرا لفافہ جو بھیجا جا رہا ہے اس میں کارڈ اور کاغذات رکھ دوں گا۔ مجھے امید ہے جیکی آرمی ہیڈ کوارٹرز جا کر دونوں کی توسیع کرالے گا۔

یہاں آج کل وقت گھونگھے کی چال چل رہا ہے اتوار کو حارثلیز اور فوسا تھیز اور میں دریا میں کشتی پر مچھلی کے شکار کو چلے جاتے ہیں۔ کینیڈین فادر رینڈ اور آئیرش سسٹرز کو چھوڑ کر یہاں ہم تین ہی غیر ملکی ہیں۔ چوتھے فیچ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے کیونکہ وہ بربجسے ناواقف ہے۔ نورا کی غیر موجودگی میں باورچی خانہ میری تحویل میں ہے اور پکانے کے نت نئے تجربوں سے تو ندگھٹ رہی ہے اور مغز چڑھ گیا ہے۔ تمہاری توند کا کیا حال ہے؟

میرا خیال ہے تم میرے بڑے لڑکے المین سے نہیں ملے ہو وہ شکار کا دھنی اور کھیلوں کا رسیا ہے اور ایک ماہ کی چھٹی پر دسمبر میں نورا کے ہمراہ میرے پاس آ رہا ہے۔ مجھے لکھو آیا اس کے لئے ہاتھی کے شکار کا بندوبست ہو سکتا ہے؟

میں تمہیں ۳۵ پونڈ کا ایک کراسڈ چیک بھیج رہا ہوں جس میں پہلا اور دوسرا ہاتھی مارنے کی فیس علی الترتیب ۱۵ اور ۲۰ شامل ہیں۔ میں ممنون ہوں گا اگر تم محکمۂ جنگلات کے صوبائی افسر اعلیٰ سے وقت نکال کر خود مل لو تاکہ لائسنس ملنے میں دقت نہ ہو۔ المین پچھلے چھ ماہ سے مُصر ہے کہ اس دفعہ اسے ہاتھی پر نشانہ لگانے کا موقعہ ضرور ملنا چاہیئے۔ اگر اُسے یہ موقعہ نہیں ملا تو تم اچھی طرح جانتے ہو نورا اور وہ ملکر کسکو نشانہ بنائیں گے۔

جیکی کو پیار تمہارا جیف راجر

دفتر ڈیویژنل افسر
اگالا ڈیویژن
ستمبر ۱۹۶۴ء

مسٹر جیف راجر
صوبائی افسر محکمہ زراعت
پوسٹ بکس ۳۱
انکیپا

ڈیئر مسٹر راجر
آپ کے ۱۱ اگست ۱۹۶۴ء کے نیم سرکاری مراسلے کے حوالے سے جو مسٹر جان کومن صوبائی انجینئر کو جا کے نام تھا آپکو اطلاع دی جاتی ہے کہ آپکے صاحبزادے مسٹر المین راجر ایلمورو کے جنگلات میں دسمبر ۱۹۶۴ء کی کسی تاریخ کو دو نر بالغ ہاتھی شکار کر سکتے ہیں۔

لائسنس اور ۳۵ پونڈ کی رسید اس اجازت نامے کے ساتھ منسلک ہیں۔

مزید تفصیلات کے لئے آپ کسی دن صبح کو دس اور بارہ بجے کے درمیان خود اس دفتر میں تشریف لا کر متعلقہ کلرک سے گفتگو کر سکتے ہیں

(دستخط) بابا یوامرتی
ڈیویژنل افسر

صفحہ ۔ ۱۳

موضع کپانچے
ضلع باساکومو
کپانچے ۱۸ ستمبر ۱۹۶۷ء

بخدمت جناب ڈیویژنل افسر صاحب بہادر
اکالا ڈیویژن

ایک درخواست

جناب والا

عرضداشت سے پیشتر میں موضع کپانچے کے جملہ سکنان کی جانب سے آپکی خدمت عالیہ میں آداب خادمانہ پیش کرتا ہوں اور ہم سب امید رکھتے ہیں کہ آپ اور آپ کی بیویاں اور بچے خیریت سے ہوں گے اور علاقے میں امن و امان ہوگا جس کی آپ سے ہمیشہ توقع رکھی جاتی ہے اور جس کے لئے ہماری حکومت نے آپکو وہاں تعین کیا ہے۔

درخواست سے پیشتر یہ عرض کرنا بھی نہایت ضروری ہے کہ ان اطراف میں ہر لحاظ سے امن اور سکون ہے اور یہاں کے آزاد باشندے آپ کے انتظام سے قطعاً مطمئن ہیں۔

اما بعد جیسا کہ آپ جانتے ہیں دریائے بینوئے ہمارے علاقے کو چھوتا ہوا بہتا ہے اور یہاں کی معیشت کا دارومدار بہت کچھ دریا اور دریا کے سفر پر ہے۔ ہمارے یہاں پینٹھ ہر چوتھے روز لگتی ہے جس میں دریا پار سے بکثرت مرد عورتیں اور بچے شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح دریا پار کے گاؤں کی پینٹھوں اور ہاٹوں میں سامان بیچنے کے لئے ہماری مائیں اور باپ اور دیگر آزاد باشندے تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز کشتی کا سفر کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے باساکومو کے اکثر باشندے ماہی گیری بھی کرتے ہیں اور ان کی راتیں اور دن دریا پر بسر ہوتے ہیں۔

غرضکہ ہمارے علاقے کے لوگوں کی گذر بسر بہت کچھ دریا کے رحم اور کرم پر ہے اور ابھی تھوڑے عرصہ تک اس میں شکایت کی جا نہ تھی لیکن اب کچھ دنوں سے یہاں ایک عجیب بلائے ناگہانی دریا میں نمودار ہوئی ہے جس سے بچنے کا ہم میں یارا نہیں اور جس کے ہوتے ہوئے دریا کا سفر ناممکن ہے۔

سب سے پہلے یہ بلا ایک ماہی گیر معلم احمد و انگپا نے دیکھی تھی جو پو پھٹے اپنی کینو میں کھڑا ہو کر جال پانی میں پھینک رہا تھا۔ اس کے سامنے کوئی اژدھے کے قسم کی چیز پانی سے ابھری اور چیخ مار کر دوبارہ پانی میں چھپ گئی۔ جثہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے ابھرنے اور ڈوبنے سے جو حرکت پانی میں ہوئی وہ جوار بھاٹے کے تناسب کی تھی اور ماہی گیر کی کینو ڈوبتے ڈوبتے بچی۔ پہلے تو معلم احمد سمجھا کوئی بڑا گھڑیال ہے جو اس کی طرف لپک رہا ہے لیکن بلا کی دُم دیکھ کر اُسے یہ خیال تبدیل کرنا پڑا اور چونکہ وہ اس نوعیت کی مخلوق سے پہلے آشنا نہ تھا اس لئے اُس نے وہاں سے بھاگنے ہی میں خیریت سمجھی اور کسی طرح کنارے تک پہنچ کر کینو کو بغیر باندھے گھر کی جانب دوڑا۔ بعد میں

.... وہ کئی دن تک بخار کا شکار رہا جو یقیناً دہشت کا نتیجہ تھا۔

اس کے بعد سے اس بلا کو جسے انکول والے بیتیا پنینیٹی (م ی ن ی ٹ ی) کہتے ہیں اور بہت سے آدمیوں نے دیکھا ہے۔ ایک موقع پر اس نے مسافروں سے بھری ہوئی ایک کشتی کا پیچھا بھی کیا تھا لیکن خوش قسمتی سے کنارہ نزدیک تھا اور ملاحوں نے فوراً کشتی کا رخ موڑ دیا۔ کنارہ پاتے ہی مسافر جھاڑیوں میں چھپ گئے اور بلا کچھ دیر آس پاس منڈلا کر دوبارہ پانی میں غوطہ مار گئی۔

یہ مینیٹی کیٹھوا ور کشتیوں کا پیچھا اتنی مرتبہ کر چکی ہے کہ اب رات تو رات دن میں لوگ دریا کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے ہیں اور ہماری پینٹھ میں دریا پار سے شریک ہونے کے لئے بمشکل دس بیس نظر آپاتے ہیں اور وہ سرِ شام واپس جانے کی سوچتے ہیں۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ کھانے کی چیزیں منقا ہو گئی ہیں اور تازہ مچھلی نایاب ہے۔

یہاں تک پھر بھی خطرے کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ کسی قسم کی خونی واردات نہیں ہوئی تھی لیکن پچھلے جمعہ کو مقامی ڈسپنسری اٹینڈنٹ کا ۱۰ سالہ لڑکا جوزف دریا کے کنارے اُگے ہوئے ایک درخت پر کسی کام سے چڑھا اور پیر پھسل جانے سے دریا میں جا گرا تب سے اس کی کوئی اطلاع نہیں ہے اور نہ ہی کسی نے اس کی لاش کو پانی سے ابھرتے دیکھا۔ چونکہ جوزف اچھا تیراک تھا اور کیلپنچ کے آس پاس دریا میں دوسرے گوشت خور جانور بھی نہیں ہیں اس لئے خیال کیا جا رہا ہے کہ مینیٹی نے اُسے درخت پر چڑھتے دیکھ لیا تھا اور وہ کنارے کے پاس پانی میں چھپی بیٹھی تھی اور بالآخر اُسی نے جوزف کو ٹھکانے لگایا۔

ہم باشندگانِ موضع کیلپنچ ضلع باساکو مو جو آپ کی کرم گستری کے پہلے سے معترف ہیں آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں جلد از جلد اس بلائے ناگہانی سے نجات دلائی جائے اور دریا کو اس نحوست سے پاک کرنے کے بعد مرحوم جوزف کی لاش بھی غوطہ خوروں کے ذریعے ڈھنڈوائی جائے تاکہ ایک بار پھر ہم امن اور یکسوئی سے اپنے اپنے کام پر جانے لگیں۔

ہم ہیں آپ کے تابع فرمان
(کچھ دستخطیں اور چند دہقانی انگوٹھوں کے نشان)

صفحہ - ۱۴

معرفت دیہی ڈسپنسری
اوجیا ناگا، اوجیا پاٹا
اومیانی
اگالا ڈویژن
۱۰ نومبر ۱۹۶۴ء

بنام ڈویژنل افسر صاحب بہادر
اگالا ڈویژن

ایک درخواست

جنابِ والا۔

ہم اومیانی کے آزاد باشندے آپکو ہدیۂ سلام پیش کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ حضور مع اہلیہ، جملہ اہلِ خانہ اور دیگر احباب کے

بخیر و عافیت ہونگے اور علاقے میں امن و امان ہوگا۔ یہ بات ہمیشہ ہمارے لئے باعث سکون رہی ہے کہ اب جبکہ انگریز ہمارے آزاد ملک سے جا چکے ہیں خود ہمارے ہی علاقے کا ایک نوجوان ہمارا ڈپٹی کمشنر افسر ہے جس سے بجا طور سے بہتری کی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں اور جو دن رات ہماری بہبودی کے لئے کوشاں ہے۔

خود ان اطراف میں مکمل امن ہے کسی قسم کی چوری چکاری خون و قتل و غارت کی واردات عرصے سے سننے میں نہیں آئی اور نہ ہی ہمارے ابا لوگ سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ یہ علاقہ بدنام سیاست دانوں کی آماجگاہ بنے اور وہ لوگوں کو ہنگاموں پر اکسائیں۔

تاہم یہ کہنے میں کچھ مضائقہ نہ ہوگا کہ جس طرح مکئی کے دانوں میں کبھی کبھی ایک آدھ کنکر مل جاتا ہے جس سے آٹے کا لطف وقتی طور سے جاتا رہتا ہے ہمارا سکون بھی فی الوقت مکمل نہیں اور اس میں شامل کوئی چیز دانتوں تلے کرکرا پیدا کر رہی ہے۔ یہ چیز ہے علاقے کے جنگلی سوروں کا آزار۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ آپ کا یہاں آنا جولیس سیزر کا آنا ہے اور آپ کے سامنے سکون برہم کرنے والی کوئی فوج دو گھڑی نہیں ٹھہر سکتی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ نپولین بوناپارٹ سے مشابہت رکھتے ہیں جس کا جذبۂ انتقام ہر دشمن کو دیکھ کر بھڑک اٹھتا تھا اور آپ اُسی کی طرح اپنے ارادوں پر قادر ہیں۔

اوجیا ٹانگا، اوجیا پا ملک کے بیشتر باشندے جیسا کہ آپ کو علم ہوگا مسلمان ہیں اور سوروں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اس لئے یہ ملعون پچھلے چند سالوں میں اتنے بڑھ گئے ہیں کہ یہ جس کھیت میں گھس جاتے ہیں اس کا وہیں کھلیان ہو جاتا ہے اور مکئی کے تو دشمن ہیں کہ جہاں پہلے کھڑے کھیت لہلہاتے تھے اب ڈنٹھلوں کے انبار ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے خوف سے بندر، سانپ اور چوہے تک یہ علاقہ خالی کر گئے ہیں اور یہ مردود ہیں کہ ان میں سے ایک ایک ہاتھی کا جثہ رکھتا ہے۔ جدھر یہ نکل جاتے ہیں رونے پیٹنے کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں اور ڈر ہے کہ آئندہ چند مہینوں میں یہاں قحط نہ پڑ جائے۔

ہمارے یہاں بندوق رکھنے والا کوئی نہیں۔ دو بالوں نے ایک بند دروازہ ہوا تیر کمانوں کے بوتے پر ہمیں ان موذیوں سے نجات دلانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ رات کو جب معمول کے مطابق سوروں نے ایک گنی کورن کے کھیت پر دھاوا بولا تو ان دونوں نے جو پہلے سے ایک درخت پر چھپے بیٹھے تھے ایک موٹے جانور کو نشانہ بنایا اور پیہم تیر مارے۔ لیکن ایسا لگتا تھا اس جانور کی کھال ربڑ کی بنی ہوئی ہے جس پر تیر بے اثر تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جانور تو مرا نہیں سوروں نے درخت کو گھیرے میں لے لیا اور گھنٹوں محاصرہ کئے رہے۔ اگلے دن کہیں درخت سے اترنا نصیب ہوا۔

تب سے ہمارے بھائی اور باپ ان جانوروں سے ٹکر لیتے ہوئے گھبراتے ہیں اور آپ سے ملتجی ہیں کہ ہمیں جلد از جلد ان موذیوں سے نجات دلائی جائے۔

ہم یقین دلاتے ہیں اگر چند یورپین شکاری یہاں دو ایک دن کے لئے بھیج دیئے جائیں تو وہ اتنا گوشت اپنے ہمراہ لے جا پائیں گے جو ہفتہ دس دن کو انہیں کافی ہوگا اور ہم بھی اطمینان کی نیند سو سکیں گے۔ ایک بار پھر آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ معاملہ عجلت طلب ہے اور بن کچھ کئے کچھ بن نہ سکے گا۔

ہم ہیں آپکی رعایا

دستخط معلم یعقوبو (دونو)، معلم ابراہیم ڈمباٹا (رنڈاکی)

معلم یحییٰ لیوازاریا (ڈسپنسری اسسٹنٹ)، اور چند انگوٹھوں کے نشان

صفحہ - ۱۵

دفتر ڈویژنل افسر
اگالا ڈویژن
حوالہ ج اگ/۲/۱۴/۲-س/۲۲۱ جلد ۳
۱۵ نومبر ۱۹۶۴ء

بنام عالیجناب ادتو آف کپانچے
ضلع کپانچے
باساکومو

<u>دریائے بینوئے میں مینٹی</u>

آپ لوگوں کی مشترکہ درخواست نوشتہ ۸ ستمبر ۱۹۶۴ء کا شکریہ جس میں میری توجہ دریائے بینوئے میں مینٹی کی موجودگی کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔

اس باب میں باساکومو کے باشندوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ درخواست ملتے ہی دریائی پولیس کی ایک کشتی متعلقہ علاقے میں تعینات کی گئی تھی جس نے متعدد بار دریا کا سفر شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی جانب کیا لیکن باوجود سعئی بسیار کے دریائے بینوئے میں مینٹی کی موجودگی کی تصدیق نہیں کی جا سکی۔

اگر یہ فتنہ دوبارہ سر اٹھائے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میرا محکمہ ہر وہ کارروائی عمل میں لائے گا جس کی ضرورت ہوگی۔ بشرطیکہ آپ عینی شہادت کی بنیاد پر مجھے بسرعت مطلع کریں۔

(دستخط) بابا یوامرتی
ڈویژنل افسر

صفحہ - ۱۶

از طرف مسٹر اد - اومیریکیبے
اڈورو
اگالا ڈویژن
۱۱ جنوری ۱۹۶۵ء

بنام ڈویژنل آفیسر صاحب بہادر
اگالا ڈویژن

جناب والا:-

عرض حال ہے کہ ان اطراف میں ہر چند کہ ہر طرح سے امن وامان ہے لیکن میں اڈورو کے آزاد باشندوں کی جانب سے یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ ہماری راتوں کی نیند اور دن کا سکون ایک ایسے غنیم نے چھین لیا ہے جس کی سمجھ میں نہیں آتا کیا تعریف کی جائے اور جس کے لئے کونسا خطاب مناسب ہوگا۔ یہ غنیم شیر کی قامت کا نہیں لیکن شیر سے قوت میں سوا ہے۔ لومڑی نہیں لیکن لومڑی سے مکر وفریب میں بازی لے گیا ہے۔ چار ہاتھ پاؤں کا ہے لیکن پیڑ پر اژدر کی طرح چڑھتا ہے اور جس کے چھل بٹے سے ہوا زمین اور پانی میں کہیں

جائے مفر نہیں۔ غرضیکہ ہر طرف ہاہاکار ہے۔ مائیں روتی ہیں کہ چولہوں پر سے پکتی ہانڈیاں غائب ہو جاتی ہیں اور ہمارے باپ اور بھائی چلاتے ہیں کہ کھیتوں میں نہ یام بچتے ہیں نہ مکئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ غنیم بچوں کے ہاتھ سے بھٹے اور گنے چھین کر لے جانے میں بھی دریغ نہیں کرتا اور اس کے لئے ہر چیز روا ہے۔

اکثر ہم سو رہے ہوتے ہیں جب یہ موذی روزن میں سے ہاتھ اندر ڈال کر کمرے کی کنڈی کھول لیتا ہے اور بے جھجکے ہماری جھونپڑی میں داخل ہو کر جو کچھ ملے چٹ کر جاتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب ہمیں دن میں بھی کھانا کمرہ بند ہو کر کھانا پڑتا ہے نہیں تو یہ موذی اس میں بے محابا برابر کا شریک ہوتا ہے اور بچوں اور بڑوں سب کے آگے سے چاول اور بیج چن چن کر اپنے گالوں میں بھر لیتا ہے اور جو کوئی ڈرائے تو اُسے نوچ لینے سے دریغ نہیں کرتا۔

آپ سمجھے یہ غنیم کون ہے؟ یہ غنیم ہے اس علاقے کا بیبون، جو ایک دو نہیں اب ہزاروں کی تعداد کو پہنچ گئے ہیں اور اڈورو جن کی تارا جگاہ بنا ہوا ہے۔ رات کو جس درخت کے نیچے سے گذر جائے ان کمینے بندروں کی چٹ چٹ سے جنگل گونج رہا ہوتا ہے اور قہر یہ ہے کہ ان موذیوں کو پہلا بخار یا کوئی اور مرض بھی تو لاحق نہیں ہوتا جو ان میں مری پڑے اور ہمیں ان سے چھٹکارا ہو۔

اس علاقے کے امن پسند لوگ بندوقوں اور تیر کمانوں سے عاری ہیں پھر بھی یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ ہمارے یہاں بھی دار و رسن کی کمی نہیں۔ چنانچہ معلم حمزہ نے جو پہلی جنگ عظیم کے آزمودہ کار سپاہی ہیں چند ماہ ہوئے اس علاقے کو بندروں سے خالی کرانے کی ٹھانی تھی۔ ایک شام معلم حمزہ اپنی توڑے دار بندوق اور اپنے نواسے کو لیکر جنگل کی جانب چل پڑے۔ نواسہ اس لئے ساتھ تھا کہ معلم کی نگاہ کمزور ہے اور وہ شست باندھنے میں ان کی مدد کرتا۔ ایک جگہ ایک درخت پر بیبونوں کا ہجوم غفیر دیکھ کر معلم حمزہ نے نشانہ لگانے کا ارادہ کیا اور نواسے کی اعانت سے پہلا فائر کیا۔ یکلخت جنگل پر خاموشی طاری ہوگئی لیکن چونکہ درخت سے کسی جانور کے گرنے کی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی اس لئے معلم نے سمجھ لیا کہ وار خالی گیا اور وہ بسرعت تمام دوبارہ بندوق کی نالی کو بارود اور لوہے کے ٹکڑوں سے بھرنے لگے۔ تب ہی ایکبارگی انہیں ایسا لگا کہ کسی نے دوزخ کے دروازے وا کر دیئے ہیں اور بندروں کے شور سے ماہ تا ماہی ایک ہوا۔ اس کے بعد کی صحیح روئیداد کون سنا سکتا ہے کیونکہ نواسا بھاگ کر پاس کی ندی میں کود پڑا تھا اور جب معلم حمزہ کراہتے ہوئے زمین سے اٹھے تو انہیں بندوق کے چھن جانے کا احساس ہوا جو سب سے قوی الجثہ بیبونوں کا سردار ان کے ہاتھ سے لے گیا تھا۔

اس درخواست کی محرک یہی واردات ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ ایک مصروف آدمی ہیں اور جو کچھ آپ ہمارے لئے کر رہے ہیں اس سے زیادہ کے طالب ہونے کا ہمیں حق نہیں تاہم ان حالات کے پیش نظر بن التجا کئے بھی نہیں رہا جاتا۔

ہماری درخواست ہے کہ ازرہ غریب پروری آپ ہفتہ عشرہ کو دو ایک شکاری جو یہاں تعینات کریں تو یہ بلا دفع ہو سکتی ہے اور ہم سکون کا سانس لے پائیں گے۔

(دستخط) مسٹر او۔ اومیریکیبے
ریٹائرڈ اسکول ٹیچر
اڈورو۔ اگالا ڈیویژن

مسٹر موسیٰ لبی
ساجن گاری
انکپاھاڈساوا
انکپا۔ براستہ ایانگبا
۲۸ فروری ۱۹۶۵ء

صفورا

بنام معلم بابا یو امرتی
ڈیویژنل افسر صاحب بہادر
اگالا ڈیویژن

جناب والا

بے شک آسمان نے آپ کی بیتے سال کی رضاکارانہ مدد کو جو مجھے آپ سے پہنچی تھی اپنی خوشنودی کے تاج سے نوازا ہے۔ چونکہ میں زندگی کی آخری منزل پر ہوں اس لئے ایسی بہت سی باتیں جانتا ہوں جو موت سے دور والے نہیں جانتے اور جانتا ہوں خدا آپ پر مہربان ہے۔ یہ توصیف میرے جذبات کے اظہار کے لئے ناکافی ہے کیونکہ خدا کی تعریف کون کر سکتا ہے اور ان کی جن پر خدا کا سایہ ہے! آپنے میری مدد بغیر تانبے کی آدھی پینی مانگے کی تھی یہ ایسی بات ہے جس کی مثال اگالا کیا اس ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی اور اس کے لئے خدا آپ کو سب سے اونچے آسمان پر جگہ دے گا۔ میری دعا ہے خدا آپ کے خاندان کی ایسی پرورش کرے جو سب کے لئے باعث رشک ہو اور خدا آپ کی عمر اتنی دراز کرے کہ آپ اپنی نیکیوں کی کھیتی خود اپنے ہاتھ سے کاٹیں۔ آمین!

اب میں انتہائی ممنون ہونگا اگر آپ میری مندرجہ ذیل درخواست پر غور کر سکیں۔

انکپاھاڈساوا کے شمال میں جیسا کہ سب جانتے ہیں دریا کے نزدیک عربی زبان کا ایک مدرسہ سالوں سے قائم ہے جس میں ہمارے مسلمان بچے اسلامی تعلیم پاتے ہیں۔ یہ مدرسہ حکومت سے امداد پاتا ہے اور خود اس کے وقف کی زمین بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے جس میں یام، مکئی اور چاول کی کاشت ہوتی ہے اور آمدن معقول ہے۔ یہ کرم ہمارے علم دوست اور مقدّس وزیر اعلیٰ کی بخشائش کا ہے۔

اگر آپ کا آنا کبھی ان اطراف میں ہو تو میری گذارش ہے گھڑی بھر کو آپ میرے دروازے پر بھی آئیں۔ انکپا کے چند لوگ مجھے اور مجھ سے زیادہ میرے لڑکے کو جانتے ہیں جو آپ کو ایک اندھیرے رمبو (گول جھونپڑی) میں لیٹا ہوا ملے گا۔ ہو سکتا ہے جب آپ آویں تو وہ چادر اوڑھ کر سگریٹ پی رہا ہو اور چادر جلنے کے دھوئیں سے جھونپڑی اٹی ہوئی ہو۔ یا ہو سکتا ہے وہ خود سے انگریزی میں باتیں کر رہا ہو اور کبھی کبھی ایسا لگتا ہے وہ خدا سے لڑ رہا ہے۔ ایک مرتبہ جب چادر کے جلنے سے خود اس کا جسم جلنے لگا تو لڑکوں نے اُسے کہتے سُنا تھا۔ "حرامزادہ جلا رہا ہے" معلوم نہیں اس کا اشارہ کس طرف تھا۔

میرا یہ لڑکا انتہائی پڑھا لکھا ہے اور سب کہتے ہیں اسی وجہ سے پاگل ہے۔ آپکو یہ سن کر یقیناً افسوس ہوگا کہ اس کی بیوی بجائے اس بیماری میں اس کے کام آنے کے ایک ایسے شخص کے گھر رہنے چلی گئی ہے جس کی وجہ سے اس کا شوہر پاگل ہوا ہے۔

لیکن یہ بات پرانی ہے اور میرا خیال ہے میرا لڑکا اب یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کا دشمن کون ہے جس مدرسے کا تذکرہ سطور بالا میں ہوا ہے اس میں میرا لڑکا کبھی مدرس ہو کر آیا تھا اور اس وقت ہم سب کو یقین تھا کہ وہ مدرسہ کا اور مدرسے کے ساتھ یہاں کے مسلمانوں کی کایا پلٹ کر رکھ دے گا کیونکہ اس کا چال چلن ایسا ہی تھا اور ارادے بلند تھے۔ اس تعلیم پر

اُسے گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں ملازمت مل رہی تھی جو تنخواہ اور ترقی کے اعتبار سے عربی مدرسے کی ملازمت سے بدرجہا بہتر تھی لیکن اُس نے یہ ملازمت ٹھکرا دی اور مدرسے کی کمیٹی کے کہنے سے تھوڑی تنخواہ پر یہاں کام کرنے آ گیا۔

یہ کمیٹی کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔ سب اس کمیٹی سے ڈرتے ہیں اور اس کے ممبروں کے سامنے ادب سے دُھرے ہو ہو جاتے ہیں۔ اگر میں اس کمیٹی کو جنگلی کتوں کے غول سے تشبیہ دوں تو مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ انہی کی طرح یہ مدرسے کو نوچے کھا رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پل کر بھیڑیا ہو گیا ہے اور جب کسی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو پورا غول اس کی استعانت کو لپک پڑتا ہے۔ یہ لوگ ہر طرح محفوظ ہیں کیونکہ ان کے تاثے چاہے قصبے کی مسجد سے لیکر صدر مقام کی سرکاری عمارتوں تک ہر جگہ بیٹھے ہیں۔ کیا ضلع کمیٹی کیا گاؤں کی پنچایت ہر چیز پر ان کا راج ہے اور جو ان کے خلاف بولتا ہے خود اپنے حق میں کانٹے بوتا ہے

اس غول کا سب سے طاقتور درندہ مدرسے کا مدرس اعلیٰ ہے۔ اس کی عمر کوئی نہیں جانتا۔ نہ کسی کو یہ معلوم ہے وہ کب اور کہاں سے یہاں آیا تھا۔ اس کی آنکھیں عقاب کی آنکھیں ہیں اور سونگھنے کی قوت گدھوں سے سوا۔ چالاکی میں وہ چیتے کو مات کرتا ہے اور پیٹ اس کا ہاتھی سے بڑا ہے جس میں مدرسے کے کھیتوں میں اُگے ہوئے پام اور بھٹے اور دھان برسوں سے غائب ہوتے رہے ہیں۔ اور دھیرے دھیرے اوقاف کی زمینیں بھی اس کی آنتوں کی بھول بھلیوں میں کھوئی جا رہی ہیں۔ مدرسے کے لڑکے اسکول کے اوقات میں اس کے ذاتی فارم پر کام کرنے جاتے ہیں اور جب چھٹیوں کے بعد اپنے گھروں سے لوٹتے ہیں تو اس کے لئے مونگ پھلی، پام نٹس اور چاول کے بوروں کی سوغاتیں لاتے ہیں۔ اس کے یہاں پلے ہوئے مینڈھوں کا کوئی شمار نہیں۔ مائیں اس کے دروازے پر صبح پام وائین (تاڑی) کے تو نبے پہنچاتے جاتی ہیں۔ وہ یہاں کا سردار نہیں لیکن ہر سردار سے زیادہ طاقتور ہے بادشاہ نہیں لیکن فرعون سے بڑھ کر قاہر ہے۔

میری بہو جس کے لئے میرے لڑکے نے ۱۴ پونڈ اپنے سُسر کو ادا کئے تھے آج اسی شخص کے گھر بیٹھی ہے اور میرا لڑکا یہ تک بھول چکا ہے کہ اس کی ملازمت کے آخری ۶ مہینوں کی تنخواہ ابھی تک اسکول کمیٹی کے ذمے واجب الادا ہے۔

آج صبح کی بات ہے میں اپنے لڑکے کو بستر سے اٹھانے اس کی جھونپڑی میں داخل ہوا۔ یہ وقت میرے لئے بڑا کٹھن ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ بستر کو خراب کر دیتا ہے اور جھونپڑی تعفن سے بھری ہوتی ہے جب میں اس پر جھکا تو میں نے دیکھا اس کی باہنہ سے خون بہہ رہا ہے اور میرے دیکھتے دیکھتے ایک رکابی جتنا بڑا بچھو اس کے بستر سے بھاگ کر دیوار پر چڑھنے لگا۔ لیکن جس چیز پر مجھے تعجب ہوا وہ یہی کہ میرا لڑکا ہنس رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"وزیر اعظم کی کوئی چٹھی آئی؟"

میں نے کہا "نہیں"

اُس نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ پھر اُس نے پوچھا

"اور گرینڈ قاضی کی؟"

دوبارہ میں نے نہیں کہا

اُس پر اس نے میری طرف پیٹھ کی اور دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔

جب میں وہاں کھڑا تھا تو مجھے بہت سی پچھلی باتیں یاد آئیں۔ صدر مدرس سے اس کی لڑائی، غبن کا الزام، غنڈوں کے ہاتھ سے

بیٹا اور بے وجہ حالات۔ اُن سب کے مقابلے میں اس بچھو کے کاٹنے کی تکلیف کیا تھی؟ ایک کرک۔

تب میں نے آپ کو یہ خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ آپ سے یہ درخواست ہے کہ از راہ کرم مجھے اس مدرس اعلیٰ کو گولی سے مارنے کا لائسنس مرحمت فرمایا جاوے۔ اس عرضداشت کے ساتھ ہی ایک گنی کا ایک پوسٹل آرڈر بھی ملفوف ہے جو مجھے امید ہے لائسنس کی قیمت ادا کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

جناب والا اگر آپ نے اسی صدق دلی سے میری درخواست منظور کر لی جس سے یہ لکھی گئی ہے تو مجھ سے زیادہ مسرور آدمی شاید آپ کو ساری دنیا میں نظر نہ آئے۔ ایک خدا ترس آدمی کی حیثیت سے میرا ایمان ہے آپ ضرور میری مدد کریں گے۔

مخلص

مسٹر موسیٰ لبی

سابن گاری۔ انکپاہا ڈساوا

انکپا۔ براستہ ایانگبا

۲۸ر فروری ۱۹۶۵ء

ڈیویژنل افسر کا حاشیہ:۔ اس خط کی ایک نقل فوراً صوبائی پولس کے افسر اعلیٰ کے پاس جانی چاہیئے اور مجھے کارروائی اور تفتیش کے نتیجے سے مطلع رکھا جائے۔

(دستخط) باباپو امرتی　　　۳ مارچ ۱۹۶۵ء

ایک ہفتے بعد چیف کلرک کا حاشیہ:۔

مزید کارروائی غیر ضروری ہے کیونکہ تفتیش پر پتہ چلا کہ معلم موسیٰ لبی نے پہلی اور دوسری مارچ کی درمیانی شب کو اپنے گھر میں خودکشی کر لی تھی اور چونکہ اس کے گھر میں اس کے لڑکے کی دیکھ بھال کرنے والا دوسرا کوئی اور فرد نہ تھا اس لئے موخرالذکر کو پاگل خانے بھیجنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

(دستخط) اوچ اوڈانگ

کھڑکی کے نیچے نائیجر بہہ رہا تھا۔ بہہ کیا رہا تھا ایسا لگتا تھا میلوں لمبا کفن زمین پر پھیلا ہوا ہے کیونکہ اس میں نہ لہروں کے ٹکرانے کی آواز تھی نہ تموج کا نشان۔

دریا کے دوسری طرف پام کے اونچے درختوں کا جنگل تھا جس میں سے کچی شراب کے تونبے بھر کے لوگ چھوٹی سیاہ کشتیوں میں سوار ہو رہے تھے۔

سورج کی ترچھی کرنیں دریا کی سطح پر پڑ رہی تھیں اور ان میں سے چند کھڑکی میں سے ہو کر دفتر کی میز سے ٹکرا رہی تھیں۔

نئے ڈیویژنل آفیسر نے شعاعوں میں اڑتے ہوئے ذروں کو دیکھا، دریا پر کی چمک اور پار کے لوگوں کو کشتیوں سے چڑھتے اترتے دیکھا اور ایک بار پھر فائل کے ورق اپنی سیاہ انگلیوں سے الٹنے لگا۔

(لاگوس ڈیلی ٹیلیگراف سے)

ذکی انور

حق آشنائی کا

غالب شروع ہو رہے ہیں۔

اور ہم میں سب سے زیادہ خوش خط شائستہ نے بڑے پیارے حرفوں میں بلیک بورڈ پر لکھ دیا ہے ؎

"ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں"

اور یقیناً شائستہ نے یہ اس لئے لکھا ہے کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ بیگم خان کی خاص دعوت پر غالب کا افتتاحیہ کلاس لینے ڈاکٹر نیاز اختر آ رہے ہیں جنہوں نے غالب پر ہی اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے اور یقیناً اُس حرافہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ لڑکیاں ڈاکٹر نیاز اختر پر اندھا دھند مرتی ہیں۔

لیکن میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا ہے۔

بیگم خان ڈاکٹر نیاز اختر کے ساتھ ساتھ آئی ہیں اور ہم سب سے اُن کا رسمی تعارف کرانے کے بعد واپس چلی گئی ہیں۔ اور ڈاکٹر نیاز اختر نے بلیک بورڈ پر ایک اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالی ہے اور مسکراتے ہوئے لیکچر اسٹینڈ کے پاس آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ہم سب کی طرف ایک نظر دیکھا ہے۔ اور جیسے ہی میری نظروں سے ان کی نظریں ٹکرائی ہیں، میرا دل دھک سے ہو گیا ہے۔

اور غالب کے ایک ہزار مشہور اور زبان زدِ عام اشعار چھوڑ کر اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے پڑھا ہے ؎

"نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا"

اور میں سوچنے لگی ہوں۔ کاش وہ مجھے قتل کر دیتا!

لیکن اس شعر نے اُن کی پُراسرار شخصیت کو اور بھی پُراسرار بنا دیا ہے!

اور میں نے اپنے دل کے نہاں خانے میں انہیں مخاطب کر لیا ہے۔ ڈاکٹر نیاز اختر! صرف تم ہی دنیا کی وہ پہلی پُراسرار

ہستی نہیں ہو جسے کوئی نہیں سمجھ سکا — میں بھی ہوں میری جان! میں بھی ہوں یہ اور بات ہے کہ میرا سر تم ہو!

ہاں — میں تمہاری وجہ سے پراسرار ہوں۔

اور جب میں کچھب انکل کو فون کرتی ہوں تو باجی مسکرانے لگتی ہیں — اور ابّی بھی اور کامریڈ شوکت بھی جو کم بخت باجی سے عشق کرتا ہے اور ایزرا پاؤنڈ پر تین سو صفحوں کی ایک کتاب لکھنے والی باجی کے ساتھ غلط انگریزی میں باتیں کرتا ہے!

لیکن میں کچھب انکل کا ناک میں دم کر دوں گی۔ اور یقیناً انہیں اس روز روز کی کوفت سے اکتا کر میرے پاسپورٹ کے لئے کوشش کرنی ہی پڑے گی۔

جانتے ہو نیاز میں کیوں پاسپورٹ حاصل کرنا چاہتی ہوں؟ — صرف تمہیں جلانے کے لئے، صرف تمہیں کڑھانے کے لئے، اور اس کے لئے مجھے کچھب انکل کی خوشامد کرنی پڑتی ہے!

اور باجی اپنے کمرے میں گھس کر یقیناً اسی لئے بند ہو گئی ہیں کہ سکون کے ساتھ وہ اپنی کہانی مکمل کر لیں جسے وہ اردو میں اس لئے لکھ رہی ہیں کہ میں کچھ زیادہ آسانی سے ایک ایک لفظ سمجھ لوں۔ اٹھارہ سال کی ایک حسین اور جذباتی لڑکی اور ترپن سال کا ایک عیسائی مرد...... یعنی میں اور کچھب انکل!

بے شک مجھے کوئی نہیں سمجھ سکا۔ اور مجھے تم نے معمّا بنا دیا ہے۔

صرف تم ہی دنیا کے ایک پراسرار آدمی نہیں ہو ڈاکٹر نیاز اختر!

اور ایم این سرکار کی میجک یونٹ کی اس لڑکی کا جسم پرسوں کے شو میں بیچ بیچ آرے سے کٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔

کیا وہ ایک پراسرار لڑکی نہیں تھی؟

اور کچھب انکل نے الف سے ی تک ساری کہانی مجھے کہہ سنائی ہے۔ ہر روز وہ لڑکی بکس سے صاف نکل جایا کرتی اور تالیاں بج اٹھتی تھیں۔ لیکن اس دن یک لخت ہنگامہ مچ گیا۔ سارا اسٹیج خون سے بھر گیا۔ اور بکس کھولا گیا، تو لڑکی کی کمر سے اوپر کا حصہ الگ، نیچے کا حصہ الگ۔

اور کچھب انکل بڑے خاص انداز میں کہہ رہے ہیں۔

"بس روحی! میں نے اٹھائیس سال کی پولیس کی نوکری میں کبھی ایسا پُراسرار حادثہ نہیں دیکھا...... ابھی تک کوئی کلو نہیں مل سکا!"

لیکن ڈاکٹر نیاز اختر! میں وہ کلو جانتی ہوں۔ میں کیا نہیں جانتی؟ دنیا کا کون سا بھید ہے جو مجھ سے چھپا ہوا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں ڈاکٹر نیاز اختر کہ اس سال تمہارے کالج میں جو نئی لڑکیاں آئی ہیں ان میں سے ایک کالی کالی لڑکی کی آنکھیں بہت پیاری ہیں اور گو میں کبھی بھی، کہیں بھی مشاعرے میں نہیں جاتی لیکن یہ بھید کبھی مجھ سے چھپا ہوا ہے کہ روٹری کلب کے مشاعرے میں تمہاری نظم "تیری آنکھوں کے سوا" تین بار پڑھوائی گئی۔ جانتی تو میں ایک بات اور بھی ہوں کہ تمہارے کالج کا فنکشن ہو رہا ہے۔ اس میں وہ پیاری آنکھوں والی لڑکی کسی ڈرامے میں ایک اہم رول کرے گی، لیکن مجھے کیا، اور اب تمہاری پراسرار ہستی کا بھید بتا دوں کیا۔ یہ برسوں کے بعد تم پھر رول کرنے کا ارادہ کر رہے ہو، کر رہے ہو نا؟

لیکن میں کتنی سادگی سے کہہ دیتی ہوں ــــ مجھے کیا؟

مگر باجی ہیں کہ اندر سے دروازے بالٹ کئے۔ اوپر کے اپنے کمرے میں گھسی اٹھارہ سال کی ایک لڑکی اور ترپن سال کے ایک مرد کی کہانی لکھ رہی ہیں۔

لیکن مجھے سمجھ ہی کون سکا ہے؟

اور جب میں پاسپورٹ حاصل کر لینے کے بعد کچھب انکل کو ہاتھ ہلا کر ٹاٹا کر دوں گی تو بخدا سارا اخفاظ پڑا رہ جائے گا، اور تب مجھے یقین ہے، اپنی سٹری پچی کہانیاں بس چلے تو آئرن سیف میں بند کر کے رکھنے والی باجی اٹھارہ سال کی لڑکی اور ترپن سال کے مرد کی کہانی پھاڑ کر پھینک دیں گی۔

اور تب غالباً وہ میری زندگی کے اسرار میں سے سوئی کی نوک کے برابر کچھ سمجھ لیں گی ــــ لیکن خاک! ــــ زیادہ سے زیادہ یہی تاکہ کچھب انکل سے میرا عشق صرف پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے تھا۔

لیکن اُس کے بعد؟

اس کے بعد تاریکی کا ایک دبیز پردہ ہے، نہیں نہیں ــــ تاریکی کا نہیں لوہے کا۔ جسے ہوا کا تیز سے تیز جھونکا ذرا بھی سرکا نہ سکے۔ آئرن کرٹین ــــ باجی کے لئے بھی، میرے لئے بھی اور کامریڈ شوکت کے لئے بھی۔ آپا کے لئے بھی اور ممی کے لئے بھی، ڈیڈی کے لئے بھی ــــ کیا تم جانتے ہو لکی کٹر نیاز اختر کہ اس آئرن کرٹین کے اُس پار کیا ہے؟

اور میکبتھ پڑھاتے ہوئے مادام سمنگی کہنے لگی ہیں۔

"وہاٹ از ٹرے جیڈی ــــ"

وہ کہتی ہیں موت ٹرے جیڈی نہیں ہے۔ المیہ تو دراصل وہ زندگی ہے جس کی ایک ایک سانس موت ہو۔

اور کبھی کبھی میں بڑی سنجیدگی سے سوچا کرتی ہوں کہ کاش میں اپنی سانسیں روک لوں۔ کاش میں ہر لمحہ ایک نئی موت سے دوچار نہ ہوتی رہوں۔ لیکن یہ سب کچھ میرے بس میں ہے ہی کب؟ اور اسی لئے تو میں کھلا کر پاسپورٹ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن وہ...... وہ...... وہ تو ایک شرمیلا سا لونڈا ہے۔ کیا تم اُس سے جل سکو گے ڈاکٹر نیاز اختر؟ میں چاہتی ہوں کہ تم جلو، تم کڑھو اور ایک دن سچ مچ ایسا آ جائے کہ تم قرار کو ترسو!

"یہ رچرڈ ہکسلے ہے۔ اکیس سال کا ایک نوجوان کیلی فورنیا میں گریجویشن کر رہا ہے۔ میرا پن فرینڈ ہے اور میں اس سے ملنے جا رہی ہوں۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" اس نے رچرڈ ہکسلے کی تصویر نہ دیکھنے کے انداز میں دیکھی ہے۔ اور اُس کے چہرے پر نہ طنز ہے نہ جلن ہے۔ اس کے چہرے پر کسی طرح کا کوئی نشان نہیں، کوئی رنگ نہیں، کوئی نقش نہیں، کوئی تاثر نہیں۔ اُف! کیا سپاٹ چہرہ ہے اُس کا جیسے یہ کوئی بڑی بات ہی نہیں۔ اگر میں کیلی فورنیا جا کر اپنے پن فرینڈ رچرڈ ہکسلے سے ملوں۔

اور میں ہی جل اٹھی۔

"میں چاہتی ہوں کہ اس سے محبت کروں...... کیا تم ایسا نہیں سمجھتے کہ اگر میں رچرڈ ہکسلے سے شادی کر لوں،

تو یہ بات میرے لئے ایک امتیازی شان کی حامل ہوگی؟"

"کوئی ضروری نہیں۔"

یا خدا۔ اُس کا چہرہ تو بدستور سپاٹ ہے۔

"میں.... میں... میں .... سنو! میں رسم و رواج اور یہاں تک کہ مذاہب کی بھی بعض احمقانہ قدروں پر ایمان نہیں رکھتی۔ اگر اس لونڈے نے ایک غیر ملکی لڑکی سے شادی کرنا پسند نہ کیا تو میں... تو میں... تو میں .... دیکھو نیاز.... تو میں اپنے ساتھ اس کی ایک عجیب و غریب یاد لے کر واپس آؤں گی۔ تم سمجھتے ہو میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"بالکل ۔۔۔۔"

لیکن ۔۔ اے میرے اللہ اُس کم بخت کا چہرہ سپاٹ کا سپاٹ ہی تو ہے۔

اور بھیا کم بخت کیا خاک سمجھی ہے؟

"ہیں اور عجیب انکل؟ ۔۔۔ چھی! ۔۔۔ جسٹ اے وانڈر!"

مجھے ہنسی آتی ہے۔ لیکن یقین کرو ڈاکٹر نیاز اختر تم نے ہی مجھے بھی ٹھیک اپنی طرح پُراسرار بنا ڈالا ہے۔

بجلی کوندی ہے۔

بادل گرج اٹھے ہیں۔

اور برگد کا ایک عظیم الشان درخت میرے اوپر گر کر چیخ اٹھا ہے۔

"بدھم ۔۔ شرنم ۔۔ گچھامی ۔۔۔"

"تم کون ہو؟" میں چیخ اٹھی ہوں۔

اور گوتم بدھ نے اپنے بازو پھیلا دیئے ہیں ۔۔۔ "اب یہ درخت گر چکا ہے۔ لیکن بیٹی میرے بازو نہیں ٹوٹے ان بازوؤں میں آجاؤ۔ تمہیں سکون مل جائے گا"

مسخروں نے چینی بودھ بھکشو چویانگ کے ساتھ ساتھ میرا نام لینا شروع کر دیا ہے

اور چویانگ میرے کالج میں بودھ دھرم پر نصف گھنٹے لکچر کرنے کے بعد واپس جانے لگا ہے تو میں نے محض کرٹسی کے طور پر اسے اس کی کار تک چھوڑ دیا ہے۔ اور بھیا فار کرٹسی سیک ہی تو میں نے اسے آئندہ اتوار کو اپنے ہاں مدعو کر لیا ہے۔ چویانگ بے شک ایک قابل نوجوان ہے دل رُبا ہے۔ اور کم سے کم چینی ادب کا مطالعہ اس کا بہت گہرا ہے۔ لیکن میں اس وقت کچھ بور سی ہونے لگی ہوں۔

اور وہ مجھے چین کی سیر کرانے لگا ہے۔

اور ہوانگ ہو ندی اور یانگزے ندی کے بارے میں بکتے بکتے وہ شاعر سینگ منتقل ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اور بھکشو ہونے سے پہلے کی اس کی کچھ یادیں ہوانگ ہو یا یانگزے سے ضرور وابستہ ہیں۔

"میری آنکھیں زندگی کو اپنے اصلی روپ میں نہیں دیکھ پاتیں۔"

اور زندگی اپنا اصلی روپ پوشیدہ رکھتی ہے۔

لیکن سچائی کی آنکھیں،
ان حسین مناظر کو آج بھی دیکھ رہی ہیں۔
جو حسین مناظر اب مر چکے ہیں ......"
اور یقیناً کسی بھی بری نیت سے نہیں، لیکن فرطِ جذبات میں اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ہے۔
"آپ بڑی حسین ہیں، کبھی موقع مل جائے تو دنیا کا حسین ترین شہر شنگھائی ...... "
لیکن جیسے میرے ہاتھ میں بچھو ہوں اور بچھو نے چویانگ کو ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے اپنی بات پوری کئے بغیر اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے اور پھر وہ مجھے مقدس رومی پہاڑ پہ لے کر چڑھنے لگا ہے ....
"اومائی گاڈ — گیارہ ہزار فٹ؟"
میں چونک اٹھی ہوں، اور وہ بتانے لگا ہے کہ ہر سال لاکھوں بدھسٹ اور غیر بدھسٹ اس کی زیارت کو آتے ہیں۔
"چینگڈو یا چنگو کی طرف سے چڑھنا آسان ہے۔ اور پھر محترمہ وہاں آپ زی لی چنگ میں نمک کے عجیب و غریب کنوئیں دیکھیں گی ..... میں بتاؤں ان کنوؤں سے اس قدر نمک نکل جاتا ہے کہ صوبہ زیچوان کی نصف ضرورت پوری ہو جاتی ہے ...... "
اور میں سوچنے لگی ہوں کہ شکر ہے پانی کا کنواں وہاں بھی نہیں!
نہ سہی زہریلے پانی کا تو ہوتا۔
خدا گواہ ہے تین گھنٹے تک میں چویانگ کے ساتھ بور ہوتی رہی ہوں۔ بھلا ایک بودھ بھکشو کے ساتھ آدمی بور نہ ہوگا تو اور کیا کرے گا۔
لیکن مسخروں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں اپنی بھنویں منڈوا لوں اور اپنی ناک روزانہ دبا دبا کر پست کروا لوں؛ مجھے ہنسی آتی ہے۔
لیکن رونا آتا ہے یہ دیکھ کر ڈاکٹر نیاز اختر کہ تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی ہے۔ اور تم نے اپنی طرف سے پوچھا تک نہیں ہے کہ بودھ بھکشو چویانگ کا کیا معاملہ ہے؟
اور میں گاتی ہوئی اس عظیم الشان برگد کے درخت کے نیچے سے نکل کر تمہارے پاس پہنچ گئی ہوں۔
"میں چین جا رہی ہوں"
"ویری گڈ"
"میں چلی جاؤں گی نیاز، میں سچ مچ چلی جاؤں گی"
"ویری گڈ ... آئی وش یو گڈ جرنی"
"لعنت ہے تم پر"
"کیوں؟ —"

میں اُس کے کیوں کا کیا جواب دوں۔

"تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے ..... محال ہے .... شاید ناممکن ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تمہارے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہے۔"

"نہیں .... خون کا ایک قطرہ! اور تم اس کا شور سنتی آئی ہو گی - اور سلطانہ نے میرے بارے میں تمہیں جو کچھ بتایا ہوگا وہ اس سے کم ہرگز نہ ہوگا کہ میں ایک جوان کنواری لڑکی کے سپنوں کا شہزادہ ہوں - اور مس کپور نے ......"

"سلطانہ، مس کپور، مینا کشی، لکشمی اور وہ نئی لڑکیاں جو تمہارے کالج میں آئی ہیں اور وہ نئی لڑکی جس کی آنکھیں .... کیا تم مجھے جلاتے ہو؟"

"نہیں ---"

"تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟ --- میں کسی سلطانہ کی بچی کو نہیں جانتی - میں کسی مس کپور کو نہیں جانتی، چولہے میں جائیں مینا کشی، لکشمی، انجنی --- میں کسی کو نہیں جانتی، میں صرف اپنے آپ کو جانتی ہوں - میرے سامنے صرف میری باتیں کرو - میرے علاوہ دنیا میں اگر کوئی ذی روح ہے تو وہ تم ہو نیاز .... بس صرف تم .... بس تم اور میں .... اور باقی ساری دنیا کچھ نہیں ہے، باقی کوئی ذی روح نہیں .... بس میں اور تم ...."

سکوت ---

موت کا سا سکوت ---

آنسو ---

طغیانی ---

طوفان آگیا ہے - اور اس طوفان میں جیسے کسی ڈوبتے ہوئے نے ایک تنکے کا سہارا پا لیا ہے - لیکن میں سوچتی ہوں کہ اسے ڈوب ہی جانا چاہیئے - ہاں وہ جی کر ہی کیا کرے گا جو کسی کو زندگی کی ایک آدھ سانس تک نہ دے سکے میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑا لینا چاہا ہے، لیکن اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔

اور پھر کہیں کوہ آتش فشاں پھوٹ پڑا ہے -

اور پھر پگھلی ہوئی آگ کا ایک قطرہ میرے ہاتھ پر گر گیا ہے -

"ونڈرفل ---" میں چیخ اٹھی ہوں۔ "یعنی تم رو بھی سکتے ہو نیاز! .... کتنی عجیب بات ہے ڈارلنگ کہ تم رو بھی سکتے ہو؟ .... ونڈرفل۔"

"مجھے کوئی نہیں سمجھ سکا روحی .... مجھے کوئی نہیں سمجھ سکا .... تم بھی نہیں سمجھ سکتی ہو مجھے سمجھنے کے لئے تمہیں اپنا وجود ختم کر دینا ہوگا۔"

"اتنے بڑے راز ہو تم؟ .... ویری گڈ .... پھر تو تم گریٹ ہو ڈاکٹر نیاز .... گریٹ ڈاکٹر نیاز اختر!"

اُس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے اور میں اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال کر بھاگ آئی ہوں۔ اور میرے کمرے میں گوتم بدھ کے پتھر کے بازو ابھی تک میرے لئے پھیلے ہوئے ہیں۔ اور برگد کا پرانا درخت اب تک گرا پڑا ہے۔ اور چینی یودھ کھیکشو گانے لگا ہے اور پھر وہ جو کچھ گا رہا تھا اس کا ترجمہ کہنے لگا ہے ـــ

"یہ ندیاں ہماری نہیں ہیں
یہ ندیاں ہماری نہیں ہیں
لیکن اب یہ آواز مر چکی ہے اور ندیاں زندہ ہیں
اور یہ ندیاں ہماری ہیں جو ہمارے کھیتوں کو زندگی بخشتی ہیں۔
اور کھیتوں کی زندگی ہماری زندگی ہے
یہ ندیاں ہماری ہیں، کیونکہ پُرانی آوازیں مر چکی ہیں۔...."

لیکن مجھے کچھ بھی سُنائی نہیں دیتا۔ اور مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اگر میں کچھ سُن سکتی ہوں تو وہ یہ کہ "روحی! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو تم ـــ اور اگر میں کچھ دیکھ سکتی ہوں تو وہ یہ کہ ـــ ڈاکٹر نیاز اختر بھی رو سکتا ہے.... اسٹریچ!

اس کے علاوہ ساری دنیا پر سکوت طاری ہے۔

آپا اور اُن کے خاوند اپنے کمرے میں شطرنج کھیل رہے ہیں۔ اگر کسی نے حد سے زیادہ بڑے ایڈیپٹ کے طور پر جدیدیت کو اپنایا ہے تو وہ مسٹر سلمی ہی تو ہیں جنہیں دولہا بھائی کہلوانا اس لئے ناپسند ہے کہ یہ ایک روایت چلی آئی ہے .... یا اللہ یہ لوگ کب یہ نعرہ لگائیں گے کہ کھانا کھانا بھی ایک روایت ہے ٹھنڈا پانی پیا کرو....

توبہ توبہ کیا بیماری چلی ہے ـــ

"مانسرووں کی پانچویں منزل پر
ایک دکھ درد کا مارا، وہ ایلورا کا بت
اپنی خاموش صداؤں سے جگاتا ہے کسے؟
نیند کی گود میں سوئی ہوئی انسان کی روح
مانسرووں کی پانچویں منزل پر...."

خدا کی مار ـــ اور مسٹر سلمی ہیں کہ پھول کر کُپا ہیں۔

واہ، واہ، واہ ـــ کیا خوب نظم ہے!

"تم نے تعریف نہیں کی روحی، کم سے کم برائیاں ہی بیان کرو۔"

"اس قدر اونچی نظم اپنے پلّے نہیں پڑ سکتی، مانسرووں کی پہلی دوسری منزل پر ہوتی تو کوشش بھی کرتی"

"بھئی روحی ـــ یہ پانچ منزلیں حواس خمسہ کی علامت ہے اور پانچویں منزل انسان کا شعور ہے۔"

"ہائے اللہ! اور میں سمجھی تھی کہ یہ پانچوں منزلیں پنجتن پاک کی علامت ہے!"

اور پھر خشمگیں آنکھیں — "تم لٹل تھیٹر کے فیشن ہو"

اور یقیناً انہیں آپا کی کوئی روایتی چال زور سے ہنسنے پر مجبور کر رہی ہے - اور وہ قہقہہ لگانے لگے ہیں .... لیکن ویری گڈ .... تھینک یو آپا ڈیئر .... ویری گڈ!

"ذرا کسی جدید چال سے اپنا فرزیں بچائیے" آپا ڈارلنگ چیخ اٹھی ہیں۔

"ویری گڈ ... تھینک یو آپا ڈارلنگ!"

جدید ترین قہقہہ ختم گیا ہے۔

سکوت —

موت کا سا سکوت!

باجی کالج چلی گئی ہیں، بچے اسکول جا چکے ہیں، ڈیڈی دفتر جا چکے ہیں، اور یہ نیا ناول ممی کو پاگل بنا کر چھوڑے گا ابھی نصف ناول تک بھی وہ نہیں پہنچی ہیں اور ان کا بلڈ پریشر کافی بڑھ گیا ہے۔ جب کسی سے غصہ نکالا نہ جا سکے تو وہ اوٹ پٹانگ چیزیں پڑھتے ہی کیوں ہیں؟ یہ "آبشار" ممی کی جان لے لے گا۔ ایک باب پڑھتی ہیں اور چھ سات بابوں میں مصنف پر غصہ اتارتی ہیں۔ مزا آتا ہے، قسم خدا کی! میرا خیال ہے ممی کی موت کسی واہیات ناول سے ہی لکھی ہے آخر غصہ کیوں نہیں برداشت کر سکتیں۔ میں بھی تو کبھی کبھی بے ہنگم چیزیں پڑھتی ہوں جیسے الم غلم افسانے پڑھتی رہتی ہوں۔ اور کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ باجی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ تمہارے ہاں اچھی چیزیں ہیں کہاں؟ ایک منٹو کہاں تک لاج رکھے گا! کیا یہ سچ ہے؟

اور انہوں نے ہارڈی کا چوتھا ناول میرے سینے پر لاد دیا ہے —

"لٹریچر کسی زبان کا بھی ہو اگر لٹریچر سے دلچسپی ہے تو ماسٹرس کو پڑھ جاؤ"

لیکن کیا مجھے سچ مچ ادب سے دلچسپی ہے؟ کیا میں ادب کی دلدادہ ہوں؟

ہوں یا نہ ہوں، لیکن میرے سینے پر ایک بھاری بوجھ آ پڑا ہے — "دی ٹرمپیٹ میجر" — لیکن میں ناول پرے رکھ کر گانے لگی ہوں۔

"کام کرودھ مد لوبھ موہ کوں' بہا چیت سے دیکھئے۔

میرا کے پربھو گردھر ناگر، تاہی کے رنگ میں بھیجئے ...."

"وہ کون تھی؟"

مجھ سے کسی نے پوچھا ہے۔

"اس کا گردھر ناگر کون ہے؟"

کم سے کم خدا تو ہرگز نہیں۔ ایک فرشتہ بھی نہیں۔ ایک آدمی، اور وہ آدمی کرشن ہے۔ لیکن میں نے سوال پوچھنے والے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔ اور میں یہ سوچنے لگی ہوں کہ میں کون ہوں؟ اور ڈاکٹر نیا ناطر کون ہے؟

مگر وہ ناگر؟

ہاں ڈاکٹر نیا زاختر! کبھی کبھی بے چین ہو کر میں سوچتی ہوں کہ تم محبت کرنے کی چیز نہیں ہو۔ تم صرف اور صرف پوجا کرنے کی چیز ہو۔ تم سے کسی طرح کی توقع کوئی کیوں رکھے۔ بیچارے کرشن!

یہ شریمتی کلپنا بھاردواج ہیں اور ہسٹری آف ہندی لٹریچر کا پیریڈ ہو گیا ہے۔ اور شریمتی کلپنا بھاردواج تھوڑا جیرا اپنے محبوب سٹیشن پر شادی کرواسطات روم میں سجا کر آگئی ہیں..... بے چاری بال ودھوا شریمتی کلپنا بھاردواج!..... بے چاری آٹھ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں.... ہائے ہائے کیسی کربناک زندگی ہے ان کی.... لیکن ان لڑکیوں کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں، جن کی شادی بھی نہیں ہوئی، جو بیوہ بھی نہیں ہوئیں.... لیکن.... لیکن اُن کی زندگی؟

شریمتی کلپنا بھاردواج بکنے لگی ہیں۔

"میرابائی تلسی داس کی ہم عصر ہیں.... کن تنبیہ داری میتی سم کالین.... میرابائی ہندی ساہتیہ کی ہسٹری میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ وہ مہارانی تھیں، بڑا راج پاٹ تھا، محلات تھے، عروج تھی، ٹھاٹ تھا۔ لیکن کرشن کے پریم میں وہ پاگل ہو کر انہوں نے سب کچھ تج دیا.... سب کچھ تج دیا.... جنگلوں میں بھٹکتی پھریں ـــ اور مندروں میں اپنے کرشن کو حاضر و ناظر جان کر وہ ناچتے ناچتے اپنا آپ کھو دیتی تھیں۔ اُن کی رُوح میں کرشن رچے بسے تھے اور.... اور.... اور اُن کی کرشن بھگتی.... اُن کا پریم.... اور یہ کوتیا.....“

"نہیں ـــ" مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں چیخ اٹھی ہوں۔ لیکن میں چیخی ویخی تو نہیں ہوں، البتہ آج کل مجھے یہ شبہ ہونے لگا ہے کہ میری آنکھیں خراب ہو رہی ہیں ـــ کبھی کبھی دھندلا دھندلا سا کیوں نظر آنے لگتا ہے۔

"مسز بھاردواج کی آواز کیسی بھاری ہو گئی ہے!"

شائستہ نے مجھے ٹھوکا لگایا ہے ـــ

"دیکھو اُن کی بھی آنکھیں بھر آئی ہیں!"

"بھی" سے تمہاری مُراد؟" ـــ میں نے اپنے آنسو پونچھ لئے ہیں۔

"تم بھی تو رو پڑی ہو"

"نہیں ـــ میری آنکھیں خراب ہو رہی ہیں"

شائستہ ہنس پڑی ہے۔ اور پتہ نہیں کتنی لڑکیاں ہنس پڑی ہیں۔ کتنے لوگ ہنس پڑے ہیں۔ ساری دنیا ہنس پڑی ہے۔

ایک تم ہو ڈاکٹر نیاز اختر! جو بالکل خاموش میرے ذہن کے ایک گوشے میں دبکے کھڑے ہو، اور ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی تم نے ہمیشہ کے لئے ریکارڈ کئے ہوئے سجلے پر ساؤنڈ بکس کی سوئی لگا دی ہے اور ریکارڈ بج اٹھا ہے...

"روحی، مجھے سمجھنے کی کوشش کرو... کاش تم مجھے سمجھ پاتیں......"

"جانتی ہو ڈاکٹر نیاز اختر کہ تم ایک پُراسرار شخصیت کے مالک ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم غیر شادی شدہ

ہو، اور یہ بھی جانتی ہوں کہ چاہے تم ایک ہزار لڑکیوں کا تذکرہ کرو، اور چاہے تم پر پانچ ہزار لڑکیاں مر رہی ہوں، لیکن تمہارا دل تمہارے چہرے کی طرح سپاٹ ہے۔ تم کسی سے محبت نہیں کرتے۔۔۔۔۔"

ہاں ہاں۔ مجھ سے بھی تو نہیں!

اور کیسی کوتاہ بیں ہوں میں کہ صرف شریمتی کلپنا بجار دواج کی بیوگی پر آنسو بہاتی ہوں۔ میں نے تو اُن لڑکیوں کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں، جن کی شادی بھی نہیں ہوئی اور جو بیوہ بھی نہیں ہوئیں۔ لیکن جن کی زندگی کی ایک ایک سانس ایک ایک موت ہے۔

"اپنے آپ کو اُن میں سے نہ کہو روحی"

"شٹ اپ —" میں چیخ اٹھی ہوں — "ڈاکٹر ضیا زاختر! مجھے سب کچھ کہہ دو میرے محبوب! جو کچھ چاہو مجھے کہہ دو۔۔۔۔ کہہ دو کہ میں نے چینی بودھ بھکشو کے ساتھ منہ کالا کیا۔۔۔۔ کہہ دو کہ میں کیلی فورنیا اسی لئے جا رہی ہوں کہ رچرڈ ٹیکسلے کا ایک بچہ اپنے ساتھ سے کرا آؤں۔۔۔۔ اور کہہ دو میرے پیارے کہ میں نے پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے کچھ انکل۔۔۔۔ اُف کچھ ب انکل کے ساتھ۔۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔۔ ہاں ڈیئر! جو کچھ چاہو کہہ دو۔ لیکن خدا کے لئے میری محبت پر شک نہ کرو، وہی تو میرا سب کچھ ہے۔۔۔۔ وہی تو میری عبادت ہے۔۔۔۔ وہی تو میری کائنات ہے"

اور میں سوچنے لگی ہوں — یہ دنیا کس قدر چھوٹی سی ہے، جہاں صرف میرا چہرہ سما سکا ہے لیکن چھوٹی سی اس دنیا میں کیسا آرام ہے، کیسا سکون ہے۔ البتہ ضیا کے دل کی دھڑکنوں کی آواز کچھ اس طرح آرہی ہے جیسے اس کے سینے کے بھیتر بھاری جنگ چھڑی ہو، اور ڈرم پیٹے جا رہے ہوں۔

ڈم ڈم ڈم ڈم —

لیکن اسے یہ بھی گوارا نہیں ہو سکا ہے کہ میں اُس کی چھاتی میں منہ چھپائے آرام سے روتی رہوں۔ اُس نے بہت ہی آہستگی کے ساتھ مجھے اپنے سینے سے الگ کرتے ہوئے ایک بار پھر ریکارڈ پر ساؤنڈ بکس رکھ دیا ہے۔

"روحی مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔ کاش تم مجھے سمجھ پاتیں۔۔۔۔۔"

"میں نہیں سمجھ سکتی۔۔۔۔ میں کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ تم ہی بتا دو کہ وہ کون بدنصیب لڑکی ہے جس سے تم محبت کر رہے ہو؟"

"کوئی بھی نہیں"

"پھر یہ بتاؤ کہ وہ کون شامت کی ماری لڑکی ہے جو تم سے محبت کر رہی ہے؟"

"تم — اور کوئی نہیں"

اور میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کا وجود اور بھی پراسرار ہو گیا ہے

اور میں سر تھام کر صوفے پر گر گئی ہوں۔

لیکن میں اپنا غم برداشت کر لوں گی ڈاکٹر ضیا زاختر صاحب — میں اپنا غم برداشت کر لوں گی۔ تم نہیں جانتے غم برداشت کر لینے میں بلکہ اس کی تلخی پر جھوٹ موٹ کی شکر کی پالش کر لینے میں مجھے بھی مہارت حاصل ہے

میرے محبوب ... مجھے بھی، صرف تم ہی دنیا کے واحد شورما نہیں ہو — میں بھی ہوں!

اور میرا غم میری مسکراہٹوں کے غلاف کے نیچے قہقہے لگایا کرتا ہے۔

اور میرا غم میرے سینے کے بھیتر ہے۔

اور میرے سینے کے بھیتر صرف ورم ہی نہیں پھٹتے بموں کے دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔

مجھے کبھی کوئی نہیں سمجھ سکا۔ میرا غم بھی کوئی نہیں دیکھ سکا۔

اور بھیا چندا دیر اپنے کمرے میں گھسی اٹھارہ سال کی ایک لڑکی اور ترپن سال کے ایک بڈھے کی محبت کی کہانی لکھ رہی ہے۔

میں آج بھی کالج نہیں جاؤں گی۔

میں کالج جانا ہی نہیں چاہتی۔

میں پڑھنا بھی نہیں چاہتی۔

لیکن چاہتی تو میں کچھ بھی نہیں ہوں، لیکن سب کچھ کرتی ہوں، چاہتی تو یہ ہوں کہ جینا بھی چھوڑ دوں — لیکن میں جیوں گی بھی، پڑھوں گی بھی، کالج بھی جاؤں گی اور وومن سنگل میں مس مایا چیٹرجی کو ہراؤں گی بھی۔ ایک سے ایک واہیات ہندوستانی فلمیں بھی زہر مار کروں گی، اور پورشیا کا رول بھی کروں گی ..... یہی سب کچھ تو وہ آئرن کرٹین ہیں جو ہم اسے سرک بھی نہ سکیں اور جن کے اس پار میرا غم پھلتا پھولتا رہے اور کوئی سمجھ نہ سکے۔

کس نے مجھے سمجھا ہے؟

کسی نے بھی تو نہیں — کوئی جیسے سرسامی حالت میں میری اور مجیب انکل کی محبت کی کہانی کہنے لگتا ہے، کسی کو پاگل پن میں یہ سوجھتا ہے کہ میں بودھ مذہب قبول کر لوں گی، اور کوئی مستقبل کے اُس خیالی کرب سے، ابھی سے ہی گھبرا کر جان دے دینا چاہتا ہے کہ میں اتنے بڑے گھرانے کی ناک کاٹ دوں گی جب کیلی فورنیا سے واپس آتے ہی چکی متی اور دوسری کی مریضہ بن جاؤں گی! احمق لوگ!

اور اب میں بھی ٹیپ کر کے رکھ لوں گی — جہاں کوئی ڈیلیریم کے عالم میں کچھ اُوٹ پٹانگ بکنے لگا اور میں نے ریکارڈ پلیئر کا بٹن دبا دیا۔

تب مجھے سمجھنے کی کوشش کیجئے بابی ..... ممی! کاش آپ مجھے سمجھ پاتیں ......

کاش میرا غم میرے بس میں ہوتا اور میں سب کو دکھا دیتی کہ دیکھئے — یہ ہے میرا غم — دیکھئے یہ ہے میرا کرب — دیکھئے یہاں ہے میرا پیار!

لیکن اپنے غم پر جھوٹ موٹ کی شکر کی پالش کرتے رہنے کے علاوہ میرے بس میں اور ہے ہی کیا!

لیکن میرے بس میں ایک چیز ہے۔

ایک بہت بڑی چیز — لیکن اس چیز کے بارے میں سوچتے ہی میں کانپنے کیوں لگی ہوں! — کیا ایک ایک سانس میں، ایک ایک موت گناہ نہیں، جو میں ایک ادھ گناہ کے نام سے لرزنے لگی ہوں۔

گناہ ۔۔۔

ہاں یہ میری بزدلی ہے کہ میں گناہ کے نام سے لرز اٹھتی ہوں ۔ یقیناً یہ میری بزدلی ہے ۔۔۔۔ اے خدا مجھے اتنی طاقت تو عطا کر کہ میں ایک گناہ تو کر سکوں ۔

لوگ کہتے ہیں گناہ میں لذت ہوتی ہے ، اور اسی لئے لوگ گناہ پر ٹوٹے پڑتے ہیں ۔ میں بھی ایک گناہ کرنا چاہتی ہوں ۔۔۔ میرے معبود ایک گناہ !

اپنے اوٹ پٹانگ خیالوں پر مجھے ہمیشہ ہنسی آئی ہے ۔ میں ہمیشہ ہنستی رہتی ہوں ۔ میرا خیال ہے کہ میں عام بچوں کی طرح روتی ہوئی ہرگز نہیں پیدا ہوئی ہوں گی ۔ یقیناً میں اس وقت بھی اپنے اس بے تکے خیال پر ہنس رہی ہوں گی کہ خدا جو بے مطلب کا کام نہیں کرتا ، اس نے مجھے کیوں پیدا کر دیا ؟ ۔۔۔ مجھ سے تو بندگی ہو سکی اور نہ اطاعت ۔۔۔ میں تو صرف محبت کر سکوں گی ، صرف محبت ۔۔۔ گناہ تک نہیں !

میں آج بھی ہنس رہی ہوں ۔

کل بھی میں ہنسوں گی ۔

اور جب میں مروں گی تو مجھے غسل دیتے ہوئے میرے لبوں پر ایک امٹ مسکراہٹ دیکھ کر بوڑھی پرانی عورتیں میری پاکبازی میری معصومیت اور عصمت مآبی کی مدح سرائی کرنے لگیں گی ۔

یعنی تب بھی مجھے کوئی پہچان نہیں سکے گا ۔

اُف کیسی پراسرار شخصیت ہے میری ؟ اور وہ بے چاری احمق ، گنوار بوڑھی پرانی عورتیں ، انہیں کیا پتہ کہ ۔۔۔ میک اپ راون کو رام اور رام کو راون بنا دیتا ہے ۔ اُن بے چاریوں کو کیا معلوم کہ میک اپ یونٹ کی وہ لڑکی جیسے مرلوز بیچ سے آرہ چلے بکس کے اندر سے صحیح سلامت باہر کو دپڑتی تھی تو اس کے لبوں پر بھی ایک امٹ مسکراہٹ ہوتی تھی ۔

اور کچھ انکل تفتیش کے بعد کی رپورٹ سنانے لگے ہیں ۔

وہ بہو بازار کی ایک رنڈی کی لڑکی تھی ، لیکن اسے اپنی آلودہ زندگی سے گھن آتی تھی لہٰذا وہ سیجیشن سرکار کی میک یونٹ میں شامل ہو گئی ۔ لیکن وہاں اس نے جسم بیچنے سے بھی زیادہ گھناؤنا کام کیا کہ سرکار کے بیٹے سے عشق کر لیا ، اور جب سرکار کو پتہ چلا ۔۔۔۔ پتہ چلا ۔۔۔۔ تو پھر ۔۔۔۔ تو پھر ۔۔۔۔ تو پھر اس نے بڑی رومانٹک خودکشی کر لی !

مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کچھ انکل ہکلانے لگے ہیں ۔ لیکن وہ تو مزے میں کہانی بکتے جا رہے ہیں ۔ البتہ میں نہیں چاہتی کہ پھر کیا ہوا ؟ یہ سنوں ! ۔۔۔ پھر کیا ہوا ، یہ میں صدیوں سے جانتی آئی ہوں ۔ پھر بار بار ایک ہی گھسی پٹی بات سننے سے کیا حاصل ؟

کبھی صلیب ، کبھی زہر کا پیالہ ، کبھی سنگسار ، کبھی دق ، کبھی قتل ، کبھی خودکشی ، یہی ہے ناعشق کا مقدر چاہے وہ عشق کیسا ہی کیوں نہ ہو ۔ عشق کسی سے کیوں نہ ہو ، اس کا مقدر تو وہی ایک ہے ۔۔۔ جلاوطنی ، ہجرت ، غاریں ، اور کرب !

لیکن میں سچ مچ کے گھڑے پر راوی پار نہیں کروں گی ڈاکٹر نیاز اختر صاحب !

اور میں ..... میں جو مہینہ کے بعد بھی مسل دیتی ہوئی بوڑھی پرانیوں کو فریب دوں گی، مجھ تمہیں فریب نہیں دے سکتی ڈاکٹر نیاز اختر، تمہیں نہیں، تمہیں ہرگز نہیں۔

لیکن آج میں پھر گلاب کے اس پودے کی جڑ کی مٹی ہلکی کروں گی اور میں پھر اس کی جڑ میں کھاد ڈالوں گی اور پھر پودا بڑا ہوگا، اس میں کونپلیں پھوٹیں گی اور پھر کلیاں لگیں گی، اور پھر میں ایک آدھ کھلی کلی کسی کے کوٹ کے کالر میں اڑس دوں گی ―

لیکن وہ کون ہوگا؟

کچھیب انکل کو ایک بار پھر فون کرنا چاہئے۔

لیکن اگر وہ غصہ ہوگئے تو؟ .... نہیں انہیں غصہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگر میری پیاری باجی سچ مچ فیس ریڈنگ میں ماہر ہیں، اور اگر سچ مچ کچھیب انکل مجھ سے عشق کرنے لگے ہیں تو پھی کوئی بات نہیں۔ لیکن میں پاسپورٹ حاصل کرکے ہی رہوں گی۔ اور گلاب کے اس پودے میں مجھے پاسپورٹ ملنے تک تو یقیناً پھول کھلنے لگیں گے۔

لیکن گلاب کے پھول کھلنے تک کا وقفہ؟ ― یہ انٹریم پیریڈ؟ ― اس کا کیا ہوگا؟ ― اُف میں کیا کروں؟ ― اُف رچرڈ کچلے کاش تم نزدیک ہوتے تو میں اس ڈاکٹر کے بچے کو بتاتی کہ عشق کی آگ کا وہ مقابلہ کرے تو کرے، لیکن رقابت کی آگ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

آجاؤ میرے محبوب رچرڈ کچلے۔

نہیں تو تم ہی آجاؤ اے بودھ بھکشو ― بدھم شرنم گچھامی!

بدھم شرنم گچھامی ―

میں جانتی ہوں، کوئی نہیں آئے گا ― کوئی نہیں آئے گا .... کیا میں اپنی امیدوں کے دریچے بند کردوں؟

نہیں ― کوئی تو آئے گا ہی ― اے موت آکہ دیکھ لوں تجھ کو قریب سے!

روزی رالکس ٹھیک ہی تو کہتی ہے کہ ہم سب احمق ہیں، یہ سارا ایج ہی احمقوں کا ایج چل رہا ہے۔ احمقوں کا ٹیک! یہ حماقت ہی تو ہے کہ میں تمنا کر رہی ہوں کہ ―

اے موت آکہ دیکھ لوں تجھ کو قریب سے!

اگر کسی نے موت نہیں دیکھی ہے تو وہ بے شک احمق ہے!

میں نے تو موت دیکھی ہے ― بہتوں کے سرہانے کھڑی سر سے پاؤں تک سیاہ پوشاک میں ملبوس۔ پیارا سا پیاری سی، سیدھی سادی معصوم سی موت ― کبھی میں نے اسے اپنے سرہانے کھڑی دیکھا ہے۔ اور جب وہ میری روح قبض کرکے جانے لگی ہے تو میں نے اسے بڑے پیار سے کہا ہے ― "ٹاٹا"۔ اور وہ بولی ہے ― "پھر ملیں گے اگر خدا لایا تو ....." کسے معلوم تھا کہ خدا کا کرنا ایسا ہوگا کہ اس بے چاری ننھی منی سی گڑیا کو میری ہر ایک سانس کے ساتھ میرے سرہانے کھڑی، میری روح قبض کرنا ہوگا!

کس قدر کام کرنا پڑتا ہے اس بے چاری ننھی سی گڑیا کو ― میری روح قبض کرکے تھوڑا ہی اس کا کام ختم

ہو جاتا ہے ـــ میری بہن! کاش میں تمہاری کچھ مدد کرسکتی۔ اور اگر میں تمہاری مدد کرسکتی تو جانتی ہو سب سے پہلے میں کس کی رُوح قبض کرتی؟

ہاں ہاں ہاں ڈاکٹر نیاز اختر کی۔

لیکن میں جانتی ہوں وہ کم بخت ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اور دُور سے ہپ، ہپ ہُرّا کی آواز آنے لگی ہے ـــ

ہپ ہپ ہُرّا.... ہپ ہپ ہرّا....

کم سنی میں کسی کو کوئی بڑا کام ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ ورنہ آدمی موت سے دور ہو جاتا ہے۔ وہ مرنا چاہے تو مر نہیں سکتا، اور خواہ مخواہ اسے بھی اپنا غم آئرن کرٹین کے پیچھے چھپانا پڑتا ہے۔ (اور یہ ہپ ہپ ہرّا بھی تو آئرن کرٹین ہی ہے نا؟ ـــ آئرن کرٹین جو ہوا کے جھونکوں سے بھی سرک نہیں سکے۔

ہپ ہپ ہُرّا ـــ ہپ ہپ ہُرّا...

بے شک وہ پریمیرس کپ کا سیمی فائنل جیت کر آرہا ہے۔ یقیناً وہ کم بخت جیت کر آرہا ہے!

ڈاکٹر نیاز اختر پی ایچ ڈی ـــ!

اور ٹیکا اور گنجی پہنے جناب ڈاکٹر نیاز اختر پی ایچ ڈی ہمارے ہاں ڈرائنگ روم میں گھس آئے ہیں، جہاں باجی اور آپا کے علاوہ اُن کی نصف درجن سہیلیاں بیٹھی ہیں۔ روزی، پشپا، ارمان، مینا، شاہدہ اور وہ ایک فٹ اونچے جوڑے والی لڑکی جس کا نام مجھے کبھی یاد نہیں رہ سکا۔

ہائے اللہ.... سب کی سب بے چاریاں شرم سے پانی پانی ہوگئی ہیں۔ اور نیاز بھی سر جھکائے کھڑا ہے۔

"اکس کیوز می" ـــ ایک نسوانی آواز کا ٹپ اُٹھی ہے۔ اور وہ ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا ہے۔

میں بھی باہر پہونچ گئی ہوں۔

"روحی! ہم نے سیمی فائنل جیت لیا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"جی تو چاہتا ہے کہ میں اُس سے لپٹ جاؤں۔ اور اگر میں ایسا کروں تو کوئی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ سب ہی جانتے ہیں کہ میں پاگل لڑکی ہوں۔ ایسی پاگل کہ لو دھرم مذہب قبول کرنے والی تھی! ـــ ایسی پاگل کہ کیلی نور تیاسے ایک ناجائز بچہ لانے جارہی ہوں! ـــ

لیکن بڑی جدوجہد کے بعد میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا ہے.... نہیں، میں اپنے چہرے پر کسی قسم کا کوئی رنگ آنے نہیں دوں گی۔ کوئی رنگ نہیں، کوئی تاثر نہیں۔

"دونوں گول میں نے ہی کئے۔ میجر چڈھا نے مجھے ایک طلائی تمغہ دینے کا اعلان کیا، اور اس کی بیٹی نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ـــ جسٹ اے فن.... وہاٹ اے میراکل! ـــ ٹو ٹو نل روحی، ٹو ٹو نل...! یہی ایک خطرہ تھا۔ ریلوے بہت ہی مضبوط ٹیم تھی، اب تو مقابلہ ٹاؤن اسپورٹنگ سے ہے اُس میں کوئی خاص بات نہیں.... لیکن

تم تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی ہو۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے:"

"کیسی خوشی؟"

میری کوشش ناکام ہوگئی ہے اور یقیناً میرے چہرے پر مایوسی کا رنگ نمایاں ہوگیا ہے۔ جب ہی تو اس نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ میرا ہاتھ تھام لیا ہے ——

"تمہاری آنکھیں...... تمہاری آنکھیں......"

"اس بھول میں نہ رہنا ڈاکٹر نیاز اختر صاحب، تمہارے لئے کوئی رو نہیں سکتا۔ میری آنکھیں آہستہ آہستہ خراب ہو رہی ہیں:"

"میں جانتا ہوں تمہاری آنکھیں کیوں خراب ہو رہی ہیں؟"

"کیوں؟"

"میری وجہ سے:"

"یعنی؟ ——"

اور ایک لخت ریکارڈ پر ساؤنڈ بکس رکھ دیا گیا ہے۔

"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو روحی...... کاش تم مجھے سمجھ پاتیں!"

اور غصہ کے مارے میرا سارا جسم پھنکنے لگا ہے۔ جیسے میں چتا پر کھڑی ہوں۔ میرے ہونٹ کانپ اٹھے ہیں اور میری آنکھیں شعلے برسانے لگی ہیں ——

اور اس نے یہ سب کچھ بھانپ لیا ہے ——

"روحی! کیا تم محبت کی اس منزل پہ ایمان رکھتی ہو جہاں مادہ کوئی چیز نہیں رہ جاتی، جو کچھ ہوتی ہے بس روح ہوتی ہے اور پرستش کا جذبہ!"

"میں میرا بائی نہیں ہوں:"

"تو پھر سنو —— تم تیار ہوکر بیٹھو، میں ایک گھنٹے میں آتا ہوں، اور تمہیں لے کر ایک ایسی جگہ چلوں گا، جہاں ہماری محبت...... جہاں ہماری محبت کا...... خیر تم چلوگی تو!...... تیار رہو میں ایک گھنٹے میں آتا ہوں!"

"کہاں چلوگے؟"

چھی! کہاں تو میں کیلی فورنیا سے ایک بچہ تک لے کر آنے کو تیار تھی کہ کسی طرح یہ کم بخت رقابت کی آگ میں تو جلے...... اور کہاں یہ میں ہی تو ہوں...... بچی میں ایسی بزدل کیوں ہوگئی —— یا خداوند قدوس مجھے گناہ کرنے کی ہمت عطا کر، اتنی کرم فرمائی تو کردے میرے کریم!

"کہاں چلوگے؟"

"بس؟" —— وہ کچھ اس انداز میں ہنس پڑا ہے کہ ہنسی کی آواز کی ایک ایک لہر تیر بن کر میرے کلیجے میں

اُترنے لگی ہے ــــ "گھبراؤ نہیں..... میں رچرڈ بکلے نہیں ہوں..... کاش میں رچرڈ بکلے ہوتا ..... روحی! میں تمہارے کمپیوٹر انکل کی برابری بھی نہیں کر سکتا..... اور وہ چینی بودھ بھکشو ..... کیا نام تھا اس کا....؟ اچھا تم تیار رہو جاؤ"

اور وہ سیٹیاں بجاتا ہوا، فتح کے نشے میں چور ڈگمگاتا ہوا چلا گیا ہے ــــ

اور میں سوچ رہی ہوں کہ یہ صرف فتح کا نشہ ہی نہیں، یہ عشق کی اس آخری منزل کا سرور بھی ہے جو منزل ابھی آئی نہیں۔ لیکن بس ایک گھنٹے بعد آنے ہی والی ہے۔

اور میرے حلق میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی سی محسوس ہونے لگی ہے۔ میری سانسیں جلدی جلدی چلنے لگی ہیں اور میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا ہے۔ اور میرے ذہن کے کسی گوشے سے کوئی مجھے مخاطب کرنے لگا ہے؛

"لولی روحی..... اب کیل فورنیا جانے کی کیا ضرورت ہے..... اور یقین کرو لی روحی تمہاری اور نیازی کی زندگی کا یہ انقلاب اس قدر آناً فاناً بس باتوں ہی باتوں میں آگیا ہے کہ ناممکن ہے کہ نشے کے اس عالم میں وہ کبھی عاقبت اندیشی سے کام لے..... لیکن تم؟..... تم تو کچھ ایسی نشے میں نہیں ہو؟"

"نہیں ــــ میں بے ہوش ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ میں مرچکی ہوں"

"تو پھر ــــ؟"

"اُف ــــ میں کیا کروں؟ اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ لیکن مجھے رونا نہیں چاہئے۔ یہ مصیبت تو میری اپنی لائی ہوئی ہے۔ آخر وہ بے چارا نیازاختر بھی تو مجبور ہی ہے نا، اس کی پریسٹیج کا بھی تو سوال ہے اور..... وہ یہ بھی تو سوچتا ہوگا کہ میں اس کے بارے میں پتا نہیں کیا کچھ سوچتی ہوں۔ اُف ــــ میں نے ہی اُسے تباہ کیا۔ لیکن میں؟..... میں اس قدر پریشان کیوں ہوں؟

اُف ــــ کیا گناہ بھی اس قدر سخت کام ہے؟ ــــ اے میرے اللہ مجھے توفیق عطا کر کہ میں یہ سخت ترین کام..... نہیں نہیں نہیں..... نہیں..... میرا یہ باوقار باعزت گھرانا؟ اور جب بات ڈیڈی تک پہونچے گی...اور جب بات ممی تک پہونچے گی؟

نہیں نہیں میرے اللہ مجھے ابدی سکون عطا کر دے۔

لیکن گوتم بدھ کے وہ پتھر کے بازو ٹکڑے ٹکڑے ہیں اور برگد کا پرانا درخت کہاں گیا جس کے نیچے گوتم بدھ کو مکتی ملی تھی؟ ــــ میرا بائی کے گیت کی ایک نے بھی تو سنائی نہیں پڑتی ... اُف میں تو خود ہی فلاسفر بننے لگی ہوں!

اور گھڑی کی بے رحم سوئیاں تو بہرحال سرکتی رہیں گی۔

یا خدا، آدھ گھنٹہ گذر گیا ــــ بس صرف آدھ گھنٹہ اور باقی ہے، پھر میں مرجاؤں گی..... کہاں گئی وہ ننھی منی سی معصوم سی گڑیا ــــ اُس کی کالی پوشاک کہیں تو نظر نہیں آتی ــــ کیا اب وہ میرا ساتھ نہیں دے گی ــــ؟

لیکن ڈرائنگ روم سے آپا، باجی اور اُن کی نصف درجن سہیلیوں کا قہقہہ بہرحال بلند ہو رہا ہے۔ اور میں کھڑی کھڑی سوچ رہی ہوں ___

'یہ دنیا کیسی بے غرض ہے اُف کیسی بے غرض، بے ربط، بے مطلب۔ کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں۔ ایک دوسرے کا کوئی ربط نہیں۔ ایک سگی بہن کو دوسری سگی بہن سے کوئی مطلب نہیں'!

'آپا ___ آپا ڈارلنگ میری مدد کیجئے..... ہاں، آپ ہی تو میری مدد کر سکتی ہیں۔ میں جانتی ہوں، آپ کے علاوہ کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک دن آپ کے خاوند صاحب میرے سامنے اپنے ٹرنک سے ٹائیوں کا ڈبہ نکال رہے تھے تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ آپ بھی میری مدد کر سکتی ہیں...... آپا ڈارلنگ پلیز میری مدد کیجئے'!

لیکن آپا ڈارلنگ کو اپنی نصف درجن سہیلیوں کے ساتھ قہقہہ لگانے سے فرصت ہی کہاں ہے جو وہ یہ سوچیں کہ باہر کاری ڈور میں کھڑی اُن کی سگی بہن موت کا انتظار کر رہی ہے!

اور میرے ذہن میں پھر کسی نے چیخ کر کہا ہے ___

'ناممکن ہے کہ دنیا کی سب سے تیز شراب کے نشے میں کسی کو اتنا ہوش رہ جائے کہ وہ عاقبت پر غور کرے اور مستقبل کی فکر میں حال کو تباہ کر دے..... ناممکن'!

اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ میں اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں طے کرنے لگی ہوں، اور پھر میں چوروں کی طرح دبے پاؤں آپا کے کمرے میں گھس گئی ہوں ___ اور پھر..... اور پھر..... اور پھر میں نے آپا کے خاوند کا ٹرنک کھول لیا ہے..... لیکن اُن کی ٹائیوں کا ڈبہ میرے ہاتھوں میں کچھ اس طرح لرزنے لگا ہے جیسے اُچھل رہا ہو ___ اور میرے سینے کے اندر یہ میرے دل کی دھڑکنیں ہیں؟ ___ یا اللہ اس قدر زور دار دھماکے! ___ اُف یہ پسینے ...... کیا گناہ اس قدر سخت کام ہے؟ ___ اور لذت؟ ___ لذت کا تو کوئی نشان نہیں۔ کیا میں اس قدر سخت کام کر لوں گی؟

ایک گھنٹہ گذر گیا ہے۔

اب وہ آچلا، اور میں نے کپڑے تک نہیں بدلے۔ اور سنگھار؟ ہونہہ کون ہے جو کپڑے بدل کر عمدہ جوڑے پہن کر اور سولہ سنگھار کر کے مرتا ہے؟

لیکن میں اپنے کمرے میں آ کر جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگی ہوں، اور باہر سے بارات کی آواز آنے لگی ہے اور میرا دل پھر کچھ ایسے انداز میں دھڑکنے لگا ہے جیسے اب چند ہی منٹوں کے بعد مجھے قتل کر دیا جائے گا۔

لیکن ایک بار پھر اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے میں نے اپنا وینٹی بیگ کھول کر دیکھ لیا ہے ___ نہیں بات ڈیڈی تک نہیں پہونچ سکتی ___ بات ممی تک نہیں پہونچ سکتی۔

اور ہم چل پڑے ہیں۔

لیکن ہم کہاں گئے اور کہاں سے واپس لوٹے؟ ___ مجھے کسی بات کا ہوش نہیں۔ مجھے تو ہوش ہے تو صرف اس بات کا کہ صدر ہسپتال کے سول سرجن ڈاکٹر بیگ نے مجھے قتل کر دیا ہے!

بات ممی اور ڈیڈی تک سچ مچ نہیں پہونچی ہے۔

لیکن بات مجھ تک پہونچ گئی ہے ـــــ لیکن میں نے تہیّہ کر لیا ہے ڈاکٹر نیاز اختر کہ میں تمہیں ویسی ہی پُراسرار ہستی رہنے دوں گی۔ تمہارا سرجوں کا توں قائم رہے گا!

اور میں ـــ؟

کاش تم مجھے قتل کر دو.... ہاں نیاز مجھے قتل کر دو... میں... میں.... میں محبت کی اس منزل پر نہیں ایمان لا سکوں گی نیاز جہاں مادہ کوئی چیز نہیں رہ جاتی۔ جو کچھ ہوتی ہے بس روح ہوتی ہے ـــــ روح اور پرستش کا جذبہ!

میں میرا بائی کیسے بن جاؤں؟ .... نہیں.... کوشش کرنے پر بھی میں نہیں بن سکتی۔

کلاس ختم ہو گیا ہے۔

غالب کا افتتاحیہ کلاس لینے کے لئے بیگم خان کی خاص دعوت پر آئے ہوئے ڈاکٹر نیاز اختر کلاس سے جا چکے ہیں۔ ساری لڑکیاں جا چکی ہیں۔ لیکن اتنے بڑے لیکچر تھیٹر میں تنہا بیٹھی میں سوچ رہی ہوں ـــ کاش وہ مجھے قتل کر دیتا، کیونکہ میں میرا بائی نہیں بن سکوں گی.... میں کیسے میرا بائی بن جاؤں؟

ام عمارہ

نفرت کی آگ

"اچھا بھئی بچو تم نے یوں تو بہت ساری کہانیاں سنی ہیں لیکن کبھی ایسی کہانی بھی سنی ہے جس میں ——"

"کیا خالہ بی، کیسی خالہ بی —— " بچوں نے راحت کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی تھی ——

راحت بیچاری کو بولنے کا مرض تھا۔ جسمانی طور پر وہ بڑی ہی دھان پان سی نازک سی عورت تھی۔ لیکن ان کی نزاکت —— پر ان کے راکھ جیسے رنگ نے پانی پھیر کے رکھ دیا تھا۔ کوئی انھیں نازک ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ بس لے دے کے ایک اچھے بھیا تھے ان کے قائل کہ راحت خالہ کی ساری طاقت زبان میں کھنچ آئی ہے۔ اور عطیہ کا خیال تھا کہ اگر یہ بولنا کم کر دیں تو انھیں اپنی صحت کی کمزوری کے بارے میں کبھی سوچنا نہ پڑے۔ اور وہ بھی ان کی طرح موٹی ہو کے قصائی کا کتا کہلانے لگیں (یہ قصائی کے کتے والی بات بھی اچھے بھیا ہی نے کہی تھی۔ خراب رذیل قسم کے خطابات سے نوازنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔) جب بھی اچھے میاں عطیہ کو "قصائی کا کتا" "پلپلا ہوا سانڈ" وغیرہ کہتے تو راحت بی اپنے نرم و نازک جسم کو دیکھ کے خدا کا شکر ادا کرنے لگتی تھیں کہ اس نے انھیں اس قسم کے طعن و تشنیع سے بچا لیا تھا —— "بس خداوندا کسی صورت سے میری زبان پر مہر لگا دے کہ میں بولنے سے معذور ہو جاؤں۔"

راحت بی ہمیشہ اپنی خاموشی کے لئے دعائیں مانگتیں اور ان کی یہ دعا ایک لمحے کے لئے بھی قبول نہیں ہوئی۔ دعا مانگنے کے بعد وہ دل ہی دل میں عہد کرتیں کہ آئندہ جا ہو یا بے جا وہ کبھی اپنی زبان نہیں کھولیں گی —— اور اگر زبان کھولی تو انھیں رسول کا کلمہ نہیں نصیب ہوگا —— مگر ابھی وہ عہد کر کے با فراغت اپنی پلنگڑی پر لیٹ بھی نہیں پاتی تھیں کہ جنم کے بیری اچھے میاں دندناتے ہوئے ان کے کمرے میں پہنچ جاتے۔

"ارے راحت خالہ آپ پلنگ پر پڑی ہیں۔" وہ ان کی ٹیبل پر سے ڈاک کے لفافے بڑے آرام سے اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہتے۔

راحت بی اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کے اچھے میاں کے سرعت سے جیب میں داخل ہوتے ہوئے ہاتھ کو دیکھتیں —— اور انھیں شک ہونے لگتا کہ وہ یہ میری کوئی چیز چرا رہے ہیں —— مگر بولیں تو کیسے ابھی ابھی تو عہد کیا ہے چاہے گھر کے گھر لٹ جائیں وہ کچھ نہیں بولیں گی ——

"ارے آج یہ توپ گولہ باری کرنا بھول گیا ہے —" اچھے میاں نے بڑے اطمینان سے راحت بی کا پارکر قلم اپنے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ بھان کا عہد اللہ کیا عہد یہ کم بخت لو ——"

"دیکھو اچھے یہ میرا قلم رکھ دو سیدھے سیدھے — جہاں سے اٹھایا ہے"

"تمہارا قلم — کیا — ؟ سٹھیا گئی ہو —"

"راحت خالہ بھلا میرے پاس تو خود ہی تم سے اچھا قلم ہے۔" اس نے اپنا ۔ ساڑھے چار روپے والا قلم ہتھیلی پر رکھ کے دکھاتے ہوئے کہا ——"

"خدا مبارک کرے تمہیں تمہارا قلم —— تم میرا خواب قلم واپس کر دو"

"راحت بی اپنا سارا عہد و بدھول کے پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔"

"پر کیا ثبوت ہے کہ میں نے تمہارا قلم ——"

"اللہ کی مار پڑے تم پر خدا کی پھٹکار —" راحت بی سچ مچ توپ کے دہانے سے گولے اگلنے لگیں۔

"ہاں اب ٹھیک ہے بکو تم —" اچھے میاں نے ہنستے ہوئے ان کا قلم میز پر رکھ دیا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

"اے پاک پروردگار جیا یہ مجھے ستاتے ہی خود ستائے جائیں —" صدمے سے ان کی آواز بھرا جاتی۔ اس اُلو کے دم اچھے کو ان سے ہمیشہ کا بیر تھا۔ جہاں انھوں نے خاموش خاموش غمگین سے سراپے میں خود کو ڈھال لینے کی کوشش کی۔ اور یہ شیطان کی طرح ان کے کمرے میں در آتا۔ اور ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتا کہ وہ اپنا غمگین سراپا، جسے آئینے میں دیکھ دیکھ کے وہ مطمئن ہوتی رہتی تھیں۔ ایکدم الانکہ ذہن سے اُتر جاتا۔ اور وہ پھر سے کٹکھنی کتیا بن جاتیں جو بھی قریب آتا اس پر بھونکنا شروع کر دیتیں۔

"کیا بک لگا رکھی ہے راحت بی —" عطیہ بیگم کہیں سے ٹپک پڑتیں —— وہ بھتیں تو بھابی لیکن عمر میں بڑی ہونے کی وجہ سے انھیں بڑی افضلیت حاصل تھی۔ صرف اچھے میاں بھی ان کے رعب میں نہیں آتے تھے۔

"میں تم سے بات بھی نہیں کرتی تم کیوں مجھ سے لوٹنے آئیں —" راحت بی بلبلا گئیں۔

"خوب تم باتیں نہیں کرتیں یہ نیا انکشاف ہوا مجھ پر — ورنہ تم تو ان لوگوں میں ہو جو در و دیوار سے باتیں کرتے ہیں —" عطیہ بی ہنسیں۔ اور ان کے ٹیبل کی چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگیں۔

"در و دیوار تم جیسے جیتے جاگتے انسانوں سے بہتر ہیں۔ وہ کم از کم میری باتیں خاموشی سے سنتے تو ہیں۔ تمہاری طرح میری باتیں سن کے ان کے چہرے پر استہزا آمیز مسکراہٹیں نہیں پھیل جاتیں۔ اور نہ انھیں بات بے بات میری تنبیہہ کرنے کی ہی سوجھتی ہے —"

راحت بی دیوار کی طرف منہ کئے حسب عادت فیری۔ فل اسٹاپ، با دکاما، کے لیا چلی جا رہی تھیں —— ان کی آواز سے بیزاری نمایاں تھی۔

اور عطیہ بی ــــ بھی ــــ اپنی عادت کے مطابق راحت بی کے دور دیس سے آئے ہوئے سارے خطوط اپنے قبضے میں کر رہی تھیں ــــ پتہ نہیں کہاں کہاں یہ خط لکھتی تھیں۔ اینڈی بینڈی کہانیاں لکھتی تھیں۔ اور صبح سے شام تک تخیل کی اڑان سے زیادہ ان کے منہ سے نکلی آواز تیز ہوتی تھی ــــ ویسے خطوط جو ان کے خط کے جواب میں آتے تھے بڑے ہی زندہ اور مزے دار ہوتے تھے۔ اور عطیہ بی انھیں بڑی ایمانداری سے چوری کرتیں، پڑھتیں اور دل ہی دل میں راحت خالہ سے جلنے لگتیں ــــ

ان کے دل میں یہ خواہش شدت سے بیدار ہونے لگتی کہ کوئی انھیں بھی راحت کی طرح خط لکھتا جن میں سارے جہان کا دکھ سمیٹ لینے کی خواہش ہوتی۔ اور بعض خط تو ایسے ہوتے جن میں ساتھ ساتھ زندہ رہنے اور شانہ بشانہ جہد مسلسل کرنے کی آرزو ہوتی۔ اتنی گئی گذری چڑچڑے مزاج کی راحت بی کے قلم میں کیا جادو ہے کہ روز کوئی نہ کوئی محبت نامہ چلا آ رہا ہے ــــ عطیہ بی سوچتیں ــــ مختلف جگہوں سے آئے ہوئے خطوط کو عطیہ بی بڑے ہی اطمینان سے محبت ناموں کے نام سے یاد کرتی تھیں۔

"سنئے عطیہ بی کسی کا خط چوری کر کے پڑھنا سخت اخلاقی جرم ہے ــــ" راحت جی نے منہ پھیرے ہی پھیرے کاغذات کی پھڑپھڑاہٹ سن کے کہا ــــ

"ــــ کون تمہارے خط چرا کے پڑھتا ہے ــــ ارے واہ اچھی آئیں چوری لگانے والی ــ" عطیہ بی نے سٹپٹا کے راحت بی کو دیکھا۔ جو بدستور دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی تھیں۔ انھیں شک ہوا کیں انھوں نے نیا آیا ہوا خط انھیں بلوز میں اڑستے ہوئے تو نہیں دیکھ لیا ــــ

"تمہارے پاس ہے ہی کیا جو میں چوری کرونگی۔ ہمارا ہی کھاؤ اور ــــ" عطیہ نے اپنی روٹی کا طعنہ دیا ــــ

"بند کرو اپنی بکواس مجھے سب پتہ ہے کہ میں کس کا کھاتی ہوں۔ خدا کا شکر کرو کہ میں ان سب باتوں کی پرواہ ہی نہیں کرتی۔ ورنہ دن میں تارے نظر آتے ــــ تمہیں! ارے تمہیں کیا تمہارے اس غاصب و ذلیل باپ کو بھی پتہ چل جاتا کہ غاصب بننے میں کیا مزا آتا ہے ــــ مگر مجھے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ ان چیزوں سے راحت بی نے ناگواری سے عطیہ کو دیکھا۔ جیسے انھیں ان کے ابا کے ذکر سے بھی نفرت ہو رہی ہو ــــ

"تم نے اگر آئندہ کبھی میرے ابا کی شان میں گستاخی کی تو راکھ لگا کے زبان کھینچ لونگی اچھی آئیں وہاں سے بے سہارا بن کے اور اب ــــ"

"ہونہہ! دعا دو تم میری بے نیازی کو ورنہ تمکو سچ سچ بتا دیتی کہ کون کتنا بے سہارا ہے ــــ" راحت نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ ورنہ اتنے میں تو وہ سب کچھ بھول کے گالی پر اتر آتی تھیں ــــ ویسے وہ بھوکے شیر کی طرح پلنگ سے اٹھ بیٹھیں۔ اور عطیہ کو ایسے دیکھا جیسے نگا ہوں میں کھا جائینگی اور پھر وہ سچ مچ شیر کی طرح عطیہ پر حملہ کر بیٹھیں۔ اور قبل اس کے کہ عطیہ کی کچھ میں کوئی بات آئے۔ انھوں نے اس کے بلاؤز میں ہاتھ ڈال کے اپنا لفافہ کھینچ لیا۔

"بڑی پارسا بنتی ہو۔ اور مال متاع تو بڑی باتیں ہیں۔ ارے تم تو اتنی رذیل ہو کہ ہمارے خط چرا کے پڑھتی ہو ــــ"

"کس نے کہا میں تمہارے خط چرا کے پڑھتی ہوں" ــ" عطیہ نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

"اچھا! خوب ہیں آپ بھی عطیہ بیگم۔ جواب نہیں ہے۔ یہ خط رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا زندہ ثبوت ہے ۔"

راحت بی نے دوز دیس سے آئے ہوئے اس خط کو آہستہ سے لفافے سے نکالا۔ جو عطیہ کے پسینے اور ایوننگ اِن پیرس کی خوشبو میں رچ رہا تھا۔

"آپ خود ہی اٹھائی گیری ہیں۔ جانے کس کس کو آپ شناپ لکھتی رہتی ہیں ۔ اور پتہ نہیں کہاں سے ننگے ننگے خط آتے ہیں تمہارے پاس ۔۔۔ اور ۔۔" "اور تم ایسے ننگے ننگے خط پڑھنے کے لئے ترستی رہتی ہو۔ گھٹیا جینس ۔۔۔ کیونکہ تمہارے لئے نہ کسی کے دل میں جگہ ہے اور نہ نظروں میں وسعت کہ جہاں تمہارا یہ ترستا ہوا وجود سما سکے ۔۔ اور اسی لئے تم میرے خطوط چرا چرا کے ذہنی عیاشی کی تسکین کرتی ہو کیوں ۔۔ ؟" راحت بی نے دھیمے دھیمے لیکن بڑے کٹیلے انداز میں اپنی بات پوری کی ۔۔۔ "

"بند کرو اپنی بیہودہ باتیں ۔۔۔ خدا کی مار، خود پتہ نہیں کہاں کی بدچلن آوارہ ہو اور مجھے ۔۔۔"

"اور تمہارا دل مجھے دیکھ دیکھ کے ایسی ہی آوارگی اور بدچلنی کرنے کے لئے تڑپتا ہے کیوں ؟ ہے نا ۔۔" راحت بی نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"خدا نہ کرے ۔ لعنت ہے تم پر اور تمہارے دوستوں پر۔ تم سمجھتی کیا ہو اپنے کو ۔۔"

"لعنت تم پر اور تمہاری سات پشت پر تم کون ہوتی ہو میرے دوستوں کو کچھ کہنے والی وہ تم سے کچھ مانگنے آتے ہیں ۔۔ کیا ۔۔"

"بالکل بھیجونگی لعنت ایک نہیں ہزار بار لعنت" ۔ پتہ نہیں کہاں کے لفنگے ہیں کم بخت ،

"جہنم میں جاؤ تم۔ اور سنو عطیہ بیگم یہ تو مجھے بہت ہی اچھی طرح معلوم ہے کہ تم انہیں لفنگوں کی ایک نظر عنایت کے لئے ترستی ہو ۔۔۔"

"تم بے شرم ہو ! مجھے تمہارے بیہودہ اور یاوہ گو احباب سے کیا مطلب خدا تمہیں ہی ان آوارہ لوگوں کی صحبت نصیب کرے ۔۔"

"آمین ۔۔" راحت بی نے بڑے خشوع وخضوع سے کہا۔ خدا کرے تمہاری دعا قبول ہو جائے۔ مجھے سچ مچ اپنے ان دوستوں کی صحبت تم جیسے پارسا عزیزوں کی صحبت سے کہیں زیادہ پیاری ہے۔"

لیعنی تم کو یہ اقرار ہے کہ تمہارے جاننے والے سب انتہائی گھٹیا ہیں ۔" عطیہ نے یکایک سوالات کی نوعیت پلٹ دی۔ کل ان کے ابا نے راحت بی کو بہت برا بھلا کہا تھا کیونکہ بیچ راستے ان کے ایک دوست نے ان سے راحت بی کی خیریت پوچھ لی تھی۔ "آپ نے کہہ دیا ہوتا کہ میرا راحت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ میری بیوی کی سب سے ناکارہ بہن ہے۔ اور میں اسے ایک منٹ کے لئے بھی اپنے گھر میں رکھنے کا روادار نہیں ۔۔۔ لیکن کیا کروں کم بخت کی اتنی بڑی جائداد میرے دل پر لاسہ بن کے چپک گئی ہے ۔۔۔"

"خاموش ہو جاؤ ۔۔۔"

"کیوں خاموش ہو جاؤں بھلا ــــ"

"خاموش ہو جاؤ ورنہ ــــ" عطیہ کے ابا کی توند بڑے زور سے مضحکہ خیز انداز میں تھرتھرائی ۔

"کیا ورنہ ــــ" راحت بی کسی سے ڈرنا جانتی ہی نہیں تھیں ۔

"ورنہ مار بیٹھونگا ــــ" وہ تنتنائے ۔

"اچھا ۔ بڑا مان ہے آپ کو ۔ ذرا ہاتھ لگا کے تو دیکھو میں تمہاری باندی، غلام نہیں ہوں ۔ ہاتھ توڑ کے رکھ دونگی ــــ راحت بی نے اعصاب زدہ کی طرح آنگن میں پڑی ہوئی کھنتی اٹھالی ۔

"ابھی چکھاتا ہوں تجھے اس خودسری کا مزہ ــــ عطیہ کے ابا دوڑ کے اپنے کمرے میں چلے گئے ۔

اری راحت اللہ کا غضب گرے تجھ پر ۔ چل یہاں سے کمبخت ، پتہ نہیں کس گناہ کی سزا مل رہی ہے مجھے ــ"

راحت کی آپا چولھے کے پاس سے دوڑی ہوئی آئیں اور راحت سے لپٹ گئیں ۔

آپ ہٹ جائیے آپا آج میں آپکے میاں کو سمجھا دونگی کہ شرافت کیا ہے اور رذالت کیا ہے ۔ راحت نے اپنی آپا کی کمزور بانہیں اپنی کمر کے گرد سے ہٹانی چاہئیں

"نہیں راحت میری جان ۔ ارے تو تو میرے بیٹوں سے بھی چھوٹی ہے میں نے تو سوچا تھا کہ تجھے آنکھ کی پتلی بنا کے پالونگی ۔ مگر ــــ مگر ــــ میں تجھ سے معافی مانگتی ہوں ــ"

"ہٹ جاؤ میرے سامنے سے بیگم ــ" دولہا بھائی ۔ اپنی توند مٹکاتے ہانپتے ہوئے آئے ۔ اور ہاتھ میں تھامی ہوئی بندوق کی نال سیدھی کر دی ــــ ہفتے میں دوچار بار بندوق نکالا ہی کرتی تھی ــــ اور سب ہی کو پتہ تھا کہ یہ بندوق کھلونے والی بندوق سے زیادہ بے ضرر ہے ۔ کیونکہ گھر میں کارتوس ہے ہی نہیں ــــ

"اونہہ ہٹ جاؤ آپا تم سامنے سے میں اس مردے کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والی نہیں ــــ ہاں ــــ آج اسے بھی پتہ چل جائے کہ کون کس کو مزہ چکھا سکتا ہے ــــ" راحت کی بدزبانی بدستور قائم تھی ۔

"اری راحت بی تمہارا دماغ خراب ہوا ہے ۔ کہیں دیوانی تو نہیں ہوگئیں ــــ" عطیہ کی آسیب زدہ پھوپی غسل خانے کی آڑ سے چلائیں ــــ

"اے عائشہ بی تم ہی آکے اسے سنبھالو" راحت کی آپا کو جیسے سہارا مل گیا ۔ انھیں اچھی طرح پتہ تھا کہ ہزیانی حالت میں اگر کوئی راحت کو سنبھال سکتا ہے تو وہ خود عائشہ بی تھیں جن پر آسیب کا سایہ تھا ۔ اور ماما کا تو خیال یہ تھا کہ اس آسیب کا کچھ کچھ سایہ راحت بی پر بھی پڑ رہا ہے ۔

"میں کیسے آؤں تم اپنے صاحب بہادر کو ہٹاؤ تب تو ــــ"

"مگر پھوپھو وہ تو آپکے بھائی ہیں جیسے اچھے بھیا ہمارے ــــ"

"ہمارا کوئی بھائی وائی نہیں ہے ۔ میں تو بس اللہ کی طرح اکیلی ہوں ــ" عائشہ پھوپھو آہستہ سے کہتیں ۔

"پھر جاؤ عرش پر خدا تو دنیا میں نہیں رہتا ہے"

"ارے او میں خدا تھوڑے ہی ہوں ۔ میں نے تو کہا کہ میں خدا کی طرح اکیلی ہوں ــــ"

"پھر بھی خدا"

"لعنت ہے تم پر - میں کیوں ہونے لگی اس سے بہتر —— " عائشہ پھوپھو کو بکنے پر اتر آئیں ——
اور ابا جواب تک بندوق تھامے غصے سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ بندوق پلنگ کے کان میں انگلی دے کر بھاگ گئے۔
بے چارے خلصے اللہ والے آدمی تھے پھر خدا کی شان میں گستاخی کیسے برداشت کرتے — اور عائشہ پھوپھو کی راحت تو تھیں نہیں کہ بندوق نکال کے ٹکڑے ہو گئے — ان پر — یہ تو آسیب زدہ عائشہ بی تھیں۔ اور بیسویں صدی میں بھی ابا آسیب اور جناتوں پر یقین رکھتے تھے - ہاں اور کیا - بدروحوں اور جناتوں کا ذکر تو قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔
"بھاگ گیا کٹھ ملا —" عائشہ بی غسل خانے کی آڑ سے نکل آئیں۔

راحت خشک ہونٹوں اور ہوائیاں اڑتے چہرے کے ساتھ اب تک کھنتی ہاتھ میں لئے کھڑی تھی اس کی آپا کی دونوں آنکھیں آنسوؤں کی چادر سے ڈھکی ہوئی تھیں ——

راحت بی تم کم از کم میرے ہی لئے خاموش ہو جایا کرو - یہ آئے دن کی تو تو میں میں، آخر کون تھوکے گا میرے دروازے پر —— اور ابھی تو تمہارا بیاہ بھی —— "

"لعنت ہے بیاہ پر اور مجھ پر بھی آپ۔ آپ۔ آپا آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے - میرا سب کچھ —— آپکو یقین ہے کہ اس کی نوبت بھی آئے گی - یہ آپ کے میاں صاحب —" راحت نے نفرت سے تھوکا۔

"میں کیا کرسکتی ہوں راحت میں تو خود —" اور آپا دھاروں دھار رونے لگیں ——

"اللہ ہٹو بھابی کیا ٹسوے بہانے بیٹھ گئیں —" اتنی بہادر ہے ہماری راحت بی کم از کم اس بڈھے کو بھی تو پتہ چلا آج کہ ابھی فرعونوں کے لئے موسیٰ موجود ہیں دنیا میں۔

"اے کمبخی تو چپ کر جاؤ عائشہ بالآخر کو عطیہ کے ابا تمہارے بڑے بھائی ہیں"

بھائی —— ہاں اللہ کی قسم بھابی مجھے اپنی اس بدقسمتی کا بہت صدمہ ہے کہ میں اس شخص کی بہن ہوں — عائشہ بی نے آہستہ سے کہا ——

"تم یہ کس منہ سے کہتی ہو - عائشہ - سنا تھا کہ بہنیں بھائیوں پر سے واری ہو جاتی ہیں"
آخر کو وہ ان کے میاں تھے ——

"بھائیوں پر سے واری ہوتی ہیں نا —— دشمنوں پر سے تو نہیں ؟ —— " -

"آؤ راحت چلیں —— " عائشہ بی نے —— اپنی بھری بھری باہوں میں دبلی پتلی راحت بی کو سمیٹ لیا اور وہ جس کی آنکھیں مارے جلن کے تپتا ہوا صحرا بن گئی تھیں۔ ایکدم امنڈ آئیں اور وہ اور عائشہ بی بہت دیر تک گلا جوڑے روتی رہیں۔

"اللہ دلہن بی، راحت بی کو عائشہ بی سے الگ کرو — انکا آسیب کہیں چمٹ نہ جائے انھیں۔ . . ."
عائشہ بی بی کی ذاتی ماما، رحمت بوا نے گھبرا کے راحت کی آپا کو خبر دی۔
اور آپا اسے سمجھا بجھا کے گھر لے آئیں۔

"راحت تم عائشہ کے پاس اتنا مت بیٹھا کرو ۔۔۔"

"کیوں ۔۔۔"

"وہ آسیب زدہ ہے ۔"

"آپ بھی ان لغویات میں یقین رکھتی ہیں آپا ۔" راحت نے تعجب سے اپنی آپا کو دیکھا ۔ جن کے بارے میں یہ بات سارے خاندان میں مشہور تھی کہ وہ اپنے زمانے کی بڑی جی دار کارکن تھیں ۔ اور ان کی ذات سے بہت ساری خاندانی روایتوں کو دھکا لگا تھا ۔

"دو کیا جانتی ہو ہر کو ۔ جتنی مختصر ہے اس کے فیصلے اتنے ہی وزن دار ہوتے تھے ۔ اس نے بھیا کو قائل کر کے تعلیم حاصل کی ۔ اور خاندان کی دوسری لڑکیوں کے لئے ترقی کے دروازے کھول دیئے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے چھوٹے چچا ہر آپا کے بارے میں بڑے فخر سے اپنی لڑکیوں کو بتاتے تھے ۔ وہ اپنے خاندان کے پہلے لندن پلٹ تھے ۔ اور ہر آپا پہلی گریجویٹ تھیں ۔ اور لقب جوب سے چھوٹی تھیں ۔ جنھیں ابا ایکدم یاد نہیں تھے ۔ چچا کے مرنے کے بعد سچ مچ یتیم ہوگئیں تھیں ۔ اور شاید وہ خود اپنے گھرانے کی پہلی لڑکی تھیں جنھوں نے قلم میں پناہ ڈھونڈی تھی ۔ اور اب آپا کے ساتھ رہتے ہوئے انھوں نے بھی محسوس کیا تھا کہ آپا ایک کھوکھلی دیوار ہیں ۔ اور ان کا وزن دن بہ دن کم ہوتا جا رہا ہے ۔ اور ان کی انانیت بڑے جیسے برخود غلط میاں سے ٹکرا ٹکرا کے پارہ پارہ ہوگئی ہے ۔

[illegible] آپا تو اس حد تک کمزور نہیں سمجھی تھیں کہ وہ ما فوق الفطرت عناصر پر بھی ایمان لے آئینگی ۔۔۔

"آپ بھی آپا ۔ یعنی آپ بھی عائشہ آپا کو آسیب زدہ کہتی ہیں"

"میں ۔ نہیں تو ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ مگر کچھ نہ کچھ ہے تو ضرور ورنہ یہ عائشہ اچھی بھلی تھی ۔۔۔ یک بیک ۔۔۔" آپا نے جواب دیتے ہوئے کشمکش سی محسوس کی ۔

آپ انھیں آسیب زدہ کہتی ہیں آپا ۔۔۔ اور میرا خیال ہے کہ ان کے علاوہ یہاں سب آسیب زدہ ہیں ۔۔۔ اور آپ پر تو آپا ۔ گستاخی معاف ۔۔۔ اس آسیب کی ایسی گہری چھاپ پڑی ہے کہ آپ کی شخصیت مسخ ہو کے رہ گئی ہے ۔۔۔"

"کیا بکتی ہو ۔ دماغ تو صحیح ہے نا تمہارا ۔۔۔"

"سولہ آنے صحیح ہے اور میں کیا بکتی تھی یہ آپ بھی اچھی طرح سمجھتی ہیں ۔ مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی ۔ آپ کے قصے سناتے ہوئے چچا میاں کی زبان نہیں تھکتی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی روح آپکی یہ درگت دیکھ کے شرمائی ، شرمائی پھرتی ہوگی ۔۔۔" راحت بی اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے مڑ گئیں ۔

"تم پاگل ہو اور میرا خیال ہے تمہیں بھی عائشہ کی ہوا لگ گئی ہے ۔۔۔ کیوں ۔۔۔" آپا ان کی ساری باتیں سمجھتے ہوئے بھی آہستہ سے بولیں ۔۔۔

"مجھے کیا ہوا لگے گی البتہ تم پر دولہا بھائی کا ایسا رنگ چڑھا ہے کہ تمہاری اپنی شخصیت اس رنگ میں ڈوب کے گم ہوگئی ہے ۔ اور تمہاری اولاد اللہ کی مار ان پر بالکل اپنے باپ کی طرح غاصب ۔۔۔" راحت نے کمرے میں قدم رکھا تو سب سے چھوٹی منی اس کے قلم کی نب کو منہ میں رکھے بڑے مزے میں پنسل کی طرح چوس رہی تھی ۔

"ارے وحشی ـــ" راحت بی نے جھٹکے سے قلم اس کے منہ سے کھینچ لیا۔ اور چھوٹی منی کے ہونٹ میں نب چبھ گئی اور نگلابی ہونٹ سے جیتے جاگتے خون کے یاقوتی قطرے ٹپکنے لگے۔

"کیا وحشت ہے تمہارے ہاتھ کیوں نہیں ٹوٹ گئے راحت بی اتنی بڑی بچی پر ظلم توڑتے ہوئے" عطیہ کہیں سے ان کی تنبیہ کرنے کے لئے آ ٹپکی۔

"ارے آدمی بنو آدمی۔ تمہارے اس لچھن سے کہاں گذر ہوگا تمہارا ـــ"

"اپنی فکر کرو تم ـــ میں جہاں ہوں ٹھیک ہوں، تم سے مطلب ـــ" راحت کو اپنی بھانجی کا یہ سرپرستانہ لہجہ کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

اور اس وقت بھی وہ بڑے اطمینان سے عطیہ کی شخصیت کے نازک تاروں کو چھیڑ چھیڑ کے لطف اندوز ہو رہی تھی ـــ وہ ظالم نہیں تھی اور نہ لوگوں کو اذیت دے کے اسے کوئی خوشی ہوتی تھی۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ اس کا دل اپنے گھر کی ننھی منی شیرس (کتیا) کے دکھ پر بھی لرز لرز گیا تھا۔ اور اس کے علاج کے لئے اس نے افتخار بھائی سے لے کے بندو جمعدار تک کی خوشامد کی تھی۔

افتخار بھائی۔ اس نے آہستہ سے زیر لب کہا اور عطیہ پر آگ برساتی زبان جیسے ٹھنڈے پانی میں بجھ کے رہ گئی ـــ اور وہ لڑنا وڑنا بھول کے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو عطیہ ـــ" عائشہ پھوپھو بکتی جھکتی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"سب ہی اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں لو بھلا وہ ریچھ بھی کہیں میری اس نازک نازک سی گڑیا کے لئے مناسب ہے ہاں ـــ اور نہیں تو ـــ"

"وکس کی بات کر رہی ہیں پھوپھو ـــ"

"وتمکو کیوں بتاؤں بھلا ـــ تم جاؤ اپنے باپ کے پاس ـــ یا اپنی بیوقوف بزدل ماں کے کلیجے سے لگی بیٹھی رہو ـــ"

"مگر پھوپھو آپ کس کی باتیں کر رہی تھیں۔ کیسے ریچھ بتا رہی تھیں"

"اطمینان رکھو میں تمہاری باتیں نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ تم تو خود ریچھ کی اولاد ہو اور تمہیں ـــ یعنی کہ اگر تمہارے لئے کسی ریچھ کا انتخاب کیا جائے تو بھی بے جا نہ ہوگا ـــ مگر ـــ افسوس تو یہ ہے عطیہ بیگم کہ آپ کو تو کوئی ریچھ نما بھی گھاس نہیں ڈالے گا۔ عائشہ پھوپھو پتہ نہیں کس جنم کا بدلہ اس سے لے رہی تھیں۔

"یا اللہ سب ہی میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ـــ" عطیہ کو اپنا وجود ایک ایسا پتھر نظر آیا جسے دیکھ کے لوگ، چومنا تو دور کی بات چھونا بھی نہیں گوارا کرتے۔ وہ تو سبھوں کے کلیجے پر رکھی ہوئی سل تھی ـــ

عائشہ پھوپھی تو آسیب زدہ تھیں ان کی باتوں کی کیا پروا لیکن یہ واقعہ تھا کہ راحت نے اسے زندگی کے ہر موڑ پر شکست دی تھی۔ اور اماں بے چاری اس کے وجود کی سل کے نیچے دبی جا رہی تھیں۔ ابا پر مارے فکر کے دل کے دورے پڑنے لگے تھے۔

پھوپھو کا خیال تھا کہ ابا نے بہت سارے برے کام کئے ہیں اور تو اور عائشہ پھوپھو کا اپنا خون بھی ان کی گردن پر تھا۔
" ابا نے ذاتی مفاد کے لئے سب کا حق غضب کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ عائشہ پھوپھو جیسی جیالی خاتون کے سارے پر کاٹ کر کے انھیں ـــــ " یہ ساری باتیں اچھے نبکار تار ہتا تھا۔ جس کے بارے میں ابا کی رائے خراب ہوتی جا رہی تھی ـــ

اور عائشہ پھوپھو وہ تو جیسے سدا کی بیرن تھیں کہ انھوں نے راحت جیسی شر لپسند سے گٹھ جوڑ کیا تھا۔ اور اس وقت بھی تیکھی تیکھی باتوں سے اس کے دل پر کچوکے لگا رہی تھیں۔

" راحت رانی تمہاری تباہیوں کے شورے ہو رہے ہیں ـــ " عائشہ پھوپھو عطیہ بی کی رونی صورت کو نظر انداز کر کے راحت کے پلنگ پر جا بیٹھیں ـــ جو ان کی تمام مکالمہ بازی کے باوجود بے جان سی پڑی تھی ـــــ

"سن رہی ہو میری جان" عائشہ پھوپھو نے آہستہ سے راحت کو چھوا۔

" کیا ہے عائشہ آپا ـــ " راحت نے بے حسی سے عائشہ کو دیکھا۔

" میں نے کہا جان! ایسے پڑے رہنے یا عطیہ سے لڑتے رہنے سے کیا فائدہ ۔ تم ذرا اپنے آپ کو سنبھالو۔ تم اتنی کمزور تو نہیں ہو جتنی کہ ـــ "

" لیکن ان باتوں سے کیا فائدہ عائشہ آپا۔ میری قسمت کے سارے دروازے تو اسی دن بند ہو گئے ۔ جب آپا مجھے چچا میاں کے یہاں سے لے آئیں کیونکہ افتخار کے لچھن اچھے نہیں تھے ۔ "

" ہاں ۔ آں افتخار کے لچھن اس لئے برے تھے میری جان کہ اسے تمہارے چچا نے تمہاری جائداد کا دلی بنا دیا تھا۔ اور میرے غاصب بھائی کی طرح اسے زمانہ سازی نہیں آتی ہے ـــ کیوں ـــ " عائشہ پھوپھو راحت کے برابر لیٹ گئیں ـــ اور عطیہ کے جسم میں خوف سے کپکپی سی دوڑ گئی ـــــ انھوں نے ہوش سنبھالنے کے بعد آج تک کسی کو پھوپھو کے ساتھ اتنی آزادی سے رہتے نہیں دیکھا تھا۔ سوائے اماں کے کوئی عائشہ پھوپھو کے قریب جانا پسند نہیں کرتا تھا ـــ اور راحت بی اماں سے کم نڈر نہیں تھیں۔ جو اندھیری رات میں کھنڈر پار کرکے دندناتی ہوئی پھوپھو کی طرف چلی جاتی تھیں، جہاں انھیں اگر کسی بتی سے کوئی ڈر لگتا تھا اور نہ چاندنی رات میں سفید لباس میں ملبوس پھوپھو سے خوف آتا تھا۔ مزے مزے کی باتیں کرتی ہوئی وہ مولسری کے درخت کے سائے میں بیٹھی نظر آتی تھیں اور پتوں سے چھنتی ہوئی چاندنی میں اُن کا وجود نہ نہ انسانوں سے زیادہ سائے نظر آتے تھے۔ انھیں دیکھ کے عطیہ وغیرہ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ۔ اسی کھنڈر میں ایک پختہ قبر تھی جسے پھوپھو ہمیشہ اپنے آنچل سے صاف کرتی تھیں ـــــ

" پھوپھو یہ کس کی قبر ہے؟ " صبح کے وقت عطیہ ہار سنگھار کا پھول چننے جاتی تھی ـــــ

" میرے شہید کی ـــ "

" آپ کے شہید کی " کیا مطلب ؟ ـــــ میں کچھ نہیں پھوپھو ـــــ " ہار سنگھار کے ننھے ننھے پھول بٹور بٹور کے وہ اپنی ڈلیا میں ڈالے جاتیں ـــ

مطلب مطلب یہ کہ اسے تمہارے ـــ یعنی کہ تمہارے ـــ یعنی تمہارا کلیجہ ـــــ پھوپھو قبر صاف کرنا چھوڑ کے منہ سے جھاگ اڑاتی دوڑتیں ـــــ اور سب بھائی بہن خوفزدہ ہو جاتے ـــــ پھوپھو پر آسیب آ رہا ہے ـــ اور

یہ خوف ان کے دلوں میں بیٹھ کے رہ گیا تھا۔ ان کے ہوائیاں اڑتے چہروں کو دیکھ کے اچھی بھلی اماں بھی پریشان ہو جاتی تھیں۔
اور اس وقت بھی پھوپھو کو راحت بی کے ساتھ لپٹا دیکھ کے عطیہ کو جھرجھری سی آگئی ——

"راحت میری گڑیا تو کہاں اس گورکھ دھندے میں پھنسی ہوئی ہے۔ تم تو میری جان بسم اللہ کہہ کے اپنے اس دوست کو خط لکھ دو کہ تمہیں لینے آجائے — "

"کس دوست کو خط لکھ دوں عائشہ آپا — " راحت بی نے تعجب سے ان کی طرف مڑ کے دیکھا۔

"ارے اتنے سارے تو خط آتے ہیں تمہارے پاس۔ کیا ان میں کوئی جیالا بھی ایسا نہیں ہے جو نفتلوں کی اس دنیا سے اپنی سجوگتا کو لے اڑے۔ کوئی بھی رام نہیں ہے جو اپنی سیتا کو چھڑانے جائے — ایں — بھلا —— "

عائشہ پھوپھو کو ہندو دیومالا پر خاصا عبور تھا۔ اور بے چاری اس مسلمان گھرانے میں خاصی مس فٹ تھیں —— ان کا علم یہاں کے ماحول کے لئے کالا علم تھا۔

"لیکن عائشہ آپا میں کسی راون کے نیچے میں تو ہوں نہیں —— "

"اللہ بٹیا تم کتنی سادہ لوح ہو — یہ جو میرا بھائی ہے کسی راون سے کم ہے کیا —— ارے راون تو پھر بھی بہادر تھا۔ اور اسی لئے میں اُسے ہیرو مانتی ہوں —— اور یہ کم بخت میرا بھائی —— یہ تو کچھ اور ہی ہے" عائشہ پھوپھو اور بدا کے بدزبانی پر اتر آئیں ——

"مگر عائشہ آپا —— "

"دیکھو بٹیا میں تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتی ہوں کہ تم اپنے اتنے سارے دوستوں میں سے کسی کو بھی —— وہ جو تمہارا کلاس فیلو ہے لانبا سا۔ بھرے بھرے جسم والا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے —— کہو — "

"لاحول ولا قوۃ عائشہ آپا کہیں آپ سچ مچ تو پاگل نہیں — کیسی بات کہاں لے آئیں —" اس نے دہشت زدہ ہو کے عائشہ آپا کو دیکھا جو ابتدا ہونے سے اس کا بیاہ کرانے پر تلی بیٹھی تھیں ——

"دیکھو بھئی راحت میں تمہارے لئے ہی کہتی ہوں ورنہ تم جانو یہ جو سب سے بڑا بھوت ہمارے ہاں ہے وہ تمہاری جائداد کے چکر میں تم ہی کو نہ نگل جائے کہیں —— "

میں اتنی کمزور نہیں ہوں عائشہ آپا —— کوئی ذرا آنکھ اٹھا کے تو دیکھے میری جائداد کی طرف، میں اس کی آنکھ نکال لونگی —— ہاں —— " راحت جلبلا کے اٹھ بیٹھی ——

"مگر گڑیا وہ تو تمہارا سودا کر رہے ہیں۔ وہ آیا بیٹھا ہے غلام رسول"

"کون غلام رسول سیٹھ —— وہ —— وہ موا جوٹ کا بیوپاری — "

"ہاں، ہاں، وہی — وہ خود جاہل ہے نا اس لئے پڑھی لکھی لڑکی کی تلاش میں ہے تاکہ اس کے کاروبار کی ترقی میں مدد ملے — "

"اچھا"

"ہاں اور کیا"

"ہوں ــــ تو یہ بات ہے ــــ" راحت نے اپنے ہونٹ پر زبان پھیری ــ" لیکن عائشہ آپا اس کے تو بیوی بچے بھی ہیں ــ پھر شادی کا کیا سوال ــ ؟"

"تم کیسی مسلمان ہو ــــ ارے بھئی وہ تو پکے مسلمان ہیں اور وہاں تو چار چار کی اجازت ہے ــ"

"ہاں یہ تو ہے ــ"

"پھر کیا خیال ہے تمہارا ــــ اس طرح تمہاری ساری جائیداد ان کے بال بچوں کے کام آئے گی"

"مگر اس کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے ــ ؟"

"کیوں بھلا ؟"

"میرے زمانہ ساز بھائی کی ایک شرط یہ بھی تو ضرور ہی ہوگی۔ عائشہ پھوپھو جیسی ــــ راحت کی بھویں تن گئیں" کمال ہے انہیں کیا حق پہنچتا ہے اس انداز سے سوچنے کا ــــ یں اسی لئے افتخار کو آوارہ بدچلن اور بیہودہ بنایا جا رہا تھا ۔ آپا بھی کیسی چالاک ہیں ۔ انھوں نے کس مزے سے اسے الٹا سیدھا سمجھا کے یہاں لا پھینکا تھا ۔

" دیکھو راحت افتخار لاکھ اچھے سہی ، اپنے سہی ، لیکن ہیں تو وہ چچا زاد اور اگر مارے محبت کے کہیں تمہیں زیادہ اہمیت دینی شروع کی تو خواہ مخواہ کی باتیں بنینگی ۔ اس لئے عقلمندی اسی میں ہے کہ تم میرے ساتھ چلی چلو تمہارے دولہا بھائی کہتے ہیں جب تم خود تعلیم مکمل کر لوگی تو ہم تمہیں اپنے ہاں سے رخصت کر دیں گے ــــ"

"لیکن آپا افتخار بھائی ــــ"

" افتخار کچھ بھی نہیں کہیں گے ــــ" بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ یہاں تمہیں اپنے " مطالعہ کا وقت بھی نہیں ملے گا ۔ کیونکہ افتخار میاں نے بہت ساری علتیں پال رکھی ہیں "

"لیکن آپا میں افتخار کے سوا ــــ"

ہاں ہاں مجھے خود افتخار بہت پسند ہے ۔ میرا خیال ہے کہ افتخار میرا ہم عمر ہے ۔ اور بٹیا یہ تو چچا میاں کا ظلم ہے جس نے تمہیں اس سے منسوب کر کے رکھ دیا ۔ ورنہ افتخار کی تو اولادیں تمہاری عمر کی ہو سکتی تھیں ــــ

"کیسی باتیں کرتی ہو آپا ــــ اتنے پیارے سے تو ہیں ۔ کتنے سنجیدہ کتنے باوقار میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ اپنی نوعمری ان کی سنجیدگی ــــ" وہ شرما سی گئی ۔

"مجھے آپا لئے جا رہی ہیں ــــ" صبح سویرے افتخار کے کمرے میں چائے پہنچانا اس کے بچپن کا معمول تھا ۔

"سنئے ــــ مجھے آپا لئے جا رہی ہیں ــــ" اس نے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے دوبارہ کہا ــــ اور افتخار حسب معمول اخباروں سے الجھ رہا تھا ۔

" آپنے سنا نہیں ــــ"

"ایں کیا کہا ۔ چائے کی پیالی مجھے پکڑا دو ــــ" اس نے لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھایا ۔

"میں نے کہا مجھے آپا اپنے ساتھ لئے جا رہی ہیں ــــ"

"اچھا ۔ مگر کیوں ــــ"

" ان کا خیال ہے کہ میں تعلیم پہلے مکمل کروں ــــ "
" اور تمہارا اپنا کیا خیال ہے ــــ گڑیا رانی ــــ ، افتخار نے کروٹ لے کے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔
" میرا ۔ میرا جی ۔ یہ ، یعنی کہ جو آپ کی رائے ہوگی وہ میری ہوگی ــــ "
ہوں ۔ آپا تمہارا کبھی برا نہیں چاہیں گی ــــ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔
" وہ مجھ سے صرف چھ مہینے ہی تو بڑی ہیں ــــ اور ــــ اُف یہ چھ مہینے در اصل ہمارے درمیان ایک نہ ٹوٹنے والی دیوار بن گئے ــــ "
" کیا مطلب "
" کچھ بھی نہیں گڑیا رانی " یہ بہت پرانی بات ہے جب ایک پاگل سا لڑکا اپنی بنت عم کا پروانہ ہو رہا تھا لیکن ــــ "
یعنی آپ ، آپا ــــ "
" وہ سب کچھ ختم ہو گیا گڈو ــــ اب تو ــــ بس تم ہی تم ہو ــــ یہ تو صرف کہنے کی باتیں ہیں ۔ میں تم سے سترہ سال بڑا ہوں لیکن یہ بڑائی کچھ بھی نہیں ۔ یہ عمر کا بعد کسی کو نہیں سوجھا ــــ اور وہ چھ مہینے معاذ اللہ ــــ میرا تو خیر ــــ کچھ نہیں بگڑا ــــ لیکن ــــ "
" یعنی آپ ــــ "
اب وہ سب کچھ نہیں رہا تھی ۔ اب تو صرف تم ہی تم ہو ــــ
افتخار نے آہستہ سے اسے جھکایا اور لیٹے ہی لیٹے اس کے لب چوم لئے ۔ اور اس نے محسوس کیا جیسے اس پیار میں مٹھاس کے بجائے ایک کڑواہٹ ہے ــــ تو افتخار نے اسے بڑی آپا کا عکس سمجھ کے اپنایا ہے ــــ گھر کے سب ہی لوگ اسے دوسری مہر کہتے تھے ــــ
اچھا تو افتخار صاحب میں آپا کی آواز بازگشت نہیں بنوں گی سمجھے ــــ اس نے آہستہ سے افتخار کی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کے اوپر چڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں فیصلہ کیا ــــ اور اپنے اس فیصلے پر اس کا دل اندر ہی اندر کٹ کے رہ گیا ــــ اور اس نے پہلی بار جھک کے افتخار کے لب پر لب رکھ دیئے اور اس کا دھڑکتا ہوا دل افتخار کے سینے سے لگ گیا ــــ
" کیوں راحت ــــ " افتخار گھبرا کے اٹھ بیٹھا ــــ جیسے کوئی ممنوعہ شئے اس سے ہم آغوش ہو رہی تھی ــــ دو موٹے موٹے آنسو اس کے گال سے ڈھلک کے افتخار کے بازو پر گرے ۔
" کچھ نہیں ــــ اس نے آہستہ سے اپنا سر افتخار کی گود میں رکھ دیا ۔
" تمہارا جی اگر نہیں چاہتا تو مت جاؤ ــــ " افتخار نے اس کے گھنے بالوں میں اپنی انگلیاں ڈبو دیں ــــ
میں ــــ میں نہیں جی میں ــــ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی وہ ہکلا کے رہ گئی ــــ "
" تمہیں مزید تعلیم کی کیا ضرورت ہے ــــ

"تم کہو تو میں آپا کو روک لوں۔ اور —"

"نہیں، میں تعلیم مکمل کر لوں —"

"تم بعد میں بھی پڑھ سکتی ہو گڑیا رانی —"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر —"

مگر — مگر میں آپا کا عکس بن کے تمہارے پاس نہیں رہنا چاہتی افتخار —" راحت نے اپنا سر افتخار کی گود سے اٹھا لیا اس کے لہجے میں تلخی تھی —

"خوب بہت عقل آگئی ہے تمہیں —" افتخار نے اس کا چہرہ پکڑ کے اس کی آنکھوں میں جھانکا وہ پاگل پاگل سی آنکھیں جن میں پیار کی لہریں اٹھتی نظر آتی تھیں — ان میں خفگی کا دریا موجزن تھا — اور محبت زخمی ہو کر اس میں غوطے لگا رہی تھی —

"تم نے غلط سمجھا — ہر شخص کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے — اور میں تمہیں راحت ہی سمجھتا ہوں —"

افتخار کی آنکھیں جھک گئیں —

"ٹھیک ہے مگر میں آپا کے ساتھ جاؤنگی۔ اگر آپ سچ مچ مجھے راحت سمجھتے ہیں تو —" ورنہ میں کسی کا سایہ بن کے نہیں رہنا چاہتی — میں نہیں چاہتی کہ آپ میرے روپ میں کسی اور کا پرتو دیکھیں۔"

افتخار خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سولہ برس کی راحت اسے اپنی طرح ۲۲ سال کی نظر آ رہی تھی — عورت نہ بوڑھی ہوتی ہے اور نہ جوان۔ عورت بس عورت ہوتی ہے — جو اپنی کم عمری کے باوجود اپنے مطلب کی باتیں بہت ہی صحیح سمجھتی ہے۔ افتخار نے اس سولہ سالہ لڑکی کو غور سے دیکھا —

اچھا تم ضرور جاؤ آپا کے ساتھ لیکن ایک بات میری یاد رکھنا۔ تمہاری آپا بُری نہیں ہے۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ لو کہ وہ غلط آدمی کے پلّے پڑ گئی ہے اور یہ "ستیتا" اس کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ اس پر اپنے شوہر کا بڑا زبردست دباؤ ہے کہیں ایسا نہ ہو تم وہاں پریشان ہو جاؤ —"

"کیوں میں پریشان کیوں ہونگی وہ لوگ تو میرے اپنے ہیں۔ آپ کی طرح کوئی رشتے دار ہیں کیا —" اس کی زبان پر زہر کی سان بہیں سے چڑھنی شروع ہوئی۔

"بالکل درست کہا تم نے میری جان لیکن پھر بھی تم ہوشیار رہنا۔ تمہاری آپا کا میاں جب معمولی سی بات کے لئے اپنی بہن کی راہ میں کانٹے بو سکتا ہے تو — تم تو اتنی بڑی جائداد کی تنہا مالک ہو —"

"مجھے اس سے کیا لینا وہ تو آپ کے ذمے ہے —"

میں کیوں درد سر مول لوں گا۔ تم جا رہی ہو تو میں اس کے کاغذات بھی ان کو دے دونگا — یہ جائداد کی باریکیاں ان کے میاں مجھ سے بہتر سمجھتے ہونگے —" افتخار بستر چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ دبلا پتلا لانبے قد، فراخ پیشانی کے ساتھ لبوترے چہرے کا مالک کتنا پرکشش تھا —، راحت نے بڑے پیار سے اسے دیکھا — یہ میرا اپنا ہے —

نہیں — نہیں۔ اس نے گھبرا کے آنکھیں بند کر لیں۔

دیکھو راحت رانی میں تو تمہارا صرف رشتہ دار ہوں۔ لیکن تم بہرحال میری جان ہو۔ تمہیں جب بھی یہ احساس ہو کہ تم پریشان ہو مجھے لکھنا میں تمہیں لینے آجاؤنگا۔ یونہی نہیں گڈو بلکہ بڑے کروفر کے ساتھ تمہارے اپنوں کی اجازت سے ــــ" افتخار نے بڑے پراعتماد لہجہ میں کہا۔

"راحت۔ راحت میری جان تم مت جاؤ ــــ" اس نے راحت کو کھینچ کے اپنے سینے سے لگالیا۔

اور راحت نے محسوس کیا۔ جیسے اسکا دل اس کے حلق میں اٹک گیا ہو۔ اس کی خواہش ہوئی کاش افتخار اسے اتنے زور سے دبائے کہ اس کے جسم کی ایک ایک رگ ٹوٹ جائے۔ اور ــــ"

"راحت ــ راحت گڑیا ــــ" افتخار نے جھک کے اس کے گلے پر اپنا لب رکھدیا وہ اس کے انگ انگ کو چومنا چاہتا تھا۔ محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"افتخار، افتخار تمہیں کیا ہوا ہے ــــ" راحت نے اپنے آپکو سنبھالنے کی کوشش کی ــــ

"کچھ بھی نہیں جان تم میری ہو میں تمہیں کہیں نہیں جانے دونگا ــــ" افتخار لڑکھڑایا ایک لمحے کو اس نے سوچا اور آگے بڑھ کے کمرے کے دروازے کی کنڈی چڑھادی راحت کا ننھا سا دل دھڑک کے جیسے خاموشی کے سیلاب میں ڈوب گیا۔

"راحت ــ" افتخار نے اپنے لب پر زبان پھیری۔

میرے قریب مت آنا۔ راحت نے سامنے ٹیبل پر رکھی ہوئی چائے کی کیتلی پکڑلی ــــ

"میں تمہیں کچھ نہیں کہونگا راحت ــ میں تمہارے جسم کو کیسے ہاتھ لگا سکتا ہوں۔ تمہارا جسم تو میری امانت ہے۔ تمہاری تضحیک میری اپنی تضحیک ہے۔ میں نے دروازہ اس لئے بند کردیا کہ تمہاری آپا پردے کی آڑ سے جھانک رہی تھی ــ اور میں نہیں چاہتا کہ وہ جو ہمیشہ ہی میری مسرتوں پر ڈاکے ڈالتی رہی ہے میری یہ لمحاتی خوشی بھی سمیٹ لے"

بھلا آپا کو کیا ملا۔ اس سے۔ وہ تو یہ جانتی ہیں کہ افتخار میرا منگیتر ہے اور میں اور وہ جب چاہیں ایک دوسرے کے ہوسکتے ہیں ــ بلکہ اگر میں چاہوں تو وہ میرے پاس اسوقت بھی آسکتا ہے۔ میں اسے کیوں نہ ابھی حاصل کرلوں ــ"

راحت پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

"آپا بدتمیز ہیں افتخار تم میرے پاس آؤ ــــ"

"راحت افتخار نے ایک بار پھر اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"راحت تمہاری آپا بری نہیں۔ بس یوں سمجھ لو غلط آدمی کا ساتھ ہوگیا ہے اسکا ــــ"

"اچھا" راحت ایکدم سرد پڑگئی۔ جیسے جلتی آگ پر کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو آپا کی محبت افتخار کی آنکھوں میں روشن تھی۔

"تم جب کہو میں تمہیں لینے آجاؤنگا ــــ"

دیکھا جائیگا۔ میں ابھی اطمینان سے پڑھنا چاہتی ہوں۔

"ہوں ــ"

"اور آپا کہتی ہیں کہ میں ابھی بہت چھوٹی ہوں اور آپ کے مقابلے میں میری عمر آدھی ہے" "یہ تو ہے۔"
اور ــــ اور اسوقت عائشہ آپا اسے تیار ہی تھیں کہ دولہا بھائی اس کی شادی غلام رسول سیٹھ سے کردینا چاہتے ہیں کیونکہ رہ صرف پڑھی لکھی لڑکی چاہتا ہے اور افتخار کی عمر اس لئے زیادہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ اس کی چاندادبھی لے جاتا ــــ پتہ نہیں افتخار نے پلٹ کے میری خبر کیوں نہیں لی۔ اب تو میں نے پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ کیا اس نے میری کہانیاں نہیں پڑھی ہیں۔" راحت نے عائشہ آپا کی طرف کروٹ لے لی۔ جو اس کے بغل سے اٹھ کے اطمینان سے بیٹھ کے سامنے اس کے خطوط پڑھ رہی تھیں ــــ

"عائشہ آپا ــــ"

"ہاں راحتی ــــ"

"کس کا خط نہیں پڑھتے ہیں ــــ"

"جو بھی جماعت کا سبق ہے۔ آجکل سب پڑھتے ہیں۔"

"عائشہ آپا نے ہنس کے خط رکھ دیا ــــ

"میں یہ دیکھ رہی تھی راحت کہ آخر ان خطوط میں ہے کیا جو عطیہ انھیں چرا کے پڑھتی ہے۔

"کچھ بھی نہیں اصل میں عطیہ بے چاری کو کوئی لفٹ ہی نہیں دیتا ہے نا ــــ اسی لئے بے چاری لولائی لولائی پناہ ڈھونڈتی پھرتی ہے ــــ اور کچھ کرنے کی حسرت میں غلط کام کر بیٹھتی ہے۔ اور پھر ہر طرف سے ڈانٹ پھٹکار، تو، تو، میں میں شروع ہو جاتی ہے ــــ"

"جیسے ابھی تم سے لڑائی ہو رہی تھی۔ کیوں۔" عائشہ آپا نے ہنس کے اسے دیکھا انھیں سب آسیب زدہ کہتے ہیں سب لیکن یہ تو سیانوں سے بھی سیانی ہیں۔ انکا تو ــــ

"اچھا راحت میں چلوں۔ اپنی طرف شام ہو رہی ہے۔ آج چاندنی نہیں نکلے گی۔ میں ذرا اپنے دولت کے مزار پر روشنی تو جلالوں ــــ ورنہ وہ اندھیرے میں بھٹکے گا ــــ"

"چلئے میں بھی چلتی ہوں ــــ"

ناہتی ــــ اسوقت تم یہیں رہو۔ تمہاری آپا خواہ مخواہ کہیں گی میں تمہیں بھی اپنے سحر میں لپیٹ رہی ہوں۔

"کمال کرتی ہیں آپ عائشہ آپا۔ آپ بھی کوئی جادوگرنی ہیں کیا ــــ"

"یہی سمجھ لو ــــ" انھوں نے سفید آنچل سے اپنا سر ڈھک لیا ــــ اور اپنے مکان کی طرف چلی گئیں۔

"سنو راحت ــــ" دولہا بھائی اپنی توند مٹکاتے آئے ــــ

"جی"

"ہم نے تمہارے لئے بڑا اچھا ٹھکانہ ڈھونڈا ہے۔ اس کے یہ بڑے بڑے چھ چھ بنگلے ہیں۔ شہر میں جوٹ کا کاروبار ہے دو دو گاڑیاں ہیں ــــ بس یوں سمجھو دولت اس کی غلام ہے ــــ"

"پھر ــــ"

"پھر کچھ نہیں۔ بڑے آرام سے رکھے گا اور"
اور آپ کے ہاتھ دو گاڑیوں میں سے ایک گاڑی آئے گی۔ چھ بنگلوں میں تین اور نہیں تو کم از کم دو بنگلے تو ضرور آئینگے اور جوٹ کے کاروبار کا آدھا نفع غرض یہ کہ ـــ"
منہ بند کرو اپنی بکواس انہیں بتادینا چاہتا ہوں کہ میں نے غلام رسول سے تمہاری بات پکی کرلی ہے ـــ"
"اچھا ـــ"
"ہاں" وہ جلدی سے جانے کے لئے مڑے ـــ
"دولہا بھائی" اس کا لہجہ بڑا ٹھنڈا تھا۔
"کیا ہے ـــ" دولہا بھائی کو اس کے سیدھے سبھاؤ پر بڑا تعجب ہوا۔
"ایک بات کہوں"
"کہو"
آپ غلام رسول سے عطیہ کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ اس طرح ساری دولت آپ کے قبضہ میں آجائیگی"
"خاموش! ورنہ راکھ لگا کے زبان کھینچ لونگا"
"بڑی ہمت ہے آپ کی ماشاء اللہ ـــ کیا خرابی ہے؟ عطیہ آخر مجھ سے بڑی ہیں مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی ہیں۔ خدا کے فضل سے مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں۔
پھر ـــ"
"وہ تمہاری طرح لاوارث نہیں ہے۔ اسکے باپ بھائی زندہ ہیں ـــ"
"بھائی تو دولہا بھائی ماشاء اللہ آپ عائشہ آپا کے بھائی ہیں۔ لیکن آج ان کی بے بسی اور کسمپرسی اس بات کی شاہد ہے کہ آپ جیسے بھائی سے تو دشمن ہی بہتر ہوتے ہیں" "اب کسی کے اوپر کسی شے کا سایہ پڑجائے تو میں کیا کرسکتا ہوں نے عائشہ کو بیٹیوں کی طرح پالا۔ اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اور اچھے گھر بیاہنا چاہا۔ لیکن اسکی قسمت کہ ـــ"
"بس بس رہنے دیجئے اپنی باتیں۔ ہمیں سب پتہ ہے عائشہ آپا آسیب زدہ ہیں تو ان جیسا آسیب زدہ ہونا بڑے فخر کی بات ہے ـــ"
"اچھا بڑی ہوا لگ رہی ہے آپکو ـــ میں آپکو بھی ٹھکانے لگائے دیتا ہوں"
دولہا بھائی نے دانت کچکچائے ـــ
"اوہ جیسے میں بھی کوئی جگہ، زمین ہوں یا مال و متاع کہ آپ مجھے ٹھکانے لگائینگے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے ٹھکانے لگاتے لگاتے آپ خود ٹھکانے لگ جائیں ـــ" راحت نے ایک ایک لفظ چبا کے کہا ـــ
"میں ابھی بتاتا ہوں ـــ تجھے ـــ"
مجھے بھی کوئی عائشہ آپا سمجھا ہے کہ تم نے ان کی دنیا اندھیری کردی اور انھوں نے تم سے بدلہ لینے کے بجائے اپنی ایک الگ دنیا بسالی۔ خوابوں کی دنیا ـــ اونہہ ہم جیسے جانتے ہی نہیں کہ عائشہ آپا کے نئے نویلے دولہا کو تم لوگوں نے زہر دیدیا تھا۔

"چپ کرو ورنہ ایسا تھپڑ دوں گا کہ ــــ"

"لگا کے دیکھو تھپڑ ابھی بتیسی جھاڑ دوں گی" ــ تہاری ــ" راحت خشک لکڑی کی طرح سلگی ــــ

"غلط نہیں کہتیں عائشہ آپا کہ تم لوگوں نے صرف جائداد بٹ جانے کے ڈر سے ان کے میاں کو ختم کر دیا اور ــ"

"اور تمہارے منگیتر کی شادی کروادی کہ ـــــــ"

"کیا کہا ــ کیا کہا ــ افتخار نے ــــ کیا مطلب ــــ" راحت ایکدم سے لپک کے آگے بڑھی ۔

"ہاں ۔ ہاں اچھی طرح کان کھول کے سن لو ۔ میں نے تمہاری آپا سے اسے لکھوادیا ہے کہ تم اس سے نفرت کرتی ہو ابن مگر میں تو اس سے نفرت نہیں کرتی ــ میرا تو رواں رواں اسے چاہتا ہے ــــ" پھر کیسے ۔پھر کیسے ــــ" راحت نے دھندلائی آنکھوں سے آپا کی طرف دیکھا ــ

جو بہت ہی مسکین بنی اپنے دبلے پتلے وجود کو دکھ کے غلاف میں سمیٹے ساری باتوں سے بے نیاز چولہے پر چڑھی کڑھی چلا رہی تھیں ۔

"تم کبھی خوش نہیں رہو گی آپا ۔تمہیں زندگی کا ایک ایک لمحہ ڈس لے گا ۔ تم نے مجھ سے میری زندگی چھین لی ۔لیکن یاد رکھو دنیا میں کسی کی طاقت نہیں ہے کہ مجھے غلام رسول سے بیاہ دے

"تمہارے سارے خواب مٹی میں مل جائیں گے" تم اتنی نیچ تو نہیں تھیں آپا کہ ایک معمولی سی جائداد کے لالچ میں ــــ

"مگر میں نے تو ــــ"

"بس رہنے دو ۔اب بکواس ہے تم تم انتہائی کمینی ہو ــــ" راحت کو الفاظ نہیں مل رہے تھے ۔

"مگر راحت میں نے تو افتخار کو لکھدیا ہے کہ وہ تمہیں آکے لے جائے ــــ" آپا نے حسب معمول آہستہ سے کہا ۔

"ہاں اور کل اس کا خط آیا ہے کہ وہ چاند کی ۲۲ تاریخ کو تمہیں لینے آجائے گا ــــ"

"کیا ــــ کیا کہہ رہی ہو تم ــــ" دولہا بھائی چونک پڑے ــ

"ہاں میں نے سوچا میں جس آگ میں آج بیس سال سے جل رہی ہوں اور تمہارے طفیل عائشہ جو جلتے توے پر چل رہی ہے تو ــــ"

"خاموش" دولہا بھائی گرجے ۔ "بس چپ رہیئے عطیہ کے ابا ۔ میں کبھی آپ کے منہ لگی اور نہ آج لگنا چاہتی ہوں ۔ کیونکہ تم مجھے کبھی اچھے نہیں لگے ۔میرے دل میں نفرت کا زہر یلا بیج جو تمہیں دیکھ کے پھوٹا تھا اب ایک تناور درخت بن گیا ہے ۔ سو میں نے سوچا ۔ نفرت ــــ جس کی آگ میں گذشتہ بیس سال سے جل رہی ہوں ۔ کہیں ایسا نہ ہو ــــ راحت کا مختصر وجود اس میں گر کے بھسم ہو جائے ــ اسی لئے میں نے ــــ اسی لئے میں ــــ یعنی میں نے سوچا افتخار اسے آکے لے ہی جائے" آپا کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا ــــ اور راحت کو اپنی آپا آج عائشہ آپا سے زیادہ پُراسرار معلوم ہو رہی تھیں ۔ آپا کی خاموشی اسے ہمیشہ عجیب سی لگتی تھی ــ لیکن ــ لیکن یہ کیسی آدمی ہیں کہ لوگ تو محبت کا دکھ سمیٹتے ہیں اور انھوں نے نفرت کا غم سمیٹا ہے ۔

سیدہ حنا

ایک لڑکی ایک لمحہ

ساری کا پلو کمر کے گرد لپیٹتی ہوئی وہ ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"آپ نے بلایا تھا مجھے؟"

اس نے اپنے اسی مخصوص شیریں لہجے میں دریافت کیا۔ جو نئے ملنے والوں کے لئے مخصوص تھا۔ پرانے ملنے والوں سے وہ بالکل سپاٹ لہجے میں گفتگو کرتی۔ بلکہ بسا اوقات اس کا انداز تحکمانہ ہوتا جیسے اس کا مخاطب محسوس کرکے برانگیختہ بھی ہوجاتا۔ مگر صرف یہی معاملہ ایسا تھا جس میں اسے کسی کے جذبات کا ذرا کم پاس ہوتا۔ وہ اسے خلوص و یگانگت کی علامت قرار دے کر اپنے فریق کو خاموش کر دیتی۔ اور خود بھی مطمئن ہوجاتی۔ مگر نئے ملنے والوں سے وہ بڑے پُرتصنع اور میٹھے لب ولہجہ میں بات کرتی۔ جس سے اس کے نئے ملاقاتی عام طور پر متاثر ہوجاتے۔ اور اس کے دوستوں میں ایک نئی دوست کا اضافہ ہوجاتا۔ اب یہ اور بات تھی کہ پرانی دوستوں میں سے ایک دو کم ہوجاتیں۔ دراصل اس کی مثال اس ہال کی سی تھی جس کے ایک دروازے سے لوگ داخل ہو رہے ہوں اور دوسرے دروازے سے باہر نکل رہے ہوں۔ وہ آنے والوں کو خوش آمدید کہنے میں اس بری طرح مصروف تھی کہ جانے والوں کو خدا حافظ کہنا اس کے لئے دشوار تھا۔

مس علوی کا اس اسکول میں نیا نیا ٹرانسفر ہوا تھا۔ اور انھیں خوش آمدید کہنے والوں میں وہ سب سے پیش پیش تھی۔ ہیڈ مسٹریس تین ماہ کی "میٹرنٹی لیو" پر گئی ہوئی تھی اور مس علوی فی الحال آفیشیٹ کر رہی تھیں۔ وہ ایک اونچے قد اور مضبوط جسم کی مردنما خاتون تھیں۔ ان کا چہرہ دیکھ کر بعض حسن پرست اور کمزور دل لڑکیوں پر تو غشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اور انہوں نے بڑے ڈوبے ڈوبے خوفزدہ لہجے میں اپنی فیورٹ اور اسکول کی سب سے زیادہ فیشن ایبل آپا جی شاہدہ سے کہا تھا

"ہائے مس ہم اس سے کس طرح پڑھیں گے؟ ہمارا تو ڈر کے مارے ہارٹ فیل ہوجائے گا"

استانیاں الگ کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ مس شہناز نے تو بڑے وثوق کے ساتھ کہا تھا۔

"دیکھ لینا یہ یہاں ٹھہر نہیں سکے گی۔ اس علاقے کے لوگ بڑے حسن پرست ہیں وہ اسے کہاں ٹکنے دینگے۔"

ویسے خود شہناز آپا جی بھی ایسی خوبصورت تو نہ تھیں لیکن جوانی کے چڑھتے سورج نے انھیں خاصا دلکش بنا رکھا تھا۔ بعض لڑکیاں تو چپکے چپکے ان پر مرتی بھی رہتی تھیں جن کی نظروں میں وہ چاند سے زیادہ خوبصورت اور پھول سے زیادہ دلکش تھیں

نگران مرنے والوں میں زیادہ تر وہی لڑکیاں تھیں جو اطراف کے دیہاتوں سے آئی ہوئی تھیں۔ قصبے کی لڑکیوں کے محسوسات ان سے بالکل جدا تھے۔ وہ تو بس انھیں استانیوں پر مرتی تھیں جو زیادہ سے زیادہ فیشن ایبل اور اسمارٹ ہوتی تھیں۔ شاہدہ آپا جی اس معیار پر بالکل پوری اترتی تھیں۔ لوہے کی تیلیوں والا بریزیر پہن کر جب وہ چست قمیص کا غلاف چڑھاتیں تو ان کے جسم کی نس نس الگ الگ دکھائی دیتی، نوکیلی چھاتیاں، تپلی سی کمر، ناف کا خم اور بھاری بھاری گول گول کولہے۔ گھٹنوں تک لمبی پھنسی ہوئی قمیص میں چلتی ہوئی وہ بالکل ایسی لگتی تھیں جیسے ٹوئسٹ کر رہی ہوں۔ فرط جذبات سے لڑکیوں کے دم گھٹ گھٹ جاتے۔

اچھا خاصا رومینٹک ماحول تھا۔ مگر وہ الٹی بور ہوا کرتی۔ سب سے الگ بیٹھی ان عجیب و غریب محبتوں سے گھن کھایا کرتی۔ یا پھر اس لمحے کو کھوجنے لگتی جو اس کی اندھیری زندگی میں چپکے سے ایک شمع روشن کر کے گذر گیا تھا وہ مدتوں اس لمحے کو کھوجتی پھری۔ ہاتھ مل مل کر اس کی تلاش میں سرگرداں رہی پر لمحے جو گذر جاتے ہیں وہ بھلا کب ہاتھ آتے ہیں۔ اس نے رو رو کر اس لمحے کو آوازیں دیں۔ آنسو بہا بہا کر اس سے لوٹ آنے اور ٹھہر جانے کی درخواستیں کیں۔ پر کہیں آنسو بہانے سے بھی بچھڑے ہوئے ملے ہیں۔ وہی عرفی والی بات تھی۔ اگر کہیں رونے سے بچھڑے ہوئے مل سکتے تو وہ سو سال بھی آنسو بہانے کو تیار تھا۔ اتنے بڑے شاعر کے آنسو جہاں بیکار ہو گئے تھے وہاں اس بیچاری ایک معمولی سی استانی کے آنسو کہاں کام دے سکتے تھے۔ آخر تھک ہار کر بیٹھ رہی۔ لمحہ گذر گیا تھا اور اس کی جلائی ہوئی شمع ابھی تک روشن تھی۔ اس نے ساری کے پلو سے اسپر اوٹ کر لی۔ کہیں یہ بھی نہ بجھ جائے۔ تب کام کے اوقات سے فارغ ہو کر وہ تنہائیوں میں چپ چاپ اس شمع کی روشنی میں اس لمحے کو کھوجا کرتی۔ اور اپنے کردار کے خد و خال ابھارا کرتی — اس کے پاس یہی روشنی تو تھی جو یہ بھی نہ ہوتی تو وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ان گھپ اندھیروں میں ہاتھ پاؤں مارتی۔ اس دلدل میں جا پڑتی جس میں وہ سب پڑی کلبلا رہی تھیں۔

پر اس لمحے جب وہ مس علوی کے سامنے کھڑی ان سے پوچھ رہی تھی۔

"آپ نے بلایا تھا مجھے — ؟"

ایک عجیب حادثہ ہوا مس علوی نے جواب دینے کے بجائے خاموشی سے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ساری کی ساری ان کی ... آنکھوں میں ڈوبتی چلی جا رہی ہے۔ وہ حیران سی کھڑی اپنے ڈوبنے کا آپ تماشا کرتی رہی۔ مس علوی کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار۔ ناقابل فہم سی مسکراہٹ رینگنے لگی۔ خود اس کے ہونٹوں کی کلیاں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ گھبرا کر کچھ شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔ اسے نظارہ بازی کی پریکٹس بالکل نہیں تھی۔ وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔ لیکن اس گھبراہٹ میں بھی ایک عجیب طرح کا سرور تھا۔ پھر بھی اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کوئی اور تو نہیں دیکھ رہا۔ سب استانیاں اپنی اپنی کلاسوں میں تھیں۔ صرف شاہدہ آپا جی۔ مس علوی کے پاس کھڑی تھیں مگر ان کی نگاہیں دور بہت دور نلکے کے پاس کھڑی لیلیٰ سے الجھی ہوئی تھیں۔ اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے روم کی طرف بڑھ گئی۔

شاہدہ کے بھائی کی شادی تھی وہ لمبی چھٹی پر جا رہی تھی۔ اسکول سے واپس آ کر اس نے شاپنگ کا پروگرام بنایا۔

"آپ چلیں گی کیا باجی"!

"سوری آپا مجھے آج دو چار ضروری خط لکھنے ہیں"

خطوط کا تو بہانہ تھا۔ دراصل وہ آج کے حادثے پر تنہائی میں غور کرنا چاہتی تھی۔ شاہدہ نے بے دلی سے اس کی معذرت

قبول کی اور دوسری دو استانیوں کے ساتھ بازار چلی گئی۔ ابھی اسے گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک خوبصورت گول مٹول
لڑکا ڈرتا جھجکتا چوروں کے سے انداز میں اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"آپ شاہدہ آپا ہیں نا" — ؟

کیوں کیا بات ہے — ؟

اس نے ایک لمحے کی دیر کئے بغیر ادھر اُدھر دیکھ کر ایک لمبا سا پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور باہر بھاگ گیا۔
وہ اسے پکارتی ہی رہ گئی۔

"سنو تو اے میاں لڑکے ذرا بات تو سنو"

جذبۂ تجسس نے اسے پیکٹ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اوپر ہی ایک کھلا ہوا خط رکھا تھا
"مس شاہدہ کے لئے" اس کے نیچے بڑے سلیقے سے تہہ کی ہوئی بروکیڈ کی قمیض تھی۔ کچھ رومال اور سینٹ کی شیشیاں
تھیں۔ بڑھیا قسم کے چاکلیٹ کے دو پیکٹ تھے۔ کچھ چیونگ گم تھے سب لڑکیاں جانتی تھیں کہ شاہدہ آپا کو چاکلیٹ
اور چیونگ گم بہت پسند ہیں۔ اس نے وہ خط کھول لیا۔

"جان سے پیاری مس!

یہ ایک حقیر سا تحفہ بھیج رہی ہوں۔ خدا کے لئے مس اسے قبول کر لیں۔ مس! میں تو
آپ کو دیکھ کر جیتی ہوں۔۔۔۔ بس! آپ کے بنا مجھے ایک منٹ قرار نہیں آتا۔ میرا پڑھائی میں ذرا دل نہیں لگتا بس میں تو
ہر وقت آپکو دیکھتے رہنا چاہتی ہوں۔ ہائے مس آپ نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ آپ خوش ہوتی ہیں تو میں خواہ مخواہ خوش ہو جاتی ہوں
۔۔۔ آپ خفا ہوتی ہیں تو میرا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہتا ہے۔ مس ہماری کلاس کی ساری لڑکیاں آپ پر جان دیتی
ہیں۔ وہ ہر وقت آپ کے کپڑوں۔ آپ کے بالوں اور آپ کی آنکھوں کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ مگر مس وہ سب فضول لڑکیاں ہیں،
آپ کی سچی پجارن تو بس میں ہوں"

دو تین صفحات کا خطاب اسی قسم کی خرافات سے بھرا ہوا تھا پھر بھی لکھنے والی نے یہ سوچ کر شاید وہ اپنے جذبات کی
صحیح ترجمانی نہیں کر سکی ہے کچھ شعروں اور ماہیوں کا سہارا لیا تھا۔

(ترجمہ) "خدا کی قسم یقین جانو تمھاری محبت نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا"

پھر ان کے اتنی لمبی چھٹی جانے اور اپنی بیقراری کا عالم بیان کر کے لکھا تھا

(ترجمہ) "دیدار کے بغیر زندگی اجیرن ہے میں کب تک یہ کٹھن زندگی گذاروں گی"

آخر میں لیلیٰ کے دستخط دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ اتنی خوبصورت اور بھولی بھالی لڑکی سے اسے ہرگز اس عبارت کی
امید نہ تھی پر اس خط کی، ان اشعار کی روشنی دور دور پڑ رہی تھی۔ اور وہ اس روشنی میں لیلیٰ کو شاہدہ آپا کے گرد پھرتے، دیدار کی بھیک
مانگتے، ہمنشینی کی آرزو کرتے دیکھ سکتی تھی۔ اسے یاد آیا وہ شاہدہ سے ٹیوشن بھی پڑھا کرتی تھی۔ گھنٹوں وہ دونوں کمرہ بند کئے
چپ چاپ پڑھا اور پڑھایا کرتی تھیں۔ وہ لیلیٰ کا یہ شوق اور محنت دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوا کرتی۔ اس کے خیالات پرانے زمانے
کے استادوں جیسے تھے۔ اسے شوقین اور ذہین طالبات سے قدرتی طور پر لگاؤ ہوتا تھا۔ وہ جو مضمون بھی انھیں پڑھاتی بڑی محنت سے

پڑھاتی۔ کلاس میں سوال کرنے کی عام اجازت تھی۔ کوئی لڑکی اگر اس سے کوئی سوال کرتی تو وہ بڑی شفقت کے ساتھ اسکو مطمئن کر دیتی۔ درس و تدریس کے دوران وہ اخلاقیات پر خاص طور سے زور دیتی، پھر بھی عجیب بات یہ تھی کہ وہ لڑکیوں میں قطعی ہر دلعزیز نہیں تھی۔ لڑکیاں بڑی حد تک اس سے خائف اور کھنچی کھنچی رہتی تھیں۔ تاہم وہ اپنی جگہ پر مطمئن تھی۔

لیکن آج جو دو واقعات پے در پے اس طرح پیش آئے تھے۔ انہوں نے اس کے اطمینان کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ صبح کا مس علوی والا واقعہ۔ اور پھر شام کو یہ لیلیٰ کا محبت نامہ۔ لیلیٰ کو دیکھ کر اسے کئی مرتبہ یہ شک گذرا تھا کہ یہ لڑکی کسی الجھن میں مبتلا ہے۔ اسے وہ شام ابھی تک یاد تھی جب شفق رنگ بادل زمین پر جھکے ہوئے تھے اور ہر چیز پر ہلکا گلابی رنگ کا غازہ سا ملا ہوا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی وہ کوئی پہن کر شال اوڑھے ہوئے جب باہر نکلی تو میس کے کشادہ آنگن میں لیلیٰ کھڑی تھی۔ اس نے کریپ کی سفید قمیص پر زرد جالی کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا جس سے اس کے سبک جسم کے خطوط صاف نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر تمتماہٹ سی تھی۔ آنکھوں میں گلابی ڈورے کھنچے ہوئے تھے اور وہ بڑی حیرت سے شاہدہ آپا جی کے بند کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج کی طرح اس دن بھی وہ شاپنگ کے لئے چلی گئی تھیں۔

اس طرح کھلے آسمان کے نیچے صرف ہلکی سی جالی کے دوپٹے میں لپٹی ہوئی یہ خوبصورت لڑکی اس لمحے اسے بہت ہی خوبصورت اور پُرکشش دکھائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک بے نام سی دھیمی دھیمی آنچ میں تپ رہی ہے۔ اسے اس آنچ کا تجربہ تھا۔ ایکبار اس کا جسم بھی اس بے نام سی آنچ میں تپا تھا۔ اور تب دسمبر جنوری کی کڑکڑاتی سردی میں وہ لون کی قمیص اور جالی کا دوپٹہ اوڑھے گھوما کرتی تھی۔ اسے سردی کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔ ہاں ایک میٹھی میٹھی، دھیمی دھیمی تپش کا سا احساس ضرور ہوا کرتا تھا۔ اسے یہ سب کچھ بڑا عجیب، بڑا خوشگوار لگتا تھا۔ برسوں کے بعد اس گلابی شام لیلیٰ کو کھلے آسمان کے نیچے یوں موسم سرما سے بے نیاز کھڑی دیکھ کر جیسے وہ اس کے ایک بڑے راز سے واقف ہو گئی تھی۔ پھر بھی اس کا خیال تھا کہ جس جذبے کی آنچ میں لیلیٰ کی نوخیز جوانی یوں تپ رہی ہے اس کا بھولپن شاید کیا یقیناً اس سے واقف نہیں ہے۔ اتنی ذرا سی تو تھی وہ ــــ

ہوا کے ایک بے باک جھونکے سے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط پھڑپھڑایا۔ اور خوش فہمیوں کی کچی دیوار چپکے سے ڈھے گئی خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ملبے کی طرح اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔

شاہدہ کو اس کی امانت سپرد کرتے وقت اس نے اسے سمجھانا چاہا۔

"دیکھو شاہدہ تم ٹیچر ہو۔ تمہاری ذمے داریاں بہت بھاری ہیں۔ قوم نے یہ نوخیز ذہن تمہارے حوالے اس لئے نہیں کئے ہیں۔ مائیں دن کے ایک بڑے حصے میں اپنی کومل کلیوں جیسی لڑکیوں کو اس لئے تمہارے پاس نہیں بھیجتیں، باپ اپنے خون کی کمائی ان پر اس لئے صرف نہیں کرتے کہ یہ تمہارے پاس آ کر محبت کرنے کی ٹریننگ لیں۔ غلط اور گمراہ کن راستوں پر چلنا سیکھیں تم انہیں سمجھاؤ۔ تم انہیں اُجلی راہوں پر چلنا سکھاؤ۔ تم انہیں اخلاق کی بلندی اور کردار کی مضبوطی کا درس دو۔"

لیکن شاہدہ کے چہرے پر چھائی ہوئی خوشی اور ہونٹوں پر تھرکتی ہوئی مسکراہٹ کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور فضا کی بلندی میں پرواز کرتے ہوئے اونچے خیالات مردہ پرندوں کی طرح اس کے پیروں میں آ گرے۔ وہ شکست خوردہ سی جھنجھلائی ہوئی سی واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے رہ رہ کر اپنے آپ پر جھنجھلاہٹ آ رہی تھی۔ آخر وہ شرمائی کیوں؟ اس نے اتنی آسانی سے اتنی جلدی ہتھیار کیوں ڈال دیئے۔

باہر چیچک کا ٹیکہ لگانے والے آئے ہوئے تھے۔ لڑکیاں سب کلاس کے کمروں میں بند تھیں آنگن میں ایک گھنے درخت کی اوٹ میں ویکسینیٹر کے لئے میز کرسی ڈال دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اس کا اسسٹنٹ بھی تھا۔ لڑکیاں برقعہ اوڑھ کر باری باری جاتی تھیں اور ٹیکہ لگوا کر واپس آجاتی تھیں۔ استانیاں سب اسٹاف روم میں اکٹھی تھیں۔ وہ مس علوی کے ساتھ اتفاقیہ طور پر ۔۔۔۔ ان کے آفس میں بند ہو گئی تھی۔ اور اب پنجرے میں پہلے پہل بند ہونے والے پرندے کی سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوں ان کی موجودگی اسے اسی طرح بے چین کر دیتی تھی۔ اور اس وقت تو وہ ان کے ساتھ۔ ان کی خطرناک آنکھوں کے سامنے تنہا تھی۔ یوں ہی رجسٹر پر نظریں جمائے چپ چاپ بیٹھی ان کی نگاہوں کی چبھن محسوس کرتی رہی۔ انہوں نے خود ہی کہا۔

"آپ ٹیکہ لگوائیں گی مس سیما۔" ؟

"جی خیال تو نہیں ہے" — !!

اس نے ڈرتے ڈرتے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ نگاہوں کا ایک ہلکا سا تصادم ہوا وہ جھٹ رجسٹر دیکھنے لگی۔ مس علوی اٹھ کھڑی ہوئیں انہوں نے اپنا ہاتھ اچانک اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ یوں اچھلی جیسے اسے کرنٹ چھو گیا ہو۔ اس نے گھبرا کر ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بڑے اطمینان سے زیر لب مسکرا رہی تھیں۔

"میں نے کہا ذرا آستین چڑھا دیجئے۔ میں ٹیکہ لگوانے چلی ہوں" !!

ایک سحر زدہ انسان کی طرح اس نے بٹن کھول کر ان کی چست آستین کو کہنی سے ذرا اوپر تک کھسکایا وہ ہلکے سے اس کا گال تھپتھپا کر "تھینک یو"، کہتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

اس کے جسم میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ اور پیشانی پسینے سے تر تھی۔

رات وہ لمحہ اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ اس کے خواب میں آیا۔ وہ اپنی ہی زندگی کا ایک خوبصورت حادثہ جیسے پردۂ فلم پر دیکھ رہی تھی۔ اس حسین حادثے کی ادنیٰ سے ادنیٰ تر تفصیل بھی اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ پیار کی اجلی اجلی کرنیں اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں کسی کے تبسم زیر لب کے کھلائے ہوئے پھول اس کے ارد گرد مہک رہے تھے۔ یہ اجلاپن یہ مہک اس کی روح کو منور کر رہی تھی۔

اس نے خود کو کسی کے انتظار میں گنگناتے اور گلدانوں میں اجلے اجلے پھول سجاتے دیکھا۔ کسی کی آرزو میں خود کو سر تا پا پایا اس نے سرد موسم میں خود کو کھلے آسمان کے نیچے تپتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دیکھا وہ زندگی کے خاکے میں اجلے اجلے رنگ بھر رہی ہے۔ پھر اس نے حالات کے بے رحم ہاتھ کو دیکھا جس نے وہ خاکہ اس سے چھین لیا تھا۔ پھر اس نے اس گریزپا لمحے کو دیکھا جو اس کے کمزور ہاتھوں سے اپنا دامن چھڑا کر چلا جا رہا تھا۔ اس نے خود کو اس کی تلاش میں سرگرداں اور اشکبار پایا۔ تب یہ سارے منظر اپنے دامن میں سمیٹے وہ لمحہ اس کے نزدیک اور نزدیک آ گیا۔

"دیکھو جس طرح کائنات کی آخری حد پر افق کے نزدیک زمین آسمان باہم ملتے ہیں جیسے کالی رات کے خاتمہ پر نورانی سحر ہنستی ہوئی اس سے آملتی ہے جس طرح کڑی دھوپ میں جھلستا ہوا دن شام کے ٹھنڈے دھندلکوں سے ملتا ہے۔ اس طرح بالکل

اس طرح زندگی کے ایک موڑ پر میں تم سے آملوں گا۔ مجھ پر یقین رکھو اور محبت کی یہ شمع جو میں نے تمہاری زندگی میں روشن کی ہے۔ اسے سنبھال کر رکھو۔ یاد رہے یہ بجھنے نہ پائے۔ ورنہ تم اپنی راہ گم کردوگی۔ پھر تم زندگی کے اس موڑ کو کبھی نہ پاسکوگی۔ جہاں زمین آسمان سے اتار کبھی نور سے اور تپش خنکی سے ہمکنار ہوتی ہے۔"

اٹھی تو طبیعت کا عجیب سا عالم تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دل کے سارے زخم ہرے ہوگئے ہیں۔ وہ ایکدفعہ پھر غم محبت اور غم جدائی سے آشنا ہو رہی تھی۔ سارا دن یہ کیفیت رہی کہ دل رہ رہکر بھر آتا تھا۔ آنکھیں ڈبڈبا جاتی تھیں اور زبان پر بے اختیار دوہا آجاتا۔

سپنے میں مورے پی ملے کرنہ سکی کچھ بات
سوئی تھی روتی اٹھی مت رہی دوبات

لڑکیوں کو ٹھیک سے پڑھا بھی نہ سکی۔ بس یونہی بے دلی سے ڈیوٹی ادا کرتی رہی۔ شام ہوتے ہوتے دل کا درد اپنے عروج پر تھا۔ یونہی سب سے بیزار ہو کر میس کے دور افتادہ گوشے میں جا بیٹھی۔ یہاں سیب اور آلوچے کے درختوں کے علاوہ بہت کچھ جھاڑ جھنکاڑ بھی لگا ہوا تھا۔ کچھ گلاب کی خودرو جھاڑیاں بھی تھیں جن میں پتوں سے زیادہ کلیوں کے سرخ نگینے جڑے ہوئے تھے۔ وہ چپ چاپ ایک جھاڑی کے پاس پتھر پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ ورڈسورتھ نیچر کی " ہیلنگ پاور " پر یقین رکھتا تھا شاید یہاں سے ہمیں بھی اپنے دل کے زخموں کا مرہم مل جائے۔ اچانک جھاڑی کی دوسری طرف سے مس عزیز کی پرسوز آواز بلند ہوئی۔
(ترجمہ) میں ایک لاعلاج مرض میں مبتلا ہوں اور میرے محبوب کے لئے دو قدم اٹھا کر آنا بھی دشوار ہے"۔ پہلے تو اسے مس عزیز کی اس دیوانگی پر ہنسی آئی لیکن پٹہ ختم کرکے اس نے رونا شروع کر دیا۔ اور سسکیوں کی آواز اونچی ہونے لگی تو ناچار اپنے درد آشنا دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ اس کے پاس چلی گئی۔

"خیر تو ہے مس عزیز یہ بلا وجہ رونا کیسا۔"

اس نے بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھدیا۔ اسے دیکھ کر مس عزیز کی سسکیاں رک گئیں۔ معلوم ہوتا ہے شاہدہ نے پھر تمہارا دل دکھا دیا۔

اس نے ایک لطیف سی چوٹ کی ــــ اور مس عزیز نے ترکی بہ ترکی جواب دیا

"آپ کی موجودگی میں اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے"

"میری موجودگی میں"۔

اس نے بناوٹی حیرت کا اظہار کرنا چاہا۔ مگر کر نہ سکی۔ اسے دسمبر کی وہ رات یاد آگئی جب سے اس غلط فہمی کی بنیاد پڑی تھی اور مس عزیز نے اسے اپنی نقیب بلکہ رقیب روسیاہ سمجھنا شروع کیا تھا۔

مس عزیز شاہدہ پر دل و جان سے فدا تھیں مگر وہ بت طناز تھی کہ اسے خاطر میں ہی نہ لاتی تھی۔ اس کی بڑی وجہ غالباً اس کا غیر معمولی دبلا پن تھا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا پنجر تھی شاہدہ کو تو اس پر اس کا گمان ہوتا تھا جو سائنس کی لیبارٹریوں میں شیشے

کی الماری میں لٹکا ہوا تھا۔ اس نے کئی بار کہا بھی تھا کہ بھلا مس عزیز کے ہوتے ہوئے اس فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی۔ سیما اسے دیکھتی تو اسے عقیدت کی رسول فاطمہ یاد آجاتی ۔۔ سوکھی سڑی بڑی بڑی آنکھوں والی رسول فاطمہ تاہم اس نے کبھی اشارتاً بھی مس عزیز کے اس جبلی نقص کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ بہر حال انسان تھی ۔ اور انسان ہونے کے لحاظ سے احترام کی مستحق تھی۔ مس عزیز بھی سیما سے خوش تھی اور اسے بجائے مس سیما کہنے کے باجی سیما کہہ کر بلاتی تھی اور شاہدہ کے راستے میں تو وہ بچھ بچھ جاتی تھی ۔ ادھر شاہدہ تھی کہ اسے چکر دے رہی تھی۔ خوب کس کر خدمت لیتی ۔ جہانیوں کی طرح اس پر حکم چلاتی ۔ فرمائشیں کرتی اور انھیں پورا کروانے کے لئے کبھی کبھی لگاوٹ سے بھی کام لیتی مگر جب دیکھتی کہ وہ ذرا بے تکلف ہو چلی ہے فوراً KICK OFF کر دیتی ۔

ایک رات اچانک وہ اس کے کمرے میں آ گئی ۔

" شاہدہ آج میری ملازمہ نہیں آئی ہے ۔ مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے ۔ میں تمہارے کمرے میں سو جاؤں " ۔۔

" مگر کمرے میں دوسرا پلنگ جو نہیں ہے " ۔۔ ؟

" میں یہیں تمہاری پائنتی لیٹ رہوں گی ۔۔ ۔

" ہاں ٹھیک تو ہے " ۔۔ !

مس شہناز اور مس خان نے اس کی تائید کی

" جاڑوں کی رات ہے ایک بستر میں سویا جا سکتا ہے "

نصف رات کے قریب کمرے میں بھگدڑ سی مچی ۔ شاہدہ جلدی سے آ کر اس کے بستر میں گھس گئی

" سیما باجی مجھے بچاؤ "

" کیا بات ہے شاہدہ ۔۔ ؟ "

" وہ ۔۔ وہ جو ہے نہ مس عزیز ۔۔ وہ مجھے تنگ کر رہی ہے "

سیما نے ایک طرف ہٹ کر اس کے لئے جگہ خالی کر دی یوں وہ کسی کو اپنے بستر میں سلایا نہیں کرتی تھی مگر اس وقت شاہدہ کو اپنے پہلو میں لیٹی پا کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے شاہدہ بہن اس کی پیاری بھتیجی ناہید اس کے پاس لیٹی ہوئی ہے ۔ ایک رات ناہید ضد کر کے اس کے ساتھ سو گئی ۔ اس رات گو وہ خود ساری رات نہیں سو سکی تھی پھر بھی وہ اس سے بیزار نہیں ہوئی تھی ۔۔ بس نیم غنودگی کی حالت میں اسے یوں محسوس ہوتا رہا تھا جیسے یہ ناہید کا ریشمی وجود نہیں ۔۔ موتیا کے پھولوں کا ڈھیر اس کے پہلو میں لگا ہوا ہے ۔ اس کے ننھے سے جسم سے اٹھنے والی صابون اور پاؤڈر کی بھینی بھینی مہک ساری رات اس کا مشام جاں معطر کرتی رہی ۔

ذرا دیر کے لئے شاہدہ بھی ننھی ناہید کا روپ اختیار کر گئی ۔ اسے اس کے جسم سے بھی ویسی بھینی بھینی مہک اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی ۔ مگر جلد ہی یہ طلسم ٹوٹ گیا ۔ شاہدہ کھسک کر اس کے نزدیک ہو گئی ۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی ۔ سیما کو اس کے جسم سے سڑاند کے بھبکے اٹھتے ہوئے محسوس ہوئے ۔

"سیما باجی" اس نے سرگوشیوں میں کہا
"آپکو پتہ ہے مس عزیز نے میرے ساتھ کیا کیا ۔؟
"کیا ۔؟"
جواب میں شاہدہ ایکدم پوری طاقت کے ساتھ اس کے سینے سے چمٹ گئی اور اندھیرے میں اس کے ہونٹ ٹٹولنے لگی۔
سیما اس کی اس حرکت پر ایک لمحہ کے لئے تو گھبرائی مگر فوراً ہی ہنس پڑی ۔
"بھئی خوب ایکٹنگ میں تو تمہارا جواب نہیں"
اس نے ملائمت سے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا ۔ مگر وہ پھر اس سے چمٹ گئی ۔
"یہ ۔ یہ ایکٹنگ نہیں ہے ۔ سیما . . . . باجی ۔؟
تیز تیز سانسوں کے دوران اس نے کہا
سیما جلدی سے خود کو چھڑا کر بستر سے نکل گئی ۔
"بھئی تم سوؤ میں ذرا تہجد پڑھ لوں ۔"
نماز کے دوران وہ برابر شاہدہ کی سسکیاں سنتی رہی ۔ اور جب اس نے آخری رکعت پڑھ کر سلام پھیرا تو شاہدہ اس کے بستر سے نکل کر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی ۔

صبح وہ دونوں اس سے ناراض تھیں ۔ شاہدہ اپنے ٹھکرائے جانے پر اور مس عزیز اسے اپنے راستہ کا کانٹا سمجھ کر۔ اب اس نے لاکھ شاہدہ کو یہ امپریشن دینے کی کوشش کی کہ رات کی بات کو اس نے ایکٹنگ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا ۔ مگر اس کا دل صاف نہ ہو سکا ۔ اور اس نے انتقامی کارروائی کے طور پر اسے دکھا دکھا کر جتا جتا کر لڑکیوں سے راہ و رسم بڑھانی شروع کر دی اور مس عزیز کو اس نے لاکھ یقین دلانا چاہا کہ وہ ان کی رقیب ہرگز نہیں ہے کئی بار غالب کے اس مصرعہ کی خاطر خواہ تشریح بھی کی کہ بلبلہ ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود، مگر اسے نہ ماننا تھا نہ مانی ، وہ جس بے نفسی سے شاہدہ کی محبت کا دم بھر رہی تھی اور جس عزم سے ۔ مٹ جائیگا سر گر تیرا پتھر نہ گھسے گا کا عملی مظاہرہ کر رہی تھی ۔ اسے دیکھ کر بارہا سیما کو اس پر ترس بھی آیا ۔

اس وقت بھی شام کی اداسیوں میں اس کی بھیگی پلکیں دیکھ کر اس کا دل پگھل گیا ۔ "سنو مس عزیز ـــــ تم شادی کر ڈالو مس عزیز نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا اور جیسے اینٹ کے جواب میں پتھر کھینچ مارا . . . .
"آپ خود شادی کیوں نہیں کر لیتیں ـــ ؟؟"
وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی ۔

اسٹاف ممبر مسز افضل کے بچے کی سالگرہ تھی ۔ سارا اسٹاف مدعو تھا ۔ سیما اکثر محفلوں سے دور رہتی اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر میس میں تنہا رہ جاتی ۔ مگر اس کی ایک خوبی ایسی تھی جس کی بنا پر لوگ اسے کم ہی بخشتے ۔ وہ خوبی تھی اس کی آواز ۔ جب وہ کوئی چیز سنانے بیٹھتی ۔ تو ساری کائنات کا درد اس کی آواز میں سمٹ آتا ہر دل کے سانس لئے اس کی آواز مضراب کا کام دیتی اور ہر روح کیف غم سے مخمور ہو جاتی ۔ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا ۔ پہلے تو شہناز اور مس علوی نے نعرہ دیا ۔ پھر خود مسز افضل آ گئیں ۔ آپکو چلنا ہوگا مس سیما ! ورنہ بڑی بے لطفی رہے گی ۔ آپ جانتی ہیں خدا نے یہ

بچہ مجھے برسوں کی دعاؤں کے بعد دیا ہے "

"یعنی بڑھاپے کی اولاد ہے ۔"

شاہدہ نے شوخی سے اس کی بات کاٹ دی ۔ سب ہنس پڑے ۔ مسز افضل نے بات جاری رکھی،

"پلیز! مس سیما! کیا آپ ایک ماں کی خوشی میں شریک نہیں ہوں گی ۔"

وہ مجبور ہوگئی ۔ دعوت کے اختتام پر حسب معمول سب نے گلے بازی کی مشق کی ۔ آخر میں سیما کی باری آئی ۔ وہ بہت اداس تھی ۔ جب کبھی وہ ایسی محفلوں میں شریک ہوتی ۔ اس کا غم تازہ ہو جاتا ۔ اسے وہ گریز پا لمحہ شدت سے یاد آنے لگتا ۔ جو ایسی ہی ایک محفل میں اس کا سب کچھ لوٹ کر لے گیا تھا ۔ وہ موہ لینے والی شخصیت جسے دیکھ کر پہلی بار اس کے دل میں SETTLED LIFE گذارنے کی امنگ بیدار ہوئی تھی، پھر بالکل غیر متوقع طور پر اس امنگ کی بربادی ۔ وہ سوچتی اور غم کیا کم تھے جو زندگی نے غم محبت بھی اس کی جھولی میں ڈال دیا ۔ اب اس غم سے چھٹکارے کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی ۔ اور سچ بات تو یہ تھی کہ یہ غم اسے تھا بھی عزیز —— وہ ایک پل کے لئے بھی اس سے غافل ہونا نہ چاہتی تھی ۔

وہ ان ہی متضاد خیالات میں گھری بیٹھی تھی جب ہر طرف سے اس پر فرمائشوں کی بوچھار ہونے لگی

"کچھ سنائیے نا مس سیما"

وہ ٹالتی رہی ——

"بھئی ایسی ایسی گلوکار خواتین کی موجودگی میں میری آواز سننا کون پسند کرے گا "

"مس سیما" مس علوی نے اسے آہستہ سے پکارا ۔

سیما نے ان کی طرف دیکھا ۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک میلی سی روشنی التجا بن کر ابھر رہی تھی ۔ اس نے نگاہیں جھکائیں اور بہادر شاہ ظفر کی مشہور اور حسب حال غزل شروع کر دی ؎

مانی ہزار منتیں پر نہ ہوئی بلائے دل

ساری آوازیں اور ساری آہٹیں دم بخود ہوگئیں ۔ ساری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں ۔ اور وہ خود ایک خود فراموشی کی حالت میں تھی ۔ اس کے چہرے پر غم کا تقدس تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ عبادت میں مصروف ہے ۔ غم اگر حقیقی ہو تو وہ بھی ایک قسم کی عبادت ہی بن جاتا ہے وہ ساری کا پلو سر پر ڈالے گردن جھکائے میز کے سہارے کھڑی تھی ۔ غزل ختم ہوئی تو اتنی تالیاں بجیں، اتنی داد ملی کہ تھوڑی دیر کے لئے سیما کو وہ سب بناوٹ معلوم ہونے لگا ۔ ابھی وہ داد کی اس بیداد سے سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک اور بیداد ہوئی ۔ مس علوی نے جوش کی حالت میں اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا ۔ وہ کسمسائی تو انہوں نے اسے سینے کے ساتھ بھینچ کر جلدی سے چھوڑ دیا ۔ اس وقت اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی مدتوں کی پیاسی روح سیراب ہوتے ہوتے رہ گئی ۔ ان کا جسم جانے کس چیز کا بنا ہوا تھا ۔ جس نے سیما کو رگ رگ کو نشہ پلا دیا ۔ روئیں روئیں میں مستیاں بھر دیں ۔ ایک لحظہ پہلے کی تقدس آمیز کیفیت ہوا ہوگئی ۔ اور کسی پہلے پہل پینے والے کی طرح اس کے جسم سے اور لاؤ اور لاؤ —— کی آوازیں اٹھنے لگیں ۔ یہ وہی جسم تو تھا جسے ایک دفعہ شاہدہ نے اپنے جوان سینے کے ساتھ بھینچا تھا ۔ جب اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا تھا ۔ اس کے علاوہ بھی وہ کتنی سہیلیوں اور رشتے کی بہنوں کے گلے لگی تھی ۔ پر کسی کے جسم میں یہ فسوں، یہ مقناطیسی کیفیت نہ تھی لیکن اس وقت تو اسکا

دل چاہ رہا تھا بس اٹھا ایک بار اسے اور اپنے سینے سے چمٹالیں۔ اور وہ بھی بے حجابانہ ان سے لپٹ جائے ___ اور ___ مگر وہ واپس جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ اور بظاہر اس سے بالکل بے پروا نظر آ رہی تھیں۔

ساقی یہ تیری سنگدلی یاد رہے گی

اس نے دل ہی دل میں ان سے شکوہ کیا اور مسز افضل سے معذرت کر کے میس لوٹ آئی۔ تاکہ جو کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے تنہائی میں اس کی مرمت کر سکے۔

شاہدہ کی طبیعت خراب تھی۔ لڑکیوں کا دل پڑھنے میں نہیں لگ رہا تھا کچھ لڑکیاں اداس تھیں کچھ فکر مند تھیں۔ کچھ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ دوڑ دوڑ کر اسکول کے بغلی دروازے سے میس میں جاتیں اور پھر آہیں بھرتی ہوئی واپس آجاتیں ہاتھ پیر اور سر دبانے کے لئے ان سب میں کشمکش ہو رہی تھی۔ کچھ لڑکیاں چپکے چپکے دوائیں اور فروٹ بھی منگوا کر دے چکی تھیں ___ مس عزیز تو جیسے کہ مستقل طور پر اس کی دیکھ بھال کے لئے وقف ہو گئی تھی۔ لیلیٰ کا حال بھی خراب تھا۔ ایکبار جو سیما نے اسے سبق پر توجہ نہ دینے کے سلسلہ میں ٹوکا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لڑکیوں نے کہا مس جانے دیں۔ یہ مس شاہدہ کے لئے پریشان ہو رہی ہے اسکول لڑکیوں کی یہ جسارت بہت گراں گذری۔ ظاہر تھا وہ یہاں پڑھنے آتی تھیں عشق لڑانے نہیں اور پھر شاہدہ کوئی ایسی SERIOUS بیمار نہ تھی۔ بس ذرا سا زکام بخار ہو گیا تھا۔ اس طرح تو شاید وہ اپنی ماؤں اور حقیقی بہنوں کے لئے بھی پریشان نہ ہوتی ہوں گی۔

اُسے یاد آیا۔ وہ یہاں سے پہلے جس اسکول میں تھی وہاں بھی ایک دفعہ ایسا ہی ہنگامہ ہوا تھا۔ ویسے تو اس اسکول کی ساری استانیاں پرانی اور ادھیڑ عمر کی تھیں۔ پھر تھیں بھی وہ سب اس قبیلے کی اس طرح تقریباً ساری لڑکیاں کسی نہ کسی تحریک کی شکار تھیں۔ اور اب بھلا خالاؤں اور پھوپھیوں کے ساتھ کون عشق کرتا ہے دوسری چند ٹیچرز جو باہر سے آئی تھیں یا تو شادی شدہ تھیں اور اپنے میاں اور بچوں کے غم میں ہر دم مبتلا رہتی تھیں یا پھر بڑی ہی مردہ قسم کی تھیں۔ ادھر پرانی استانیوں کی کڑی نگرانی نے اور کام خراب کر رکھا تھا۔ اگر کسی بہت ہی دل پھینک قسم کی لڑکی نے باہر سے آئی ہوئی کسی استانی کو بھول دل پیش کرنے کی چاہے تو دوسرے ہی دن اسے ہیڈ مسٹریس کی عدالت میں حاضر ہونا پڑیگا۔ اور یوں وہ عشق سبزۂ نومیدہ کی مانند سر اٹھاتے ہی پامال ہو گیا۔ پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ وہاں ایک شہر کی بڑی ہی فیشن ایبل اور کمسن استانی کا تبادلہ ہوا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے تو وہ خیر بس واجبی سی تھی۔ بلکہ اوپر کے نکلے ہوئے دو بڑے بڑے دانتوں نے بڑی حد تک اس کی شکل مکروہ کر دی تھی۔ پھر بھی وہ لڑکیوں کے دلوں پر قیامت بن کر ٹوٹی۔

اپنی آمد کے دوسرے ہی دن جب وہ کالی شلوار پہن کر کلاس میں گئی تو پوری کلاس میں طوفان آ گیا اور چند ہی دن کے بعد وہی پرانی استانیوں کے سامنے چپ چپ رہنے والی لڑکیاں عشق و جنوں کے ہاتھوں اتنی منہ زور اور خود سر ہوئیں کہ ادر تو اور ہیڈ مسٹریس کے ہاتھوں سے بھی نکل گئیں۔ نزہت نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ حسن نے عشق کو سہارا دیا۔ تو عشق نے وہ گل کھلائے کہ ہر ویرانے کو چمن بنا ڈالا۔ لڑکیوں کی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کے لئے اپنے گھروں سے کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ روپیہ چھوٹا موٹا زیور اور کپڑا تک اٹھا لاتیں۔ مائیں فریاد کر رہی تھیں۔ پرانی استانیاں پرانی اقدار کی گرتی دیواروں کو سہارا دینے اور کھڑا رکھنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہر روز دو چار کی پیشی ہیڈ مسٹریس کی عدالت میں ضرور

ہوتی۔ ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ کبھی کبھی ہیڈ مسٹریس ہاتھوں سے بھی کام لیتی، کبھی چوٹیاں پکڑ کر نوچتی، کبھی گالوں پر کس کس کر طمانچے مارتی۔ مگر جنونِ عشق کے انداز کہاں چھٹتے تھے۔ سیما کو یاد آیا۔ ایسے ہی ایک مرتبہ نزہت نصیب دشمناں بیمار ہوگئی تھی تو اسکول کا ڈسپلن سنبھالنا دشوار ہوگیا تھا۔ نزہت اسکول کے ایک کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی اور اس کمرے کے اندر اور باہر لڑکیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ ہیڈ مسٹریس بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی تھی۔ چوہے بلی کا سا کھیل تھا۔ ادھر اسے آتے دیکھ کر لڑکیاں منتشر ہوئیں۔ اُدھر اس کی پیٹھ پھری اور وہ پھر آ موجود ہوئیں۔

سیما اس طرح اپنا تماشا نہیں بنوانا چاہتی تھیں۔ اس لئے لڑکیوں کی اس بے باکانہ عبارت پر خاموش ہو رہی۔

تاش کی بازی جمی ہوئی تھی۔ مس صفی جو حال ہی میں ایک دوسرے اسکول سے ٹرانسفر ہو کر آئی تھی اپنی ہیڈ مسٹریس مسز شاہ کے چڑچڑے پن کی باتیں کر رہی تھی۔ مس علوی نے اسے ٹوکا۔

"مسز شاہ کو میں جانتی ہوں وہ تو بڑی خوش مزاج ہوا کرتی تھیں۔

"جی شادی سے پہلے کی بات ہے۔ جب سے انہوں نے شادی کی ہے بالکل ہی بدل گئی ہیں۔ خاصی بدمزاج ہوگئی ہیں۔"

"وجہ کیا ہے۔" ؟

"بس کچھ شوہر سے بنتی نہیں"۔

"مگر نباہ تو رہی ہیں"

"اس لئے تو اور بھی بدمزاج ہوگئی ہیں۔ شوہر کا غصہ اسٹاف پر اتارتی ہیں۔"

"عورتوں کو شادی نہیں کرنی چاہیئے خصوصاً" ٹیچرس کو" مس علوی نے بہت سوچ سوچ کر کہا

سیما چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ مس علوی نے اپنی بات کی دلیل میں کئی مسٹریسوں کی ناکام شادیوں کے واقعات سنائے۔ دوسری ٹیچرز کیا سوچ رہی تھیں۔ سیما کو اس کا علم نہیں تھا۔ لیکن وہ خود گرہستی کے تصور سے کھلی جا رہی تھی۔ اگر اسے اپنے خوابِ پریشاں کی تعبیر مل جائے تو زندگی کتنی شاندار گذرے۔ وہ مسکراتا ہوا کردار کی پختگی اور پاکیزگی سے دمکتا ہوا چہرہ اس کے تصور میں ابھر آیا تھا۔ اور ایک چھوٹے سے گھر کا نقشہ لمحہ بہ لمحہ مکمل ہو رہا تھا۔ استانیاں مس علوی کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ صرف شہناز ان کی مخالفت کر رہی تھی۔ وہ شادی کے حق میں تھی۔ مس علوی کہہ رہی تھیں۔ شادی کرنا اچھی بھلی زندگی کو روگ لگانا ہے!

شہناز نے کہا مگر پھر زندگی کیسے ـــ وہ محجوب ہو کر چپ ہوگئی سب ہنسنے لگے۔ سیما نے اس کی آنکھوں میں جھانکا وہاں اسے اس شمع کی روشنی نظر آئی جس نے اس کی اپنی اندھیری زندگی میں اُجالا کر رکھا تھا۔ "کزن" اس نے سرگوشی کی ـــ اور شہناز کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک لہر ابھری جو پھیل کر اس کے سارے وجود پر چھا گئی۔ سیما جانتی تھی وہ مدتوں سے اپنے ایک کزن کے تصور کو دل میں بسائے بیٹھی تھی۔ وہ بھی اسے پسند کرتا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک ہی خواب دیکھ رہے تھے۔ دونوں ہی کے تصور میں ایک چھوٹے سے گھر کا نقشہ مکمل ہو رہا تھا۔ دونوں ہی خاموشی سے اپنے بزرگوں کی رضامندی کا انتظار کر رہے تھے۔ سیما نے سوچا، محبت اگر صحیح خطوط پر کی جائے تو وہ کتنی مقدس، کتنی پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کاش کوئی شاہدہ اور مس عزیز کو بھی یہ راستہ دکھا دے، پھر اسے ایک شاک سا لگا۔ وہ تو خود کچھ دن سے بھٹکنے لگی ہے مس علوی کا تصور سوتے جاگتے

اس کے ذہن پر سوار تھا ان کے قرب کی خواہش اسے ہر لمحہ بے چین رکھتی ۔ وہ ہنستی تو وہ بھی ہنستی ۔ وہ چپ ہوتیں تو سیما کا دل اداس ہو جاتا اب وہ تنہائیوں میں بیٹھ کر اس لمحے کو کھوجنے کے بجائے مس علوی کے لئے سوچا کرتی ۔ اس کے سارے وجود پہ ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی ۔

آج مدتوں کے بعد دھند چھٹی تھی ۔ اور وہ چہرہ اس کے تصور میں ابھرا تھا اور بجلی کے ایک کوندے کی طرح ابھر کر غائب ہو گیا تھا ۔ اور پھر مس علوی کا تصور بڑھتے ہوئے اندھیرے کی طرح اس کے ذہن پر چھا رہا تھا ۔ اندھیروں کے بھنور بن رہے تھے اور ــــ اور اس کی روح اس بھنور میں گھری ہوئی اپنی گمشدہ محبت سے فریاد کر رہی تھی ۔

بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتے ہیں ہم

وقت کے ساتھ ساتھ روشنی کا دائرہ سکڑتا گیا ۔ اندھیروں کے بھنور پھیلتے گئے ۔ وہ مس علوی کو پاگل پن کی حد تک چاہنے لگی تھی ۔ پیار کی پیاس اسے جوہر کے کنارے لے آئی تھی ۔ اس کا پاگل دل ، ہر وقت انہیں کے خیال میں گم رہنے لگا تھا ۔ وہ کسی سے ہنس کر بات کرتیں تو اس کا دل سلگنے لگتا ۔ وہ کسی اور کے نزدیک بیٹھتیں تو وہ غصہ سے بے تاب ہو جاتی ۔ ذرا اس سے بے اتفاقی برتتیں تو اس کا سارا وجود لرزتا ہوا ، جلتا ہوا آنسو بن جاتا ۔ وہ کوشش کر کے ان کے ساتھ بیٹھتی ۔ ان کے نزدیک رہتی ۔ تاش کی بازیوں میں ان کی پارٹنر بنتی ۔ شاہدہ کی دیوانی لیلیٰ میں اور اس میں اتنا ہی فرق تھا کہ ابھی تک اس نے محبت نامے تحریر نہیں کئے تھے تحفے ، تحائف کا چکر نہیں چلایا تھا ۔ ادھر ایک نئی الجھن اور پڑ گئی تھی ۔ مس عزیز نے یا تو اس کی کمزوری بھانپ لی تھی اور شاہدہ والے واقعہ کا انتقام لینا شروع کر دیا تھا یا پھر وہ بھی اسی کی طرح کچھ اپنی فطرت کے تقاضوں اور کچھ ان کی بے پناہ کشش سے مجبور ہو کر اس کے راستے میں آ گئی تھی اور بڑی مستعدی کے ساتھ ان کی خدمت میں مصروف تھی ۔ گو وہ اسے لفٹ ذرا کم ہی دیتی تھیں ۔ پھر بھی جب وہ اس سے ہنس کر بات کر لیتیں سیما انگاروں پر لوٹ جاتی ۔

یوں تو اسے ہر صبح اسکول جانے سے پہلے آئینے کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا تھا ۔ پر ہوتا یوں تھا کہ وہ آئینہ میں خود کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھ پاتی ۔ یونہی ہجوم خیالات میں کھوئی ہوئی خالی خالی آنکھوں سے شیشہ دیکھ کر بال سنوارتی اور باہر نکل جاتی ۔ وہ تو ایکدن اسے شہناز نے ٹوکا ۔

"کیا بات ہے سیما تم روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہو" ــ ؟

"کون میں ـــ ؟ ــ نہیں تو" !

ہاں ہاں ذرا آئینہ اٹھا کر اپنا منہ دیکھو"

وہ ہنس پڑی " وہ تو روز ہی دیکھتی ہوں " شہناز بھی ہنس پڑی ۔ اس وقت تو بات ہنسی میں ٹل گئی ۔ لیکن بعد میں اس نے شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر بغور اپنا چہرہ دیکھا ۔ سنولایا ہوا رنگ مرجھایا ہوا چہرہ ، آنکھوں کے گرد گہرے حلقے ، مارے حیرت و افسوس کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ، تو یہ نتیجہ ہوتا ہے ان راستوں پر چلنے کا اور تو اور وہ تو ابھی چلی ہی نہیں تھی ہاں چلنے کی تمنا ضرور کر رہی تھی ۔ وہیں کھڑے کھڑے اسے آصفہ یاد آ گئی ۔ آصفہ اس کی محبت کا دم بھرتی تھی ۔ خاصی قبول صورت اور سوخ لڑکی تھی ۔ جانے کس لمحے وہ اس دلدل میں جا پڑی تھی ۔ ان دنوں سیما کا وہاں نیا نیا ٹرانسفر ہوا تھا اسکول میں ………… کا کچھ بندوبست نہیں تھا ۔ سیما نے مکان لے کر اپنی امی کو بلا کر ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا پر مکان ملنا بھی تو کوئی آسان بات نہ تھی ۔

اور پھر وہ تو تھی بھی وہاں بالکل انجان، اجنبی، ہر پھر کرا سے شاگردوں کا ہی سہارا لینا پڑا۔ کئی لڑکیاں اس کے لئے مکان دیکھنے لگیں آصفہ ان سب میں پیش پیش تھی۔ وہ سیما کا بہت خیال رکھتی تھی۔ ایکدن وہ اُسے اپنے گھر لے گئی۔

”مس آپ کے ساتھ کوئی مرد تو ہے نہیں پھر آپ ہمارے گھر میں کیوں نہ رہیں۔ مس میں آپ کا سارا کام کروں گی آپ کو ہمارے پاس رہ کر کوئی تکلیف نہ ہوگی!“

سیما نے پیار سے اسکو دیکھا۔ خلوص دل سے اس کے جذبے کو سراہا اور پھر بڑے اچھے پیرائے میں معذرت کرلی — شاگردوں کے ساتھ یوں ۔ ۳ ن ۴۵ × ۳۰ سونا اُسے اچھا نہ لگا۔ آصفہ اُداس ہوگئی۔

سیما کو مکان مل گیا۔ اس کی آنٹی بھی آگئیں۔ اور وہ آصفہ کی اس پیش کش کو بھول بھی گئی۔ پھر بھی اکثر شوخ لڑکیاں آتے جاتے اس کے کان میں یہ بات ڈال ہی دیتیں کہ آصفہ اس سے محبت کرتی ہے۔ وہ سنی ان سنی کر جاتی۔ آصفہ کلاس میں بیٹھی چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہتی۔ وہ جہاں بھی تنہا کھڑی ہوتی آصفہ اس کے پاس آجاتی۔

”مس کیا سوچ رہی ہیں۔“؟

اب مس بھلا اتنی سی لڑکی کو کیا بتائیں کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں وہ کس خیال میں غرق ہیں۔

پھر ایک دن اس نے سیما سے کہا۔

”مس کبھی ہمارے گھر آئیے نا“

”تمہارے گھر —؟“ سیما اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی!! بھئی اب تو مجھے تمہارے گھر کا راستہ بھی یاد نہیں رہا“

سچائی بعض اوقات کتنی بے رحم ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اسے بہت بعد میں ہوا۔ کاش اس نے یہ الفاظ نہ کہے ہوتے۔ اس وقت تو بس اتنا ہوا کہ آصفہ کی آنکھیں بھر آئیں — بڑے مایوس بڑے درد بھرے لہجے میں اس نے اس کا جملہ دہرایا۔ ”گھر کا راستہ بھی یاد نہیں رہا“ اور چپ چاپ اس کے پاس سے چلی گئی۔ کئی مرتبہ اس نے لڑکیوں میں اس کی بیماری کے چرچے سنے۔ ایک دفعہ دور سے اسے دیکھا بھی۔ وہ ہیڈ مسٹریس کے پاس شاید اپنا سرٹیفکیٹ لینے آئی تھی۔ اسے دیکھ کر سیما کو دکھ ہوا۔ وہ قبول صورت لڑکی سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اس کی وہ مسکراہٹیں وہ شوخیاں جانے کہاں گم ہوگئی تھیں۔ وہ دور کھڑی سیما کو دیکھتی رہی۔ اس کے نزدیک نہیں آئی۔ سیما نے بھی بجھتی چنگاریوں کو ہوا دینے کی کوشش نہیں کی۔ گو اس کا دل اس لڑکی کے لئے رو رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی یہ ننھی بچیاں تتلیوں کے پیچھے دوڑتی ہوئی گھروں سے اتنی دور کیوں نکل آتی ہیں کہ ساری عمر خارزاروں میں برہنہ پا بھٹکنا پڑتا ہے کوئی انہیں سمجھاتا کیوں نہیں کوئی انہیں روکتا کیوں نہیں —؟

آج آئینہ میں اپنا حلیہ دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے آصفہ کا بھوت اس سے چمٹ گیا ہے۔ آصفہ کا جنون اس کے خون میں حلول کر گیا ہے۔ پر وہ تو کوئی ننھی بچی نہیں تھی۔ نرمس علوی رنگین پروں والی تتلی۔ وہ کیوں اپنا راستہ گم کر بیٹھی۔ اس نے خود کو سمجھایا کیوں نہیں۔ خود کو روکا کیوں نہیں —؟؟

تب کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ” اب تم زندگی کے اس موڑ کو کبھی نہ پا سکو گی جہاں زمین آسمان سے، تاریکی نور سے، تپش خنکی سے ہمکنار ہوتی ہے!!

"نہیں" وہ تڑپ اٹھی ـــ !! نہیں ـــ میں پلٹ آؤں گی۔ میں خود کو سمجھا لوں گی۔ میں خود کو روک لوں گی۔"
وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خلا میں دیکھنے لگی ـــ دور کہیں گھپ اندھیروں میں روشنی کا ایک نقطہ سا ٹمٹما رہا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر اس طرف بڑھی اور دیوار سے ٹکرا کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
اس دن شام ہی سے مس علوی کی طبیعت خراب تھی۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں چھلک رہی تھیں انھیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ان کا جسم کوئی بڑی ہی سخت اذیت برداشت کر رہا ہے۔ سیمارات گئے تک ان کی تیمارداری کرتی رہی۔
آج آپ میرے پاس سو جائیے مس سیما" انہوں نے بڑے خوشامدانہ انداز میں کہا۔
"آپ کے پاس" سیما نے حیرت سے پوچھا اور اسے کراہیت کا ایک عجیب سا احساس ہوا۔
"ہاں آج میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔"
کوئی بات نہیں میں ساری رات آپ کے پاس رہوں گی۔ چوکیدار سے کہہ کر آپ کے پلنگ کے ساتھ ڈلوائے لیتی ہوں۔
"ایزی چیئر" جیسے انہوں نے خود سے سوال کیا اور کروٹیں بدل بدل کر کراہنے لگیں۔
"کیا تکلیف ہے آپکو ـــ" سیما نے ہمدردی سے پوچھا۔
"کمر میں اور ٹانگوں میں سخت درد ہو رہا ہے اگر کوئی دبا دیتا ـــ!!
"ٹھہریئے دیکھتی ہوں اگر مس عزیز کی ملازمہ ہوئی تو اسے بلائے لاتی ہوں وہ دبا دیگی"
ان کا چہرہ بھیانک پڑ گیا۔ "نہیں نہیں ملازمہ نہیں۔"
"پھر ـــ؟" اس نے ان کی طرف دیکھا ـــ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ سیما سر سے پیر تک کانپ گئی ـــ
مس علوی غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس کی گردن تنی ہوئی تھی۔ سر فیصلہ کن انداز میں اوپر اٹھا ہوا تھا ـــ آنکھیں خالی خالی تھیں۔ جانے وہ کہاں دیکھ رہی تھی۔ فیصلہ کی گھڑی آگئی تھی۔ ایک طرف جسم کی مانگ تھی۔ پیار کی پیاس تھی مس علوی تھیں ان کی خود سپردگی تھی۔ دوسری طرف وہ لمحہ تھا۔ روٹھا روٹھا دور ہی دور بھاگتا ہوا لمحہ، اور ہوس کی آندھیوں میں ٹمٹماتی شمع تھی۔ جذبات کے تھپیڑوں میں روشنی کا ایک ننھا سا نقطہ، جیسے پلک پر لرزتا ہوا آنسو، کہ گرا اور گم ہوا ـــ "نہیں" وہ خیالوں میں سسک پڑی۔
مس علوی کو اس وقت اس کے تیور بڑے انجان انجان سے لگے، کیا یہ وہی سیما ہے انہوں نے خود سے سوال کیا جو اتنے دن سے ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ ان کا قرب ڈھونڈھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں پیار کی پیاس تھی۔ یہ تو کوئی انجان اجنبی لڑکی تھی۔ جو ان کے پاس ہو کر بھی دور تھی۔ جو انہیں دیکھ کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کی بات سن کر بھی نہیں سن رہی تھی۔ نہیں سمجھ رہی تھی۔ "بے وقوف" انہوں نے زیر لب کہا۔ پھر جیسے ان پر دورہ سا پڑ گیا۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں چیخنے لگیں
"جائیے مس سیما چلی جائیے خدا کے لئے"
سیما چونک پڑی۔ واپس آگئی ـــ
"مگر مس علوی ـــ"
مس علوی نے اسے سختی سے روک دیا۔ چلی جائیے فوراً مس عزیز کو بھیج دیجئے سیما بہر حال ان کی اسسٹنٹ تھی وہ چپ

چاپ چلی آئی۔ مس آکر اس نے مس عزیز کو بھیج دیا۔

رات لمحہ لمحہ کرکے گذرتی رہی، اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ ایک الجھن ایک کرید سی تھی کچھ کھونے کا غم تھا۔ کچھ پانے کی خوشی تھی۔ دونوں جذبے کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہوگئے تھے کہ وہ بوکھلائی جارہی تھی۔ کمرے سے نکل کر وہ دیر تک میس کے آنگن میں ٹہلتی رہی رات بھیگی ہوئی تھی اوس پڑرہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں نمی تھی۔ اسے کئی دفعہ چھینکیں آئیں مگر وہ اندر نہیں گئی۔ اندر کے خیال سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ بکھر جائے۔ ریزہ ریزہ ہوکر اس وسیع کائنات میں گم ہوجائے۔ اس لمحے کی ننھی سی جوئبار بن کر وقت کے سمندر میں گھل مل جائے۔

وہ بے چینی سی ادھر اُدھر گھومتی رہی۔ اس کے قدم آپ سے آپ مس علوی کے کوارٹر کی طرف اٹھ گئے۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے دروازے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ وہ تھوڑی دیر کھڑی سوچتی رہی۔ گھڑی کی سوئیاں ڈھائی بجا رہی تھیں۔ مس علوی کو دوا کی تیسری خوراک دینی تھی اس نے سوچا اسے مس عزیز کو بتلا دینا چاہیئے۔ وہ کھڑکی کی طرف چلی گئی کھڑکی کھلی تھی اور نیلے بلب کی خوابناک چاندنی پردے سے چھن رہی تھی۔ اس کا خیال تھا مس عزیز کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی ہوگی اس نے ذرا سا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ اچانک کراہیت کے شدید احساس کے ساتھ اسے زور کی اُبکائی آئی۔ سردی کی کئی لہریں اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسرائیں۔ وہ کپکپاتی ہوئی آکر اپنے بستر میں گھس گئی۔ اُسے جاڑے کے ساتھ تیز بخار چڑھ آیا تھا۔

صبح وہ دونوں اسے پوچھنے آئیں۔ مس علوی کے چہرے سے رات کی اذیت کے آثار مٹ گئے تھے ان کے خدوخال سے آسودگی جھلک رہی تھی۔ مس عزیز کی آنکھوں میں شراب کی سی مستی تھی۔ اس کا پنجرہ دائیں بائیں یوں جھول رہا تھا جیسے اس نے بہت سا نشہ پی رکھا ہو۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر اسے رات کا منظر یاد آگیا۔ اچانک اسے دوبارہ کراہیت کا شدید احساس ہوا اور وہ منہ ایک طرف نکال کر زور زور سے قے کرنے لگی۔


نظم

شاد عارفی

اختر انصاری (دہلوی)

جمیل مظہری

تمنا

مسعود اختر جمال

ادا جعفری

مشفق مصحفی

نازش ناصری

احمد ظفر

جمیل ملک

رضا ہمدانی

ساقی جاوید

حسن عابد

لذت شاد نوری

ادیب سہیل

قمر ساحری

شاد عارفی

گوالن

شاد عارفی (مرحوم) پاک و ہند کے منفرد شاعر تھے۔
طنزیہ شاعری میں بالخصوص ان کا ایک بلند مرتبہ ہے۔
ذیل کی غیر مطبوعہ نظم انہوں نے بطور خاص افکار کے لئے
ارسال کی تھی جو ہمارے پاس محفوظ تھی ہم اسے مستحق کا
شمارہ میں پیش کر رہے ہیں۔ (ص ب)

گرمیوں کی صبحِ کیف آور کا "عکسِ بے ضرر" حدّتِ شعلہ بجاں۔ تڑپی فضا میں ہر طرف
ابر کے ٹکڑوں سے ٹکرا کر ہوا زیر و زبر آتشِ برقِ تپاں جھپٹی ہوا میں ہر طرف

پھر ہمالہ کی "اُٹھی چوٹی" پہ ڈالی روشنی اب کہ سُورج آچکا تھا ٹھیک سمت الرّاس پر
برف کے گلتے ہوئے ہیرے میں ڈھالی روشنی اور سیدھی ہو کے کرنیں پڑ رہی تھیں گھاس پر

پھر حسیں چشموں سے مل کر، وادیوں تک آگیا تازگی پودوں میں، شاخوں میں "عضویت" ہوگئی
دامنِ فطرت سے "فطرت زادیوں" تک آ گیا جا ملے ذرّے بگولوں سے، رطُوبت کھو گئی

پھر درختوں سے اُتر آیا جو فرشِ خاک پر "مُنہ اندھیرے کی" طراوت ریزیِٔ شبنم گئی
وہ کڑے تیور.... اگر مکھی بھی بیٹھے ناک پر....؟ نرم و نازک پتیوں پر گرد کی تہہ جم گئی

بج رہے تھے دس کہ بھیرا آفتابِ تُند خُو آ گئی "کاریز" کے ہونٹوں پہ خشکی آ گئی
ہوش کھسکا، جوش میں آیا حرارت کا لہو دوب گولوں کے کنارے تھی مگر مُرجھا گئی

دلکشی کا نور، گلشن سے عیاں بے رونقی
مٹ گئی تنظیم برگ و بار، ہلچل مچ گئی

رنگ و نکہت کے ہوا خواہوں نے اپنی راہ لی
خوشنما پھولوں سے، تتلی نے معافی چاہ لی

رس بھرے گیتوں سے متوالا پپیہا باز تھا
موجِ دریا کے بیوں پر شعلۂ آواز تھا

"لو" نے باندھی وہ ہوا، پہلا ہی چھاپہ مارکر
گاؤں کی جانب بڑھے دہقان ہمت ہار کر

وہ گوالن رہ گئی جس کی جوانی کی ترنگ
اپنے ڈھوروں کے لئے تھی دھوپ سے مصروفِ جنگ

"سنگِ موسیٰ" جس سے "عزمہ کار" وہ صورت تھی... وہ
ایک بے ڈھنگے ہیولیٰ وضع کی مورت تھی وہ...

جس کے چہرے کے "نقوشِ ناسبک" آہن گداز
"وسعت و قعرِ دہانِ بدنما" ہاون گداز

جنبشِ لب وہ کہ جیسے، زخم سے "ٹانکا ہٹے"
خندۂ بدزیب سے "ہنستا تو" دل میں کٹے

"عشوۂ ناساز" میں لپٹی ہوئی نسوانیت
سختیٔ اعصاب سے چمٹی ہوئی دہقانیت

گفتگو کا طرز رسوائے غلط فہمی نہ تھا
"چشمِ بے غمزہ" میں ایمائے غلط فہمی نہ تھا

ہاتھ، چاکِ دامنِ پندار سے ناآشنا
پاؤں جنبش لغزشِ رفتار سے ناآشنا

نیلگوں کھدر کا صد پیوند بوسیدہ لباس
اتنا بوسیدہ کہ چشمِ آدمیت بدحواس

ہاتھ میں شیشم کا "دوشاخہ" چھڑی کے طور پر
"گائی کی رسی" کلائی میں گھڑی کے طور پر

"اس طرف عمرِ طبیعی سے" وہ لاکھوں جوڑیاں"
بھر گئے تھے مَیل سے جن کے نگینوں کے نشاں

سلوٹیں کھا کھا کے "جلدِ پشتِ پا" گینڈے کی ڈھال
برہنہ پائی سے تلوے، ٹھیک حیوانوں کی مثال

حسنِ صورت میں یہ بدذوقی مگر سیرت بلند
یعنی دل میں "بدعتِ حیوانیہ" عزلت پسند"

یعنی وہ عورت تھی۔ عورت اور پیانِ دردِ دل
آب و گل سے مٹ نہیں سکتی "سرشتِ آب و گل"

اس کا احساسِ جوانی ظرف سے باہر نہ تھا
خم کی گہرائی میں شعلہ تھا، مگر مضطر نہ تھا

جس طرح کائی کنول سے منہ نہیں آتی کبھی
خوبیٔ باطن کثافت سے نہیں جاتی کبھی

پاؤ گے تم ہند کے ہر خطۂ بازار میں
یہ گوالن جس کا "خاکہ ہے" مرے اشعار میں

(۲) عفیف اختر انصاری دہلوی

رُباعیات

ہے ہے یہ اُچھل کُود کراتا ہے کون؟ زنجیر پسِ پردہ ہلاتا ہے کون ؟
تقدیر کی ڈگڈگی پہ انسانوں کو بندر کی طرح ناچ نچاتا ہے کون؟

ناکس سے بھی ہے مرتبہ کم تر میرا اک طرفہ تماشا ہے مقدر میرا
ہیں کاسۂ سر لاکھوں حمق سے لبریز خالی ہے مئے ناب سے ساغر میرا

دل وقت سے مسرور نہیں ہے پیارے! ہاں وقت پہ مقدور نہیں ہے پیارے!
جب وقت ہی مغموم سے ماری ہوگا وہ وقت بھی کچھ دور نہیں ہے پیارے!

وہ ظلم کہ حیوان بھی جب پہ شرمائے وہ خبث جو شیطان کے چھکے چھڑوائے
انسان کے کرتوت الٰہی توبہ ! سُن لے تو جہنم کو پسینہ آجائے

اس حال میں لاگ اور لگاوٹ کیا خوب! بگڑی ہوئی صورت پہ بناوٹ کیا خوب!
دامن پہ مری دلقِ گدایا نہ کے مقیش کے بوٹوں کی سجاوٹ کیا خوب!

اختر کوئی تدبیر فراغت کر لو! کچھ روز دکھاوے کی عبادت کر لو!
سامانِ تجارت جو نہیں ہے نہ سہی
اللہ کے نام کی تجارت کر لو!

پروفیسر جمیل مظہری

خدا خیر کرے

چشمِ اُس شوخ کی پُرنم ہے خدا خیر کرے
زلف کے انداز سے برہم ہے خدا خیر کرے
حسن پر عشق کا عالم ہے خدا خیر کرے

جب یہی دل کے تقاضے ہیں تو انا للہ
عشق تھا عقل سے بیگانہ تو خوش تھی نگاہ
عقل اب عشق کی محرم ہے خدا خیر کرے

دلِ مایوس پہ تسکین کا عالم ہے آج
جس سے وابستہ ہے تقدیرِ محبت کا مزاج
وہ خلش رات سے کچھ کم ہے خدا خیر کرے

وہی آنکھوں میں تبسم وہی ہونٹوں میں شراب
ذوقِ بینش نے لڑکپن سے جو دیکھا تھا خواب
آج وہ خواب مجسم ہے خدا خیر کرے

عادتِ سجدہ دلائی ہے ترے در نے سر کو
دی ہے آواز کسی نقشِ قدم نے مُڑ کر
میری گردن میں وہی خم ہے خدا خیر کرے

ہاتھ آ رہے ہیں تقدیر کے خوابوں لے دوست
دل دھڑکتا ہے کہ اب دستِ جنوں میں لے سوت
گوشۂ دامنِ مریم ہے خدا خیر کرے

جس طرف دیکھیے ہے ایک سوادِ تشکیک
مظہری عقل کی آنکھوں میں ہے دنیا تاریک
روشنی دل کی بہت کم ہے خدا خیر کرے

مسعود اختر جمال

مملکتِ دل کے تاجدار

یہ اژدہام تو دیکھو امیدواروں کا
ہر ایک گام پہ مجمع وفا شعاروں کا
ہر ایک موڑ پہ انبوہ رازداروں کا

زمیں پہ جلوۂ سیمیں سمن عذاروں کا
فلک پہ حسنِ دل آویز ماہ پاروں کا
سفر ہے مملکتِ دل کے تاجداروں کا

چلے ہیں لے کے ہزاروں جہانِ تازہ و تر
نفس کی رَو میں فروغِ بہارِ شام و سحر
نظر کے ساتھ اک عالم حسیں نظاروں کا

بلا کا سوز، قیامت کی بے قراری ہے
غضب کی خونِ تمنا سے لالہ کاری ہے
یہ بانکپن کوئی دیکھے جگر فگاروں کا

حریفِ رفعتِ گردوں ہیں آج ویرانے
ہجومِ ظلمتِ شب میں چلے ہیں دیوانے
ہر ذرہ پہ اپنے لئے قافلہ ستاروں کا

جنوں کی راہ سے اب کارواں گذرتا ہے
غمِ حیات کے طوفان سے ابھرتا ہے
ہر اک قدم پہ دھڑکتا ہے دل بہاروں کا

قتیل شفائی

پہچان

میں نے اک شعر سُنا
رُوح مری جھوم اٹھی
دل میں کھنک بیدار ہوئی
سوچ نے لی انگڑائی ـــــــ

میں نے اس شعر کے خالق سے کہا
اپنی تخلیق مرے سایۂ تحسین ہُنر تک لے آ
تاکہ میں بھی تری اس پرورشِ لوح و قلم کے انداز
غور سے دیکھ سکوں
دیکھ کے دنیا سے کہوں
آج میں نے بھی وہ آواز سُنی ہے جس میں
اک ہمکتے ہوئے بچے کی ادا شامل ہے
اک جواں بخت مغنی کی نوا شامل ہے
اک کہن سال مصوّر کی دعا شامل ہے
ـــــ اور اس شعر کے خالق نے کہا
تو کوئی صاحبِ اولاد نظر آتا ہے

ادا جعفری

عجزِ فن کار

تمام عمر بنائی ہیں میں نے تصویریں
کہ رنگِ خون تھا نہایت ارزاں تھا
تخیلات کو پہنا سکی نہ زنجیریں
نہ احتیاطِ خموشی نہ احتیاجِ نوا
نہ التزامِ تماشا، نہ اہتمامِ ثنا
نگارخانۂ جاں میں سجائے شہ پارے
سب آفتاب کی قاشیں، تمام مہ پارے
مگر وہ ایک تصوّر، مگر وہ ایک دعا
پہونچ سکا نہ وہاں تک مرا جنونِ رسا
کہ ما ورائے بیاں تھیں ہزار تعبیریں
وہ ایک لفظ کہا بھی جو تونے یا نہ کہا
وہ ایک لفظ مرے دل نے بار بار سنا
تمام عمر کا حاصل وہ ایک حرفِ وفا
وہ اک شکست کہ جس پر مجھے غرور رہا
وہ ایک خوابِ گریزاں ہیں جس سے تعبیریں
تمام عمر بنائی ہیں میں نے تصویریں!

شب ۔ صبح

بیہودہ بات

اندھیرے کی منڈی میں اک نوجواں
موم کی مرمریں شمعوں کا ٹوکرا
اپنے سر پہ دھرے
دیر سے
روشنی کے خریدار کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے

یہ احمق نہیں ہے،
نہ پاگل ہے..
یہ نوجواں،
موم کی مرمریں شمعوں کا ٹوکرا جو لئے
دیر سے اس اندھیرے کی منڈی میں
ظلمت فروشوں کی نگری میں
بے کار منڈلا رہا ہے
اُجالے کی دنیا کا معصوم باشندہ ہے!

اُجالے کی دنیا کے باشندے کو
چند لوگوں نے ناحق
ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے
چند لوگوں (بزرگوں!) نے
بیہودہ سی بات کہہ دی ہے اس نوجواں سے
کہ ظلمت فروشوں کی بستی میں بھی
روشنی کے طلب گار ہوتے ہیں پیدا!!

فارغ بخاری

منزلِ جاں

جیت اور ہار کا رونا کیسا — یہ تو ہر کھیل کی تقدیر میں ہے
حادثوں ہی سے عبارت ہے حیات — موت کا زہر تو ہر تیر میں ہے

زیست بن جاتی اگر جوئے نشاط — درد کے چاند کا ارماں ہوتا
اتفاقات کے بازاروں میں — کوئی سودا نہیں ارزاں ہوتا

اپنے ہی زخموں کو اب چاٹتے ہیں — شکر نا داریٔ مرہم تو نہیں
حرصِ قربت نے بھی گمرہ نہ کیا — یہ یقیں اپنے لئے کم تو نہیں

رشتۂ درد سلامت اے دل — عشرتِ ماتمِ امید تو ہے
رنج بے رحمیٔ حالات ہو کیا — عیشِ محرومیٔ جاوید تو ہے

غم تعبیر میں گھلنا ہے عبث — وقت کا خواب کوئی زندہ نہیں
میں وفا کر کے پشیماں نہ ہوا — تو جفا کر کے بھی شرمندہ نہیں

نہ کوئی لمحۂ اقرار کا دکھ — نہ کوئی زخمِ تمنا کا ملال
درِ تنہائی پہ پیاسی دستک — دامِ عسرت نہ کوئی طوقِ سوال

سنگِ افتادہ ہے اب منزلِ جاں — اب کہیں عکسِ درو بام نہیں
بھیگی پلکوں پہ ہیں یادوں کے مزار
دل میں کوئی ہوسِ خام نہیں

احمد ظفر

رہائی

فنا کا وہ دستِ احمریں ہے
جو میرے رخسار چھو رہا ہے
ہجوم افکار، جیسے کہسار دور ہی دور جا رہا ہو
تھرکتا پانی، وہ آئینہ سا
جو ٹوٹتا ہے تو دل میں جیسے ہزاروں نشتر اُتر رہے ہوں
فضا کی جادوگری مرے ساتھ چل رہی ہے

سسکتی خوشبو گذر رہی ہے
ہوا مرے کان میں کوئی بات کہہ گئی ہے
فضا کی جادوگری مرے بعد بھی رہے گی

یہ جسم میرا
زمیں جسے کل نگل چکی ہے
بکھر بکھر کر یہیں رہے گا
کبھی ہوا میں کبھی فضا میں
فضا کی جادوگری مری زندگی کے جنگل میں شمع روشن بنی رہے گی

جمیلہ ملک

رُوحوں کی پُکار

تم بھی دنیا چھوڑ چکے ہو!

تم بھی بُوڑھے برگد کی ٹھنڈی چھاؤں میں جا بیٹھے ہو!!

جسم کی آنچ، نگاہوں کی بے لاگ چمک اتنی قاتل تھی!!

جس سے ڈر کر تم نے دھرتی ماں سے اپنا رشتہ توڑا!!

جس کے خوف سے تم پتھر کی صورت یوں خاموش ہو جیسے

تم بھی بے حس پتھر ہو، انسان نہیں ہو!

گیان دھیان کی باتیں چھوڑو!

اس جھوٹی مسکان سے دھرتی ماں کے گھاؤ بھر نہ سکیں گے

مڑ کر دیکھو

سرحد سرحد، گاؤں گاؤں، شہر شہر ہیں

کیسی ہاہاکار مچی ہے!

شق ہے بوڑھی ماں کا سینہ

بیٹوں پر اُفتاد پڑی ہے

خون کے قلزم میں سب دھرتی ڈوب گئی ہے

لاشوں کا انبار لگا ہے

جلتی پھرتی، جلتی سڑتی لاشیں!

لاشوں پر گدھ منڈلاتے ہیں

بوٹی بوٹی نوچ رہے ہیں

گیان دھیان پر مرنے والو

آؤ میرے ساتھ چلو، میں تم کو دکھاؤں!

اِن کی آنکھوں میں وہ جوت، جو بجھ کر بھی روشن ہے

اِن کے ہونٹوں پر وہ گیت،

جو وادی وادی، قریہ قریہ گونج رہا ہے

اِن کے سینوں کی وہ دھڑکن

جس میں آج کا، آنے والی کل کا گیان چھپا ہے

رضا ہمدانی

راہی

اَن جانی منزل کے راہی
منزل، بچھڑا دوست نہیں ہے
حجرے کے دروازے پر جو
اک دن تجھ کو مل جائے گا

منزل، کوئی پھول نہیں ہے
جس کی جانی بوجھی خوشبو
ڈالی تک پہنچا دے تجھ کو

منزل کوئی جام نہیں ہے
چند کھنکتے سکے تیرے
جس کو ان تشنہ ہونٹوں تک
لے آئیں کے گھیرے گھیرے

اَن جانی منزل کے راہی
جانے سے پہلے دیوانے
منزل کا کچھ بھید تو پالے

ساجدہ جاوید

عظیم ماں

اے روشنی کی جھیل، مقدس عظیم ماں
دکھ کا امر چراغ جلا کر چلی کہاں

تیرا نحیف جسم نشانِ وفا و عزم
تیری صدا دلیلِ دل و جاں تھی آج تک
تیری سفید دودھ سی زلفوں کی چاندنی
غم کی شبوں میں صبح کا عنواں تھی آج تک

تیری جبیں پہ ثبت شب و روز کے خطوط
آنچل ترا سحر کی علامت بنا رہا
تو نے مرے وطن کے سپوتوں سے آج تک
جو کچھ دیا وہ مہرِ صداقت بنا رہا

تیرے لبوں کا زہر کشیدِ دل و نگاہ
ان پتھروں کو زہر پلاتی رہی ہے تو
غم کی مہیب رات میں اے ماں تاہی آگ
جلتی رہی ہے اور جلاتی رہی ہے تو

اس دورِ سانحات میں ہم سے خفا ہے تو
تجھ سے تو کوئی درد چھپایا نہیں ہے ماں!
ہم چل رہے ہیں آج بھی زخموں کی دھوپ میں
اور ان سروں پہ کوئی بھی سایہ نہیں ہے ماں!

حسن طاہر

حقیقت کا سراب

دُور بابل کے کھنڈر پاس بُلاتے ہیں مجھے
روح آوارہ ہے خاموش سیہ غاروں میں
جھلملاتی ہوئی قندیلوں، گھوں پر شمعیں
عنبر و عود کے آتش زدہ نغمے ہر سو
پھیلتے جاتے ہیں آفاق کی پہنائی میں

دُف بجے اور دھماکوں سے فضا چاک ہوئی
ناچے گھنگھرو کی گتوں پر کئی مستانہ خیال
دُور پاتال سے جن، قاف سے پریاں آئیں
گیت گانے لگا، انگڑائیاں لینے لگا خوں
رقص اور رنگ نے باندھا وہ سماں چار طرف
ذکر کرتے ہوئے ہیرے کی زباں کٹتی ہے

ننگے سر، ننگے بدن لو وہ پجاری آئے
دیوتاؤں سے زر و سیم کی جھنکار رُستی
مینڈھے سینگوں پہ اُٹھائے ہوئے کونین کا بوجھ
اور شمعون کے ہاتھوں میں چمکتی تلوار
ایک ہی وار میں لُٹ گئی حقیقت کی نقاب
رقص کی، رنگ کی، خوشبو کی حقیقت کی نقاب

ادیب سہیل

محبوسِ عمل

پہنشیبوں کے مکیں!
ان کو کیا معلوم
وہ دانشِ کہسے
وہ صاحبِ سیف و قلم
جانتے ہیں جن کو یہ منزل بہ منزل ترجمانِ دل
نقیبِ درد
ہمراز سفر
چاہتے ہیں جن کے بل پر سر کریں سب مرحلہ ہائے فراز
پاٹ ڈالیں ہر خلیجِ امتیاز
اُن میں کچھ کو لے اڑی عیشِ فراواں کی پری
ان میں کچھ شمعِ ہوا پر مر مٹے دیوانہ وار
اور کچھ اپنی ہی تیزی کے اسیر ——
آپ محبوسِ عمل
کر رہے ہیں رہ گزر در رہ گزر تعمیر ذہنوں کے حصار
جن کو کہیے مرحلہ در مرحلہ دیوار ساز
اور اس دیوار سازی کے لیے مخفی وسیلوں کا جواز!
دستِ نامحسوس کے پروردہ باز !!
پہنشیبوں کے مکیں
ان کو کیا معلوم
وہ دانش کہسے
وہ صاحبِ سیف و قلم !!!

نوشاد نوری

اقلیمِ شب

دن میں مہتاب، نہ مریخ، نہ زہرہ، نہ زحل
سب ہی روشن ہیں، سبھی چشمِ رسا سے اوجھل
مطمئن سب ہیں کہ آفاق میں دن زندہ ہے
اور خورشید اُجالے کا نمائندہ ہے

قرصِ خورشید پہ اتنا بھی گماں کب گذرا
چاند کی طرح کوئی داغِ الم رکھتا ہو
فصل کی طرح دبے پاؤں، کلی سا محجوب
چاند کی طرح شبستاں میں قدم رکھتا ہو
نور کی گود میں، ظلمات کے پس منظر میں
چاند کی طرح، ہر زخم کو نم رکھتا ہو

شب میں جگنو ہو، ستارا ہو، شرر ہو کہ چراغ
شب کی اقلیم میں مہتاب شہنشاہ بھی ہے
شب کی اقلیم میں تنویر کا ہر جزوِ خفیف
جل رہا ہے کہ شبِ تار سے آگاہ بھی ہے

قمر ساحری

آدرش

اب اور کیا انتظار کرنا
ستارے تاریک ہو چکے ہیں
یہ مہر و مہتاب، آب و تاب اپنی کھو چکے ہیں

میں چاہتا ہوں
تمام گندے سمندروں کو
ہر ایک دریا کو خشک کر دوں
تمام بے آب بادلوں کو فضا سے باہر اچھال پھینکوں
تمام اونچے پہاڑ جن کی بلندیاں سر جھکا چکی ہیں
تمام منظر کہ رنگ جن کے اکھڑ چکے ہیں
تمام شاخیں کہ جن میں کوئی لچک نہیں ہے
تمام پتوں کو جن میں کوئی چمک نہیں ہے
تمام پھولوں کو جن میں کوئی مہک نہیں ہے
خلا کے شعلوں کی نذر کر دوں
میں چاہتا ہوں کہ اس زمیں کو نئی خلاؤں میں لے کے جاؤں
نئی فضاؤں میں لے کے جاؤں
خود اپنے ہاتھوں سے حسن بخشوں
حسین انداز سے سجاؤں۔

مختصر افسانہ

[illegible]　　جوگندر پال

جیلانی بانو　　[illegible] جمال

کوثر چاندپوری　　[illegible]

سیدہ [illegible]　　رفعت

[illegible]　　قیصر تمکین

[illegible]　　[illegible]

[illegible]

[illegible]　　اعتبار ساجد

رام لعل

ایک غلط سچ

اشوک کتنی دیر سے پڑھنے میں مصروف تھا۔ دوسرے دن اُس کا ہسٹری کا پیپر تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ اسی کمرے میں اُس کا پلنگ بھی تھا۔ اُس کے ممی ڈیڈی کے ساتھ دوسرے کمرے میں سوتے تھے۔ وہ غالباً دیر سے سوچکے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ ڈائیننگ ٹیبل سے اٹھ کر سیدھا پڑھنے میں ہی جٹ گیا تھا۔ امتحان کے دنوں میں وہ اُن سے کھانے کی میز پر ہی مل پاتا تھا۔

اُس نے بتی آف کر کے پلنگ پر جا کر سونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک اُس کے من میں ڈیڈی کی ایک سگریٹ پینے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ اس طرح کی حرکت وہ پہلے بھی کبھی کبھی کر چکا تھا۔ اس میں اُسے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ سگریٹ میں نہیں چوری کرنے میں۔ دوسرے دن کالج جا کر وہ اپنے ساتھیوں کو اپنا کارنامہ سناتا تو وہ بھی اِسے خوب داد دیتے۔ اُسے اپنے بھی اِسی قسم کے قصے سناتے۔ ہر لڑکا اس قسم کے کارناموں پر بڑا فخر بھی محسوس کرتا تھا۔

اگرچہ اشوک پڑھتے پڑھتے بہت تھک چکا تھا۔ فوراً سو جانا چاہتا تھا لیکن سگریٹ کے لئے ڈیڈی کے کمرے میں چوری سے جانے کی خواہش اس کی نیند پر غالب آگئی اور وہ دبے پاؤں آنگن پار کر کے ڈرائننگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ڈیڈی رات کو سگریٹ کی ڈبیا وہیں چھوڑ دیتے تھے۔ کبھی کبھار ایک آدھ سگریٹ نکل جانے کا انہیں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ ٹھیک ڈیڈی کے صوفے میں گھس کر اور میز پر پاؤں پھیلا کر دو چار کش ہی لگاتا تھا۔ اس کے بعد سگریٹ کو باتھ روم کے کموڈ میں پھینک کر، دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا اپنے کمرے میں جا کر سو جاتا تھا۔

جس وقت وہ ڈرائنگ روم کے قریب پہونچا۔ اسے اندر سے کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ بہت ہی محتاط آواز! وہ سمجھ گیا۔ ڈیڈی کا پارٹنر ہے۔ کسی خاص کام سے آگیا ہوگا۔ لیکن اس کی محتاط آواز اور اچانک اپنی ممی کا ذکر سن کر اُس کے پاؤں میں زنجیر سی پڑ گئی۔ وہ آدمی کتنی دیر تک بولتا رہا۔ اُس کے ڈیڈی بیچ بیچ میں بس کبھی ہوں، ہاں کر دیتے یا ان کے سگریٹ سلگانے پر ماچس جلانے کی ہلکی سی آواز سنائی دے جاتی۔

جو کچھ اُس آدمی نے کہا اس کی ترتیب اشوک کے معصوم ذہن میں اسی طرح بنی —— جگت بہادر (اشوک کے ڈیڈی) کی بیوی کا چال چلن اچھا نہیں ہے۔ وہ اس کے (جگت بہادر کے پارٹنر کے) پیچھے پیچھے گھومتی رہتی ہے —— اسکی وجہ سے اس کی

دیا پارٹنر کی) بیوی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اور وہ اسکینڈل سے بچنے کے لئے اب اُس کے ساتھ اپنی پارٹنر شپ ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اس شہر کو چھوڑ کر وہ کسی دوسرے شہر میں اپنا کاروبار شروع کرے گا ۔۔۔ اُس آدمی نے اس کے ڈیڈی کو بار بار یقین دلایا کہ وہ اس معاملے میں بالکل بے قصور ہے ۔ جب حالات کے سر سے گزرنے کی نوبت آگئی تب ہی اُس نے یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے ۔ ! '

اشوک کو فوراً یقین نہ آیا یہ سب صحیح ہوگا ۔ لیکن اُسے بے حد صدمہ پہونچا ۔ اُس نے اپنے ڈیڈی کے لئے بھی ایک زبردست صدمے کا احساس کیا جو بڑی خاموشی سے اپنے پارٹنر کی باتیں سنتے جا رہے تھے ۔ ایک حیرت ناک صبر کے ساتھ ۔ اشوک میں اس کے بعد کچھ اور سننے کی تاب نہ رہی تو اپنے کمرے میں لوٹ آیا ۔ جب وہ اپنی ممی کے کمرے کے پاس سے گزرا تو اس کا دل بے اختیار چاہا اندر جا کر اپنی ممی سے لپٹ جائے اور خوب روئے ۔ اُس سے کہے ۔۔۔ اُس آدمی کو گھر سے نکال دو ۔ ابھی جا کر نکال دو ۔ وہ کتنے غلیظ جھوٹ بول رہا ہے ! یہ بات سچ نہیں ہے نا ممی !

اپنے کمرے میں جا کر وہ بستر پر لیٹ گیا ۔ اُس کی نیند اُچاٹ ہو چکی تھی ۔ سگریٹ پینے کی خواہش بھی ختم ہو چکی تھی ۔ وہ لیٹے لیٹے اپنی ممی کے بارے میں سوچتا رہا ۔ گذشتہ کئی سالوں کے واقعات اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے ۔ اس کی ممی سوشل حلقوں میں بے حد مقبول ہیں ۔ ہر شخص اُن سے بات کر کے خوش ہوتا ہے ۔ اُن کی پرسنلٹی اتنی دلکش اور پُرکشش ہے کہ سب ہی ان کے گرویدہ ہو اٹھتے ہیں ۔ وہ خود اپنی ممی کو بہت پسند کرتا ہے ۔ اس کی ہر بات کو ! کپڑوں اور کھانے کے بارے میں اس کے سلجھے ہوئے ذوق کو ، اور دلچسپ باتوں کو ! اُس کے ڈیڈی اس معاملے میں بہت پیچھے ہیں ۔ وہ ممی کی کسی اچھی بات کی ٹھیک ڈھنگ سے تعریف بھی نہیں کر سکتے ۔ اشوک کو کبھی کبھی اُن کا وجود اس گھر کے لئے بالکل غیر ضروری سا محسوس ہونے لگتا ہے ۔ انہیں کبھی بخار آجاتا ہے یا کوئی اور تکلیف ہو جاتی ہے تو اشوک کے دل میں کبھی ہمدردی کے جذبات نہیں اُبھرتے ۔ وہ انہیں دیکھنے کے لئے بھی نہیں جاتا ۔ بلکہ ان کے پاس جانے سے طرح طرح کے بہانوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اتفاق سے سامنا ہو جاتا ہے تو وہ اُن کی مزاج پرسی بس رسمی طور پر ہی کر لیتا ہے ۔

لیکن آج کے واقعہ پر اپنے ڈیڈی کی گہری خاموشی کو اشوک نے خاصے شک کی نظر سے دیکھا ۔ وہ کسی بھی لمحہ ممی پر برس سکتے ہیں سوتے میں اُس کا گلا بھی گھونٹ سکتے ہیں ۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں ۔ اشوک اپنے ڈیڈی کی خاموشی سے خوفزدہ ہو اٹھا ۔ ساری رات سو نہ سکا ۔ جب اس کے ڈیڈی سونے کے لئے اپنے کمرے میں واپس گئے تو وہ ہر لمحہ اُن کی اونچی آواز سننے کا منتظر رہا ۔ لیکن وہ کمرے میں جا کر چپکے سے سو گئے ۔ روشنی کی نہ ممی کو جگایا ۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں !

صبح ہوتے ہی اشوک بستر سے نکل آیا ۔ وہ گھر میں سب سے پہلے جاگا تھا ۔ لیکن وہ سویا ہی کہاں تھا ساری رات اُس نے کروٹیں لیتے گزار دی تھی ۔ پیپر دینے کے لئے اُس نے جو کچھ یاد کیا تھا وہ سب بھول چکا تھا ۔ پھر بھی وہ جلدی جلدی تیار ہو کر ناشتے کے لئے میز پر پہونچ گیا ۔ اُس کے ممی اور ڈیڈی بھی تیار ہو کر آگئے ۔ اُس نے دونوں کو گہری نظر سے دیکھا ۔ اُن کے چہرے کے تاثرات کو ، ان کے آپس میں بات کرنے کے انداز کو ۔ اس کے ڈیڈی حسب معمول خاموش تھے ۔ انہوں نے اشوک کو دیکھ کر بس اتنا ہی پوچھا ۔ کیا رات کو تم نے بہت دیر تک اسٹڈی کی ہے !"

یہ بات انہوں نے غالباً اُس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ہی پوچھی ۔ انہیں کیا معلوم میں رات بھر سو ہی نہ سکا ! اشوک نے دل میں سوچا ۔ اُس کی ممی حسب معمول چہٹر باکس بنی ہوئی تھی ۔ بات بات پر بولتی رہی ، ہنستی ہوئی ، چہکتی ہوئی ، نوکر کو حکم دیتی ہوئی ، اُس کے ڈیڈی کے کپڑوں میں نقص نکالتی ہوئی ، اور اُس کی یعنی اشوک کی ہر بات کی بلا وجہ تعریف کرتی ہوئی ۔

اشوک چپ چاپ اُس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے محسوس کیا اُس کے ڈیڈی بھی آج خلاف معمول بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہیں!

باپ بیٹا دونوں ایک عجیب سی خاموشی سے ناشتہ کرتے رہے۔ اشوک کے ڈیڈی نے ناشتہ جلدی ختم کر لیا۔ انھیں جانے کی جلدی تھی۔ انھوں نے بتایا اُن کے پارٹنر نے انہیں کسی ضروری کام کے لئے جلدی بلایا ہے۔ اس کی ممی نے اُن کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا اتنا ضرور کیا انھیں ناشتہ جلدی دے دیا۔ میز پر کوئی ڈش آئی تو پہلے انہی کی طرف بڑھا دی۔ اشوک کو اب بھی توقع تھی اُس کے ڈیڈی گھر سے جاتے جاتے اچانک پلٹ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اس کی ممی کو چیخ چیخ کر بتانے لگیں گے۔ "تمھاری وجہ سے آج میرے بزنس میں کتنا بڑا کرائسس پیدا ہو گیا ہے۔ ! میرا پارٹنر مجھ سے الگ ہو رہا ہے۔ کیا تم جانتی ہو؟"

لیکن اُس کے ڈیڈی نے واپس آنے کی کوئی علامت نہ دکھائی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا باہر چلا گیا۔ ایسے کار اسٹارٹ کرنے کی آواز آئی پھر کار ایک لمبی دہوک، چھوڑتی ہوئی چلی گئی۔ اشوک کو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر اس کی ممی مصنوعی غصّے سے بولی — "تمہیں ایگزام دینے نہیں جانا ہے؟ کتنی دیر سے ننھے بچوں کی طرح بیٹھے کیا کر رہے ہو! چلو اٹھو اب!"

اشوک کو ممی کی یہ ڈانٹ تیر کی طرح لگی۔ اُس کا چہرہ غصّے سے لال ہو اٹھا۔ اُس نے آگے پڑی ہوئی ایک پلیٹ اٹھا کر ممی کی طرف زور سے پھینکی۔ اس کی ممی جلدی سے ایک طرف ہٹ نہ گئی ہوتی تو پلیٹ اس کی ناک پر ہی جا لگتی۔ پلیٹ دیوار کے ساتھ ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اس کی ممی کتنی دیر تک حیرت سے اشوک کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بھی اپنی جگہ پر بیٹھا بیٹھا کانپتا رہا۔ اچانک وہ چیخ پڑی۔

"یہ پلیٹ تم نے پھینکی مجھ پر! تم نے! کیوں؟ اتنی ہمت تو تمہارے باپ کو بھی کبھی نہ ہوئی!"

وہ اُس کے کان اینٹھنے کے لئے آگے بڑھی تو اشوک ایک دوسری پلیٹ اٹھا کر کھڑا ہو گیا — "ممی! آگے ایک بھی قدم نہ بڑھانا! تمہاری بے جا دھونس میں ڈیڈی آ سکتے ہیں، میں نہیں آ سکتا!!"

جوگندر پال

بوڑھا جزیرہ

سمندر کے اس حصے میں بس یہی ایک چھوٹا سا تنہا جزیرہ ہے مٹی کا ایک نہایت قدیم تودہ گویا بنی نوع انسان کے پیر سال شعور کی قبر جو آبی ادوار کے مسلسل بہاؤ سے شاداب ہوتی رہتی ہے۔ اس قبر پہ میرے "انٹرنیشنل ہوم فار دی ایجڈ" کے بوڑھے۔ کھیلتے، ہنستے، روتے اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں ان بوڑھوں کا نوجوان باپ ہوں اور یہ میری خبر گیری میں پل پل کر بچے ہو رہے ہیں اور میں، بوڑھا۔

"جمی!"

"یس، ڈیڈی۔"

"آج پھر تم نے بالی سے جھگڑا کیا؟"

"ساری، ڈیڈی۔"

"نہیں، ساری واری سے کام نہیں چلے گا۔ جاؤ اپنے کمرے میں جا کر بائبل کے پہلے دو صفحے دو سو بار اونچی اونچی آواز میں پڑھو۔"

اس جزیرے میں میرے اور میرے ان بوڑھے بچوں کے علاوہ "انٹرنیشنل ہوم فار دی ایجڈ" کا ورکنگ اسٹاف بھی رہتا ہے۔ میرا اسٹاف غیر شادی شدہ خواتین پر مشتمل ہے۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے یہاں شادی شدہ جوڑے بس گئے تو ان کی ننھی منی اولاد کی موجودگی سے میرے ایجڈ چلڈرن جزیرے کے باہر کی دنیا کے بوڑھوں کی طرح نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو ہو کر اپنے ماضی کی طرف پلٹ جائیں گے۔ ہر دم وہیں پڑے رہیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے پل پل جئیں اور ان کے ذہنوں پہ ایک ہمہ وقت حالیہ کیفیت طاری رہے۔ جب زندگی کا تصور صرف اسی پل سے وابستہ ہو چکا ہو، تو عمر ابدی ہو جاتی ہے۔ انسان کی ابدی زندگی کا انحصار بیک وقت دو سانسوں کے بجائے حال کے صرف ایک سانس پر ہے۔ وہ سانس جو وہ بھر رہا ہو۔ یوں نہ ہوتا تو فطرت اس کے نئے جنم پر پرانے جنم کی یاد نہ چھین لیتی۔ میرے یہ سبھی بوڑھے اس لئے تو عمر گئے ہیں کہ میں نے انہیں یادوں کی قید سے بچا لیا ہے۔ انہیں دیکھ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ کہنہ عمری کی علامت بڑھاپا نہیں، کہنہ عمری کا شکار وہ ہوتا ہے

جو اپنے آپ کو کہنہ یادوں کے جراثیم سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ یہ موذی جراثیم آدمی کے حال کو چاٹ جاتے ہیں اور اس کے دل و دماغ میں قطار در قطار رینگ رینگ کر جا بجا سوراخ کر کر کے گھٹا ٹوپ نہاں خانوں میں جا نکلتے ہیں۔ آدمی بے چارہ اپنی آنکھیں بند کئے ان نہاں خانوں میں پڑا رہتا ہے، اور اس تاریک کائنات کا عادی ہو ہو کر باہر کی روشنی اسے اذیت کن معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہی کہنہ عمری ہے۔ میرے بوڑھے اس لئے کہنہ عمر نہیں کہ اُن کے ذہنوں سے اپنی گذشتہ عمریں محو ہیں۔ وہ یوں کہ وہ زمانہ حال کے باہر قدم ہی نہیں دھرتے۔ جو لمحۂ 'اب' اسی وقت ہے بس وہی ہے۔ اس کے آگے کچھ ہے ہی نہیں۔ اور مستقبل عدم وجود ہو تو ماضی از خود اوجھل ہو جاتا ہے۔۔۔

کلاس کا بلّی نوّے برس کا ہونے کو آ رہا ہے۔ اس کے گذشتہ برتھ ڈے پہ اس کی نوجوان پوتی اتنا لمبا سفر طے کر کے اس سے ملنے آئی۔ کوئی بیس برس بعد دادا پوتی کی ملاقات ہو رہی تھی۔

"گرین پا!" نوجوان پوتی اپنے گیلے گیلے گہرے جذبے کی اوٹ میں اس طرح نظر آ رہی تھی جیسے بادلوں کے پیچھے بوڑھا آسمان۔

"ہائی ـــ!" بوڑھے بلّی کی آنکھوں میں مطلع بالکل صاف تھا۔ کسی بچے کے چہرے کا ایک خوشگوار خالی پن اور بس۔

لڑکی نے چپکے سے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک گڑیا نکال کر اپنے گرین پا کے سامنے رکھ دی جو بلّی نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر اپنی پوتی کو اس کی آٹھویں سالگرہ پر دی تھی۔

"گڑیا! ـــ گڑ ـــ یا ـــ!" بوڑھے کو شاید کچھ یاد آ رہا تھا لیکن نہیں۔

"یہ گڑیا بہت اچھی ہے ـــ" اس نے گڑیا کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر نگاہ اس پر جمائی ـــ "بہت اچھی! ـــ تم بھی جب ننھی سی ہوگی تو ایسی ہی لگتی ہوگی ـــ"

میں چونک پڑا۔ شاید کہنہ یادوں کے جراثیم بند چھتوں اور دیواروں میں سوراخ کرنے لگے ہیں، لیکن نہیں۔ اس نے اپنی پوتی کی طرف سرسری نظر سے دیکھا اور پھر جی بھر کر گڑیا کی جانب دیکھنے لگا۔

لڑکی نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"میں میگی ہوں گرین پا، میگی، تمہاری پوتی"

"ہاں، تم میری پوتی ہو" گویا بلّی اس پر ترس کھا رہا تھا کہ شاید کوئی یتیم لڑکی ہے "اور جانتی ہو یہ کون ہے؟" اس نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا: "تمہارا ڈی اَل گرین پا، ہم سب کا ڈی اَل گرین پا"

لڑکی کے آنسو نہ تھم پائے۔

"ارے! رونے لگی؟ ـــ یہ لو اپنی گڑیا۔ میں نے یہ تھوڑی ہی کہا تھا کہ لوٹاؤں گا نہیں۔ اچھی ہے پر تمہاری ہے ـــ"

چھت کہن سے ٹپ ٹپ پانی گر رہا تھا اور بوڑھا بلّی بچوں کی طرح بارش میں کھیل رہا تھا، اور بارش سے

غافل تھا۔

یہ تو ماضی بعید سے بے خبری کا قصہ ہوا۔ اپنا پچھتر سالہ شوشو ہر لحظہ کسی نئی لڑکی سے معاشقہ شروع کرکے بڑی معصومیت سے گاڈ آل مائٹی کو اپنا ضامن بنا لیتا ہے کہ اپنی محبت تا قیامت نبھائے گا۔ اُس کے محبت کے حلف میں سو فی صد خلوص کارفرما ہوتا ہے پر اس کا کیا کیا جائے کہ وہ بڑے خلوص سے اپنا ہر حلفیہ بیان بھول جاتا ہے، اور لحظہ لحظہ ایک نئی قیامت پھر دم توڑ کر اس کی محبت ایک نیا جنم لیتی ہے، سدا بہار رہتی ہے۔ اُسے دیکھ کر مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ خود فراموش لمحاتی محبتوں کے چھوٹے چھوٹے جذبے دائمی اور دانستہ محبت کی یک نوعی طوالت سے زیادہ گنجان اور سرسبز مناظر پیش کرتے ہیں۔ دائمی محبت دراصل عشق کی ابتدائی عادتوں میں سے ہے۔ ہمارے شوشو نے بھی اپنی جوانی میں ایسی ہی خام عادت کے تحت اپنے کسی محبوب سے دائمی محبت کے پیمان باندھے ہوں گے مگر اب جب کہ محبت کی خواہش کی نس نس میں رچ بس کر اُس کی نیچر بن چکی ہے تو اس البیلے بوڑھے کو عالم خود فراموشی میں ہر پیارا چہرہ محبوب کا چہرا معلوم ہوتا ہے۔

"قسم ہے مجھے آل مائٹی گاڈ کی، اونیکا،" ایک بار وہ اپنے کمرے کے سامنے چنبیلی کے پودوں کو سینچ رہا تھا اور کسی افریقی فرمانروا کی معمر حبشی ماں سے مخاطب تھا، "میں اس جزیرے کی کالی مٹی کو اس لئے سیراب کرتا رہتا ہوں کہ تمہارے کالے کالے زرخیز جسم پر مجھے چنبیلی کے مہک آور سفید پھول اُگے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"مجھے کالا رنگ بڑا پیارا لگتا ہے اونیکا کیونکہ تم کالی ہو۔"

"پتھر گیلے ہو کر بھی پانی کو اپنے اوپر نہیں ٹھہرنے دیتے۔ مگر کبھی کبھی کالی مٹی دریاؤں کا پانی پی کر بھی پیاسی رہتی ہے۔" اُونیکا شوشو کی جانب بڑھنے لگی۔

سمندر کا بوڑھا باطن اپنی خواہشات سے، اپنے پانی سے لبالب بھر کر اپنے آپ سے باہر نکل رہا تھا اور جزیرے کے کناروں کی طرف جا رہا تھا، اور کنارے اپنی تکمیل خواہش کے قرب کی تاب نہ لا کر بوکھلا کر پرے ہوتے جا رہے تھے، اپنے مقام پر کھڑے کھڑے دور دور تک پھیل گئے تھے، اور یہ خشک وسعتیں سیراب ہو رہی تھیں، اور وہ —— وہاں گیلی گیلی ریت پر دو مسن کیکڑے ایک دوسرے سے جڑ رہے تھے اور جڑ جڑ کر ایک دوسرے کو اپنی اپنی زندگی دے رہے تھے اور ایک لمحے کی صحبت میں زندگیاں بدل کر انہوں نے ایک ایک صدی کی عمر بڑھا لی تھی، —— اور ابھی کوئی سمندری لہر انہیں علیٰحدہ کر کے جانے کہاں سے کہاں بہا لے جائے گی۔

شوشو کی محبت کے فطری اظہار کو کسی متمدن، کوتاہ پیمانے سے ناپنا ایسے ہی ہے جیسے یہ اعتراض کہ ہم نے اپنے جزیرے کے پہاڑوں پر ٹیبل کلاتھ کیوں نہیں بچھا رکھے۔ ہمارے جزیرے کی ہر عورت شوشو کی محبوبہ ہے کیونکہ شوشو صرف اسی عورت سے متعلق سوچتا ہے جسے وہ دیکھ رہا ہو اور جسے وہ نہ دیکھ رہا ہو، وہ عورت اس کے ذہن سے یکسر غائب ہوتی ہے۔ جس طرح کینیوں کی خوشی کا مدار اس پر ہوتا ہے کہ فلاں شے مہیا ہو، اسی طرح کینیوں کا اس پر کہ فلاں شے میسر نہیں۔ شوشو اور جزیرے کے دیگر بوڑھوں کی مسرت کا باعث یہ ہے کہ ان کا

حافظہ جواب دے چکا ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ وہ سب وہاں کیونکر آ گئے ہیں پر یہ حقیقت کہ فی الوقت وہ سب وہاں ہیں اُن کے دلی اطمینان کا سامان پیدا کرتی ہے۔

اس جزیرے کے باہر کے لوگ اس لئے حافظے کے محتاج ہیں کہ اُن کی دنیا اُن کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ اپنے حافظے پہ زور ڈال ڈال کر جینے کے سوا انہیں چارہ نہیں۔ ان کے دماغ ہر دم حافظے سے لوڈڈ رہتے ہیں اور جب وہ تھک جاتے ہیں تو خواب آور گولیاں کھا کھا اپنے آپ کو ذرا سا اَن لوڈ کر لیتے ہیں تاکہ بندوق اس تناؤ سے کبھی از خود نہ چل جائے —— اور آخر اُن کی بندوقیں بے کار ہو جاتی ہیں تو ان کے بیٹے بیٹیاں اور پوتے پوتیاں سنگینیں لئے اُن کے محاذ سنبھال لیتے ہیں اور انہیں غیر مسلح کر دیا جاتا ہے۔

مجھے کئی بار محسوس ہوتا ہے کہ اس جزیرے کے آگے کہیں لڑائی کا میدان ہے اور ساری دنیا اپنے تباہ کن، خود کار ہتھیاروں سے گھمسان کی لڑائی لڑ رہی ہے۔ کئی مر کھپ جاتے ہیں، کئی بدستور لڑتے رہتے ہیں اور جو لڑنے کے قابل نہیں رہتے اُن کے ہتھیار اور ذہن وہیں اتروا کر انہیں یہاں میرے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔

اس جزیرے کا نام بوڑھا جزیرہ ہے۔ حالانکہ یہاں پہونچ کر سب سے پہلے یہی خیال جی میں آتا ہے کہ نیچر یہاں کتنی جوان اور بیباک ہے۔ یہاں کا انسان اپنی پہچان کے علیحدہ نشانات پر مصر نہیں، نیچر ہی اس کی پہچان ہے، نیچر ہی اس کی حفاظت کرتی ہے، لہٰذا وہ غیر مسلح ہے اور بذاتِ خود بے ذہن، یعنی نیچر کے بڑے ذہن کا ایک مائکروسکوپک آلہ۔ وہ اپنی زندگی سے بے حد خوش ہے لیکن ایک لمحے سے بھی کم نوٹس پر اپنی جان دینے پر تیار رہو جاتا ہے۔

اس وقت درحقیقت میں اس اطالوی موسیقار کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ستر برس کی عمر میں ماروِنی جب یہاں رہائش کے لئے آیا تو اس کا میوزک ساری دنیا بجا رہی تھی۔ اپنی آمد پر وہ اپنی شہرت سے بہت تھکا ہوا نظر آتا تھا۔

"نئے نئے گراموفون ریکارڈ کی طرح کبھی میرا وجود تازہ دم آواز سے بھرا ہوا تھا" اُس نے ہمیں بتایا تھا "مگر کئی سال متواتر بج بج کر اب میں اپنی آواز سے خالی ہو گیا ہوں"۔ اس کی مضمحل آواز یوں ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی جیسے کُند سوئی سے گھر گھرنے سے پیدا ہو رہی ہو۔" اب میں کبھی نہیں گاؤں گا۔ ساری عمر گا گا کر مجھے معلوم ہوا ہے کہ جو سب سے زیادہ سنتا ہے وہ سب سے اچھا گاتا ہے۔ کسی بڑے موسیقار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ گلے ضرور، صرف یہ ہے کہ وہ سننے کا اہل ہو۔ سُن سُن کر اسے محسوس ہو کہ گانے والا جو کچھ گا رہا ہے وہ اسی آواز میں اپنے باطن کو گا رہا ہے، منہ سے گانے کے بجائے اپنے سارے وجود سے"۔

"تو پھر میں تم سے بڑی موسیقار ہوں میسیو۔ تمہیں سن سن کر مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا ہے"۔

"ہاں تم مجھ سے بڑی موسیقار ہو" مارونی نے آگے بڑھ کر میری تیس سالہ اسٹاف سکریٹری مس ہرلشیا کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "اسی لئے میں ساری دنیا تج کر تمہارے پاس چلا آیا ہوں"۔

"چل ہٹے" ہرلشیا اُس کے ہاتھ اپنی طرف کھینچ کر ہنسنے لگی، اور وہ بھی، اور لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے

کی اپنی ملاقات سے پہلے ہی جانتے تھے۔

اپنی شہرت اور شخصیت کو سرنڈر کر کے مارونی کا خالی خالی دیدہ زیب وجود بڑے پیار سے سہج سہج بڑھنے لگا۔ وہ ہر روز ہرلیشیا کے ساتھ جزیرے میں کسی طرف نکل جاتا اور جب وہ لوٹ رہے ہوتے تو دور سے ہرلیشیا کے بلند بانگ قہقہوں کی صدائیں کے آگے آگے دوڑ کر ہمارے کانوں تک پہنچتیں اور اس کے پیچھے پیچھے مارونی کے قہقہے بھی اور پھر وہ خود دونوں، آگے آگے ہرلیشیا اور ذرا پیچھے مارونی ۔ اور ہم سب اُن کی طرف تکنے لگتے۔

"کیا تم ہم دونوں کو عاشق سمجھتے ہو؟" مارونی کی بے ہتھیار سچائی ہمیں بڑی بھلی لگتی "سچ تو یہ ہے، جب میں ہرلیشیا کے ساتھ باہر نکلتا ہوں تو میری نیت سدا بری ہوتی ہے"

ہرلیشیا ہنس دیتی اور ہم سے پوچھتی "کیا تمہیں یقین آسکتا ہے، میرے اس اولڈ مین میں بدمعاشی کے کوئی جراثیم بچے رہ گئے ہوں گے؟"

"ہرلیشیا ٹھیک کہتی ہے۔ جب میں تھکا ماندہ اس کے ساتھ لوٹ رہا ہوتا ہوں تو اس کی انرجی محسوس کر کے مجھے معلوم ہوتا ہے وہ میرے کسی دوست کی بیٹی ہے ۔۔۔ "

"یو ڈیئر!" ہرلیشیا آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیتی اور مارونی کے اچھے الفاظ اُس کے حلق میں پھنس جاتے "میرا کئی بار جی چاہتا ہے مارونی، تم سے شادی کر لوں ۔۔۔ " وہ جلدی جلدی میری طرف منہ کر کے اپنی اپالوجی پیش کرتی "آئی ایم ساری! ۔۔۔ اور فوراً اس کی جانب متوجہ ہو جاتی ۔۔۔ " اور شادی کے بعد اپنا سارا وقت تمہاری نگہداشت میں بتا دوں "

اگرچہ ہمارے ہاں شادی کے حادثوں کے وقوع پذیر ہونے کا امکان نہ تھا ۔۔۔ میرے سوا سبھی مرد بوڑھے ہیں اور باقی سب عورتیں ۔۔۔ تاہم ہرلیشیا اور مارونی کی یہ غیر معمولی وابستگی جزیرے کے دوسرے مرد و زن میں ترجیحوں کے اسباب پیدا کر سکتی تھی۔ انہی ترجیحوں سے ہی ابتدائی سماج میں ازدواج کی الجھن نے جڑ پکڑی ہوگی جس سے ہوتے ہوتے آج سارا جہان ایک دشوار گذار جنگل کا سماں پیش کرنے لگا ہے۔ اس موضوع پر میرے خیالات واضح اور دوٹوک ہیں۔ الجھی ازدواج بھی مشرقی ممالک کے پنج سالہ پلانوں کے مانند ان گنت اضافی مسائل کا باعث ہوتی ہے اور ان پیچیدہ مسائل سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اسٹینڈرڈ امپورٹ کو شادیوں کی لوکل پروڈکشن پر ترجیح دی جائے تاکہ اس چھوٹے سے جزیرے کی وسعت قائم رہے اور اس کے کھلے ماحول میں میرے بوڑھے دوست اپنی مشترک زندگی بڑے چین سے گذاریں۔ یہاں تنہا آئیں اور آ کر پہلے اپنے گنجان آباد ماضی کی بھیڑ بھاڑ کو جزیرے کے آس پاس کے گہرے پانیوں میں غرق کر دیں اور ان اجنبی نشانات سے مانوس ہو کر انہیں علم ہو کہ ان کی نئی زندگی کا بچپن شروع ہو رہا ہے۔ میں اپنے بوڑھے دوستوں کو موت کے خوف سے آزاد کر کے ان کے بڑھاپے کو ماں کا ایک خوش گوار تجربہ بنانا چاہتا ہوں۔ اُن کی انفرادی بے بسی کو جوڑ جوڑ کر اس قابل بنانا چاہتا ہوں کہ اس اشتراک سے وہ اپنی زندگی پھر تا در ہو جائیں۔ جوانی کے بیلی قدم اور تند جنسی حملوں سے پناہ لے کر ہلکی پھلکی بے فرد، بے جنس معاشرت کے عادی ہو جائیں

اور یوں احساسِ کمتری کا شکار ہونے سے بچے رہیں۔ اس لئے ازدواج کی اکثر میرے یہاں میں فٹ نہیں ہوتی۔ بچوں کی لوکل پروڈکشن سے بوڑھے جزیرے میں تو دوسے ٹریفک شروع ہو جائے گی لیکن بوڑھا جزیرہ صرف باہر جانے کا راستہ ہے یہاں سے اندر کی طرف سب راستے بند ہیں۔ ڈبل ٹریفک سے مقامی ٹریفک میں ابتری پیدا ہو جائے گی۔ نہیں نہیں اس لاقانونیت کا دور دورہ نہیں ہونے دوں گا۔

تاہم میرا خیال ہے کہ ہرلیشیا اور مارونی کے ایک دوسرے سے ترتیبی رویے میں ان جان پہچان سا ہے جو لاقانونیت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہرلیشیا ذرا منہ زور ہے اور بس' اور مارونی؟ پہلے بوسوں سے ہاکا ترمیش کے بجائے تقدس کا تصور بندھتا ہے۔ بوڑھا عاشق کسی جوان عورت سے عشق بھی کر رہا ہو تو دراصل اس سے نری شفقت سے ہی پیش آتا ہے۔ لیکن ہرلیشیا سے مارونی کا پیہم ذکر سن سن کر مجھے عجیب و غریب خیالات ستانے لگے۔ مثلاً یہ کہ ——

خیر چھوڑیئے۔

اب وہ مجھ سے کہہ رہی ہوتی۔

مارونی اتنا بڑا موسیقار ہے کہ موسیقار لگتا ہی نہیں۔"

میری متانت یونہی ذرا سی چڑھ جاتی۔

("کیا لگتا ہے؟")

اور اب!

"آج مارونی نے اپنی باتوں سے گھنٹوں بور کیا، پر میں سوچتی ہوں، وہ مجھے بور نہ کرے تو میں بور ہو ہو جاؤں ——"

عورت کی ٹیڑھی میڑھی چاہ کی وہی سیدھی لکیر!

اور اب:

"مارونی نے ——"

مارونی:

مارونی سے متعلق ڈاکٹر کی رائے ٹھیک نہ تھی، کسی دن بھی اس کی روانگی ہو جائے گی۔ وہ چلا گیا تو ہرلیشیا کہاں جائے گی ——؟ —— پیچھے؟ روما شہر میں، جہاں مارونی کے پوتے پوتیاں رہتے ہیں؟ مگر یہاں سے پیچھے جانے کے تو سب راستے بند ہیں۔

"ہرلیشیا ڈیئر، ہر ایک سے محبت کرو"

("تم سے بھی؟")

"ہر ایک سے محبت کرو" میں اُسے کیوں سمجھا رہا تھا؟ —— تاکہ کچھ مر جائیں تو دوسروں میں اپنی محبت کا وہی جذبہ پا کر بھی سب لوگ بدستور زندہ معلوم ہوں"

کبھی کبھی وہ میری بات کو اس قدر توجہ سے سنتی جیسے اپنی سماعت اور میری گویائی کو گلے ملتے دیکھ رہی ہو۔
"باہر جو تمہیں یہ کائنات نظر آرہی ہے ہریشیا، یہ دراصل تمہارے ہی ذہن سے منعکس ہے، تمہاری ہی ملکیت ہے۔ باہر کی اس کائنات میں اپنی دو آنکھوں سے جو جو کچھ دیکھ رہی ہو وہ تمہارا اپنا ہی ہے۔ وہ ——— وہ ——— وہ ——— سب تمہارے ہیں، اپنی ساری ملکیت کو بیک نظر دیکھو، ہر ایک سے محبت کرو ———"
وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور مجھے سن رہی تھی، مگر دراصل وہ مجھے سن نہیں رہی تھی، سماعت اور گویائی کے متوازن کونوں کے جڑنے کا کھیل دیکھنے میں مگن تھی۔
"میں کیا کہہ رہا ہوں ہریشیا؟"
وہ ہنس دی، گویا میں نے اسے کوئی چٹکلہ سنایا ہو۔
"قسم ہے آل مائیٹی گاڈ کی، ہریشیا" شوشو حسب معمول دفعتاً کہیں سے آ نکلا: "تمہیں یوں کھل کھلا کر ہنستا پا کر میری وہ ساری بھرپور بینائی لوٹ آئی ہے جو میں اپنی ماں کے پیٹ سے لایا تھا۔" وہ صوفے پر ہریشیا کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر گویا ہوا: "تم بڑی پیاری ہو ہریشیا۔ قسم ہے آل مائیٹی کی، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"
ہریشیا نے اسے بازوؤں میں لے کر منہ اس کی طرف جھکا دیا۔
"قسم ہے آل مائیٹی کی ———"
میں انہیں تنہا چھوڑ کے کمرے سے باہر آ گیا۔
باہر مغربی افق پر سورج غروب ہو رہا تھا اور ڈوب جانے سے ذرا پہلے شفق کی سرخی سے اس کے سارے دن کا بڑھاپا شگفتہ اور جواں سال لگ رہا تھا۔ اور اپنی موت سے بغل گیر ہو ہو کر اس کا سراپا نینوں کی گہرائی میں فی الفور جا رہا تھا، اور موت کا یہ منظر سمندر کی سطح پر زندگی کی بڑی پیاری، رنگ برنگی متحرک شکلیں بنا رہا تھا اور مچھلیوں کے ڈھیر تہوں سے ابھر آئے تھے اور زندگی کا میلہ لگا ہوا تھا۔
کمرے سے ماروتی کے کسی گراموفون ریکارڈ کی آواز آنے لگی ———
ٹک ٹک! یہ ہریشیا کے پیروں کی آواز ہے۔
ٹ ٹ! یہ آواز شوشو کی ہے۔
ماروتی کے گراموفون ریکارڈ پر دونوں ڈانس کر رہے ہیں۔ موت ہنس رہی ہے، زندگی ہنس رہی ہے، اور ہنس ہنس کر دونوں گلے مل رہے ہیں۔ شفق کے رنگ شگفتہ و دلفریب ہیں!
"ٹک ٹ! ——— ٹک ٹ! ———!"
ہریشیا کے ساتھ شوشو ناچ رہا ہے اور مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ شوشو کے بجائے میں ناچ رہا ہوں ——— پیروں کے دو جوڑے، دو دو پیروں کے ایک جوڑے کے مانند رقص رہے ہیں۔ میں کھڑے کھڑے ناچ رہا ہوں ——— ناچ ——— ناچ ——— میں تھک گیا ہوں۔ اب مجھے سو جانا چاہیے۔ سویا پڑا رہنا چاہیے، باہر کی کائنات دور دور پھیل

رہی ہے اور میں اپنے وجود کے اندر کھڑا محسوس کر رہا ہوں کہ میں اس ساری کائنات میں ہوں۔ میں سو گیا ہوں، اور عالم خواب میں جاگ رہا ہوں ـــ سورج ڈوب رہا ہے، ابھی ڈوب جائے گا ـــ میں جاگ رہا ہوں۔ مجھے رات کا انتظار ہے۔

اور ـــ

اُسی رات ڈنر ٹیبل پر مارونی پر ہنستے بولتے دل کا شدید دورہ پڑا، اور وہ ہمارے دیکھتے دیکھتے چل بسا۔ ہم چپ چاپ بیٹھے تھے اور باہر سے بحری پنچھیوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور معلوم ہو رہا تھا کہ مارونی کی کشتی کہیں جا رہی ہے اور پرانہماک شوق میں وہ ہمیں، گڈبائی، کہنا بھی بھول گیا ہے۔

پھر ہم اپنے بوڑھے جزیرے کے ڈیتھ ہال میں بیٹھے تھے اور سب بوڑھے ہرلیشیا کی طرف بار بار ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ گویا مارونی کا جانا اتنا المناک نہ ہو جتنا ہرلیشیا کا رہ جانا۔ میں اُس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اور بڑی نرمی سے اس کی گردن کے نیچے پیٹھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس کے بالوں میں اپنی چھپی چھپی انگلیاں دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ سمندر کے ٹھہرے ٹھہرے پانی میں کوئی حرکت سکون پذیر ہے۔

"نہیں ـ"

ہرلیشیا کا کھلنڈرا پن گویا اپنا گھر بھول کر کھیلتے کھیلتے اداسی کی بھول بھلیوں میں آ نکلا ہو۔

"مارونی چلا گیا ہے تو کیا؟ ـــ کیا؟"

اُس نے شوشو کی جانب دیکھا، جمی اور بابی کی جانب، پھر یک نظر سب بوڑھوں کی جانب۔

"تم سب جو ہو۔ تم سب میرے مارونی ہو ـــ"

اُس کا کھلنڈرا پن رو رہا تھا، جیسے سمندر پر پھوار ہو رہی ہو، اور پتہ نہ چلے۔

میں نے اُسے شانوں سے تھام کر اٹھایا اور بیڈ روم میں لے آیا۔

"ہرلیشیا ـــ!"

اُسے بستر پر بٹھا کر میں بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"ہرلیشیا ـــ!"

مجھے دراصل اُس سے کچھ بھی نہیں کہنا تھا، جانے میں اُسے کیوں بلا رہا تھا۔

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ مجھے مارونی کے جانے کا غم نہیں ـــ نہیں! غم ہے ـــ ہے!" وہ بیڈ روم کی خاموشی کو دھیرے دھیرے رو رو کر بھرنے لگی۔

اور میں اُس کے پاس بیٹھا تھا، پیاسا، اور چاہتا تھا کہ پانی کی دھار پھوٹ پڑے، مگر پانی یوں گر رہا تھا ـــ ٹپ ـــ ٹپ ـــ ٹ ـــ!

"میں کیوں رو رہی ہوں؟ ـــ شوشو اور جمی اور سب دوسرے بھی تو ہیں ـــ یہ بھی تو مارونی ہی ہیں ـــ مارونی کی طرح انہیں بھی جھریوں نے بے نقش بنا دیا ہے ـــ بے نقش اور بے ذات۔" ٹپ ٹپ رُکنے لگی ـــ

سب بوڑھے ایک سے لگتے ہیں، بڑے پشتے ماروفی۔ ہے نا؟"

"ہاں۔"

میں نے اپنا دایاں بازو اُس کے بائیں کندھے اور گردن پر پھیلا دیا۔

"ماروفی!" ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کا پٹ ذرا کھڑکھڑایا تو وہ اُس کی جانب دیکھنے لگی — "ماروفی آئی ہے، اتنی دور جا کر لوٹ آئی ہے، مجھ سے "گڈبائی!" کہنے!—"

"گڈبائی!" اُس نے ہلتے ہوئے پٹ کی طرف دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلایا — "گڈبائی!— ماروفی جا رہی ہے—" وہ میری طرف دیکھنے لگی، "چلا گیا ہے!"

"ماروفی اور تم—"

"ماروفی اور میں ہمیشہ تمہاری باتیں کیا کرتے تھے۔"

"میری باتیں؟"

"ہاں، میں نے ہمیشہ اُس پر بھروسہ کیا، اور بھروسہ کر کے میرے ارادے کو ہمیشہ تقویت ملی —— مگر تمہارے سامنے آکر —— تمہیں دیکھ کر میرا ارادہ ساتھ چھوڑ دیتا — تم — تم سب سے بوڑھے ہو۔ ماروفی شوشو — سب سے بوڑھے۔ اگر میں چاہتی تو ماروفی جھٹ آمادہ ہو جاتا، اس کی جھرّیوں سے اس کے چہرے کے نقوش از سرِ نو برآمد ہو جاتے، جیسے سمندر میں طوفان آئے اور کوئی ڈوبی ہوئی بستی اُبھر آئے —— میں نے کئی بار سوچا بھی، کہ تمہارا خیال چھوڑ کر—"

"کیا — ؟"

"ہاں، مجھے تم سے محبت ہے!" اُس نے میری جانب دیکھا۔

اور میں مڑ کر اپنے آپ کو اپنے پیچھے دیکھنے لگا۔

"مگر کیا فائدہ؟ — تم ماروفی سے بھی زیادہ بوڑھے ہو۔"

"ہاں ہرلیشیا، میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھو — چہرے کے اندر۔" میں اُس کے عین سامنے کھڑا ہو گیا، وہ بھی کھڑی ہو گئی اور میرے چہرے پر ٹکٹکی باندھ لی۔

"غور سے دیکھو ہرلیشیا!"

اُس کی ٹکٹکی میں خوف اور تحیّر کی آمیزش ہونے لگی۔

"میں بہت بوڑھا ہوں ہرلیشیا —— جتنا شگفتہ نظر آتا ہوں، اُس سے بھی زیادہ بوڑھا —— اور میری عمر بے حساب ہے۔"

وہ بدستور میری طرف گھور رہی تھی اور اس کی نظر میں پھیلے ہوئے تحیّر اور خوف مرکز میں سمٹ سمٹ کر گاڑھے ہو رہے تھے۔

"تم — ؟ — کیا — ک — ؟!"

(باقی صفحہ ۲۷۳ پر)

جیلانی بانو

اسکوٹر والا

اکیلے گھر میں عابدہ کو ہر طرف پُراسرار سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں۔

منّے کو کاندھے سے لگائے ٹہلتے ہیں وہ جانے کیا کیا سوچا کرتی تھی۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ سامنے دیوار پر بیٹھی ہوئی چڑیا بن جائے اور دیکھے کہ دوسرے گھر میں وائیلن پر کون گیت گا رہا ہے؟ کبھی اسے خیال آتا کہ اگر وہ منّے کی طرح ایک ان کا بچہ بن کر پھر سے زندگی شروع کرے تو کیا بنے گی —؟

اب وہ سسرال کا بھرا پرا گھر چھوڑ کر پہلی بار الگ ہوئی تھی تو تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑتی۔ مگر اپنے شوہر اور اپنے بچے کے ساتھ گھر بسانے کا جو چاؤ تھا وہ پورا ہوا اور اسے سسرال کے گھر میں یہ وہم بھی ہو گیا تھا کہ اس کی جٹھانی جلن کے مارے کہیں منّے کو زہر ہی نہ دیدے۔

نئے گھر میں ابھی تک کوئی نوکر نہ ملا تھا۔ اور منّا بھی ۔۔۔۔ اتنا چھوٹا سا تھا کہ وہ گھر کا کام کاج نہیں کر پاتی تھی۔

یہی سب باتیں سوچتے سوچتے عابدہ نے منّے کو سلا دیا۔

آج وہ بہت تھک گئی تھی۔ طویل بخار کے بعد کمزوری اور کھانسی کی وجہ سے منّا دن کو چین سے سوتا تھا نہ رات کو۔

محسن کو آفس جانے سے پہلے منّے کو سنبھالنا پڑتا تھا تب عابدہ ناشتہ تیار کرتی۔ محسن آفس چلا جاتا تو عابدہ منّے کو سلا دیتی اور سوچتی تھی کہ اتنے بہت سے کاموں سے کیا نبٹا جائے!

آج بھی وہ منّے کو سلا کے بیٹھی یہی سوچتی رہی۔

کھانا پکانا تھا۔ منّے کے کپڑے دھونا تھے۔ گھر کی صفائی — اور — اور جانے کتنے کام تھے — باتھ روم میں جا کر اس نے بھیگے کپڑوں کا بیسن اٹھایا تھا کہ سڑک پر کوئی اسکوٹر والا شور مچاتا تیزی سے گزر گیا اور منّا پھر آنکھیں کھول کر رونے لگا۔

"اوہنہ — نہ جانے کون منحوس تھا۔ سوتے بچے کو جگا گیا۔" وہ پھر بچے کو کاندھے سے لگا کے ٹہلنے لگی۔ اس کی ساس ٹھیک ہی تو کہتی تھی کہ اتنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ الگ گھر میں رہنا بڑا مشکل کام ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد منّے کو پھر سلا کے وہ کچن میں بھاگی کہ پہلے کھانا تیار کرلے

ایک بجے تک بہت سے کام ہو چکے تھے، عابدہ کا جی چاہا کہ اسے بھی کہیں سے ایک اسکوٹر مل جائے تو وہ اس اسکوٹر والے کا تعاقب کر کے خوب زد... بالکل فلمی ہیروؤں والی لڑائی ہو۔ سارے لوگ سڑک چھوڑ کے اس کی کھڑکیوں کے نیچے سے کیوں گزرتے ہیں۔ عجیب فضول محلہ ہے یہ۔ عابدہ کی سسرال والا گھر بڑے پُرسکون محلے میں تھا۔ منا وہیں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے ذرا سا بھی شور برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر عابدہ کے اس گھر کی ہر کھڑکی سڑک پر کھلتی تھی۔ اور سڑک بھی اتنی تپلی سی تھی کہ سارے پھیری والے عابدہ کی کھڑکیوں میں منہ اڑا کے صدا لگاتے تھے۔

دو دن میں عابدہ اس محلے میں اتنی ہی واقف ہو گئی تھی کہ ٹھیک دس بجتے ہی پھیری والے آنا شروع ہو جاتے ہیں —۔ سبزی والا ایک بجے آتا ہے۔ تین چار فقیر نو سے گیارہ بجے تک آتے ہیں۔ لیکن ایک نہایت چیختی آواز والا فقیر رات کو ٹھیک اس وقت آتا ہے جب منا ہزار نخروں کے بعد سو جائے۔

ادھر اسکوٹر والے نے الگ جان کھا لی تھی۔ صبح دس بجے جب منا سوتا تھا تو وہ جگا کے چلا جاتا۔ دوپہر میں منے کو سلا کے جب عابدہ خود بھی سونے کی کوشش کرتی تھی تب بھی وہی اسکوٹر پھر دندناتا ہوا آ جاتا تھا۔ اسکوٹر چلنے اور رکنے کی آواز سے عابدہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ عابدہ کے گھر سے دو تین مکان آگے جا کر رک جاتا تھا یعنی وہ عابدہ کا کوئی پڑوسی ہے جو اتنی پابندی سے اسے ستانے پر تلا ہوا ہے۔ منے کو دوبارہ تھپکنے میں عابدہ کے دماغ پر خواہ مخواہ وہ اسکوٹر والا سوار ہو جاتا تھا بیچارہ اپنے آپ کو بڑا ہیرو سمجھتا ہو گا جو یوں چیختا چلاتا ہوا آتا ہے۔ مگر بڑا ندیدہ ہے ایک بجتے ہی کھانے کے لئے بھاگا بھاگا ہوا گھر آتا ہے۔ جانے کون آفس ہے جو گھر جانے کی چھٹی مل جاتی ہے۔ یہاں تو منا کتنا ہی بیمار ہو لیکن محسن وقت سے پہلے گھر نہیں آ سکتے مگر وہ اسکوٹر والے نواب صاحب واپس ہوتے ہیں کبھی دو بجے۔ کبھی ڈھائی بجے ممکن ہے کھانے کے بعد قیلولہ بھی کرتے ہوں۔ شاید نئی نئی شادی ہوئی ہے جبھی تو بیوی کے دیدار کے لئے یوں طوفانی اسپیڈ سے بھاگے ہوئے آتے ہیں۔

شادی کے بعد شروع دنوں میں محسن بھی تو پانچ کے بجائے چار بجے ہی آ جاتے تھے۔ لیکن منا کیا ہوا کہ سارا رومانس ہی ختم ہو گیا۔ اب دن نکلے تو وہ، دونوں منے کی شرارتوں میں کھو جاتے۔ رات ہوتی تو منے کو سلانے جگانے کی مصروفیت ہوتی۔ صبح آفس جانے سے پہلے محسن کو تیار ہونے میں دو ایک گھنٹے لگ جاتے تھے۔ اس لئے عابدہ کی طرف توجہ دینے کا وقت ہی نہ ملتا تھا اور وہ منے کو ٹاٹا کر کے گھر سے نکل جاتا تھا۔

مگر اسکوٹر والے کی بیوی اسے بار بار روکتی ہو گی کہ ابھی تو صرف دو بجے ہیں ابھی سے آفس جا کر کیا کرو گے ———
والبتہ چھٹی کے دن بڑا امن رہتا تھا۔ وہ کمبخت اسکوٹر والا نئی نویلی دلہن کو گھر میں چھوڑ کر بھلا کیوں جانے لگا باہر ——!
اللہ کرے کم بخت کے چھ سات بچے ہو جائیں۔ تب پتہ چلے یوں شور مچانے کا۔

جانے کیوں وہ اسکوٹر والا دن رات عابدہ کے ذہن پر سوار رہنے لگا تھا۔ اسکوٹر والے کی ایک خوبصورت سی شوخ و شنگ دلہن عابدہ کی نظروں میں بس گئی تھی گہرا گہرا میک اپ کئے۔ جھلملاتے ہوئے کپڑے پہنے۔ سرخ مچھر دانی کے اندر مسہری پر بیٹھی رہتی ہو گی۔ ممکن ہے اب اس نے میز پر کھانا لگا دیا ہو۔ اس کا دولہا وقت کا پابند جو ٹھہرا۔ دوپہر ہوئی تو عابدہ کو شام کا انتظار ہی نہ رہتا جب محسن کے آنے کا وقت ہوتا ہے اور نہ کھانے پکانے کا ہوش رہتا تھا۔ اس کی نظریں بار بار

کھڑکی پر جاتی تھیں کہ کب ایک بجے اور اسکوٹر والے کی پھٹ پھٹ سنائی دے۔ جب تک وہ گزر نہ جاتا تھا عابدہ سخت مضطرب سی رہتی تھی۔ جیسے بار بار چھینک آتے آتے رُک جائے۔ یا کوئی زوردار دھماکا ہونے والا ہے اور ہو نہیں چکتا۔ کتنی بار اس نے ارادہ کیا کہ اسکوٹر والے کو دیکھے۔ آخر وہ کون چھیل چھبیلا ہے۔ مگر اس کی کھڑکیاں اتنی اونچی تھیں کہ جب تک پردہ ہٹا کر نہ دیکھو سڑک کی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اسلئے ایک غیر مرد کو دیکھنے کے لئے وہ کھڑکی کیسے کھول سکتی تھی!

ایک آدھ بار اس نے محسن سے شکایت بھی کی۔

"اس محلے میں ایک اسکوٹر والے نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ جہاں منا سویا اور وہ جگا گیا۔"

"کہیں بیٹھا دیکھتا ہو گا کہ تم منے کو کب سلاتی ہو۔" محسن اس کی کسی پریشانی کو سنجیدگی سے سننے کا عادی نہ تھا

"آپ مذاق سمجھ رہے ہیں۔ مگر وہ سچ مچ ٹھیک دس بجے روز کہیں جاتا ہے جب منا بھی سونے کو لیٹے۔ اور پھر ایک بجے کھانے کے لئے آتا ہے اور پھر دو ڈھائی بجے جب منا سو جائے تو جاتا ہے اور پھر رات میں ———"

"واہ بھئی! اسکوٹر والے کی معروفیت کے اوقات تو تم نے خوب یاد کر لئے ہیں۔ کہیں اسکی پرائیویٹ سیکرٹری تو نہیں بن رہی ہو ——" محسن اپنے جوتوں پر پالش کرتے ہوئے خوب ہنسنے لگا۔

اچانک عابدہ کو بھی احساس ہوا کہ ایک اَن دیکھے اجنبی کے بارے میں اس نے اتنی تفصیل کیوں یاد کر رکھی ہے!

"آپ کو کیا معلوم —— اس کم بخت نے میری مصیبت میں جان کر دی ہے۔ میرے بچے کی نیند کا دشمن ہو گیا ہے وہ"

"تو کیا پولیس میں رپورٹ لکھوا آؤں کہ ایک اسکوٹر والے سے اسکا اسکوٹر چھین لیا جائے کیونکہ وہ ہمارے منے کو جگا دیتا ہے"۔

"خیر آپ مذاق ہی کرتے رہیئے۔ میں خود اس کا کوئی بندوبست کرونگی۔"

عابدہ نے جھنجھلا کے کہا۔

یہ محلہ بڑے گھٹیا لوگوں کا تھا۔ مردوں کے باہر جاتے ہی عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی ہو کر پڑوسنوں سے لڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ ایسے ایسے کوسنوں اور گالیوں کا آپس میں تبادلہ ہوتا جو عابدہ نے کبھی نہ سنی تھیں۔

اس دن بھی وہ کسی کام سے کمرے میں آئی تو اس کی پڑوسن کہہ رہی تھی۔

"ہاں ہاں تو نے ہی میرے منو کی ٹانگ توڑی ہے۔ کل تو نے کوسنے دیئے تھے کہ میری چھت پر چڑھنے والے کی ٹانگ ٹوٹے گی اور آج اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اب میں تجھے سولی پر چڑھا دونگی۔ سُود کی بچی ——"

عابدہ کو کوسنوں پر بالکل یقین نہ آتا تھا۔ مگر اس عورت کی بات سن کر سخت تعجب ہوا۔ کیا واقعی کوسنے اتنے خوفناک ہوتے ہیں —— جبھی لوگ بد دعاؤں سے اتنا ڈرتے ہیں ——

پھر عابدہ کا جی چاہا کہ وہ بھی اپنے کسی دشمن کو کوسنے دیکر اس کا اثر دیکھے۔

اپنے دشمنوں کی لسٹ پر نظر ڈالی تو سر فہرست اس کی جٹھانی تھی۔ آفت کی پڑیا —— سرخ مرچ۔ اسی کی وجہ سے عابدہ کو الگ گھر بسانا پڑا تھا —— کالج میں ایک لڑکی شمیم بھی اس کی جانی دشمن بن گئی تھی۔ مگر ان دونوں کو کوستے ہوئے عابدہ کا جی دُکھا۔ جٹھانی کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ ماں کے بغیر کمبخت سسک سسک کر مر جائیں گے۔ اور سنا ہے شمیم کا تو میا

حشر ہوا۔ شوہر آوارہ نکما نکل گیا۔ بچے پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں۔ ایسے مرتے ہوؤں کو مارنے سے کیا فائدہ ــــ ؟

دوسرے دن محسن نے اپنے چند دوستوں کو شام کے کھانے پر بلایا تھا۔

نئے گھر میں آنے کی خوشی میں وہ سب دعوت کا تقاضہ کر رہے تھے۔ عابدہ بھی اپنے پکانے کے آرٹ سے ان سب کو متاثر کرنا چاہتی تھی۔ اسلئے آج اس نے صبح ہی منے کو دودھ پلا کے سلا دیا اور کام میں مصروف ہوگئی۔ بارہ بجتے بجتے آدھا کام نپٹ چکا تھا۔ لیکن اب اس کا دل کام میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ اب تھوڑی دیر میں اسکوٹر والا آتا ہوگا۔ پھر وہ شام تک کچھ نہ کر سکے گی۔ جھاڑن ہاتھ میں لئے تھی کہ دور کہیں سے اسکوٹر کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی اور وہ جھاڑن پھینک کر منے کے کمرے میں یوں بھاگی جیسے محسن کے آفس سے آتے ہی وہ خوشی کے مارے کھل اٹھتی تھی۔ مگر وہ کوئی اور اسکوٹر تھا۔ ادھر آنے کے بجائے کسی اور سڑک پر چلا گیا۔ اب تو ایکسینج رہا ہے ــــ آج کیا بات ہوگئی ــــ عابدہ سے اب کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بے چینی سے سارے گھر میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ منا بھی بڑے مزے میں دونوں ہاتھ گالوں پر رکھے سو رہا تھا۔ وہ ٹہلتی ہوئی دالانے تک ہی آئی تھی کہ اسکوٹر کی آواز گونج اٹھی اور منا کسمسا کے رونے لگا۔

"اللہ کرے مرجائے یہ اسکوٹر والا۔ کسی بس سے اس کا ایکسی ڈنٹ ہوجائے۔ اسکوٹر کے پرزے بکھر جائیں ــــ" جانے کیسے آج عابدہ کی زبان پر کوسنے آگئے اور وہ منے کو لیکر ٹہلنے لگی۔ شام کو محسن کے دوست آگئے ــــ شور مچاتے اور قہقہے لگاتے ہوئے ــــ آٹھ بجے تک گپ بازی ہوتی رہی۔ پھر کھانے کے تقاضے ہوئے۔ اتنی دیر میں شیام کچن میں جاکر ڈشس کا مزہ چکھ آیا تھا اور اب کھانے کے لئے سخت بیقرار تھا۔ لیکن عابدہ چاہتی تھی کہ پہلے منا سو جائے تب کھانا میز پر لگائے۔

منا سو گیا تو دونوں میاں بیوی جلدی جلدی میز ٹھیک کرنے میں لگ گئے۔ عابدہ کام میں مصروف تھی مگر اس کے کان اسکوٹر والے کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

کھانے کے دوران شیام۔ صادق اور قیصر نے ملکر خوب شور مچایا۔ عابدہ بھی بلا کی حاضر جواب تھی۔ مگر اس وقت اسے یہی خیال ستائے جا رہا تھا کہ اسکوٹر والے کا وقت ہوگیا ہے ــــ تھوڑی دیر بعد وہ میز سے اٹھی۔ "میں ابھی آئی ــــ ذرا منے کو دیکھ آؤں ــــ کمرے میں آکر وہ ٹہلنے لگی۔ بس اب پھٹ پھٹ کا شور ہونے والا ہے۔ اب منا اٹھ بیٹھے گا کھانا ختم ہوا ــــ کافی کا دور بھی پھیکا پڑ گیا۔ ہنستے ہنستے سب تھک چکے تھے۔ مگر کسی کا اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا ــــ

آج شاید گھڑی کچھ آگے تھی۔ دس بج چکے تھے۔ پھر اسکوٹر والا کیوں نہیں آیا ــــ ؟

عابدہ سوچ رہی تھی۔

"آج بھابی کا موڈ آف ہے۔" شیام نے پھر چھیڑ خانی کی۔

"نہیں تو ــــ وہ ہنس پڑی اور پھر دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ واقعی کیا مجھے کوئی پریشانی ہے!

بعض وقت دل میں ایسے اندیشے بھر جاتے ہیں کہ اپنی پریشانی کی وجہ خود ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ بار بار سوچنا پڑتا ہے کہ دل کیوں ڈوبا جا رہا ہے ــــ ؟

آج میں نے اسکوٹر والے کو کوسنے دیئے تھے ــــ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے یاد کیا۔ اور آگے کی بات سوچنے

کے بجائے گھڑی دیکھی — ساڑھے دس ہو چکے تھے ۔
" بھابی بار بار گھڑی دیکھ کر کہہ رہی ہیں کہ اب خدا حافظ —" قیصر نے شیام سے کہا۔
" مگر جب تک مرغ ہضم ہونے کی رسید نہ بھیج دے میں تو اٹھنے کے موقف میں نہیں ہوں ۔" شیام آرام سے صوفے پر لیٹ گیا۔
" اللہ توبہ میرے بار بار گھڑی دیکھنے سے یہ لوگ جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔ عابدہ نے گھبرا کے سوچا اور پوری دلچسپی کے ساتھ ان کے ہنسی مذاق میں شریک ہو گئی ۔
اچانک کہیں سے کسی عورت کے رونے کی آواز آئی اور عابدہ خوف کے مارے اچھل پڑی ۔
" کیا ہوا —؟ کیا بات ہے — ؟ شیام، صادق اور محسن نے اس کے ڈرنے پر ایک ساتھ پوچھا۔
" شاید محلے میں کوئی مر گیا ہے — اس کی بیوی رو رہی ہے —" عابدہ نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا ۔
محسن اٹھ کر دروازے تک گیا اور غور سے آواز سن کر بولا ۔
" نہیں جی — کوئی عورت بچے کو مار رہی ہے ۔ بڑے فضول قسم کے لوگوں کا محلہ ہے یہ "
" فضول قسم کے لوگوں سے آپ کا مطلب ان خواتین سے ہے جو بچوں کو مارا کرتی ہیں —؟
شیام نے محسن سے پوچھا اور پھر شرارت بھری نظروں سے عابدہ کو دیکھ کر بولا ۔
" ہم نے تو سنا ہے کہ بھابی بھی منے کو مارا کرتی ہیں۔"
" بلکہ منے کے باپ کو بھی " ۔ صادق نے کہا اور پھر سب ہنسنے لگے ۔
مگر عابدہ پریشان ہو کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور محسن سے پوچھنے لگی۔
" کیا واقعی کوئی نہیں مرا — ؟ اے ہے میں تو اتنی گھبرا گئی — میرا تو دم نکل گیا — "
" مگر یہ تو بتائیے بھابی کہ محلے میں آپ کس کے مرنے کا انتظار کر رہی ہیں — ؟
صادق نے پوچھا تو پھر قہقہے بلند ہونے لگے ۔
لیکن عابدہ نے ہنسنے کے بجائے سر جھکا لیا۔ جیسے اسکوٹر والے کو مارنے کی پوری ذمہ داری اسی پر ہو۔
ہاسپٹل والوں نے لاوارث لاش سمجھ کر اسے مردہ گھر میں ڈال دیا ہوگا ۔ اسکوٹر کے ٹکڑے ساری سڑک پر بکھرے پڑے ہونگے۔ اور اس کی بیوی بالوں میں پھولوں کے ہار سجائے ۔ سولہ سنگھار کیئے، میز پر کھانا رکھے انتظار کر رہی ہوگی ۔ سوچ رہی ہوگی کہ آج کس چڑیل نے اس کے شوہر کا راستہ روک لیا ہے ۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ — کہ عابدہ — فضا کو یوں گم سم ہوتے دیکھ کر محسن کے دوست اٹھ کھڑے ہوئے ۔
دس پندرہ منٹ کے بعد لائٹ آف کر کے محسن سونے کے کمرے میں آیا تو عابدہ تکیے پر سر رکھے رو رہی تھی۔
" عبو — عابدہ جان — کیا ہوا — ؟ وہ سخت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اچانک عابدہ کو کیا تکلیف ہو گئی ۔ آخر بڑی دیر کے بعد وہ سسکیاں روک کر بولی ۔
" محسن مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ۔ یوں لگتا ہے میں نے کسی کی جان لی ہے "
" کیا — ؟ محسن اچھل پڑا ۔ اسے سارا کمرہ گھومتا ہوا نظر آیا۔

"تم نے کس کی جان لی ہے۔ کیا ہوا — مجھے پوری بات تو بتا — ؟"
" وہ جو اسکوٹر والا روز کھڑکی کے نیچے سے جاتا تھا نا۔ آج میں نے اسے خوب کوسنے دیئے تھے۔ اور آج وہ ابھی تک گھر لوٹ کر نہیں آیا ہے۔ ضرور کسی بس سے اس کی ٹکر ہوگئی ہے۔
وہ مر گیا ہے — جبھی تو اس کی بیوی رو رہی تھی —
"بے وقوف — احمق کہیں کی۔ تمہارے کوسنے نہ ہوئے بندوق کی گولیاں ہوگئے — چلو اب چھوڑو یہ حماقت — سو جاؤ — ہر وقت اسکوٹر والا — اسکوٹر والا"
محسن اسے زبردستی لٹا کے تھپکنے لگا۔
مگر عابدہ ساری رات دہشتناک خواب دیکھتی رہی۔ کہتے ہیں قاتلوں کو کبھی ذہنی سکون نہیں ملتا۔ وہ بھی بار بار خواب میں دیکھتی کہ کسی کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ پھر خوف کے مارے خود ہی چلانے لگتی تھی۔
صبح اس کی آنکھ کھلی تو جیسے مہینوں کی بیمار ہو۔ تیز بخار میں اس کا بدن تپ رہا تھا۔ محسن سمجھ گیا کہ غالباً رات اسی تیز بخار کی آمد تھی جو عابدہ نہ جانے کیا اول فول بک رہی تھی۔
آج منے کو دودھ پلانے سے لیکر چائے بنانے تک سارے کام محسن کو خود نپٹانا پڑے۔ پھر آفس جانے سے پہلے اس نے اپنی امی کے ہاں جا کر کسی ملازم کا بندوبست کرنے کو بھی کہدیا۔ محسن آفس چلا گیا تو عابدہ بھی منے کو لیکر سو گئی —
مگر اچانک پڑوس میں کہیں رونے پیٹنے کا شور بلند ہوا۔ مختلف دردناک آوازوں سے عابدہ نے اندازہ لگا لیا کہ کوئی مر گیا ہے — وہ اٹھ بیٹھی — خوف کے مارے کانپنے لگی — پھر رو پڑی۔ منے کو پلنگ پر چھوڑ کر اس نے جلدی جلدی سارے گھر کے دروازے کھڑکیاں بند کر دیں اور خود باتھ روم میں گھس کر اندر سے دروازہ یوں بند کیا جیسے کوئی اسے پکڑنے آ رہا ہو۔ تیز بخار اور ڈر کی وجہ سے وہ کانپ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب پولیس اس کے دروازے پہ آئیگی —
قاتل یہ ہے — قاتل — قاتل —
اس کی نظروں میں فلموں اور ناولوں کے سیکڑوں قاتلوں کے چہرے گھوم گئے اور وہ زور زور سے چلانے لگی۔
نہیں نہیں — میں قاتل نہیں ہوں — میں نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔ وہ چیختے چیختے تھک گئی تو باتھ روم کھول کر باہر آئی اور منے سے لپٹ کر لیٹ گئی۔
لوگ کتنی زور زور سے رو رہے تھے — عورتوں کی آوازیں کیسی دردناک تھیں — ہائے اللہ — اسکی بیوی کا کیا حال ہوگا — ؟ اس کے جوڑے کے پھول — مہندی لگے ہاتھ — سرخ بچھونا — اور پھر چپکے سے اس کے دماغ نے سوچا — (اتنے آہستہ کہ خود اسے خبر نہ ہونے پائے) کہ اب اسکوٹر کی آواز سنے بغیر وہ دن کیسے کاٹے گی!
وہ پھر رونے لگی — اٹھ کر ٹہلنے لگی۔
بھاگ جاؤ — ٹہلنے میں اسے خیال آیا —
ایسے موقعوں پر سب مجرم یہی کیا کرتے ہیں۔ مگر لوگ کہتے ہیں خون نہیں چھپتا — مرنے والے کی روح ہمیشہ قاتل کا پیچھا کرتی ہے — تو کیا وہ اسکوٹر والا اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا — ؟ محسن اب اس سے کتنی نفرت کرے گا

سسرال والے کیا کہیں گے — ؟ اور منا — ؟ منا ایک قاتل ماں کا بیٹا کہلائے گا اور وہ خود اب عدالتوں میں کھنچی کھنچی پھرے گی — حوالات میں بند ہوگی۔ اور پھر — پھانسی کا تختہ — اس نے لرز کے سوچا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

رونے پیٹنے کا ہنگامہ بڑھتا جا رہا تھا۔ غالباً موت کی خبر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ لوگ آ رہے تھے۔ وہ سب پوچھ رہے ہونگے کہ کیسے مر گئیں — ؟ کیا ہوا تھا — ؟ مگر کسی کو بھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ ایکسی ڈنٹ کی وجہ کیا ہوئی! — پولیس والے ہی کو پکڑا ہوگا — تو پھر وہ کیوں ڈر کے مارے مری جا رہی ہے — ‌

اچانک عابدہ کو یوں لگا جیسے اس کی پھانسی کی سزا معاف ہو چکی ہو۔

شاید بخار بھی اب کم ہو رہا تھا — وہ پسینے میں نہا رہی تھی

پھر اچانک دروازے کی بیل بج اٹھی — اور عابدہ اچھل پڑی — ڈر کے مارے سارے گھر میں دوڑنے لگی۔

"دروازہ کھولیے —" کوئی چلا رہا تھا۔

"یقیناً پولیس ہوگی — اب اقرار کرنا ہی پڑے گا — ہاں میں قاتل ہوں — قاتل ہوں — دیکھتے ہیں قتل کا اقرار کرنے سے سزا کم ہو جاتی ہے!)

دروازہ کھولنے میں اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور آنسوؤں میں چہرا بھیگا ہوا تھا۔

باہر ایک نوجوان مرد کھڑا تھا۔ ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھائے — تین چار بچوں کی انگلی تھامے۔

"معاف کیجئے محترمہ — آپ کو بے وقت زحمت دی ہے۔ میں آپ کا پڑوسی ہوں۔ صبح میرے خسر صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ میری بیوی بے ہوش ہے۔ کیا آپ دو تین گھنٹے کے لئے ہمارے اس چھوٹے بچے کو سنبھال سکیں گی — اسے تھوڑا سا دودھ پلا دیجئے — شکریہ — عابدہ نے کچھ نہ سنا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر اس نے ہاتھ بڑھا کے بچے کو لے لیا۔

"مگر آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی — کیا آپ کے ہاں بھی کوئی — ؟

اس آدمی نے عابدہ کے بکھرے بال، آنسوؤں میں ڈوبا چہرا اور سرخ سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر پوچھا۔

لیکن عابدہ نے جواب دینے کے بجائے جلدی سے کواڑ بند کر لیے

پھر اچانک وہ اچھل پڑی — باہر اسکوٹر کی وہی مانوس پھٹ پھٹ سنائی دی اور خوشی کے مارے وہ اجنبی بچے سے لپٹ کر چلانے لگی۔

"نہیں — میرا کوئی نہیں مرا — میرا کوئی نہیں مرا —!

بوڑھا جزیرہ - (صفحہ ۲۶۶ سے آگے)

شاید وہ مجھے پہچان گئی تھی۔

"ہاں ہرلشیا، میں ہی بوڑھا جزیرہ ہوں!"

وہ میرے ہاتھوں میں بے ہوش ہو گئی، اور میں نے اُسے بستر پر سیدھا لٹا دیا، اور اپنی جگہ سے کھڑے کھڑے غائب ہو کر اُس کی کوکھ میں جا پہنچا۔

میں خود آپ اپنا بیج ہوں اور ہر بار کوئی نہ کوئی کنواری ماں میری نوخیا دائی کے لئے مجھے نیا جسم دیتی ہے!

اختر جمال

برزخ کا بادشاہ

ڈاکٹر پیڈے کی شخصیت بڑی مختصر سی تھی۔ مشکل سے چار فٹ کا قد، سوکھا ہوا دبلا پتلا جسم، چھوٹا سا چہرہ اور گدھ کی سی چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ جن میں ازلی بھوک چھپی ہوئی تھی۔ ان کے سارے دانت ٹوٹ چکے تھے لیکن دو دانت بڑے ظالم تھے اوپر کے مسوڑھے میں بالکل سامنے یہ دو بڑے بڑے دانت اس طرح نکلے رہتے تھے کہ ان کا منہ آگے کو نکلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور جب وہ ہنستے تو یہ دانت ان کی شخصیت کا کچھ ایسا تاثر پیدا کرتے کہ خود بخود نفرت پیدا ہوتی۔

اس عجیب و غریب شخصیت کے باوجود ان کے اندر کچھ ایسی مقناطیسی طاقت تھی کہ وہ ہر سوسائٹی کی جان بن جاتے تھے یہاں تک کہ ان سے نفرت رکھنے والے بھی ان سے پیچھا نہ چھڑا سکتے تھے۔ وہ بیگمات جو اپنے شوہروں کے آوارہ پن کی شاکی تھیں جن کی شامیں بہت افسردہ اور تنہا ہوتی تھیں جو باوجود بالوں کو خضاب سے رنگنے کے اپنے سفید بالوں سے خوفزدہ رہتی تھیں اور جنہیں اپنے ڈھلتے ہوئے جسم کا احساس ہر وقت احساس کمتری میں مبتلا رکھتا تھا ڈاکٹر پیڈے کے پاس ایسی خواتین کے لئے حیرت انگیز علاج تھا۔ وہ ان کی اس طرح مرید ہو جاتی تھیں اور اپنے اختلاج کے دوروں اور نفسیاتی تکالیف سے جب تنگ آجاتیں تو ان کو بلواتیں۔ وہ ادب کے ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی ان سب کا اتنی کامیابی سے علاج کرتے کہ تعجب ہوتا بیگمات کے چہروں پر ان کی باتوں سے ہی تازگی آجایا کرتی تھی۔ چاپلوسی اور خوشامد میں کوئی ان سے بازی نہ لیجا سکتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ بیگماتی فطرت کو جس طرح انہوں نے سمجھا تھا اس کو دیکھ کر یہ دھوکا ہوتا تھا کہ غالباً ان کی ریسرچ کا موضوع ہی ادھیڑ عمر کی عورتوں کی نفسیات رہا ہوگا۔ نوجوان لڑکیاں عموماً انہیں مذاق کا نشانہ بنایا کرتی تھیں تو ان کے حصے میں ہمیشہ پرانا اور ٹھکرایا ہوا مال ہی آتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ بہت خوش تھے۔ اور بے تکلف دوستوں میں وہ یہ بات کہا کرتے تھے کہ جو عورتیں خود جنسی تجربات سے دو چار نہ ہوئی ہوں وہ ان کی صحیح قدر نہیں کر سکتیں

ڈاکٹر پیڈے کا نام تو کچھ اور تھا۔ مگر یونیورسٹی میں ان کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا اور اسی لئے یہی نام خاص و عام میں اتنا مشہور ہوا کہ اصلی نام تو بس سرٹیفکیٹ میں ہی رہ گیا یہاں تک کہ جب وہ وظیفہ حاصل کر کے ولایت گئے تو وہاں بھی اسی نام سے مشہور ہوئے اور پیڈے کے بجائے PEDDY کہلائے۔

ڈاکٹر پیڈے ایک یونیورسٹی میں عرصہ دراز سے پڑھا رہے تھے مگر اب ولایت سے ان کا واپس جانے کو

جی نہ چاہتا تھا۔ ایک برج پارٹی میں انہوں نے نواب صاحب کو دیکھا ۔ بہت زیادہ پینے کے باوجود ان کا فہم غلط نہ ہوتا تھا۔ نواب صاحب ریاست کے بکھیڑوں سے اکتا کر ولایت میں دل بہلانے آئے تھے ۔ وہ برج کے شوقین تھے۔ ڈاکٹر پدّے برج کے ماہر تھے ۔ اور طنز و مزاح کی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے کہ نواب صاحب کی زیر لب مسکراہٹ قہقہے بن جاتی ۔

جب نواب صاحب ولایت سے واپس ہوئے تو ڈاکٹر پدّے بھی ان کے ملازم ہو کر ریاست میں ہی آ گئے ۔

یونیورسٹی میں انہیں جو تنخواہ ملتی تھی نواب صاحب کی مہربانیاں اور فیاضیاں اس سے بہت زیادہ تھیں۔ انہیں محل کے پاس ہی ایک چھوٹا سا بنگلہ عنایت ہوا تھا جس میں وکٹورین عہد کا بھاری اور عالیشان فرنیچر تھا۔ بیش قیمت قالین تھے اور جگہ جگہ ہرن کی کھوپڑیاں اور شیر کی کھالیں نظر آتی تھیں۔ ڈاکٹر پدّے اس ماحول میں بہت خوش تھے۔ نواب صاحب ان سے بہت محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ انہیں ڈاکٹر پدّے میں وہ سب خوبیاں نظر آتی تھیں جو ایک نواب کے پرائیوٹ سکریٹری میں ہونی چاہئیے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ریاست میں کوئی اہم ذمہ داری سنبھال لیں۔ ریاست کے مقامی افسروں اور وزیروں سے وہ خائف رہنے لگے تھے ۔ نواب صاحب کے عزیز اور رشتہ دار جو بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے ریاستی سیاست میں کسی نہ کسی طرح ٹانگ اڑاتے تھے ۔ ایسے حالات میں ڈاکٹر پدّے کا ملنا نواب صاحب کو نعمت معلوم ہوا۔ ڈاکٹر پدّے نے بھی اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ ان کا مستقبل نواب صاحب کی خوشنودی سے ہی سنور سکتا ہے۔ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے سب سے اچھے مصاحب بھی بن گئے اور جی حضوری کے فن میں سب کے کان کاٹنے لگے ۔

نواب صاحب ان کے تدبر کے ہر معاملے میں قائل ہو چکے تھے۔ سیاست، معاشیات سے لیکر برج تک ہر علم اور فن میں وہ طاق تھے ۔۔۔! اور برج بھی وہ اس طرح کھیلتے تھے کہ انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ شطرنج کی طرح یہ بھی خاص بادشاہوں کا کھیل ہے اور سیاسی مسائل برج سے چٹکیوں میں حل ہو جاتے ہیں ۔ ڈاکٹر پدّے افسوس کیا کرتے تھے کہ انہوں نے اپنی عمر کا قیمتی حصہ یونیورسٹی میں کیوں گنوا را ۔ اور یونیورسٹی کی تنگ اور محدود دنیا میں اپنا تجربہ اور صلاحتیں کیوں گنوائیں جب کہ ان کی قسمت کم از کم کسی ریاست کی وزارت عظمیٰ کی ہونی چاہیئے تھی ۔ ڈاکٹر پدّے کی بیوی یوپی کے دور دراز ایک چھوٹے سے گاؤں میں اپنے سسرال والوں کے ساتھ رہا کرتی تھیں ۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں ۔ (یونیورسٹی کے زمانہ میں بھی انہوں نے اپنی بیوی اور لڑکیوں کو کبھی ساتھ نہ رکھا تھا) وہ اکیلے کوٹھی میں رہا کرتے تھے اور اب جب نواب صاحب نے انہیں اتنا عالیشان بنگلہ دے رکھا تھا انہیں نواب صاحب کے ایک دفعہ کہنے کے باوجود بھی اپنے بیوی بچوں کو بلانے کا خیال نہ آیا ۔ ان کی بیوی اچھی خاصی پڑھی لکھی خاتون تھیں ۔ جتنی تعلیم اس زمانہ کے شرفا میں دی جاتی تھی ان کی بیوی نے بھی حاصل کی تھی۔ قرآن پاک کے علاوہ مولوی نذیر احمد اور مولانا راشد الخیری اور خاموش فتحپوری کے ناول ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا کرتی تھیں ۔ تھوڑا بہت حکمت میں بھی دخل تھا۔ ان کے والد قصبہ کے مشہور حکیم تھے اور ان کی بہت سی دوائیں ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو یاد تھیں ۔ اور گاؤں کی عورتیں ان سے علاج دوا کے سلسلہ میں مشورے لیا کرتی تھیں۔ چند نسخے تو ایسے مشہور تھے کہ ڈاکٹر بھی حیران رہ گئے تھے ۔

ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو اس بات کا غم تھا کہ میاں انہیں ساتھ نہیں رکھتے مگر میاں کی فرمانبرداری ان کا مذہب تھی۔ انہوں نے کبھی ضد بھی نہ کی کہ ڈاکٹر صاحب انہیں ساتھ لیجائیں سال میں دو تین دفعہ ڈاکٹر صاحب چھٹیوں میں وطن آتے تھے اور ان کے لئے ان کی یہ آمد ہی زندگی کا حاصل تھی ۔ اگر وہ نہ آتے تب بھی وہ صابر و شاکر رہتیں ۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی تینوں لڑکیاں جوان ہو گئی تھیں

وہ قصبے کے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتی تھیں اور انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ انہیں باپ کی توجہ اور محبت نہیں ملی ہے۔ وہ ماں کے برعکس چپکے چپکے باپ کے خلاف نفرت کے جذبہ کو پروان چڑھا رہی تھیں ــــ! جب ڈاکٹر صاحب ریاست میں ملازم ہوئے تو ان کے گھر والوں نے سمجھا کہ اب شاید ڈاکٹر صاحب انہیں آکر بلا لیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب نے نواب صاحب سے بھی یہی کہدیا کہ ان کے بوڑھے والد کو بہو کی خدمت کی ضرورت ہے اور اس لئے ان کا گاؤں میں رہنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو خدا جانے کیوں یہ وہم تھا کہ ان کی بیوی کے پرانے طور طریقوں کا مذاق اڑایا جائے گا اور محل کی فر فر انگریزی بولنے والی لڑکیوں کے سامنے ان کی سیدھی سادھی گھریلو لڑکیاں اور حقیر معلوم ہونگی ــــ پھر یہ کہ آج تک انہوں نے بیوی، بچوں سے متعلق ذمہ داری قبول کی تھی اور نہ کرنا ہی چاہتے تھے۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کو تنہا رہتے دیکھ کر اکثر خواتین کو یہ مغالطہ ہوتا تھا کہ وہ کنوارے ہیں۔ اور ایک اچھی عمر کا مرد بھی جب تک کنوارا رہے اس کی زندگی میں رنگینی قائم رہتی ہے اور لوگ اس رنگینی کو قابل اعتراض بھی نہیں سمجھتے۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کے بیوی، بچوں کو آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کی زندگی کس طریقے سے گذرتی رہی ہے ــــ!

ایک دفعہ ایک طالب علم لڑکی ان کے جھانسے میں آگئی تھی اور ان کی دوسری شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ نہ جانے کیسے لڑکی کے والدین کو ان کے بیوی، بچوں کا علم ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب ایک مدت تک اپنے بیوی بچوں کے وجود کو قابل نفرت سمجھتے رہے۔ اگر وہ لوگ نہ ہوتے تو ایک پڑھی لکھی فیشن ایبل لڑکی ان کی رفیق حیات بن جاتی۔ اس دفعہ چھٹیوں میں وہ اپنے گھر بھی نہیں گئے اور یونیورسٹی سے لمبی چھٹی لے کر ولایت چلے گئے ــــ ولایت میں تین سال رہ کر جہاں انہوں نے پی، ایچ، ڈی کیا وہاں تین سال دل بھر کر زندگی کی نعمتوں سے فیض یاب ہوئے اور اس کے بعد جب نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان کے دن ہی پھر گئے۔

اب ان کا مستقبل بہت روشن تھا ــ! پرانے زمانے میں شطرنج کی جو اہمیت تھی وہ اب مہذب سوسائٹی میں برج کو حاصل تھی۔ اور ڈاکٹر بیدّے برج کے بادشاہ مانے جاتے تھے۔ ہر سیاسی بات کا جواب وہ مسکرا کر یہی دیتے کہ " برج سیکھو" ــــ وہ نہ صرف اپنی نجات کی راہ برج کو سمجھتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی مخلصانہ مشورہ دیتے تھے۔ " برج سب سے بڑی سیاست ہے۔ جو شخص کامیابی سے برج کھیل سکتا ہے وہ ہر مشکل کا مقابلہ کرنا جانتا ہے اور ترقی کے زینے اتنی جلدی طے کرتا ہے جتنی جلدی تاش کے پتے پھینکے جاتے ہیں۔"

نواب صاحب کے وزیر مال اور وزیر اعظم میں دانت کاٹی روٹی تھی وزیر مال کی رعب دار شخصیت تھی ــ بھاری ڈیل ڈول اور ایسی ہی آواز ــــ وہ پتھر کو ہیرا بنانے کا فن جانتے تھے ــــ! ان کی خوبیاں دیکھ کر ہی نواب صاحب نے انہیں وزیر مال کا عہدہ دیا تھا وزیر اعظم نواب صاحب کے رشتہ دار بھی تھے۔ ان کے ہم مکتب بھی۔ وہ نواب صاحب کے بعد اپنی ذات کو ریاست میں سب سے زیادہ واجب التعظیم سمجھتے تھے۔ وزیر اعظم کو نواب صاحب اور وزیر مال کے مخلصانہ تعلقات ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنے راستہ کا روڑا اور خطرہ سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر بیدّے جو نواب صاحب کی ناک کا بال سمجھے جانے لگے تھے دونوں صاحبان سے بہت خلوص سے ملتے تھے اور دونوں پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ان کے معتمد خاص ہیں۔ دونوں ان سے بنائے رکھنا مصلحت سمجھتے تھے۔ اور اس لئے دونوں برج میں ان کے شاگرد

ہوگئے تھے۔

گرمیاں قریب تھیں نواب صاحب شملے جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ وائسرائے بہادر بھی شملے پہنچنے والے تھے اس لئے والیانِ ریاست کا ان دنوں وہاں جانا ریاستی عوام اور حکمران دونوں کے لئے مفید سمجھا جاتا تھا۔

ریاست کے چند سر پھرے عوامی لیڈران دنوں محل کے متعلق غلط سلط افواہیں پھیلا رہے تھے۔ اور یہ ظاہر کر رہے تھے کہ نواب صاحب عیش و عشرت میں روپیہ کوڑیوں کے مول بہا رہے ہیں اور دوسری جانب عوام فاقے کر رہے ہیں۔ اس صورت حال سے نواب صاحب کبیدہ خاطر تھے۔ حالانکہ نواب صاحب عوام کی بہبود کے کاموں میں دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے تھے اور جیب خاص سے بھی ہزاروں وظائف دیتے تھے مگر پھر بھی چند سر پھرے ریاستی باشندے ان کے لئے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ اور جب وہ شملہ اور مسوری کی سیر کا پروگرام بنائیں گے اور شاہی خاندان کی معزز بیگمات ان کے ساتھ ہونگی انہیں خزانہ سے ایک بڑی رقم حاصل کرنا ہوگی ـــ ! اور اس کے بعد جاسوس عوام میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کی راہ ڈھونڈ لیں گے ـــ ! ڈاکٹر بیدے نواب صاحب کی الجھنوں کو سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے دست بستہ کہا۔ "حضور ان دنوں انگریزی حکومت ریاستوں کے معاملات میں ضرورت سے زیادہ دخل اندازی کر رہی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ حاصل کرنے کے لئے دوسرے ذرائع استعمال کئے جائیں" ـــ ! نواب صاحب نے حیرت سے انہیں دیکھا ـــ اور وہ جھک کر بندگی عرض کر کے بولے "۔ حضور برج کھیلئے" ـــ آخر ریاست میں جو بڑے بڑے جاگیر دار اور وزیر ہیں ہزاروں کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ خرچ تو صرف حضور کرتے ہیں اور جمع یہ حضرات کرتے ہیں۔" نواب صاحب مسکرا کر چپ ہوگئے۔

ڈاکٹر بیدے نے وزیر اعظم اور وزیر مال کی باہمی رقابت کو اور ہوا دے دی تھی۔ اب انہوں نے دونوں کو علیحدہ علیحدہ مخلصانہ مشورے دیئے کہ نواب صاحب کو روپیہ کی ضرورت ہے۔ وہ جتنی رقمیں ہار سکتے ہوں ہار جائیں ـــ اس طرح نواب صاحب ان سے خوش ہوں گے اور ان کی خوشنودی روپیہ سے لاکھ قیمتی ہے خوش ہوں گے تو اس کا بدل کر دیں گے یا پھر جاگیر اور املاک کی صورت میں دگنا مل جائے گا۔ عہدے کی ترقی ہوگی تو خود ایک کے چار بنا لیں گے۔ وزیر مال ان دنوں وزیر اعظم بننے کا خواب دیکھ رہے تھے فوراً خوش ہوگئے اور وزیر اعظم جو وزیر مال سے خوفزدہ تھے وہ بہر حال اپنا مستقبل محفوظ رکھنے کے لئے نواب صاحب کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مقررہ پروگرام کے مطابق ایک دن برج پارٹی میں وزیر مال دس ہزار ہار گئے ـــ دوسرے دن وزیر اعظم بیس ہزار ہارے۔ تیسرے دن وزیر مال بیس ہزار اور ہارے اور چوتھے دن وزیر اعظم جو خود ایک بڑے جاگیر دار تھے اپنی جاگیر کے نام کی لاج رکھنے کو تیس ہزار کی رقم ہار گئے ـــ ! ڈاکٹر بیدے انکسار کی پوٹ بن بن کر نواب صاحب کو جیتتے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک ماہر فن کھلاڑی تھے مگر ظاہر یہی کر رہے تھے کہ وہ نہیں نواب صاحب جیت رہے ہیں اور جب نواب صاحب نے یہ کہہ کر کہ جیت میں ان کی رقم آدھی ہے انہیں مالا مال کر دیا تو ان کی پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں تھا۔ باچھیں کھل گئیں ـــ وزیر مال اس کے بعد نہیں آئے وہ وزیر اعظم سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پاس اتنی بڑی جاگیر نہ تھی جو نقصان عظیم کی تلافی کرتی ـــ

چند روز دوسرے جاگیر داروں کی باری باری محفل جمی۔ خوب خوب برج کھیلا گیا ـــ اور ڈاکٹر بیدے کے دن بھی پھر گئے ـــ ! نواب صاحب ایک بھاری تجوری لیکر شملے روانہ ہوئے اور سوچنے لگے اب کہ انہیں خزانے سے رقم

نکلوانے کی ضرورت نہ ہوگی ـــ ! آخر پرانے زمانے کے بادشاہ بھی تمنیں تھیلی کرتے تھے انہوں نے تو صرف برج کھیلا ہے ـــ !
ڈاکٹر پڈے اب انہیں اتنے مخلص، ایماندار اور سمجھدار آدمی معلوم ہوتے تھے کہ وہ انہیں اپنے پرائیوٹ سکریٹری کے عہدے سے ترقی دیکر وزیر اعظم کا عہدہ دینا چاہتے تھے چنانچہ مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔ کیونکہ وزیر اعظم سازشی دماغ کے آدمی تھے اور پھر ان سے رشتہ داری بھی تھی اور وہ تمام جاگیرداروں کے گٹھ جوڑ میں شریک تھے اس لئے انہیں فوری طور پر برطرف کرنا خلاف مصلحت تھا۔

نواب صاحب اپنے شاہانہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر برج پارٹی میں یہی کہتے رہے "نہیں بھائی میں یہ نہیں لونگا ـــ میرے لئے جیت کی خوشی ہی کافی ہے ـــ مجھے ضرورت نہیں ـــ " لیکن ڈاکٹر پڈے نے یہ کہہ کر "حضور کھیل کھیل ہے اور اصول اصول ہیں، آپ کو رقم قبول کرنا ہوگی" نواب صاحب کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ روپیہ قبول کریں اس بات کا دلی ں وزیر اعظم اور وزیر مال دونوں کو رنج تھا کہ ڈاکٹر پڈے اگر اصرار نہ کرتے تو بات بھی رہ جاتی اور رقم بھی نہ جاتی۔ دونوں نواب کو بیوقوف بنا کر روپیہ وصول کرنے کے عادی تھے۔ روپیہ الٹا نواب کی جیب میں چلا جائے اس بات کا ان کے دل پر بے حد داغ تھا اور دونوں سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے خاموش تھے ـــ ! اور اس رات جب نواب صاحب نے بہت زیادہ پی لی تو انہوں نے اپنی بیگمات کی موجودگی میں وزیر مال اور وزیر اعظم کو گالیاں دیں۔ جاہل۔ عیاش اور رشوت خور کہا ـــ آخر یہ دونوں نے جو روپیہ ہار رہے ہے ـــ یہ بھی خزانے کا ہوگا ـــ ان کے پاس اتنی بڑی بڑی رقمیں کہاں سے آئیں ؟ اور انہوں نے صاف کہا کہ ڈاکٹر پڈے جیسے عالم فاضل لوگوں کے ہوتے ہوئے وزارت عظمیٰ کا حق اور کسی کو نہیں ہے۔ جن لوگوں نے سنا انہیں اپنے کانوں پر اعتماد نہ ہوا۔ نواب صاحب کی چھوٹی بیگم نے جو ڈاکٹر پڈے سے انتہائی نفرت کرتی تھیں دوسرے دن اپنی بھنویں سکیڑ کر سلام کا جواب دینے کے بجائے مسکرا کر جواب دیا اور کہا شاید چند روز میں آپ نواب صاحب سے کوئی خوش خبری سنیں گے ـــ !

ڈاکٹر صاحب کو تاش کے پتوں پر بڑا بھروسہ تھا۔ وہ مسکرا کر تعظیم کے لئے جھکے اور سب کچھ سمجھ گئے !

دوسرے دن شاہی خاندان کو لیکر ڈاکٹر پڈے کی معیت میں نواب صاحب شملے روانہ ہوگئے ـــ !
ڈاکٹر پڈے نے رخصت ہوتے وقت وزیر مال اور وزیر اعظم کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں صاف ظاہر تھا کہ شملے سے واپسی کے بعد ان کا مرتبہ ان دونوں حضرات سے بہت بڑا ہوگا ـــ ! دونوں دل ہی دل میں انھیں گالیاں دے رہے تھے اور ان سے سخت خوفزدہ تھے !

شملے کے دوران قیام ڈاکٹر پنڈی عرف پڈے کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی ـــ ! ڈاکٹر پڈے کی شہرت کے ساتھ ساتھ نواب صاحب کے برج کی بھی شہرت تھی۔ اور نواب صاحب ڈاکٹر پڈے کے ساتھ کھیل کر یہی سمجھتے تھے کہ ان کا اب اس کھیل میں کوئی اگر مقابلہ کر سکتا ہے تو صرف ڈاکٹر پڈے ہے ـــ ! اب انہیں برج کے طفیل نواب صاحب کے ساتھ ہر جگہ مدعو کیا جاتا تھا۔ نواب صاحب کی زندگی میں اب تک صرف دو تفریحیں زیادہ اہم تھیں۔ حسین بیگمات اور شراب ارغوان اب یہ تیسری تفریح برج جب سے زیادہ مقبول ہوگئی تھی بیگمات ڈاکٹر پڈے سے بدگمان اور خفا سی رہنے لگی تھیں ـــ انہیں اپنے ناز و انداز دکھانے اور ایک دوسری پر سبقت لیجانے کے مواقع کم ملتے تھے۔ اب نواب سر جھکائے تاش کے پتوں

میں محو ہوتے ——! نواب صاحب کی ایک رشتہ کی بچی ان سے خاص طور پر خفا تھیں۔ ان کی نوجوان بیٹی نے اسی سال ایک مشہور انگریزی کالج سے سینئر کیمبرج پاس کیا تھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی اور انگریزی بولتی اور ڈانس کرتی تو بالکل میم معلوم ہوتی تھی انہیں پوری توقع تھی کہ اس سال شملے میں ان کی بیٹی کی خوب شہرت ہوگی اور انشاء اللہ جب آئندہ سال سرکار انگلستان کی سیر کو جائیں گے تو ان کی بیٹی ساتھ جائیگی —! ہر سال نواب اپنے حسین وجمیل خاندان کی ایک خوبصورت خاتون کو اپنے دورۂ انگلستان میں شریک کرتے تھے، یہ ایک پرانی روایت تھی، اور اس دورے کے بعد نواب صاحب جب واپس آتے تھے تو اس خاتون کی دھوم دھام سے خود نکاحی باپ بن کر شادی کرتے تھے! جہیز بھی خود دیتے اور دولہا بھی خود تلاش کرتے تھے ——! لیکن اس سال نواب صاحب نے اس حسین اور کم سن سینئر کیمبرج پاس دوشیزہ کا دل توڑ دیا جو اس سال "مس شملہ" بننے کے خواب دیکھ رہی تھی اسے نواب صاحب کی ذات سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہ تھی مگر اپنی ماں کی ہدایت کے مطابق اسے اس خاص اعزاز سے دلچسپی تھی جو خاندان کی ہر حسین عورت کو حاصل رہا ہے پھر ولایت کی سیر کا جو فرہ نواب صاحب کے ساتھ جانے میں ہے وہ سب جانتے ہیں! نواب صاحب دل کھول کر تفریح کرتے اور کراتے ہیں۔ اسے انگلینڈ جانے کا شدید ارمان تھا۔ بچپن میں وہ جب Pussy CAT کی زبانی یہ سنتی I have [illegible] to London [illegible] تو اس کا دل رشک سے بھر جاتا۔ وہ اپنی خوبصورت آنکھوں میں لندن جانے کے ہزاروں خواب لیائے جوان ہوئی تھی —! اور اگر اس دفعہ سیزن میں اس سے نواب صاحب نے وعدہ نہ کیا تو خدا جانے وہ پھر کسے لیجائیں —! بہرحال وہ اپنی ماں کی طرح اداس بھی نہ تھی۔ سارا دن ٹونی اپنے رشتے کے ایک بھائی کے ساتھ گھوڑے کی سواری کرتی۔ ٹونی اسے بہت چاہتا تھا۔ مگر یہ بات ٹونی بھی جانتا تھا کہ وہ اسے لندن کی سیر نہیں کرا سکتا۔ اور اسے یقین تھا کہ جب وہ سیر کر کے لوٹے گی تو اس کی شادی ٹونی سے ہوگی ——! ٹونی نے بھی سینئر کیمبرج پاس کیا تھا اور آجکل وہ ریاست کی فوج میں کپتان تھا ——! وہ بہت ہنس مکھ اور خوبصورت تھا۔ اور دونوں بال روم میں ڈانس کرتے تو ساری دنیا کو بھول جایا کرتے تھے ——! بہت سے راج کمار اور راجکماریاں شہزادے اور شہزادیاں تعجب سے انہیں دیکھا کرتے کہ وہ بالکل ہندوستانی فلموں جیسی محبت کرتے ہیں۔ ! جس میں انتہائی بچپن اور خلوص ہوتا ہے! ایسی محبت حقیقی دنیا میں کہاں ہوتی ہے۔ خدا جانے دونوں کا کیا انجام ہوگا ——! اس کا نام بھی تو لیلیٰ تھا ——! انہی دنوں ایک صوبے کے انگریز گورنر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ شملے آئے ہوئے تھے۔ ان کی لڑکی اور لڑکا لیلیٰ اور ٹونی کے ہم عمر تھے اور ان کی جلد ہی گہری دوستی ہوگئی تھی —! اب ڈانس میں بھی وہ ایک دوسرے کے خوشی سے پارٹنر بننے لگے تھے۔ ولیم اور لیلیٰ —— ٹونی اور ڈورتھی ——! چاروں ایک ساتھ گھوڑے دوڑاتے شملے کی پہاڑیوں پر تفریح کرتے۔ شام کو جب پہاڑوں کی ڈھلانوں پر روشنیاں جگمگاتی ہوتیں لیلیٰ اور ٹونی گھر واپس آتے تو یہ سنتے کہ نواب صاحب اور ڈاکٹر صاحب برج کھیلنے کہیں مدعو ہیں! اس وقت لیلیٰ ٹونی کا ہاتھ پکڑ کر کہتی "ٹونی ممی کہتی ہیں اگر اس سال نواب صاحب مجھے ولایت کی سیر کو نہ لے گئے تو وہ میری شادی نہیں کر سکیں گی۔ ممی کے پاس اتنا روپیہ کہاں ہے۔ کاش یہ بوڑھا نواب ہم دونوں کو لیجائے ——" ٹونی ہنس پڑتا بھلا وہ مجھے کیوں لے جائے گا —— وہ صرف تمہیں لیجائے گا —— وہ شاہی خاندان کے دوسرے نوجوانوں کی طرح یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کی محبوبہ پر پہلا حق نواب کا ہے —— اور اس منزل سے گذر کر ہی وہ اسے پا سکتا ہے —— وہ خلوص دل سے دعا کرتا۔ لیلیٰ خدا کرے تمہیں اس بار بڈھا ضرور لیجائے اور دونوں ہنس پڑتے ——!

ایک شام نواب صاحب کے ہاں برج پارٹی میں ایک ایسے رجواڑے مدعو تھے جو برج کے نامی کھلاڑی سمجھے جاتے نواب صاحب اور ڈاکٹر پڈے کے ساتھ کئی ربر کھیل کر وہ متواتر ہارنے اور جیت میں جو ہزاروں روپیہ حاصل ہوا تم نواب صاحب نے وہ سب کی موجودگی میں ڈاکٹر پڈے کے حوالے کر دیا ۔ نوابوں رجواڑوں کے سامنے اس روپیہ میں ے رکھنا ان کے لئے خلاف شان تھا ان کے لئے یہی اعزاز کافی تھا کہ ایک مشہور برج کے کھلاڑی کو انہوں نے شکست دیدی۔

ڈاکٹر پڈے اب شملے میں ہر سوسائٹی کی جان تھے ۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اگر وہ کوئی نو نہ کرتے تو برج کھیل کر بھی زندگی آسائش سے گذار سکتے تھے ۔ نواب صاحب بھی ڈاکٹر پڈے کی بدولت اس غلط فہمی میں ہوگئے تھے کہ وہ بھی بہت اچھا برج کھیلتے ہیں۔ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ کمال ڈاکٹر پڈے کے ہاتھوں کا تھا وہ ہر میں نواب کو جیتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے اگر کسی اور کے پارٹنر بنتے تو نواب کی خاطر ہارتے اور اگر نواب کے پارٹنر بنے کھیل میں جیت یقینی تھی۔

ایک دفعہ انہیں وائسرائے بہادر کی طرف سے برج کھیلنے کی دعوت موصول ہوئی ۔ نواب صاحب اور ڈاکٹر پا کے لئے یہ ایک اعزاز تھا ۔ وائسرائے بہادر کو برج سے معمولی دلچسپی تھی۔ ان کے مقابل جو گورنر تھے وہ اچھا برج کھیلے لیکن ڈاکٹر پڈے کا شہرہ سن کر وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ برج کے سب سے بڑے کھلاڑی سے کھیل رہے ہیں اور ان کا خیال صحیح ڈاکٹر پڈے کے مقابل میں وہ واقعی ان کے شاگرد کی حیثیت رکھتے تھے نواب صاحب سوچ رہے تھے کہ اگر وائسرائے کے وہ اچھا کھیلے تو انہیں برج میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہو جائے گی ۔ اور انہیں یقین تھا کہ ڈاکٹر پڈے یقیناً جیت کا باعث ہوں گے ۔ کھیل شروع ہے ! دکی ۔۔ تھہی ۔۔۔ اور یتے ۔۔۔ ! رات کو دس بجے تک وہ رہے ۔ نواب صاحب کا چہرہ اترا جا رہا تھا ۔ آج تک شملے میں انہوں نے ڈاکٹر پڈے کی بدولت جتنا کمایا تھا وہ آج سے زیادہ لٹا چکے تھے ۔ ڈاکٹر پڈے کے سور جیسے دونوں دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور وہ نواب صاحب کو آج ا گھناؤنے نظر آ رہے تھے ۔ اس سے پہلے وہ انہیں فال نیک سمجھتے تھے ۔ ڈاکٹر پڈے کے چہرے پر مسلسل ہارنے کے با شیطانی مسکراہٹ تھی ۔ کھیل ختم ہوا ۔ کئی ربر کھیلے جا چکے تھے ! وائسرائے بہادر حیرت انگیز جیت پر خوش تھے ۔ وہ گورنر بڑی تہذیب سے مسکرا رہے تھے مگر ان کی آنکھوں سے مسرت کی پھوار برس رہی تھی ۔ وائسرائے بہادر کھیل میں بھی وقت کی پابندی کے قائل تھے دس بجے برج ختم ہو گیا مگر دو گھنٹوں میں نواب صاحب کی دنیا تاریک ہو گئی ۔ اس کے باوجود وہ اپنے خاندان کی رو فراخ دلی کی وجہ سے مسکراتے رہے ۔ اور بڑے حوصلے اور عزم سے ہار قبول کی ۔ وائسرائے بہادر کی خوشنودی کے خواہشمند تھے ۔ نواب صاحب یہ بات اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ ڈاکٹر پڈے وائسرائے کے مقابلے میں جان بوجھ کر ہیں ۔ وہ وائسرائے کی ہر چال کو کامیاب بنانے کے نکتے سوچ سوچ کر اپنے مخالف کو جتواتے رہے ہیں، لیکن وہ کر سکتے تھے ۔ کھیل کے دوران وہ دل ہی دل میں ڈاکٹر پڈے کو گالیاں دیتے رہے اور مسکرا مسکرا کر وقار سے پھینکتے رہے ۔ وائسرائے صاحب نے اخلاقاً جب رقم لینے سے انکار کرتے ہوئے یہ کہنا چاہا کہ یہ صرف کھیل تھا پڈے نے بے حد اصرار کر کے نواب صاحب کی خاندانی روایتوں کا واسطہ دیکر رقم قبول کرنے پر مجبور کیا اور کہا ۔ اگر ہارتے تو نواب صاحب کو قبول کرنی پڑتی ۔۔۔ کھیل کے قواعد کی پابندی بھی کھیل کا ایک اخلاق ہے ۔۔۔

ڈاکٹر صاحب کی باتوں میں مجبوراً نواب صاحب کو بھی ہاں میں ہاں ملانی پڑی ـــــ وائسرائے نے مسکرا کر کہا۔

"Dr. You are a man of Principle."

اور رخصت ہوتے وقت جب وائسرائے نے ڈاکٹر پیڈے سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تو اُن کے جسم میں خون کی گردش کے ساتھ ہی چلو بھر خون بھی بڑھ گیا۔ اُنھیں اپنا مستقبل انتہائی رنگین اور حسین نظر آیا۔ سب اُن کا لوہا مان چکے تھے۔ ہار اور جیت کوئی اہم نہیں ہے ـــــ مگر وہ بہت خوبصورتی سے کھیلے ـــــ! بہت اونچا اور بہت اچھا کھیل کھیلے ـــــ! وہ سب سے (compliment) لیکر نواب صاحب کے ساتھ کار میں بیٹھے تو بھیگی بلی بنے خاموش بیٹھے رہے! نواب کا دل ان سے کھٹا ہو چکا تھا ـــــ لیکن ظاہر داری برتتے ہوئے نواب صاحب بولے "وائسرائے کمال کا کھیلتا ہے آج تو تم بھی چاروں شانے چت گر پڑے" اس فقرے پر ڈاکٹر پیڈے کے دانت باہر نکل آئے وہ مسکرا کر بولے۔ "حضور یہ ہاتھ ہارنا نہیں جانتے مگر دور اندیشی نے ہارنے پر مجبور کر دیا!"

"ہوں ـــــ!" نواب صاحب خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر پیڈے سارا مضمون پہلے ہی سوچ چکے تھے۔ بڑے ادب سے کہنے لگے۔ حضور آپ فرما رہے تھے وائسرائے بہادر ریاست کا عنقریب دورہ کریں گے۔ میں نے دورے سے پہلے ہی ایسا انتظام کر لیا کہ اب آپ کو چنداں فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ ریاستی کانگریس نے فتنے پھیلا رکھے ہیں۔ جاگیردار الگ سازشیں کر رہے ہیں۔ لیکن وائسرائے بہادر کی حمایت اگر حاصل رہی تو پھر کوئی خوف نہیں ہے ـــــ! نواب صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ جو آدمی اُنھیں مکر و فریب کا پتلا معلوم ہو رہا تھا یہ جملہ سنتے ہی اپنا سب سے بڑا وفادار معلوم ہوا۔ وہ پھر آہستہ سے بولے "حضور آپ کے لئے چند لاکھ کی کیا حقیقت ہے مگر یہ نودولتے انگریز ـــــ آپ ان لوگوں کو جانتے ہیں۔ سوداگر لوگ ہیں۔ نفع نقصان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے تمام صورت حال پر غور کر کے یہی مصلحت معلوم ہوئی کہ وائسرائے کو اپنا ہم خیال بنانا ضروری ہے ـــــ"

نواب صاحب نے سوچا کہ اتنی دور اندیشی اُن کے کسی وزیر میں نہیں ہے۔ واقعی چند لاکھ ان کی پشتینی ریاست کے سامنے کیا وقعت رکھتے ہیں۔ ان کے دل سے سارا غبار ڈھل گیا۔ وہ دل ہی دل میں الٹے ڈاکٹر پیڈے کے احسانمند ہو گئے اور اپنی ہار کو انہوں نے جیت سے زیادہ قیمتی سمجھا۔ وہ ڈاکٹر پیڈے کو وزارت عظمیٰ کی پیشکش کے لئے پہلے ہی سے سوچ رہے تھے، آج انہوں نے مناسب سمجھا کہ وہ شملے میں ہی یہ اعلان کر دیں کہ ریاست کے وزیر اعظم کا عہدہ اب ڈاکٹر صاحب کو دیدیا گیا ہے۔

دوسرے دن جب اخبارات میں ڈاکٹر پیڈی کی وزارت عظمیٰ، ان کے حالات اور تعلیمی قابلیت اور ان کی شخصیت کا ایک مختصر سا خاکہ شائع ہوا تو ریاست میں بھی ہر طرف ان کا نام سنائی دینے لگا۔ اور وزیر مال اور سابق وزیر اعظم جو اب وزیر تعلیم بنا دیئے گئے تھے اپنی باہمی رقابت بھول کر حواس باختہ سے ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ دونوں رقیب ایک دوسرے کے سب سے بڑے غمخوار بن گئے اور ایک کنج میں بیٹھے ڈاکٹر پیڈے کو جی بھر کر گالیاں بکتے رہے اور اول فول سناتے رہے اور وسکی کی بوتلیں کھول کھول کر دل کا غبار نکالتے رہے۔

ڈاکٹر پیڈے جو اب شملے میں ڈاکٹر پیڈی کے نام سے ہر دلعزیز ہو چکے تھے۔ وزیر اعظم ریاست ہونے کے بعد اور

بھی زیادہ ہر دلعزیز ہو گئے تھے۔ شملے میں جن روساء اور معززین نے انہیں مبارک باد دی تھی ان سب کو انہوں نے ڈ
دیا۔ اس ڈنر میں میزبان ہونے کے باوجود اپنے حسن اخلاق اور خوبیوں کی وجہ سے سب سے ہر دلعزیز شخصیت وہ
خاندان کی حسین و جمیل بیگمات میں سے جو بہت مغرور رہتیں اور ان کے بڑے بڑے دانت دیکھ کر منہ پھیر لیا کرتی
وہ بھی اب ان کی طرف مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ اور تو اور وہ سب لڑکیاں جو ہمیشہ انہیں دیکھتے ہی کھسر پسر کر کے قہقہے لگایا کرتی تھ
کوٹ میں مسکرا کر گلاب کا پھول لگانا چاہتی تھیں۔ وہ اس تبدیلی سے بہت زیادہ خوش تھے۔ اب وہ بڑی آسانی سے کسی بھی لڑکی کو بیٹا کہہ کر اپنی
تھے اور اس کی چکنی اور سفید رانوں پر اس طرح ہاتھ پھیرتے جیسے وہ دودھ پیتی بچی ہے۔ ان کے منہ سے ایسے وقت
دو دانت زیادہ آگے آجاتے اور وہ سمجھدار بیٹیاں اپنے رومال سے ان کا منہ پونچھ دیتی۔ اور سہیلیوں میں بیٹھ کر سب
لگاتیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ FUN اب تک شملے میں انہیں نہ ملا تھا۔ انکل کتنے پیارے سینما دیکھنے کے لیے جب
روپیہ کا نوٹ دیتے ہیں۔ اور بعض بیٹیاں تو برج میں جیتی ہوئی رقم اس طرح مسکرا کر جیب سے نکال لیتیں کہ انہیں گ
نہ ملتی تھی — ! ان سب باتوں کے باوجود ڈاکٹر پیڈی اس بادشاہ کی طرح خوش تھے جس کے چھونے سے ہر چیز سونا
— ! انہیں روپیہ خرچ کرنے کا کوئی غم نہ ہوتا تھا۔ وہ جب چاہتے تھے سونا بنا لیتے تھے۔

لیلیٰ جو ہمیشہ ڈاکٹر پیڈی کو انتہائی نفرت سے دیکھتی تھی اپنی ماں کی ہدایت پر اُن کے بہت قریب آ گئ
ایک دن اس نے ان کے کوٹ میں گلاب کی ننھی منی کلی لگا کر کہا — "انکل میں چاہتی ہوں اس سال حضور مجھے اپنے
لے جائیں" اس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں امید سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر پیڈی نے اس کی خوبصورت
چھو کر کہا "لڑکی تیرے جانے کی ایک ہی ترکیب ہے"، "وہ کیا — !"

"برج کھیلا کر" اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر پیڈی کو دیکھا "انکل پیڈی مجھے تو in door games
ہی پسند ہیں۔" "لیکن بیٹا in door games کی اہمیت out door games سے بہت زیادہ ہے —
تمہیں in door games کھیلنا ہی ہوگا۔ اور اس دن کے بعد لیلیٰ ڈاکٹر پیڈی کی شاگرد بن گئی۔ اکثر جب نواب صا
شوق فرماتے تو وہ بڑے ادب سے کبھی ساری کبھی اسکرٹ اور شلوار قمیض میں مودب ان کے سامنے بیٹھ جاتی۔ اس
بال ماتھے پر ڈھلک آتے۔ موتیوں جیسے دانت چمکتے اور گلابی ہونٹوں کے کونے سکیڑ کر وہ شرارت بھری نظروں سے
"انکل پیڈی آج آپ ہم سے نہیں جیت سکتے —"

حضور نے پیچ پیچ چند ہی games اس کے ساتھ کھیل کر یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس سے کوئی نہیں جیت سکتا
ایسی ہی ننھی سی برج پارٹی میں انہوں نے یہ خوشخبری سنائی۔ "اب کے ہم لیلیٰ کو ولایت کی سیر کرائیں گے —" [illegible]
اس کے حلق سے شکریہ کے الفاظ بھی نہ نکل سکے۔ خوشی سے کانپتے ہوئے اس نے حضور کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور
— ! یہ بات کہ اب کے ولایت کے سفر میں ان کے ساتھ لیلیٰ ہوگی محل میں پَر لگا کر اڑی۔

ڈاکٹر پیڈی کے ساتھ لیلیٰ کی شہرت کا بھی ڈنکا بج گیا۔ اس روز لیلیٰ ڈاکٹر پیڈی کے کمرے میں گئی۔ اچانک
گلے سے لپٹ کر چٹ چٹ دونوں گالوں پر پیار کر کے بولی "Uncle Paddy you are so sweet"
اور اپنا اسکرٹ لہراتی ہوئی بھاگ آئی۔ ڈاکٹر پیڈی اس گرمجوشی سے شکریہ کے اظہار پر بھونچکے سے رہ گئے — !

۶

جب ٹونی کو اس نے گھوڑے پر بیٹھے ہوئے دور سے دیکھا تو اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتی ہوئی اس کے پاس گئی۔ اور اسے یہ خوشخبری سنائی ٹونی کے چہرے پر رقابت اور خوشی کے ملے جلے جذبات نے کچھ ایسا تاثر پیدا کیا کہ وہ گھوڑے کی باگیں تھامے اسے خاموشی سے تکنے لگا۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا ۔۔ ! "خوشی ہونا چاہیئے تجھے ۔۔۔ میں جب ولایت سے واپس آؤنگی تو ہماری شادی ہو جائے گی۔ صرف چھ ماہ بعد ! اور وہ گھوڑے سے کود کر ٹونی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی اور پھر سب کچھ بھول کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ اس لمحہ اس کا دل چاہا۔ کاش وہ اس بڈھے کھوسٹ نواب کے ساتھ ولایت جانے کے بجائے اپنے ٹونی کے ساتھ ولایت جاسکتی ۔ کیسا مزا آتا ۔۔ ! وہ دونوں خوب ڈانس کرتے اکٹھے گھومتے پھرتے۔ تھیٹر دیکھتے ۔۔۔ اور وہ تمام نئی نئی تفریحات جو اسے صرف ولایت میں میسر ہوتیں ٹونی کے ساتھ کرسکتی ۔۔ ! اس کے خوبصورت چہرے پر اداسی پھیل گئی ۔۔ ! "آؤ ٹونی چلیں ۔۔۔ ٹونی بھی شاید ایسی ہی باتیں سوچ کر چپ تھا وہ دونوں خاموشی سے اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ گئے ۔۔ !

جب لیلیٰ اور ٹونی بینڈسٹینڈ پہنچے تھے اسی وقت ڈورتھی اور ولیم بھی وہاں آگئے ۔۔۔ ! یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت کھلا ہوا آراستہ باغ تھا جس میں گول چبوترہ بنا ہوا تھا اور شام کو بینڈ بجایا جاتا تھا ۔۔۔ ! لڑکے لڑکیاں عموماً یہاں بینڈ سننے آیا کرتے تھے۔ لیلیٰ نے بینڈ کے شور میں ڈورتھی کے پاس آہستہ سے کہا کہ وہ اسے صرف چند ماہ بعد ولایت میں ملیگی اور ڈورتھی خوشی سے تالی بجا کر اس کے قریب آگئی ۔۔۔ ! جب بینڈ ماسٹر نے اپنی ننھی سی چھڑی کے اشارے سے اپنے طائفہ کو خاموش کیا تو وہ دونوں باتیں کرنے لگیں۔ " ڈورتھی بولی کیا تمہارے ڈیڈی کا ٹرانسفر ہو گیا ۔۔۔ " نہیں ۔۔ " "
پھر کیا تم پڑھنے جارہی ہو ۔۔ ؟ ٹونی بھی جائے گا !" " نہیں "

" پھر پھر ۔۔ " ڈورتھی کی پھر پھر کے جواب میں اسے یہ کہتے ذرا اچھا نہ لگا کہ میں ہز ہائی نس دی گریٹ کے ساتھ جارہی ہوں "

" تم ان کے قریبی رشتہ دار ہو ۔۔۔"

" ہاں وہ میرے انکل ہوتے ہیں دور کے رشتے سے ۔۔ !

اور پھر وہ دونوں خاموش ہوگئیں ۔۔۔ لیلیٰ نے اس موضوع کو زیادہ پھیلانا پسند نہ کیا۔ وہ اسے کیسے بتائے کہ وہ ان کی کنیز کی طرح جا رہی ہے ۔۔۔ ان کا دل بہلائے گی ۔۔ ! جب ڈورتھی نے دوبارہ پوچھا ان کے ساتھ کیا آپ لڑکیاں جائیں گی تو وہ مسکرا کر بولی ۔ " دراصل میں ان کی سکریٹری کے طور پر جا رہی ہوں " اس نئے رشتے کو غالباً ڈورتھی بھی خوب سمجھتی تھی وہ زیر لب مسکرائی اور بولی " یہ تو بہت اچھی بات ہے " ! ان دونوں نے طے کر لیا کہ شملے سے واپسی پر وہ ایک دوسرے کا پتہ لے لینگی۔ ڈورتھی چھٹیوں میں پاپا کے پاس ہندوستان آئی تھی۔ اسکول کھلتے ہی وہ انگلستان چلی جائیگی ۔۔ اور یہ کتنی خوشی کی بات ہوگی کہ وہاں جانے پر اس کی دوبارہ لیلیٰ سے ملاقات ہوگی ۔۔ ! ٹونی اور ولیم شکار کا پروگرام بنا رہے تھے ۔۔۔ ! دونوں نے ان کی گفتگو سنی مگر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ ٹونی اس موضوع کو غالباً چھیڑنا نہ چاہتا تھا اور ولیم کی سلجھی ہوئی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک بہت مہذب لڑکا ہے جسے دوسروں کے جذبات کا احترام کرنے کی تعلیم دی گئی ہے ۔۔ ! دونوں بہن بھائی جب رخصت ہوئے تو ٹونی اور لیلیٰ نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہا " ہم ہمیشہ ہمیشہ ایک دوسرے کے رہیں گے !" اور اس شام اندھیرا ہونے تک وہ ایک دوسرے کا سہارا لئے ایک چٹان پر بیٹھے رہے۔

نواب صاحب اپنے عقلمند وزیراعظم سے بہت خوش تھے۔ انہیں امید تھی کہ ڈاکٹر پنڈے کی سوجھ بوجھ اور دور اندیشی سے ریاست کے معاملات سلجھ جائیں گے۔ جوڑ توڑ کرنے والے منہ کی کھائینگے۔ اور اسٹیٹ کانگریس نے جو شور مچا رکھا ہے وہ اب ختم ہوجائے گا۔ وائسرائے عنقریب ریاست کا دورہ کریں گے اور ڈاکٹر پنڈے کے وائسرائے سے تعلقات اب اتنے زیادہ بڑھ گئے ہیں اور خود وائسرائے ان سے جس طرح اخلاق سے ملتاہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وائسرائے انکی ریاست سے مطمئن واپس آئے گا۔ نواب صاحب کو اب پریشان اور فکرمند ہونے کی مطلق ضرورت نہ ہوگی۔ اب انہیں کسی بھی مسئلے کے بارے میں پریشان نہ ہونا پڑے گا۔ وہ اپنے محل میں راجہ اندر بن کر بیٹھا کریں گے۔ ریاست کی حسین عورتوں کی رقابت سے انہیں لطف آتا تھا لیکن وزراء اور امراء کی رقابتیں ان کی برداشت سے باہر تھیں۔ اور ان کے امراء اور وزراء کی کمزوریوں کی وجہ سے اسٹیٹ کانگریس کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا تھا مگر اب ڈاکٹر پنڈے تمام مسائل حل کریں گے۔ ان کے دو بڑے بڑے سورج جیسے دانت نواب صاحب کی نظروں میں امید کے دو درخشاں ستارے تھے۔!

ڈاکٹر پنڈی شملہ میں اب بہت ہی ہر دلعزیز شخصیت بن چکے تھے بہت سے سول اور فوجی افسروں کی انہوں نے انہی برج پارٹیوں میں ترقی کا بندوبست کر دیا تھا۔ بہت سے لوگوں پر سینکڑوں چھوٹے موٹے احسان کر چکے تھے۔ اس طرح تاش کے پتوں سے بھی وہ نیکی کما رہے تھے —! برطانوی ہند کے انگریز افسروں میں بھی وہ بہت مقبول تھے اور وائسرائے بھی ان سے بے تکلفی سے ملنے لگے تھے —! نواب صاحب کو ڈاکٹر پنڈے اور وائسرائے کے میل جول سے اور زیادہ خوشی تھی۔ وہ سوچا کرتے تھے کہ ریاست کے نقطہ نظر سے یہ میل جول بہت ضروری ہے۔ سارے دن ڈاکٹر صاحب کے فون آتے تھے۔ پارٹیوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ — وہسکی — باتیں — پتے —! اب ان سب چیزوں سے وہ تھک چلے تھے — مگر وہ خوش تھے کہ اب وائسرائے بھی جلد شملے سے جانے والے ہیں اور نواب صاحب بھی ان کے جاتے ہی چلے جائیں گے — نواب صاحب کا اعتماد دن بدن مضبوط ہوتا جا رہا تھا —! اور محل کی بیگمات بھی ان کی خاطر مدارات میں لگی رہتی تھیں — وہ ادب کے ڈاکٹر تھے مگر باتوں کی چاشنی اس بات کا ثبوت تھی کہ اگر قلم اٹھاتے تو خود بھی بہت بڑے ادیب ہوتے۔ اب جب کہ وہ ریاست کے وزیراعظم ہوئے تو سب نے محسوس کیا کہ اس عہدے کے لئے ان سے زیادہ موزوں آج تک کوئی نہ ملا تھا۔ نواب صاحب انہیں پیدائشی سیاست دان سمجھتے تھے —! اور اب ان کے اور وائسرائے کے تعلقات دیکھتے ہوئے وہ پھولے نہیں سما رہے تھے!

ایک شام جب وہ وائسرائے کے ہاں سے برج کھیل کر لوٹے تو ان کا چہرہ مسرت سے گلنار ہو رہا تھا اور ان کے دونوں دانت خوشی سے چھلانگ لگانے کے آرزومند نظر آتے تھے — وہ سیدھے تیزی سے حضور کی قیامگاہ میں داخل ہوئے — داخلہ کی اجازت فوراً مل گئی! لیکن چند ہی لمحے بعد وہ اسی دروازے سے اس طرح بھاگ کے چکنے فرش پر دھڑام سے گر پڑے۔ ان کے سامنے کے دو بے عزت دانت آخر کار آدھے جھڑ گئے۔ انہوں نے اپنا سفید رومال منہ پر رکھ لیا اور خون آلود ہونٹوں کو صاف کیا۔ لیلیٰ انہیں گرتے دیکھ کر اپنے کمرے سے دوڑی مگر اس کے آنے سے پہلے ہی وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے اور ایک منٹ ضائع کئے بغیر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو انہوں نے خود ہی ڈریسنگ کی اور اپنے آدھے ٹوٹے ہوئے دانتوں کو دیکھ کر سوچا کہ اب وہ ولایت جا کر خوبصورت

سانپنا دانتوں کا بیٹ گوائیں گے۔

نواب صاحب غصہ میں وہسکی کی بوتلیں توڑ رہے تھے اور ڈاکٹر بیڈے کو مغلظات سنا رہے تھے — حرام خور پاجی — کمینے —— اور بدمعاش جیسے لفظ باربار فضا میں گونج رہے تھے۔ نواب صاحب کے دوسرے سکریٹری معززین اور بیگمات سب خاموش تھے — ! جب وہ دل بھر کر ڈاکٹر بیڈے کو صلواتیں سنا چکے تو انہوں نے سب کو میز پر پڑا ہوا سفید کاغذ دکھایا —— یہ ڈاکٹر بیڈے کا استعفےٰ تھا۔ انہوں نے بڑے ادب سے درخواست کی تھی کہ نواب صاحب انہیں وزیراعظم کے عہدے سے سبکدوش کردیں۔ تاکہ وہ وائسرائے کے ساتھ ولایت جاکر وہاں چند برج پارٹیوں میں شرکت کرسکیں — !

"سنا وہ سور کا بچہ وائسرائے بہادر کے ہمراہ ولایت جارہا ہے — برج کھیلنے — !" سب نے رشک سے ایک دوسرے کو دیکھا — اور سوچا کہ واقعی وزارت عظمیٰ ڈاکٹر بیڈے کے لائق نہ تھی۔ اب وہ ولایت سے واپسی پر غالباً وائسرائے کی کابینہ کے ہندوستانی وزیر ہوں گے یا کسی صوبے کے ہندوستانی گورنر —— !

جب وسکی کا نشہ ذرا کم ہوا تو نواب صاحب کا غصہ کچھ سوچ کر ایکدم سرد پڑ گیا — ! انہیں اپنے جذباتی اور نوابی خون پر غصہ آیا۔ ناحق انہوں نے سب کے سامنے ڈاکٹر بیڈے کو باتیں سنائیں۔ اب نمک حرام لوگ نمک مرچ لگا کر ڈاکٹر بیڈے کو ان سے بدظن کریں گے —— اور وہ خود اپنے کانوں سے سن کر گئے ہیں وہ باتیں بھی بہت افسوسناک تھیں — کاش ایسا نہ ہوتا۔

نواب صاحب نے میکاڈلی کو پڑھا تھا اور وہ حکومت کرنے کے اصول جانتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ وزیراعظم کی خدمات کا ایک بیان میں اعتراف کریں گے۔ انہیں خلعت دیکر اعزاز کے ساتھ رخصت کریں گے۔ اور اپنے چند معززین کے ساتھ انہیں الوداع کہنے بھی جائیں گے —— ! ویسے بھی وائسرائے بہادر کے رخصت کرنے کو وہ جانا چاہتے تھے۔ ! جانے پر وہ وائسرائے بہادر سے پہلے ڈاکٹر بیڈے سے گرمجوشی سے ہاتھ ملائیں گے اور پھر سب کام درست ہوں گے۔

چھوٹی بیگم نے حیران ہو کر اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکائیں اور نازک ہونٹوں کو جنبش دی "حضور آپ ایسے نمک حرام آدمی کو خلعت دیں گے — رخصت کریں گے — تو دنیا کیا کہے گی — "

"بیگم اس کا وائسرائے کے ساتھ رہنا اچھا ہے وہ ہمارا وفادار خادم ہے۔ اس نے ہماری ریاست کی بڑی خدمت کی ہے۔ اور اب جب وہ وائسرائے کی کابینہ میں شامل ہوگا تو ہمارے اور زیادہ کام آئے گا اور ہماری قدر کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ واقعی وہ آدمی کھیل کا فن جانتا ہے — ہم نے اس جیسا برج کھیلنے والا ہندوستان تو کیا یورپ میں بھی نہیں دیکھا — وہ برج کا بادشاہ ہے — !"

سب نے تعظیم سے سر جھکا کر کہا "جی حضور بجا فرمایا وہ واقعی "برج کا بادشاہ" ہے

کوثر چاندپوری

شری رام ناتھ

شری رام ناتھ جی سے شیک ہینڈ کرتے ہوئے آپ کو ہچکچانا نہیں چاہیئے اب وہ صرف باربر ہی نہیں ناتھ ہیر کٹنگ سیلون کے اکلوتے پروپرائیٹر بھی ہیں۔ بلکہ پروپرائٹر اور سیاسی رہنما زیادہ اور باربر کم ہیں۔ دیکھیئے قیمتی بش شرٹ اور چست پینٹ ان کے بدن پر کتنا سج رہا ہے۔ ٹھیک ہے کہ ان کی مونچھیں ماڈرن ٹائپ کی نہیں لیکن سر سے پاؤں تک وہ جدید خصوصیات کا آئینہ ہیں۔ ان کی آنکھوں پر لگے ہوئے ہلکے نیلے آئینوں اور سنہری کمانی والے چشمہ نے مونچھوں کی قدامت کے علاوہ چہرے کے ہر عیب کو چھپا کر انھیں بہت زیادہ رعب دار بنا دیا ہے بھاری بھرکم جسم پر ٹیڈی قسم کا لباس بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے مندر کا کلس آتار کر کسی نے گرجا کی صلیب لگا دی ہو۔ پانچ سیٹوں والا ناتھ ہیر کٹنگ سیلون بڑی خوبصورت سڑک پر واقع ہے اس کی سجاوٹ میں حسن اور آرٹ کی بہت سی خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ قیمتی اور خوبصورت آئینوں کے علاوہ وہاں ریڈیو ہے، بجلی کے پنکھے ہیں، دلکش مناظر اور تاریخی عمارات کی تصاویر ہیں، مشہور نیتاؤں کے فوٹو ہیں۔ ناتھ سیلون کوئی ایسا ہوائی قلعہ نہیں ہے جو آپ ہی آپ زمین پر اتر آیا ہو۔ اس کے پیچھے ایک شاندار ماضی اور اس کی تاریخ ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں باربر کی معمولی دکان تھی جہاں زنگ آلود مشینوں اور دیسی استروں سے حجامت بنائی جایا کرتی تھی۔ اس میں صرف ایک کرسی تھی اس کے سامنے آئینہ لگا ہوا تھا جس پر مختلف غازوں اور کریموں کی خالی شیشیاں رکھی رہتی تھیں۔ شری رام ناتھ جی میلی دھوتی پر میلی سی قمیص پہنے بال کاٹنے اور شیو بنانے اور سر پر تیل کی مالش کرنے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اسوقت ان کی مونچھیں اتنی لمبی نہ تھیں کہ انھیں برگد کی داڑھی یا سامر کے سینگوں سے تشبیہہ دی جا سکتی۔ صبح کو نو بجے سے بارہ بجے تک وہ گھروں پر جا کر اس سماج کے بڑے آدمیوں کی کٹنگ کیا کرتے تھے۔ ان کی چرب زبانی ہمیشہ ہی مشہور رہی ہے۔ گفتگو کے دوران وہ اردو کے شعر اور ہندی کے دوہے پڑھنے کے شروع سے عادی رہے ہیں لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے انداز بدلتے گئے۔ وہ زمانہ ساز ہوں یا نہ ہوں وقت شناس ضرور ہیں۔ سماج کی کروٹوں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ شری رام ناتھ ایک ایسی ریاست کے رہنے والے ہیں جہاں خوشامد کو عزت حاصل کرنے کا بہترین وسیلہ خیال کیا جاتا رہا ہے اور ہر چھوٹا آدمی بڑے آدمی کی چاپلوسی کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتا رہا ہے۔ رام ناتھ جی کو اس آرٹ میں زبردست مہارت حاصل ہے وہ جس کسٹمر کا شیو بناتے ہیں اس کے رخساروں کی نرمی، بالوں کی سیاہی اور پیشانی کی موزونیت پر نثری قصیدہ بھی ضرور پڑھتے ہیں۔

آپ کے گال کیا ہیں۔ حضور سچ مچ روئی کا گالا ہیں۔ نرم، ملائم، چمکدار، بالکل ریشم کے لچھے معلوم ہوتے ہیں اور ان کی سیاہی تو کالے ناگ کے رنگ کو بھی مات کرتی ہے۔

سرکار چوڑی پیشانی والا آدمی بڑا خوش نصیب ہوتا ہے کیا کہنے ہیں اس چوڑے ماتھے کے۔

ریاستیں باقی نہ رہیں اور وہ خصوصیات بھی زوال پذیر ہونے لگیں جو اس ماحول کی دین تھیں تو رام ناتھ جی نے بھی ترقی پسندی کا ثبوت دیا اور پرانی کینچلی اتار کر نیا لباس زیب تن کر لیا۔ مونچھیں بڑھائیں پینٹ اور بش شرٹ پہننے لگے۔ دکان کو رفتہ رفتہ ترقی دیکر سیلون کی شکل میں منتقل کر دیا۔ اس کے اوپر ناتھ ہیر کٹنگ سیلون کا بورڈ لگا دیا۔ اب اس میں ہر طرف آئینے ہی آئینے نظر آتے ہیں۔ سیلون میں داخل ہوتے ہی ایک شخص آٹھ دس شخصیتوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ آئینوں پر سرخ حروف میں موزوں عبارتیں لکھی ہوئی ہیں۔ راجوں مہاراجوں پہلوانوں اور طوائفوں کی تصاویر نوچ کر پھینک دی گئی ہیں۔ ان کی جگہ بڑے بڑے نیتاؤں کے فوٹو لگا دیئے گئے ہیں۔ جب وزارت بدلتی ہے سیلون کی پرانی تصاویر بھی دیواروں سے غائب ہو جاتی ہیں اور ایک ہی رات میں نئے وزیروں کے فوٹو لگا دیئے جاتے ہیں۔ شری رام ناتھ جی درحقیقت اوپر ہی سے بدلے ہیں ان کی فطرت میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ وہ خوشامد اب بھی کرتے ہیں اس کا طریقہ ضرور بدل گیا ہے ان کا عقیدہ ان کے تجربہ سے اس معاملہ میں بالکل ہم آہنگ ہے کہ خوشامد کے انداز تغیر پذیر ہو سکتے ہیں مگر اس کی تاثیرات وہی رہینگی۔ رام ناتھ جی سیلون کے پروپرائٹر ہیں، اشتہارات میں بھی ان کے نام کے ساتھ اسی عہدے کا اعلان ہوتا ہے بلکہ نئے ہینڈبل ان کی تصویر سے بھی مزین ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی مونچھوں سے بہت زیادہ محبت ہے ان میں دونوں وقت تیل لگاتے ہیں اور اتنا تاؤ دیتے ہیں کہ بال ٹوٹنے لگتے ہیں۔ وہ اب معمولی مشین سے بال نہیں کاٹتے۔ اس کام کے لئے انھوں نے برقی مشین منگالی ہے۔ جس قینچی سے کٹنگ کرتے ہیں وہ بھی بہت قیمتی ہے۔ ان کی قینچی اتنی نہیں چلتی جتنی زبان چلتی ہے۔ وہ کسی وقت اور کسی معاملہ میں زبان بند نہیں رکھتے۔ سیلون میں آنے والوں کا نہایت گرم خیر مقدم کرتے ہیں۔ اسوقت ان کے لبوں پر بڑی دلفریب قسم کی مصنوعی مسکراہٹ ہوتی ہے کسٹمر کے اندر آتے ہی وہ کہتے ہیں۔

آئیے شریمان جی

سیٹ خالی نہیں ہے سرکار صوفہ پر بیٹھئے اخبار موجود ہیں ان میں تازہ خبریں پڑھئے۔

دیکھئے دیس میں کہاں دنگے فساد ہو رہے ہیں،

اور طوفان کا تو تانتا بندھا ہوا ہے گاؤں اس طرح بہ رہے ہیں جیسے بچپن میں ہماری کاغذ کی کشتیاں بہا کرتی تھیں۔

ہندی سندھی اردو پنجابی گجراتی غرض پوری چودہ زبانوں کے اخبارات میز پر بکھرے رہتے ہیں۔ اگر کسی نے ان میں سے کوئی اخبار نہ اٹھایا تو رام ناتھ جی آپ ہی کوئی تازہ روزنامہ اٹھا کر اس کے سامنے ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

پڑھئے حضور یہ کٹنگ پوری کر کے آپ ہی کو سیٹ پر آنے کا کشٹ دونگا۔ اور جب نئے کسٹمر کو سیٹ مل جاتی ہے تو اس کے سارے دکھ درد دور ہو جاتے ہیں۔ رام ناتھ جی ایسی ایسی خبریں سناتے ہیں کہ ہفتہ بھر کا مطالعہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

دیکھئے سرکار ساون آگیا۔ کیا موسم ہے حضور برسات کا ــ آسمان پر کالے کالے بادل زمین پر سنگتے شیلوں پر پیلے پیلے آم اور نیلی نیلی جامنیں سچ پوچھئے تو برکھا رت کا مزہ دیہات میں آتا ہے۔ مور کی جھنکار اور پپیہے کی پی کہاں کی آواز وہ سماں باندھتی ہے کہ جنم جنم کے رستے ہوئے زخم بھر جاتے ہیں۔ یہ دونوں پرند اپنے دیس کے کونوں میں گنے جاتے ہیں۔

ایک کو توہی پر نما مان لیا گیا ہے اور دوسرے کا حال ان میلاؤں سے پوچھئے جن کے گھر والے پردیس میں ہیں۔ ان کے ساون بھادوں کی جھڑی میں بھی جیٹھ بیساکھ جیسی لو چلتی ہے۔

وہ صابون کے جھاگوں میں ڈوبا ہوا برش رخساروں پر پھیرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کٹنگ ختم ہو کر شیونگ کی نوبت آگئی ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ پلک جھپکتے ہی ہو گیا۔ رام ناتھ جی کالے دستہ کا چکیلا استرا چلاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے چہرے پر ہلکے ہاتھوں سے کریم لگا رہے ہوں۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ لوہا داڑھی کے سخت بالوں سے زور آزمائی کر رہا ہے کٹنگ کے دوران رام ناتھ جی شعر سنانے کے علاوہ کبھی کبھی مشین، قینچی یا استرے کی تعریف بھی کرنے لگتے ہیں!

قینچی کی دھار جس کاریگر سے بنواتا ہوں وہ شہر کا سب سے بڑا فن کار ہے۔ دیکھئے قینچی کی آواز ہی آرہی ہے یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ بال بھی کٹتے جا رہے ہیں۔

قینچی کی رفتار لال پری کے رقص سے کسی طرح کم نہیں۔

اور ایسے اُسترے تو اب کہیں ملتے ہی نہیں۔ جب میں نے یہ اُسترا خرید اتھا دلیس میں آزادی کی لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ لوگ جیل جا رہے تھے پوسٹر لگانے کو کہیں جگہ نہیں ملتی تھی۔ میرا ہی کلیجہ تھا کہ دوکان کے کواڑ اشتہاروں کے لئے وقف کر دئیے تھے۔

رام ناتھ جی کی مونچھوں کے بال جس قدر سخت ہیں انگلیاں اتنی ہی نرم ہیں۔ وہ پانی اور تیل ڈال کر آہستہ آہستہ انگلیوں سے سر دباتے ہیں تو نیند آنے لگتی ہے۔ دماغ سے تمام کرب ناک خیالات غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کی لمبی اور پتلی انگلیوں کے لمس میں کلور وفارم کا اثر ہے۔ پورے سر میں ٹھنڈک سی بھر جاتی ہے اور حواس پر نشہ سا چھا جاتا ہے آدمی بے اختیار اونگھنے لگتا ہے

رام ناتھ جی سیلون میں کام کرنے والے چار کاریگروں کے افسر ہیں۔ یہ کاریگر غالب کے کہاروں سے زیادہ ذہین اور سمجھدار ہیں ان میں سماجی شعور بھی ہے اور سیاسی بھی، رام ناتھ جی درمیانی سیٹ کے انچارج ہیں۔ گویا ان کے پاس وزارت عظمیٰ کا پورٹ فولیو ہے اس سیٹ پر کٹنگ کی اجرت کچھ زیادہ ہے۔ ناخن تراشی سیلون کے معیار سے بہت گری ہوئی چیز ہے۔ یہ کام باہر فرش پر بیٹھے ہوئے ایک معمولی باربر کے سپرد ہے۔ ناتھ سیلون میں دال چل پان اور چائے وغیرہ کا بجٹ بھی ہے۔ ان کا تعلق رام ناتھ جی کی ذات سے ہے۔ خیرات کے پیسے وہ عام رواج کے خلاف جوان اور تندرست فقیروں کو دیا کرتے ہیں۔ چائے کافی اور پان کی پیشکش میں بھی کوئی گہرا راز کارفرما رہتا ہے۔ بعض لوگوں کی بات تک نہیں پوچھی جاتی اور بعض ایسے کسٹمر ہوتے ہیں جن کے لئے سب کچھ منگالیا جاتا ہے۔ آنے والوں کی درجہ بندی ان کی ذہنی چیز ہے۔ جب کوئی ایسا گاہک آجاتا ہے تو وہ لہجہ میں لوچ پیدا کر کے پوچھتے ہیں۔

چائے تو چلیگی سرکار

اور سگریٹ

اچھا کوکو کولا

ان سب پیشکشوں کو نا منظور کر دیا جاتا ہے تو وہ بغیر پوچھے پانوں کی تھالی بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

پان تو کھانا ہی پڑے گا حضور

ناتھ سیلون میں کٹنگ کی اجرت عام طور پر دوگنی لی جاتی ہے۔ یہاں زیادہ تر وہی لوگ آتے ہیں جو اتنی اجرت دے

سکتے ہیں بلکہ دینا چاہتے ہیں۔ رام ناتھ شکل و صورت سے آدمی کی حیثیت کا پتہ چلانے میں بڑی ذہانت سے کام لیتے ہیں۔ سڑک پر چلتے چلتے کوئی شخص بورڈ پڑھنے کے بعد سیلون میں آنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ فوراً پہچان لیتے ہیں کہ یہ دو دو آنے پر جھگڑنے والا تھرڈ کلاس کسٹمر ہے یا پانچ روپئے کا نوٹ دیکر بقیہ کی واپسی کا انتظار کئے بغیر سیٹ چھوڑ دینے والا صاحب ہو صلا انسان تھرڈ کلاس کسٹمر کو وہ اپنے کسی ماتحت باربر کے حوالے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

صاحب کو اپنی سیٹ پر بٹھا دیں جن لوگوں سے اچھی توقعات ہوتی ہیں ان کو اپنی کرسی پر بٹھلاتے ہیں اور الماری سے دھلا ہوا سفید تولیہ نکال کر تصاویر کا البم دکھلاتے ہوئے سوال کرتے ہیں :۔

تبائیے حضور کس نمونے کی کٹنگ کردوں اس البم میں مشہور اداکاروں اور فوجی افسروں کے فوٹو لگے ہوتے ہیں ـــ رام ناتھ جی ان میں سے ہر اداکار اور افسر کے طرز کی کٹنگ کر دیتے ہیں۔

شیروانی اور پاجامے والے کسٹمر سے ان کا سلوک حقارت آمیز تو نہیں ہوتا لیکن لب و لہجہ میں مزاح ضرور جھلک آتا ہے سب سے پہلے وہ پوچھتے ہیں۔

اچکن حیدرآبادی معلوم ہوتی ہے ؟

علیگڑھ کا درزی اتنی اچھی شیروانی نہیں سیتا۔

یہ سوال درحقیقت اس موضوع پر بات کرنے کا موقع فراہم کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے اس کے بعد وہ حیدرآباد۔ علیگڑھ۔ دہلی اور بھوپال کے کاریگروں کی ایسی ایسی خصوصیات بیان کرتے ہیں کہ سننے والا حیران رہ جاتا ہے۔

بھوپالی شیروانی کا کالر چوڑا ہوتا ہے چلتے وقت اس کے دامن نہیں کھلتے ۔ اور دلی کی شیروانی کا کیا پوچھنا کمر اور سینہ پر ذرا سا جھول بھی تو دکھائی نہیں دیتا اور جب سنہ ۲ سے اُدھر کا شاعر گلے تک بٹن لگا لیتا ہے تو شیروانی بالکل منڈھ جاتی ہے جسم پر

ناتھ سیلون ادیبوں، شاعروں، افسروں اور صاف ستھرے آدمیوں کا ایسا مرکز ہے جہاں یہ لوگ محض باتیں کرنے، اہل معاملہ سے ملنے اور شعر سننے یا سنانے کے شوق میں بھی کٹنگ کرانے آجاتے ہیں۔ بعض شاعر تو رام ناتھ جی اور ان کے کاریگروں کو غزلیں سنانے ہی آتے ہیں۔ ایک افسانہ نگار کو چند بار کہانی پڑھتے دیکھا گیا ہے۔ جو چیزیں سیلون میں پڑھی جاتی ہیں ان پر تنقید بھی ہوتی ہے لطف یہ ہے کہ تنقید میں حصہ لینے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو کرسیوں پر بیٹھے کٹنگ کراتے رہتے ہیں یا صوفہ پر بیٹھے اخبار پڑھنے میں معروف ہوتے ہیں شری رام ناتھ پروپرائٹر اور اُن کا ماتحت عملہ بھی اس بحث میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔

رام ناتھ جی ہر موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں پہلے وہ ذرا محتاط تھے اب بہت آزاد خیال بن گئے ہیں سماجی۔ سیاسی، اصلاحی، تاریخی ادبی غرض کوئی گفتگو ہو وہ نہایت روانی کے ساتھ اس پر اپنی رائے پیش کر دیتے ہیں آجکل ان کی سیاسی معروفیتیں سارے مشاغل پر غالب آگئی ہیں۔ بڑے بڑے سیاست داں سیلون میں کٹنگ کرانے آتے ہیں۔ الیکشن ناتھ سیلون سیاست کا بہت بڑا مرکز بن جاتا ہے۔ رام ناتھ جی جس امیدوار کے لئے چاہتے ہیں میدان ہموار کر دیتے ہیں۔ وزارتیں بنانے اور بگاڑنے میں بھی وہ بہت اہم پارٹ ادا کرتے ہیں۔ ان کے سیاسی نظریات اسی درمیان میں بار بار بدلتے

رہتے ہیں۔ آج ایک جماعت کی حمایت کر رہے ہیں کل دوسری پارٹی کی طرفداری میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ سیاست کوئی شانت سنگر تھوڑا ہی ہے اس میں تو ہر آن طوفان آتے ہیں اور مناظر بدلتے رہتے ہیں۔

رام ناتھ جی مجھ پر خاص طور سے مہربان ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں نے اسوقت ان پر ایک خاکہ لکھا تھا جب وہ صرف باربر تھے۔ ناتھ سیلون کے پروپرائٹر بننے کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ شہر میں صرف ایک ایسا تاریخی آدمی رہ گیا ہوں جو ان کی پوری لائف سے باخبر ہے۔ وہ سارے جاگیردار مرچکے ہیں یا معزول ہوگئے ہیں جو انھیں رامو یا نھوا، کہکر پکارا کرتے تھے اب کوئی ایسی جرأت نہیں کرسکتا یہ رام ناتھ جی کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ میں شروع ہی سے ان کو شری رام ناتھ جی کہتا آیا ہوں۔ ممکن ہے کہ میری یہی بات انھیں پسند ہو۔ ان کی یہ وضعداری قابل تعریف ہے کہ مجھ سے اب بھی کٹنگ کی وہی اجرت لیتے ہیں جو دوکان کے عہد تاریک میں لیا کرتے تھے۔ ایک روز میں ناتھ سیلون میں داخل ہوا تو رام ناتھ جی ایک بہت بڑے افسر کا شیو بنانے کے بعد اس کے رخساروں پر نہایت خوشبودار کریم لگا رہے تھے اور وہ کرسی کے تکیہ سے ٹکا آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد اس کے منہ سے خراٹوں کی بھیانک آوازیں نکلنے لگیں۔ رام ناتھ جی مسکرا کر بولے۔

بولو رام رام ست ہے۔

رام ناتھ جی کا شمار ان خوش نصیب افراد میں ہے جو اپنے پیشہ کو دنیا بھر کے پیشوں سے افضل سمجھتے ہیں انھوں نے اسی پیشہ میں ترقی کی ساتوں منزلیں طے کی ہیں۔ اسوقت وہ شہر کے ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں قسمتیں بدل دینے کی طاقت ہے اور یہ سب کچھ باربری کی دین ہے۔

آج ابھی ابھی یہ خبر سننے میں آئی ہے کہ شری رام ناتھ جی کا دیہانت ہوگیا۔ باربروں کی دوکانیں، جلدی جلدی بند ہو رہی ہیں۔ سیلون سنسان ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک جیپ پر اس بری خبر کا اعلان کیا جا رہا ہے ان کی موت پر ایک دور کا خاتمہ ہو رہا ہے سوچتا ہوں شہر میں سب سے پہلا سیلون بنانے والا یہ شخص کیا مرا کٹنگ اور شیونگ کی آبرو اٹھ گئی۔ قریب ہی ایک چوراہہ پر چند آدمی اکٹھا ہیں۔ گفتگو رام ناتھ جی کے متعلق ہو رہی ہے ایک کہہ رہا ہے کہ ان کی ارتھی کو پھولوں سے سجایا جائے گا۔ ممکن ہے کٹے ہوئے بالوں سے آراستہ کیا جائے۔

دوسرا بول اٹھتا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس پر قینچیوں اور استروں کی جھالر لگائی جائے۔

ایک مسخرے نے کہا ہے اس زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ صرف ایک گرگٹ لگا دیا جائے۔ ان کی پوری زندگی کی ترجمانی ہو جائے گی!

ہنسراج رہبر

سچائی کی تلاش

—— مجاز کے نام ——

(ایک فینٹسی)

ہماری اس بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کی بات ہے سندیش اور سروپ یونیورسٹی میں ہم سبق تھے۔ سندیش ایک اچھا شاعر تھا، اور بھی اچھا بننا چاہتا تھا اور بننے کی اس میں صلاحیت بھی تھی۔ تنگ منہ، پتلے پتلے ہونٹ، مختصر سا تیلا دبلا جسم وہ بہت آہستہ آہستہ بولنے کا عادی تھا لیکن لوگ اس کی بات دھیان سے سنتے تھے۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ وہ نئی فکر اور نئے شعور کا مجسمہ سا معلوم ہوتا تھا۔

سروپ جو سندیش کی دوستی کا دم بھرتا تھا لمبا، تگڑا، سڈول جسم کا نوجوان تھا۔ وہ بھی شاعر تھا سندیش جو بات آہستہ آہستہ نرم لہجے میں اختصار سے کہتا تھا سروپ اسے۔۔۔ گھن گرج کے انداز میں پھیلا کر ڈرامائی انداز میں ادا کرتا تھا۔ جوشیلے نوجوان اس کے ڈرامائی انداز سے متاثر ہوتے تھے اور اسی کو وہ اپنی کامیابی سمجھتا تھا۔ مگر کچھ سنجیدہ اور متین لوگ ایسے بھی تھے کہ جب سروپ شعر پڑھتا تھا تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے اگر آواز بہت زیادہ اونچی ہوتی تو "توبہ! توبہ" بھی کر اٹھتے تھے۔

سروپ ہمیشہ سائے کی مانند سندیش کے ساتھ ساتھ رہتا تھا، مدعا شاید لوگوں کو اپنی دلی دوستی کا یقین دلانا تھا۔ سندیش جو بھلا اور کم گو شخص تھا اس کی معیت میں یوں خوش رہتا تھا جیسے اس کے نحیف جسم کو سندیش کے لمبے تگڑے اور بھاری بھرکم جسم کا سہارا درکار ہو اور دونوں میں لطافت اور کثافت کا قدرتی اور ناگزیر رشتہ ہو۔ پھر سندیش کو چپ رہنا زیادہ پسند تھا۔ سروپ کی بدولت وہ فضول بولنے کی زحمت سے بچا رہتا تھا۔ نیا شعور اور نئی شاعری کیا ہے؟ سروپ اس کی وضاحت لچھے دار زبان میں کرتا اور اس سلسلے کے تمام سوالوں کا جواب دیتا تھا۔ سندیش صرف نظم لکھتا تھا اور جب اسے اپنے نرم و شیریں لہجے میں جھوم جھوم کر پڑھتا تھا تو سننے والے خود رفتگی اور محویت کے عالم میں یوں اس کی طرف دیکھا کرتے تھے جیسے وہ شاعر کے الفاظ میں مخفی معنی کو ۔۔۔ نئے شعور کو جلوہ گر دیکھ رہے ہوں۔

"واہ! واہ! مکرر مکرر!" سروپ چلاتا اور طلسم ٹوٹ جاتا۔

رفتہ رفتہ لوگ سروپ کو سندیش کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہو گئے، بلکہ اسے پسند بھی کرنے لگے۔ وجہ کثافت و لطافت کا ناگریز رشتہ ہی ہوگا۔

"دل بڑا بے چین اور بے قرار رہتا ہے۔" ایک دن سندیش نے کہا۔
"کیوں؟ کیا بات ہے؟" سروپ نے جھٹ پوچھا
وہ ایک تالاب کے کنارے بیٹھے تھے۔ سندیش نے ایک کنکر اٹھا کر پانی میں پھینکا اور اس میں جو لہریں اٹھیں ایک دائرے میں پھیلتی حرکتی دیکھنے لگا۔
"اب ہم یہاں سے چلیں۔" سندیش پھر بولا۔
"چلیں۔" سروپ نے اس کا منشا سمجھے بغیر ہی بات دہرائی
"ہاں، کہیں دور — بہت دور۔"
سندیش نے ایک نظر سروپ کی طرف دیکھا اور پھر چپ ہو گیا۔ سب طرف خاموشی تھی اور وہ ایک ٹک افق کی اور دیکھ رہا تھا
"بتاؤ تو سہی میرے اچھے دوست، کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"
سروپ نے خاموشی توڑی۔
"مجھے سچائی کی تلاش ہے۔" سندیش نے آہستہ سے جواب دیا اور پھر سروپ کا ہاتھ تھام کر آگے کہا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو، سچائی کہاں ملے گی؟"
"زندگی کا سارا سفر ہی سچائی کی تلاش ہے"
سروپ جوش میں بھر کر بول اٹھا لیکن سندیش کو گمبھیر دیکھ کر وہ بھی گمبھیر ہو گیا اور کہا۔ "وہ کہاں ملے گی یہ میں نہیں جانتا۔ بہرحال آپ کا خیال بہت اچھا ہے۔ ہمیں سچائی کی تلاش میں چلنا ہی چاہیئے۔ ہر شاعر اور ادیب اور مفکر کا کام سچائی کو تلاش کرنا ہے۔"
دوسرے دن دونوں دوست سچائی کی کھوج میں نکل پڑے۔ یونیورسٹی میں اس بات کی کوئی چرچا نہیں کی تھی۔ اس لئے لوگ حیران تھے کہ وہ یکایک کہاں چلے گئے۔ دو تین روز تو یہی سوچ کر چپ رہے کہ گھومنے پھرنے گئے ہیں، لوٹ آئیں گے۔ مگر جب نہ آئے تو کھوج اور تلاش شروع ہوئی۔ بہت پوچھ تاچھ کی مگر کہیں کچھ پتہ نہ چلا۔ البتہ سندیش کی دراز سے ایک خط ملا۔ لکھا تھا
"دوستو"!
ہر زمانے کی ایک سچائی ہوتی ہے۔ اس کے معلوم نہ ہونے سے پوری قوم بھٹک جاتی ہے۔ میں اپنے دوست سروپ کے ساتھ سچائی کی کھوج میں جا رہا ہوں۔ اگر ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تو پھر ملاقات ہوگی ورنہ خدا حافظ۔ آپ سے جو خلوص اور پیار ملا اس کے لئے بے حد شکریہ۔ آپ لوگوں کی یاد ہمیشہ آتی رہے گی امید ہے کہ آپ بھی مجھے یاد رکھیں گے۔
ہو سکے تو میری ماں کو خبر کر دیجئے کہ اس کا بیٹا سچائی کی کھوج میں ایک لمبے سفر پر نکلا ہے۔ میں نے ماں کا جو مقدس دودھ پیا ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں اپنی زندگی ایک اعلیٰ مقصد کے لئے وقف کر دوں ماں کو میری جدائی پر رنج نہیں بلکہ بیٹے کی اس بات پر فخر کرنا چاہیئے۔"
سفر کٹھن تھا۔ سندیش اور سروپ کافی دور نکل آئے تھے۔ جانے ابھی کتنا اور چلنا تھا۔ وہ دن بھر چلتے اور جب رات پڑتی تو کسی سرائے میں یا کسی نیک دل کسان کے گھر پر بسر کر لیتے اور صبح اٹھ کر پھر آگے چل پڑتے۔ کھانے کو جو کچھ بھی مل جاتا اسی پر

اکتفا کرتے۔ بعض مرتبہ مکئی یا باجرے کی روٹی اور چھاچھ ہی پر گذارا کرنا پڑتا اور ایسے موقعوں پر سروپ سینہ تان کر بڑے فخر سے کہتا۔ "دیکھئے سندیش بھائی، اپنے اعلیٰ مقصد کے لئے ہم کتنا بڑا ایثار کر رہے ہیں۔"

لیکن سندیش نے اپنے منہ سے کبھی ایک لفظ تک نہیں کہا اور چپ چاپ سفر جاری رکھا۔ دیکھنے کو خواہ وہ کتنا ہی تیلا دُبلا اور نحیف تھا مگر چلنے میں سروپ سے تیز تھا۔ کوئی سوسوا سو میل کا سفر طے ہو چکا تھا مگر اس کے چہرے پر تکان کے بجائے تازگی تھی اور وہ ہمیشہ خوش و خرم نظر آتا تھا۔ جو نئے تجربے حاصل ہو رہے تھے انہیں وہ اپنے مخصوص اسلوب میں سمو کر نظمیں لکھتا تھا۔

"ان نظموں میں نئی روح، تازگی اور شگفتگی ہے۔" سروپ داد دیتا۔

سروپ نے خود بھی اسی بیچ میں کئی نظمیں لکھیں لیکن جو نئی روح سندیش کی نظموں میں تھی ان میں اسی کا نقدان تھا۔ سروپ صرف خارجی مناظر بیان کرتا تھا وہ بھاری بھرکم الفاظ، انوکھے استعاروں اور تشبیہوں کی مدد سے وہ بات کو خوب پھیلا دیتا تھا۔ منظر کی وسعت نظم میں بھی آجائے تو وہ اسے اپنی قابلیت اور کامیابی تصور کرتا تھا۔ سندیش یہ نظمیں سنتا اور دھیرے سے مسکرا دیتا۔

"ہم دونوں کا اپنا اپنا انداز ہے۔" سروپ سندیش کی مسکراہٹ کا جواب دیتا۔

"اور اس انداز میں وہی فرق ہے جو تمہارے اور میرے ڈیل ڈول میں . . . ."

"واہ! واہ! کیا بات کہی ہے۔ تمہارے لطیفے بھی تمہاری شاعری کی طرح ہمیشہ یاد رہیں گے۔"

یوں ہنستے بولتے اور خوش گپیاں کرتے وہ گاؤں گاؤں، جنگل جنگل کوئی سال بھر چلتے رہے اور منزل تھی کہ افق کی مانند آگے ہی آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ آخر وہ ایک پہاڑ کی تلہٹی میں پہنچے اور وہاں ایک دوراہے پر رک گئے۔

ایک طرف پگڈنڈی تھی جو بل کھاتی پھر پہاڑ پر چڑھتی تھی دور پہاڑ پر گھنا جنگل تھا جس میں کانٹے دار جھاڑیاں تھیں — سانپ، بچھو اور شیر چیتوں کے ہونے کا بھی امکان تھا اس لئے پگڈنڈی پر چلتے ہوئے جنگل میں گھسنا جان جوکھم کا کام تھا۔

دوسری طرف صاف ستھری سڑک تھی اور تھوڑی ہی دور پہاڑ پر رنگ مرمر کا سفید سندر محل دکھائی دے رہا تھا۔

سورج ڈوبنے کے قریب تھا اور پنچھی اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ اب سندیش اور سروپ کو فیصلہ یہ کرنا تھا کہ وہ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے جنگل میں گھسیں یا سڑک پکڑ کر اس سفید سندر محل میں پہنچیں جسے سورج کی آخری کرنوں نے خوب جگمگا دیا تھا۔

"آؤ۔ اس محل کو دیکھیں۔" سروپ نے تجویز پیش کی۔ "لیکن؟" سندیش نے شک کا اظہار کیا۔

"لیکن ویکن پھر دیکھا جائے گا پہلے یہ سندر محل تو دیکھ لیں" سروپ بولا۔ "ممکن ہے یہ سڑک ہی سچائی کی اور جاتی ہو۔ بے کار جوکھم اٹھانے سے فائدہ؟"

اسی وقت ایک ادھیڑ عمر دیہاتی آدمی پگڈنڈی کی راہ پہاڑ سے اترتا ہوا ادھر آنکلا۔ اس کے چہرے پر تکان اور دھول تھی لیکن آنکھوں کی چمک اور کندھے پر کدال مضبوط ارادے کا پتہ دیتی تھی۔

"یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟" سروپ نے اس کے نزدیک آتے ہی پوچھا۔

"وہاں" دیہاتی نے محل کی طرف اشارہ کیا۔

"اور یہ پگڈنڈی ،" سندیش بولا۔

ادھیڑ عمر دیہاتی نے ایک لحظہ سندیش کی طرف خوب دھیان سے دیکھا اور پوچھا۔ "تمہیں کہاں جانا ہے؟"

"ہمیں . . . . . ہم سچائی کی کھوج میں نکلے ہیں۔"

"تب بڑھے جاؤ۔" دیہاتی نے پگڈنڈی کی طرف اشارا کیا اور کہا۔ "نزدیک ہی ملے گی۔ میں صدیوں سے سچائی ہی کی راہ ہموار کر رہا ہوں۔"

"یہ ان پڑھ دہقان ہمیں بہکا رہا ہے اس کی باتوں پر مت جاؤ۔"

سروپ نے کہا اور وہ سندیش کو کندھے سے دھکیلتا ہوا سڑک کی جانب بڑھا۔

دیہاتی نے سروپ کی طرف دیکھا اور اس کے قہقہے نے جنگل کے وسیع خلاء کو بھر دیا۔

محل کے دروازے پر ایک نازک اندام دوشیزہ نے ان کا یوں سواگت کیا جیسے وہ پہلے ہی سے ان کا انتظار کر رہی ہو۔

محل واقعی عالیشان تھا اور اندر سے خوب سجا ہوا تھا۔ عیش و آرام کا سب سامان وہاں موجود تھا نوکر چاکر اور داس داسیوں کی کمی نہیں تھی۔ اس دوشیزہ کے جس نے ان کا سواگت کیا تھا ہر ایک حکم کی یوں تعمیل ہوتی تھی جیسے وہ اس محل کی ملکہ ہو۔

سندیش اور سروپ یہ ٹھاٹھ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ دوشیزہ نے ان کی آؤ بھگت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ شراب اور رقص کی محفل جمی جو رات گئے تک چلتی رہی پی کھا کر بستر پر لیٹے تو انہیں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ "جیتے جی سورگ میں پہنچ گئے ہیں۔" صبح اٹھ کر سروپ نے کہا۔ "اس میں کیا شک ہے" سندیش نے تائید کی۔

"دراصل یہ ہمارے تپ اور تیاگ کا پھل ہے۔ نہ ہم وہاں سے چلتے اور نہ یہ زندگی جینے کو ملتی۔" سروپ نے مسکرا کر دلی مسرت کا اظہار کیا اور کہا۔ اس سے بڑی سچائی اور کیا ہو گی؟ تم خواہ مخواہ جنگل میں بھٹک جانا چاہتے تھے۔"

اب جنت سے کون جائے! دن پر دن بیتنے لگے۔ ہر روز محفل جمتی تھی۔ سندیش اور سروپ کی ہر فرمائش لب ہلاتے ہی پوری ہو جاتی تھی۔ محل کی مالکن دوشیزہ خوبصورت ہونے کے علاوہ شائستہ، مہذب اور سلیقہ شعار بھی تھی۔ سُر اتنا میٹھا کہ اس کے بولنے سے کانوں میں ایک عجیب رس سا گھلتا تھا اور روح تک ایک ناقابل بیان حلاوت سے بھر جاتی تھی۔ اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، بات چیت کرنا ہی بذاتِ خود خوشی اور مسرت کی بات تھی۔

"گستاخی معاف، میرے خیال میں آپ کا نام موہنی ہے۔" سروپ نے دوشیزہ سے کہا۔

"گستاخی آپ کریں گے تو ہرگز معاف نہ ہو گی۔ ویسے میرا نام موہنی نہیں۔ مایا ہے۔" دوشیزہ نے جواب دیا۔

"موہنی اور مایا ایک ہی بات ہے۔ میرا جو مطلب تھا وہ آپ نے سمجھ ہی لیا ہو گا۔"

"جی، نہیں۔ پہیلیاں بوجھنا میں نے نہیں سیکھا۔"

"موہنی کے ذریعے موہے جانا یا مایا کے ذریعہ ٹھگے جانا بجھارت نہیں، ایک کھلی حقیقت ہے۔"

"آپ کو ٹھگے جانے کی شکایت تو نہیں؟"

"واہ، شکایت کیا ہو گی؟ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے اور اس لئے تو یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" مایا نے جواب دیا اور پلٹ کر سندیش کی اور دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگوں کا جی لگ

میرے لئے خوشی اور فخر کی بات ہے ۔ میں چاہتی ہوں کہ زندگی قیامت تک اسی طرح آپ لوگوں کی صحبت میں گذرے ۔"

"قیامت کا کیا مجال کہ آپ کے اس محل میں قدم بھی رکھے ؟

سندیش نے نگاہیں اوپر اٹھا کر آہستہ سے کہا ۔ سروپ اور مایا دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے ۔

دن ، ہفتے اور مہینے آرام سے گذرتے رہے ۔ کبھی کبھی سندیش بہک جاتا اور وہ ایکا ایکی یوں اٹھ کھڑا ہوتا جیسے ابھی سر دیوار سے ٹکرا دے گا ۔

"کیا بات ہے ؟" سروپ پوچھتا ۔

"اب ہم یہاں سے چلیں ۔" سندیش کہتا ۔

"اماں ، جلدی کیا ہے ؟ یہ عیش ، یہ آرام اور کہاں میسر آئے گا ؟" سروپ جواب دیتا اور پھر جام اس کی طرف سرکا کر کہتا ۔ "شراب اور عورت ہی تو زندگی ہے ۔"

سندیش سوچ میں ڈوب جاتا ، کچھ دیر یونہی ڈوبا رہتا اور پھر جام اٹھا کر دھیرے دھیرے پینے لگتا ۔

"مایا ، سندیش کا من بہلاؤ ۔ اس کی طبیعت کچھ اچاٹ ہے" ۔

سروپ دوشیزہ سے تنہائی میں کہتا ۔

دوشیزہ اپنے حسن کا جادو پھونکتی ۔ سندیش کی طبیعت ٹھکانے آتی اور پھر کچھ دن خاموشی اور چین سے گذر جاتے ۔

"سروپ ، تم خود تباہ ہوئے اور ساتھ مجھے بھی تباہ کر دیا ۔" آخر ایک دن سندیش نے مضبوط لہجے میں کہا اور حقارت کی نظر سروپ پر ڈالی ۔

"میرے دوست ، تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو"

سروپ نے سندیش کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ہمیشہ کی طرح ہنس کر بات ٹال دینی چاہی ۔ "بے چینی تمہاری فطرت بن چکی ہے ۔ ویسے ہے بھی درست ، شاعر اگر بے چین نہ ہو تو شاعر ہی نہیں ہو سکتا ۔"

اس کے بعد وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا ۔

اسی وقت مایا آگئی ۔ اس نے ایک معنی خیز نگاہ دونوں پر ڈالی اور وہ خاص انداز سے مسکرائی ۔

"پوچھ دیکھئے ، آپ بھی میری بات کی تائید کریں گی ۔"

مایا کی نگاہ اور مسکراہٹ نے جو ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی اس سے ابھرنے کے لئے سروپ نے اپنے ساتھی سے کہا اور پھر وہ مایا سے مخاطب ہوا ۔ "میں ابھی سندیش بھائی سے کہہ رہا تھا کہ شاعر اگر بے چین نہ ہو تو شاعر نہیں ہو سکتا ۔"

"آپ نے درست فرمایا ۔ شاعر اپنی روح کی بے چینی کو ہی شاعری کا روپ عطا کرتا ہے" مایا نے جواب دیا ۔

"چنانچہ بے چینی ہمارے دوست سندیش کی فطرت بھی بن چکی ہے ۔" سروپ نے انگلی ہلا کر خاص انداز سے کہا ۔

"لیکن آپ کی تو نہیں ؟" مایا نے اپنی خوبصورت پتلیاں گھما کر چٹ پوچھا ۔

سروپ چپ رہا ۔ اس کا سر خجالت سے جھک گیا ۔ لیکن مایا خاص انداز سے مسکرائی اور سروپ نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا . . .

شام کو سندیش اور سروپ ٹہلنے نکلے۔ سورج ڈوبنے کا منظر نہایت دلکش تھا۔ سامنے پہاڑی پر شفق رقصاں تھی ۔ لیکن سندیش یہ سب نہیں دیکھ رہا تھا وہ اپنے آپ میں کھویا کھویا سا چپ چاپ چل رہا تھا اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر سنجیدگی پہلے سے کچھ زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ سروپ نے بھی اس بات کو بھانپ لیا اس نے بلند آواز میں سامنے کے منظر کی تعریف شروع کی جس گمبھیر ذہنی کیفیت سے وہ ڈر رہا تھا دوست کو اس سے ابھارنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن سندیش چپ اور گمبھیر ہی بنا رہا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک چٹان پر پہنچے، جس کے دوسری طرف بھیانک کھڈ تھی اور اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر سروپ بھی یکایک، چپ ہو گیا اور دونوں دوست کافی دیر تک چٹان پر خاموش کھڑے رہے۔

سندیش دور اندھیرے میں جھانک رہا تھا اور سروپ کی نگاہیں سندیش پر مرکوز تھیں جو ساکت و صامت کھڑا تھا۔

سندیش یکایک حرکت میں آیا اور "ماں! ماں!" چلاتا ہوا کھڈ میں کود گیا۔

کھڈ بہت گہری تھی، نیچے جھانکتے بھی ڈر لگتا تھا۔ سندیش کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صرف اس کے الفاظ "ماں! ماں!" فضا میں گونج رہے تھے۔

سروپ محل میں تنہا لوٹا۔ وہ افسوس کے بجائے غصے میں زیادہ تھا۔

"آپ نے میرے دوست کی جان لی ہے۔" وہ آتے ہی مایا پر برس پڑا۔

"آپ کے دوست کی جان!"

"ہاں، اس کی موت کے لئے آپ ـــ اور صرف آپ ذمے دار ہیں۔"

مایا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھا، آپ ذمہ داری سے بچنے کے لئے الٹا میرا مذاق اڑا رہی ہیں مگر. . . . ."

سروپ جوش اور غصے کے مارے فقرے پورا نہ کرسکا۔

"کیوں صاحب، میں نے آپ کو دعوت دے کر بلایا تھا؟"

سروپ کو چپ دیکھ کر مایا بولی۔

وہ پھر بھی چپ رہا۔ اب اس کی زبان بند ہو چکی تھی۔

"سچائی سے کترا کر کیوں نکل آئے تھے؟ اسی لئے نا کہ یہاں عیش کرنا چاہتے تھے؟" مایا کا حسین چہرہ تمتما اٹھا اور آواز تیکھی اور بھاری ہو گئی۔ "وہ جسے سچائی کی تلاش تھی مر گیا اور تم عیش و عشرت کے بھوکے کوسنے کو رہ گئے۔ نکل جاؤ۔ تمہاری یہاں کوئی ضرورت نہیں۔"

مایا نے تالی بجائی اور دو قوی ہیکل نوکروں نے سروپ کو محل سے باہر کی راہ دکھائی۔

رشیدہ رضویہ

آنسوؤں کے پُل پہ

آنسوؤں کے پُل پہ کھڑی میں تمام شرقِ اوسط بلکہ تمام تر اسلامی ممالک کی جانب دیکھ رہی ہوں۔ پُل پہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے اردگرد بے شمار چہرے ہیں۔ ایک چہرہ نوجوان لڑکی کا ہے جو اس شدت سے رو رہی ہے کہ دریا کے پانی میں اُس کے آنسوؤں سے روانی آتی ہے۔ پُل پہ امریکی و فرانسیسی اخبارات کے نامہ نگار بھی ہیں۔ جو میری طرح لڑکی کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن میری نگاہیں لڑکی کی متورم آنکھوں اور رخساروں پر گرتے نمکین و گرم قطروں پہ جمی ہیں۔ اور یہ غیر ملکی نامہ نگار اُس کے تمام سراپا کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھ کر سوچتے ہیں۔ اس لڑکی کو کس زاویئے سے اخبار میں پیش کیا جائے کہ سنسنی پھیل جائے۔ "آنسو اور بھرپور جوانی" سے بڑھ کر اور کونسا ہیجان انگیز موضوع ہو سکتا ہے؟

یہ لڑکی اگر ہالی وُڈ جائے تو — امریکی نامہ نگار ایک آنکھ بند کر کے لڑکی کے پیچ و خم دیکھتا ہے۔

یہ لڑکی تو جمیلہ بوحیرد سے کہیں خوبصورت ہے۔ جمیلہ بوحیرد کی دوشیزگی ہم نے ایک بوتل کے ذریعے لی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ اسرائیلی سپاہیوں نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا؟ فرانسیسی نامہ نگار سرکھجاتا ہے۔

"معلوم ہے تمہیں — جب تم نے جمیلہ بوحیرد پر ظلم و ستم کیئے تھے تو میرے ہم وطن بالکل خاموش تھے۔ انہیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ حسن و عشق۔ روایت و ادب اور فلسفہ کے دلدادہ ظلم بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن جب پیرس میں مادام سیمون ڈی بوویئر نے اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا۔ اور فرانسیسی دانشوروں نے آواز بلند کی تو ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں نے قلم اٹھایا۔ کیونکہ ہمارے ہاں زیادہ پڑھے لکھے لوگ برطانوی و فرانسیسی دانشوروں کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں۔ اب اگر تم اس لڑکی کا ذکر کروگے جو آنسوؤں کے پُل پہ کھڑی ہے تو ہمارے ہاں بھی کچھ لوگ متاثر ہو جائیں گے۔ جب برطانوی اور فرانسیسی ذہن پرستوں نے اسرائیل کی حمایت میں اپیلیں شائع کرائیں۔ تو ہمارے دانش کدوں میں بھی مظلوم عربوں کے لئے آواز اٹھی۔ ورنہ تم جانو اے فرانسیسی نامہ نگار! میرے ہاں کے لوگ شرقِ اوسط سے براہ راست متاثر نہیں ہوتے۔ گو وہاں کے کیبرے، شبینہ کلب اور رقاصائیں بڑی کشش رکھتی ہیں۔ اور مانا کہ شرقِ اوسط میں اُن کا کوئی گھر نہیں۔ عرب ممالک سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہیں۔ تاہم ظلم کہیں بھی ہو۔ کسی جگہ بھی ہو۔ ہر حالت میں ظلم ہے۔ اور پھر یہ لڑکی جوان ہے۔ خوبصورت ہے۔ اس کی آنکھیں اردو غزل کا عنوان اور ہونٹ ایک مصرعہ ہو سکتے ہیں۔ ان آنکھوں میں جھانک کر دیکھو کتنا وسیع قبرستان ہے۔ ان رخساروں

کو دیکھو۔ موت کیسے ان پر رقص کر رہی ہے۔ اور اس کے ہونٹ دیکھو۔ اِن پر دکھ اور کرب کے کونسے نغمے مچل رہے ہیں۔

فرانسیسی نامہ نگار سے نگاہیں ہٹا کر دوبارہ لڑکی کو دیکھتی ہوں۔ وہ لگاتار رو ئے جا رہی ہے۔

"تو اسے کیا دکھ ہے؟" اس کا جواب تو اقوام متحدہ ہی بہتر طور پہ دے سکتی ہے۔

امریکی نامہ نگار اُس کے آنسوؤں کی وجہ دریافت کرنے آگے بڑھتا ہے تو آنسوؤں کا تسلسل بھی لمحہ بھر کے لئے ٹوٹ جاتا ہے۔ آنکھوں میں ایسی نفرت چمک اٹھتی ہے کہ امریکی نامہ نگار بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ لڑکی کی دونوں مٹھیاں بار بار کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔ گویا ابھی آگے بڑھ کر اُس امریکی کا منہ نوچ لے گی۔ لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتی ہے۔ اُسے امریکی کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں۔

اسرائیلی فوج میں امریکی سپاہی بھی شامل تھے۔ جنہوں نے گنبد صخرا کے سائے میں مسلمان دوشیزاؤں کو بے حرمت کیا تھا۔ یہ امریکی اب یہاں آنسوؤں کے پل پہ کیا لینے آیا تھا؟

اب اسے کیا چاہیئے تھا؟

تصویر!

کس کی تصویر ـــــ اس لڑکی کی یا بے عصمت انسانیت کی۔ یا اُس تشنگی دنیا کی ـ جس کا سینہ اس لئے کاٹ دیا گیا ہے کہ اس سے دودھ کی دھاریں نہ بہہ سکیں۔ انسان نشوونما نہ پا سکے۔

امریکی نامہ نگار کے کیمرے میں جو تصویر آئے گی۔ وہ کسی انسان کی نہ ہوگی۔ بلکہ درندے کی ہوگی۔ انسان اب خارج از فیشن ہو چکا ہے۔

فرانسیسی نامہ نگار عربوں کی نفسیات سے واقف ہے۔ عربوں کی طرح ہی وہ جذباتی زود رنج اور جھگڑالو ہے وہ پہلے تو امریکی سے تصویر لینے کے سوال پہ اُلجھ پڑا پھر عربوں پہ کئے گئے مظالم پہ ایک شاعرانہ تقریر کرتا ہے اور پھر لڑکی کا نام دریافت کرتا ہے۔

لڑکی بیروت یونیورسٹی کی طالبہ ہے۔ فرانسیسی بخوبی جانتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ ۱۹۵۶ء میں فرانس نے شرق اوسط کی تباہی کے لئے کیا کردار ادا کیا تھا۔ تاہم وہ فرانسیسی نامہ نگار کو دیکھ کر منہ نہیں چھپاتی اور سسکیوں کے درمیان اپنا نام بتاتی ہے

امیرہ بنت ـــــ

امیرہ، چونک کر میں لڑکی کے قریب جا پہنچتی ہوں اور بغور اُسے دیکھتی ہوں۔ آپ بھی اسے دیکھئے۔ یہ چہرہ آپ نے بارہا خواب و تخیل میں دیکھا ہوگا۔ افسانوں کا مرکزی کردار بنایا ہوگا۔ اس پہ غزلیں اور دوہے لکھے ہوں گے۔ یہ چہرہ آپ کو وسکی کے گلاس اور بیئر کی بوتل میں بھی نظر آیا ہوگا۔ اس چہرہ میں کبھی بغداد کی چاندنی اور یروشلم کی دھوپ تھی۔ اس کی آنکھوں میں صحراؤں کے گیت اور نغمے ہو سکتے تھے اور اس کے ہونٹ جولائی کی کھجور کی مانند شیریں و گداز تھے۔

لیکن آپ بغداد کی چاندنی اور یروشلم کی دھوپ سے آشنا نہیں۔ آپ نے شرق اوسط کے صحراؤں میں جون جولائی اور اگست کی زندگی کو نہیں دیکھا ہے۔ نہ جلے مکانات۔ پھانسی پہ لٹکتی لاشیں اور ظلم و ستم دیکھا ہے۔ آپ اس امیرہ بنت فلسطین کو محسوس نہیں کر سکتے اور اس کی کہانی میں آپ کو ایسے لمحات میں سناؤں گی جبکہ آپ اپنے آرام دہ خنک کمروں میں بیٹھے بڑے رومانی انداز میں ظلم و ستم کا ذکر لیں

کرتی ہیں۔ گویا ظلم و ستم بھی کوئی ایسا پرنس چارمنگ ہو۔ جو کسی ہری بھری وادی میں گھوڑے پہ سوار گٹار بجاتا ہو۔ یا فاختاؤں کا شکار کرتا ہو۔ اور جسے دیکھ کر آپ "ہائے اللہ" کہہ کر غش کھا جائیں۔

اور میں یہ کہانی آپ کو اُن لمحات میں سناؤں گی۔ جبکہ آپ اپنے دفتروں میں کوئی بارد شروب سامنے رکھے الف لیلیٰ کی راتوں کے خواب دیکھتے ہوں گے۔ وہاں کی عیاشیوں کا ذکر کرکے اور 'ٹائم میگزین' اور 'پوسٹ' کو پڑھ پڑھ کر عربوں کو برا بھلا کہتے ہونگے جیسا کہ آپ حضرات کرتے چلے آئے ہیں۔

لیکن میں تیز دھوپ اور گرم ہواؤں کے تھپیڑوں میں آنسوؤں کے پل پہ کھڑی یروشلم کے اُن راستوں کی طرف دیکھتی ہوں۔ جہاں سے میری پیاری امیرہ بنت سلامان تمام عرب قوم کو ساتھ لے کر نکل گئی تھی۔ اب اسی پل پہ کھڑے ہو کر میں اس ننھی امیرہ کی کہانی سناؤں گی۔

اس پل پہ کھڑی جب میں غزہ کے اُن جوانوں اور بوڑھوں کو دیکھتی ہوں۔ جن کے جسم کا ایک ایک بال کھینچ کھینچ کر نکالا جاتا ہے۔ صحرائے سینا میں جنہیں سورج کے نیچے صحرائی ریت پہ بھوکا پیاسا مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔

اور جب میں اُن عورتوں اور بچوں کو دیکھتی ہوں جو عمان اور یروشلم کے راستوں پہ مفلوج پڑے ہیں ——

اور جب میں نو جولائی کے 'آبزرور' میں ایک نامہ نگار کی یہ تحریر پڑھتی ہوں۔

"بیت المقدس میں لوٹ مار کے اِکا دُکا واقعات کے علاوہ کوئی سنگین واقعہ نہیں ہوا۔ اسرائیلی سپاہیوں نے عربوں کے ساتھ عمدہ سلوک روا رکھا ہے جس کی گواہی مقبوضہ عرب علاقوں کے میئر بھی دے سکتے ہیں۔

اور جب میں برطانیہ کے مرحوم وزیر اعظم چرچل کے بیٹے اور پوتے کی کتاب The six day war میں یہ الفاظ پڑھتی ہوں :-

"ایک لاکھ عرب جو دریائے اردن کے مشرقی کنارے سے دوران جنگ یا بعد میں عمان آئے ہیں۔ اپنے ہمراہ بے شمار فرضی کہانیاں لائے ہیں۔

اور جب میں شب کے ایک اور دو کے درمیان ریڈیو اسرائیل سے عرب قیدی عورتوں اور مردوں کے وہ پیغامات سنتی ہوں جن میں اسرائیل کی انسان دوستی اور دریا دلی کے تذکرے ہوتے ہیں۔

اور پھر جب میں مہاجرین کے کیمپوں پر نگاہیں دوڑاتے اس 'امیرہ' کو دیکھتی ہوں تو مجھے انسان سے بڑھ کر مکروہ اور بدترین جھوٹ اس دنیا میں کوئی نظر نہیں آتا۔

لیکن امریکی نامہ نگار اس جھوٹ کے متعلق کچھ نہ لکھے گا اُسے محض ایک لڑکی کی تصویر چاہئیے۔ بے بس مسلمان لڑکی کی تصویر —— جو سنسنی پھیلا دے —— اُس کی نگاہیں لڑکی کی پنڈلیوں پر جمی ہیں۔

اور فرانسیسی نامہ نگار Pour qu'Israel soit créé sur les cadavres et les corps brulés des victimes

(اسرائیل مردہ اجسام اور ظلم و ستم کی بنیادوں پر ہی وجود میں رہ سکتا ہے)

کے عنوان سے ایک کہانی کی فکر میں ہے۔ اور امیرہ کے بجائے اُس مردہ کے پاس کھڑا ہے جس کا نام محمد محمود باسط

ہے یہ شخص خان یونس کی جیل سے فرار ہو کر آنسوؤں کے پل تک پہنچا ہے۔ خان یونس کے متعلق آپ کو یقیناً علم ہوگا۔ اسرائیلیوں نے جب مغربی اردن پہ قبضہ کیا۔ تو خان یونس کو ایک طویل جنگی قید خانہ میں تبدیل کر دیا۔ قید خانہ کے بجائے اُسے اذیت گاہ کہنا مناسب ہوگا تو یہاں میاں محمود باسط کی رگوں میں بجلی دوڑ آئی تھی، اور ـــــ اسرائیلی نہیں چاہتے عرب افزائش نسل کے قابل رہے۔ جوزف کونراڈ کی لارڈ جم آپ نے پڑھی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا لارڈ جم کی مردانیت کس طرح ختم کی گئی تھی۔

محمد محمود باسط کی داستان الم طویل ہے لیکن آپ اس اُدھیڑی کھال والے شخص کے بجائے امیرہ کی کہانی سننا زیادہ پسند کریں گے۔

میرے قریب آجاؤ میری بہنو ـــــ اس لڑکی کو غور سے دیکھو۔ یہ کوئی علم ایکلرلیس نہیں ہے جیسا کہ آپ ہر اچھی لڑکی کے لیئے کہنے کی عادی ہیں۔ یہ اخبار نویس بھی اسے علم ایکلرلیس جان کر اس کے گرد اکھٹے نہیں ہوئے تھے۔ اسے ذرا قریب سے دیکھو۔ میری بہنو اور تم بھی میرے بھائیو۔ تاکہ اس کے چہرہ کے ایک ایک نقش اور جسم کے خطوط کے معائنہ کے بعد آپ اس کے ذاتی کردار اور شرافت کے بخوبی بخیئے اُدھیڑ سکیں۔ یقین ہے ان بخیوں سے ہی ایک انسان تیار کر کے اس لڑکی کی کہانی سناؤں گی۔ یہ کہانی بہادروں کی جستجو میں پلاؤں میں پڑنے والے چھالوں کی داستان نہ ہوگی۔ نہ شب ہجراں اور داغ فراق کی کہانی ہے۔ یہ تو ایک سیدھی سادی سی حقیقت ہے جو شاید آپ کے دل پہ بھی آبلے اور داغ ڈال سکے ـــــ شاید!

اس لئے کہ آپ تو ایسے بھیانک دور میں بھی ـــــ بیت المقدس کے چلے جانے کے باوجود فرماتے اور فرماتی ہیں۔

ـــــ شرق اوسط کا ذکر کیوں؟

اگر کربلا اور مکہ بھی چلے جاتے۔ تو بھی آپ کو میری نگاہوں کے شرق اوسط کی طرف اٹھنے پہ اعتراض ہوتا!

اور غالباً آپ کو یہ اعتراض پرل بک پر بھی ہوگا کہ وہ چین کا ذکر کیوں کرتی ہے۔ ای۔ ایم فورسٹر سے آپ نے دریافت کیا ہوگا کہ وہ ہندوستان کا راستہ کیوں دیکھتا ہے۔ رونلڈ کولین کو بہ نگاہ حقارت دیکھا ہوگا کہ وہ اپنا گم شدہ افق تبت کی پہاڑیوں میں کیوں تلاش کرتا ہے؟ اور ارنسٹ ہیمنگوے پہ ناک منہ چڑھایا ہوگا۔ کہ وہ اسپین کا ذکر کرتا ہے۔ روڈیارڈ کپلنگ اور جارج آرویل بھی ناگوار گزرتے ہونگے۔ غالباً آپ نے یہ سوال بھی اٹھایا ہوگا کہ روسی، فرانسیسی، چینی، انگریزی۔ امریکی شہپارے اردو میں کیوں منتقل کئے جاتے ہیں؟ اور غالباً آپ نے خود سے یہ سوال بھی کیا ہوگا کہ آپ یہاں پاکستان میں رہ کر اپنی تحریروں میں ہندو داستانوں کے اقتباسات فخریہ کیوں پیش کرتے ہیں؟

نہیں ـــــ آپ کو محض قرآن حکیم کی زبان اور نبیوں پیغمبروں کی زمین کا ذکر ناگوار ہے۔ جہاں آپ کے اپنے قدم نہیں اٹھے۔ وہاں کی کہانیاں میری زبانی ناپسند ہیں۔ لہذا میں آپ کو یہ کہانی نہیں سناؤں گی۔ کیونکہ اسرائیل و عرب جنگ نے آپ کو شرق اوسط کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ دراصل حکومت عربوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ اس لئے آپ کو غالباً امیرہ کے آنسو تو نظر آجائیں گے۔ لیکن میرے آنسو نظر نہ آئیں گے۔ جو اُس لمحہ تک بہتے رہیں گے۔ جب تلک کہ میرے اپنے قدم دوبارہ یروشلم میں نہ اٹھیں گے۔

میں امیرہ کی جانب دیکھتی ہوں۔ اب وہ پل پہ میرے ساتھ تنہا ہے۔ اور دریا کا پانی کچھ کہتا پل سے ٹکرا رہا ہے۔ میں پانی کی آواز سنتی ہوں تو مجھے یوں سنائی دیتا ہے۔

ہم جو تاریک راہوں مارے گئے

دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

دار ! دار !

ٹھائیں ٹھائیں ۔ دھم ۔ دھم ۔ دھم !

شعلوں اور خون میں گھرا دار !

دار ! دار ! ۔ دریا کی ہر ہر لہر میں گونج پیدا ہوتی ہے ۔ اور میں کانوں پہ ہاتھ رکھ کے گھبرا کر امیرہ کی جانب دیکھتی ہوں ۔ امیرہ کا سر ریلنگ پر جھکا ہے ۔ اور آنکھیں بند ہیں ۔ تصور میں اُس کا بچپن ہے ۔ جب وہ قدس کے ایک پرائمری مدرسہ میں قاعدہ پڑھتی تھی ۔ دار ۔۔ دُوری !

دار =

دُوری =

دار اور دُوری کی تصویریں بنا کر وہ اُن میں طرح طرح کے رنگ بھرتی، اور خوش ہو کر ماں باپ کو دکھاتی ۔ یونہی جب وہ بڑی جماعتوں میں پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ دوری کے لئے فصیح لفظ عُصفور اور دار کے لئے ایک بہت ہی خوبصورت لفظ عائلہ بھی تھا ۔

عائلہ ۔۔۔ ! یہ نام وہ اپنی بیٹی کا رکھنا چاہتی تھی ۔ اُس کی خواہش تھی کہ پہلے اُسے بیٹی ہو ۔ بیٹے تو بڑے ہو کر جنگوں میں چلے جاتے ہیں یا سیاست میں حصہ لے کر تاریک راہوں میں مارے جاتے ہیں ۔ دار کی خشک ٹہنی پہ لٹک جاتے ہیں ۔ لیکن اس کی عائلہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے دار کو سنوارے نکھارے گی ۔ چڑیا کی طرح چہچہائے گی ۔ اور اس کے قدموں سے گھر میں زندگی کی آہٹیں گونجیں گی لیکن گھر بننے سے پیشتر ہی شعلوں کی نذر ہو گیا اور عصفور نے خول سے نکلنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا ۔ اور وہ بے بس، بے سہارا آنسوؤں کے پل پہ کھڑی تھی ۔ پل کے نیچے دریا کا پانی سر ٹکرا ٹکرا کر کہتا تھا

آج سینائی کی مسجدیں بے اذان
آج سینائی میں عید صہیونیاں
اک دیوارِ گریہ بنا ڈالیا
آج یاروں کو روؤ رلاؤ سہیلیا

چپ رہو خاموش ۔۔۔ ! تم بخوبی جانتے ہو کہ سینائی کی مسجدیں اپنے نمازیوں کی غداری کی وجہ سے بے اذان ہوئی ہیں ۔ العریش کے فوجی گورنر جنرل عبدالمنعم حسنی نے خود اپنا آپ اسرائیلی لونڈوں کے حوالے کر کے العریش پہ پرچم داؤد کا لہرایا ہے ۔ ساٹھ ہزار مصری فوجی افسروں نے خود کو ہنسی خوشی اسرائیل کے حوالے کیا ہے ۔ اور دیوارِ گریہ بھی ہم خود بنے ہیں ۔ یہ امیرہ اور دوسرے بے شمار ۔ ہا ! یہ تم کیا رونے رلانے کی بات کرتے ہو ۔ ہمارے آنسوؤں سے تمہارے پانی میں تڑپ اور بے چینی ہے ۔

لیکن دریا کا پانی اب مذاق اڑاتا وہی الفاظ دہراتا ہے جو خود میرے دل سے نکلے تھے ۔

آج مقامِ ابراہیم بے فغاں ہے ۔

آج اقصیٰ کے مینار بے اماں ہیں ۔ امیرہ کا گھر مقامِ ابراہیم اور اقصیٰ کے درمیان تھا ۔ تین کمروں اور گلاب کے

کے چند پودوں پہ مشتمل چھوٹا سا گھر — جس کی چھت پر کبوتروں کا بخرہ تھا۔ اور مرغیاں کٹ کٹ کرتی تھیں اور مطبخ میں زیتون کے تیل اور ٹماٹر کے رس میں ہنڈیاں پکتیں اور بینگن تلے جاتے باقلّہ ابلتا۔ چھوٹے بہن بھائی ہنگامے کرتے۔ اور امیرہ بیروت یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔

جب مئی کی تعطیلات میں وہ گھر آئی تو اسرائیل کی جنگی تیاریوں کی خبر لاوے کی مانند ہر طرف پھیلی تھی۔ اور فلسطین کی فوج آزادی حرکت میں آچکی تھی۔ احمد شکیری نے فلسطین کی عورتوں اور بوڑھوں کو بھی اکٹھا کر لیا تھا۔ امیرہ کی ماں — جسے اُم امیرہ کہا جاتا تھا۔ اپنے شوہر سمیت فوج آزادی میں شریک تھی۔ یہ فوج اُن خطوط پہ چلنا چاہتی تھی جن پہ الجزائر کی ایف ایل ان چلی تھی۔ اُدھر مصر میں فدایان اور شام میں حزب البعث بھی سرگرم عمل تھی۔ غدار بھی ہر سر جماعتوں میں موجود ہر کارروائی سے اسرائیل کو آگاہ کر رہے تھے۔ قدس کی فضا میں خون کی بو تھی اور اُم امیرہ ہر لحظہ گھر سے غائب رہتی۔ امیرہ بہت جلد اپنے شہر سے اکتا گئی۔ اور اپنی ایک دوست کے گھر عمان چلی گئی۔

وہ تو کہا کرتی تھی۔ اُسے بٹیا کبھی نہ ہوگا۔ بیٹے جنگوں اور سیاست میں چلے جاتے ہیں۔ یہاں اُس کی ماں ہی سیاست میں چلی گئی۔

پانچ جون کی صبح بھی امیرہ عمان میں تھی جبکہ شرق اوسط کے ہر شہر میں ہیجان پھیلا تھا۔ لوگ ریڈیو کے قریب سر جوڑے بیٹھے "جنگ ہوگی — نہیں ہوگی" پر خیال آرائی کرتے تھے۔ سڑکوں اور دوکانوں پہ جمع ہو کر اسرائیل کی تیاریوں پہ تبصرہ کرتے تھے۔ اور نوجوان "جنگ — جنگ ہمیں جنگ چاہیئے۔ اسرائیل چاہیئے" کی تکرار کرتے تھے۔ اُدھر یروشلم میں تل ابیب میں موت کا سکوت طاری تھا۔ مدرسے بند ہو چکے تھے۔ حد اسد ملی مرکز کے در و دیوار کے تمام مشہور عالم شیشے اتار دیئے گئے تھے۔ نیشنل میوزیم کی زبردست حفاظتی تدابیر کی گئی تھیں۔ اسرائیلی ہسپتالوں میں خون کا ذخیرہ جمع ہو رہا تھا۔ برطانیہ کے مرحوم وزیر اعظم ونسٹن کا پوتا بھی خون دینے میں پیش پیش تھا۔ جو اسرائیل عرب کی ممکنہ جنگ کے پیش نظر وارد ہوا تھا۔ لندن میں اسرائیل کے دیگر حامی بھی اسرائیل کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ جنگ کی خبر دنیا بھر میں پھیل گئی۔

ہزاروں عرب مائیں بیوہ ہو گئیں۔ عرب بچے یتیم ہو گئے۔ گھر — جو اتنی مشکل سے سالہا سال میں بنتے ہیں۔ پل بھر میں تباہ ہو گئے اور —!

اردنی بموں سے یروشلم چڑیا گھر کے محض ستر طوطے۔ ایک بندر اور ایک دریائی بلی ہلاک ہو گئے۔

مسجد اقصیٰ میں سنکھ بجائے جانے لگے۔ دیوار گریہ پھر آباد ہو گئی اور —!

" احمد شکیری عورتوں کے لباس میں فرار ہو گیا۔ اُس کے دو ساتھی اسرائیل کے حامی ثابت ہوئے۔

اور مسلمان شہر اہل پر عذاب نازل ہونے لگے۔ اسرائیلی پولیس اور فوج گلی گلی۔ گھر گھر ان کا شکار کرنے لگی۔ اُم امیرہ اپنے محفوظ گھر میں فوج آزادی کے جوانوں کو پناہ دیئے ان کے لئے اور اپنے بچوں کے لئے کھانا تیار کر رہی تھی۔ باقلہ کی اشتہا آمیز خوشبو ہر طرف پھیلی تھی اور اسرائیلی سپاہی اور اُن کے شکاری کتے زبان چاٹتے گھر میں داخل ہوئے جوان مقابلہ کرتے مارے گئے یا پکڑے گئے۔ زخمی بچے گلی کوچوں میں ہانک دیئے گئے اور ام امیرہ —؟

ام امیرہ پہ کتے چھوڑ دیئے گئے، کتے ایک جیتی جاگتی عورت کو نوچتے ہیں تو کیا محسوس ہوتا ہے؟

رفعت

پیاسے پنچھی

پلکیں جھکی رہیں یا اٹھ جائیں، کہانی تو یوں بھی بن جاتی ہیں
مگر تمہاری پلکوں کی نوک پر یہ کونسی کہانی کانپ رہی ہے؟؟
یہ میری زندگی کا ادھورا عکس ہے؟
یا تمہاری زندگی کی ناکام سرگزشت ؟

راکھ بکھیرتی سورج کی بجھتی کرنیں میرے اور تمہارے درمیان حائل ہیں، مگر میرا جی نہیں چاہ رہا کہ اس بکھری راکھ سے چٹکی بھر لوں — آخر میں ان لمحوں کو کن رنگوں سے سجانا چاہتی ہوں؟

میں اس راکھ سے کس سیندور کی امید لگا رہی ہوں — ؟

اور تم جو چپ چاپ منہ اٹھائے میری روح میں جھانکنے کی کوشش کر رہے ہو، تمہیں یہاں کس چیز کی امید ہے؟
تم پھوار برساتے رنگوں کی قوس قزح سے نکل کر کن راکھ بھرے سایوں میں دل کا سکون پانے نکل آئے ہو؟

ہم دونوں صحرا کے مسافر یہ کس نخلستان کے موڑ پر آن ٹھہرے ہیں — ؟ تم نے مجھے کیوں پکارا تھا؟ میں نے تمہیں کیسے آواز دیدی — ؟

ریشم کے پیچھے الیی حوا کو اپنے قریب پا کر آدم اپنی ساری شکوے بھری تنہائیاں بھول گیا تھا۔

اپنے آپ کو اتنے جاندار پرحرارت پیار بھرے حصار میں محفوظ پا کر حوا بھی تنہائی کی ساری گھٹن بھول گئی تھی مگر تمہارے کانپتے ہونٹوں پر تنہائی کے یہ شکوے کیسے — ؟ اور میری لرزتی پلکوں پر درد بھرے آنسوؤں کی برسات کیوں؟

تم میرے لئے اپنے بھائی سے الجھ پڑے تھے، تم ہابیل ہو یا قابیل؟ یہ پہچان آج بھی میرے لئے مشکل ہے تم جب بھی آپس میں الجھے میں پاس کھڑی اپنے تحفظ کے طرق سوچنے کے ساتھ ساتھ تم دونوں میں سے صرف ایک کی زندگی کی دعائیں مانگتی رہی — کس کے لئے — ؟؟ یہ نہیں بتا سکوں گی — یہ مجھے خود بھی نہیں پتہ، مگر تم نے تو اپنے عیش کے لئے مجھے جوئے میں ہار دیا تھا — وہ میرا کون تھا جو مجھے لے گیا؟ اس نے مجھے جیتا تھا مگر حاصل نہ کر پایا۔ مگر تم سے میرا کیا ناتہ تھا کہ تم نے مجھے نیلام کرنے سے بھی گریز نہ کیا — مجھے کس نے پایا ہے — ؟؟ تم کسی سروپ نکھار کے بہکاوے میں آن کر مجھے اٹھا لے جا دیا

ہر دو طرف کے لشکر کا جر موں کی طرح کاٹ کر میرے جسم کی قیمت چکاؤ ـــــ مگر تم کیوں نہیں جانتے کہ ہم پھر بھی تنہا رہتے ہیں ہم انسانوں کی اس بولتی چیختی تنہائیوں بھری بستی میں اکیلے ہیں ـ یہاں ہماری روحوں نے جلنے کے نت نئے سلیقے اپنائے ہیں ـ سیراب ہونے کے لمحے نہیں پائے ـــــ ہم نے کبھی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیا ـ حالانکہ تمہیں اپنی ناکمل زندگی کا رونا ہے اور مجھے اپنے اکیلے پن کا غم ـــــ تنہائی کے اسی جنگل میں ہم دونوں گھوم رہے ہیں ـ

تم نے خود اذیتی میں روح کا چین تلاش کرنے کی بے سود کوشش کی ہے ـ میں نے رنگین اداؤں سے اپنے آپ کو دلاسا دینے کی ناکام تمنا کی ہے ـــــ مگر روح کا یہ درد بھرا ناتہ کیا ہے ـــــ" ذہن کی یہ پیاس ادھورا ساتھ کیسی ـــــ؟ ان فاصلوں بھری قربتوں میں شبنم کی سی پاکیزہ نمی اور گرم آنسوؤں کی حدت کیوں ہے ـــــ؟ راہوں کی بکھری کانچ پر ننگے پاؤں چلنے کی ہمت مجھ میں نہیں (گھر پانے کا اعتماد بیچ پانیوں کے ڈوب گیا) گھورتی آنکھوں کو سلاخوں سے داغنے اور بولتی زبانوں کو تلوار سے کاٹنے کی جسارت تم نہیں کر سکتے ـــــ تو پھر اس راکھ بھری شام تلے بولتے رنگوں کی قوسِ قزح سجانے کا ارادہ کیوں ـ؟!

یہ سب کچھ تو میں تمہیں اس گھڑی کہہ دیتی جب تم میری روح میں جھانکنے کی بھرپور کوشش کی تھی، اور جلدی جلدی پلکیں جھپک کر مجھے خاموشی سے تکتے ہوئے میرے ہاتھ کو تھام کر "خدا حافظ" کہتے ہوئے نئے ناتے کا آغاز کرنا چاہا تھا ـ

تمہارے ہاتھ کی آنچ میرے ذہن کا سکون نہیں بن سکتی!

میرے سرد ہاتھ کی نرمی پھوار بن کر تمہارے تپتے ہوئے ذہن کو ٹھنڈک نہیں پہنچا سکتی!! ـ

یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجانی منزل کا یہ موڑ کیسے پاؤں تلے سے آپ سے آپ سرک گیا ـــــ؟ یہ کیسی منزلیں ہیں جن کے رستے قدم نہیں پلکوں کی جنبش طے کرتی ہے ـ

مگر تم ان فاصلوں کے رہزن بن کر کجاوے لوٹتے اور نیم خواب دلہنیں اغوا کرتے ہو ـــــ مگر میں نے اس دلہن کو اغوا ہونے سے ہمیشہ بچایا ہے جو من کی سیج پر آنکھیں موندے چپ چاپ پڑی رومان بھری آہٹوں کی منتظر ہے ـــــ مگر یہ عورت کیسی ہے؟ جو میرے ذہن کے جھلملاتے پردوں کو نوچتی رہتی ہے ـــــ!

یہ پردے نوچ پھاڑ ہی کر تو روحوں کے گھروندے بجتے ہیں ـ

تو پھر یہ پاگل روح خود ہی پردے نوچتے پھاڑتے تھک جائے گی ـــــ مارے پیاس کے اس کے ہونٹ پھٹ جائیں گے ـ مارے گرمی کے ذہن میں جھلملاتے پردوں کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں ـــــ ان پھیکے رنگوں اور پھٹے ہونٹوں سے دلہن نے قوسِ قزح کے رنگ بھرے ہیں اور حیات بخش پھوار برسائی ہے اور تم نے اُسے "ظالم عورت" کہہ کر یاد کیا ہے ـ

اگر تمہاری پلکوں پر بھی ایسا ہی دکھ کانپ رہا ہے تو اسے میری پلکوں کی حیات بخش پھوار بھی نہیں دھو سکتی ـ یہ رنگ اتنے کچے بھی نہیں کہ دھل جائیں ـــــ یہاں آدم کو تنہائیاں تنگ کرتی اور حوا کو اکیلی گھڑیاں ڈستی ہیں ـ تنہائی کے اس جنگل میں ہم سب مارے مارے پھر رہے ہیں ـ ہم سب دوسرا ساتھ کا سودا کرتے اور تنہائیاں خریدتے ہیں ـ ہم جسموں کی حرمت پر تڑپتے اور روح کی گھٹن پر روتے ہیں ـ یہاں تڑپ کو بہلانا آسان ہے مگر اس گھٹن سے نجات پانا مشکل ـــــ مگر اس کے باوجود ہم ایک سعی لاحاصل کو مقصدِ حیات بنا لیتے ہیں ـ

سورج کی راکھ بکھرتی زرد کرنیں میری اور تمہاری تنہائی کا مداوا نہیں بن سکتیں کہ اس چشمے کی پھوار نمی بن کر ہمارے

(باقی صفحہ ۳۱۳ پر)

یونس راہی

دستک

میرے سامنے بڑے دریچہ کے چوکھٹے میں خوبصورت لینڈ سکیپ اپنی تمام تر رعنائی اور زندگی کے ساتھ نظر آرہا ہے۔ شیشم کی سرسبز پتیاں جھوم جھوم کر رہی ہیں اور ڈھلتے آسمان پر چاند دھیرے دھیرے سر ابھار رہا ہے جیسے کوئی رسونتی نار دریا میں نہاتے وقت پانی سے سر نکال رہی ہو۔ چاند بڑا ٹھنڈا ہے، اس کی شبنمی روشنی قدم قدم چلتی ہوئی میرے دل میں اتر آئی ہے۔ اور آخری منزل کی طرح میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر اطمینان کا سانس لے رہی ہے۔ اس بھیگی بھیگی سی رات میں مجھے یوں احساس ہو رہا ہے جیسے میرے چاروں طرف گیتوں کے حاشیے ہیں، خوشبو ہے اور میں یونانی دیومالا کا ایک کردار ہوں۔

میرے مختصر سے شلف میں اگاتھا کرسٹی کی کتابیں میرا منہ تک رہی ہیں۔ دن کے چار بجے ہیں، میں نے ایک خط موصول کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ میری ماں علیل ہے۔ میں ماں کو بہت چاہتا ہوں اس لئے کہ اس نے مجھے اس خوبصورت دنیا میں جنم دیا ہے یا پھر جس کی زچگی کی اذیت نے ایک نئی اذیت ناک زندگی کی تخلیق کی ہے۔ میرا اپنا یہی خیال ہے۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جینا سب سے بڑی اذیت ہے، مرنا اتنی بڑی اذیت نہ ہوگی اس لئے کہ مرنے کا عمل لمحاتی ہے اور جینے کا عمل مسلسل جو دن ہفتوں اور سالوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ زندگی کا درد تو انہی دن کے خانوں میں تقسیم ہو کر کچھ کم ہو جاتا ہے اور آرام کی منزل جو زندگی کے کڑے کوس کی مسافت کے بعد آتی ہے بے حد لمحاتی ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ایک لمحہ —— آرام کا لمحہ بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ اس لمحہ کی اپنی لذت اور رنگینی ہوتی ہے —— تیز شوخ اور حلاوت انگیز جیسے پہاڑوں پر مچلتی ہوئی سورج کی اولین کرنیں، جوئبار کی طرح خنک اور شیریں اور انسان اس لمحہ کا ہاتھ تھامے اپنے تصورات میں گم دور بہت دور نکل جاتا ہے۔ وہی لمحہ اس وقت سب کچھ ہوتا ہے۔ اس لمحہ سے آگے پیچھے کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی زمان و مکان نہیں۔ چنانچہ ایک ایسا لمحہ اور ایسے بہت سے دوسرے لمحات، زندگی کی مسلسل اذیت کے درمیان رنگین وقفے ہیں، اور جب ہی انسان اس خوبصورت سی دنیا میں مرنا نہیں چاہتا۔

ہاں تو میں ماں کو بہت چاہتا ہوں۔ مجھے بے کاری کے مسئلہ پر ایک مضمون لکھنا ہے۔ لیکن اچانک میں سب کچھ بھول گیا ہوں میں نے زندگی کے تمام اضافی رشتوں کو بھلا دیا ہے —— اور بس ایک دستک کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کئی دن۔ کئی مہینے سے سوچتا چلا آرہا ہوں۔ اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ کیا انسان واقعی تنہا نہیں رہ سکتا؟ —— میں نے اس دستک سے اپنے ذہن کا رشتہ کیوں جوڑ لیا ہے۔ حالانکہ اس کے بغیر بھی زندگی گذر سکتی ہے۔ اور میں تو اس تنہائی کا عادی بن چکا تھا —— لیکن۔

یوکلپٹس کی شاخوں پر شام دھیرے دھیرے اتر آئی ہے۔

درختوں کے گھنے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں، شام کی چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک معمولی سا سگریٹ جل رہا ہے۔ سامنے آتشدان پر اسما کی تصویر نظر آ رہی ہے۔ اسما۔ اسما۔ اسما۔ آسماں نام سے کچھ نہیں ہوتا۔ عورت تو بس عورت ہوتی ہے اور عورت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سب کو اچھی لگتی ہے، مجھے اسما اچھی لگی تھی، پکے ہوئے سیب کی طرح خوشبودار، رنگین اور گداز۔ جس کے احساس ہی سے ہونٹوں میں حلاوت انگیز لذت کروٹیں لینے لگتی ہے۔ اسما مجھے کہاں ملی تھی؟ ہاں کہیں ملی ضرور تھی۔ ٹھہریئے میں بتاتا ہوں۔ ہاں خوب یاد آیا اس دنیا میں ملی تھی کب اور کہاں کی کیا ضرورت ہے، رنگ و نسل ملک و قوم کی شناخت سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ اور ازلی نفرت بھی۔

میں اپنے گھر کو بھی پہچاننا نہیں چاہتا محض اس وجہ سے کہ شاید کسی دوسرے کو پسند ہو اور یہ کہ دوسروں کی پسند پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ وہ دنیا کی بڑی حسین رہی ہو گی جب کوئی پسند نہ تھی — میری مراد زندگی کے غیر مہذب آغاز سے ہے۔ اور اب جبکہ ہم مہذب ہو چکے ہیں، اپنی پسند دوسروں پر زبردستی بھی تھوپ دیتے ہیں اس لئے کہ پسند بازاروں میں ہمیشہ سے بکتی ہے عورت کے عریاں جسم سے لے کر بندوق کی گولی تک! ہاں یہ الگ بات ہے کہ ان بازاروں میں انسانی جسم سب سے سستی چیز ہے پترہ آنے ایک شلنگ چند سینٹ میں ملتی ہے۔ بندوق کی ایک گولی کی قیمت زیادہ تو نہیں۔ اس کی قیمت تو سگریٹ کے معمولی پیکٹ کے برابر ہے۔

میرے سامنے تازہ اخبار پڑا ہے ویت نام کے بازاروں میں جسم کتنے ارزاں ہیں چند ملین سینٹ میں کتنے جسم پیوند خاک بن گئے۔ تو میں کہہ رہا تھا پسند کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ سماجی پسند، سیاسی پسند، اقتصادی پسند، ثقافتی پسند، اور ہر پسند کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ یہ قیمت اپنے اقدار، پندار، روایات خصوصیات کے ذریعے چکائی جاتی ہے۔ یہ پسند کی بات ہے کہ ہم خٹک اور نیٹم نہ ناچیں، کیمون کیمون اور راک اینڈ رول سے دل بہلائیں، اپنی محبوبہ کو جانِ من، ہنی اور بے۔ بی کہیں اور ماضی کو ایک سرے سے فراموش کر دیں۔ آج کی دنیا ایکسپورٹ امپورٹ کی ہے۔ جس کا معمولی نظریہ ہے، جو ہمارے پاس نہیں وہ دوسروں کے پاس ہے اور جو دوسروں کے پاس نہیں وہ ہمارے پاس ہے اور ان دو نقطوں کے درمیان ساری دنیا پھیل رہی ہے چنانچہ تجارت بڑی چیز ہے، اس کے عمل کے نتیجے میں بیشتر ایسی چیزیں امپورٹ کی جاتی ہیں جنہیں ہم دیکھ سکتے ہیں اور کچھ ایسی ہیں جنہیں ہم دیکھ نہیں سکتے۔ جو جہازوں پر لد کر نہیں آتیں — مثلاً غیر ملکی تہذیب، ثقافت، سیاست، معیشت، اقدار، سوٹ ٹائی، بکنیز، سٹریچنز، ٹائیٹس منی اسکرٹ ہنی شلوار۔ وغیرہ۔

شام گہری ہو کر رات کے سینے میں خنجر کی طرح اتر گئی ہے، اور سامنے مینٹل پیس پر اسما کی تصویر ہنوز مجھے گھور رہی ہے، ہاں تو اسما سے میں اس دنیا میں کہیں ملا تھا، ایک جھیل کے کنارے (جھیل کا نام نہیں بتاؤں گا) اور اس دن میں نے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں صبح کا اجالا دیکھا تھا میں نے سوچا تھا یہ میری زندگی کی اولین صبح ہے یہیں سے زندگی شروع ہوتی ہے بائیولوجیکلی Biologically ہم ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس لئے ہم دونوں نے واقعی ایک دوسرے کے لئے ایک کشش سی محسوس کی۔ نظریوں کی اور جسم کی متضادیت نے بہت سی ضروری چیزوں کی طرح ایک دوسرے کی ضرورت محسوس کی۔ میں نے اس سے پہلی بار جب سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔

تم مجھے پہچانتی ہو؟ —— تو اس نے اسی انداز میں مجھ سے کہا تھا

"ہاں تم ایک مرد ہو"

"اور تم ایک عورت"، — میں نے کہا تھا۔

"ہاں یہ سچ ہے"!

"ہاں یہ سچ ہے"، "یہ سچ ہے کہ تم عورت ہو اور میں مرد ہوں۔ ہم دونوں دو نصف (Two halves) ہیں۔ ارسطو کے Two halves۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی تلاش تھی ہے نا؟ اور اس نے انکار نہیں کیا۔

"تو آؤ ہم شادی کر لیں۔ اس نے گھبرائی ہوئی کانپتی آواز میں کہا جس سے عورت کی کمزوری مترشح تھی" اور اس In search کی غمازی جو عورت کی کمزوری کی تاریخ ہے اور شکسپئر کو بھی خواہ مخواہ کہنا پڑا تھا۔ "Frailty thy name (is) woman" ----- — "شادی؟" میں ہنسا میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس لفظ کو اعتماد سے بدل ڈالو تمہارے جسم و جاں کی قیمت شادی سے تو ادا نہیں ہو سکتی۔" لیکن جواب میں اس کے ہونٹ نہیں ہلے۔ اور میں نے اسے معاف کر دیا۔

پھر آسانے جلدی جلدی دو شادیاں کر ڈالیں۔ دو ناکام شادیاں، دو بچے بھی پیدا کر لئے اور اب دوسرے شوہر سے طلاق لے کر اپنے نقد جاں کے لٹ جانے کا ماتم تنہائی کے کسی گوشے میں کر رہی ہے۔ آسا سے مجھے ہمدردی ہے، میری کلاس میٹ، ازما۔ اسما۔ آسا۔ اور جب سے میں کسی دوسری لڑکی سے نہیں ملا۔ مبادا وہ شادی کی فرمائش نہ کر بیٹھے۔

پھر دھیرے دھیرے پانچ سال بیت گئے۔ میں تنہائی کا عادی ہوتا ہو گیا۔ باہر کی دنیا مجھے نہیں جانتی لیکن اس کمرہ کی چھوٹی سی دنیا مجھے پہچانتی ہے۔ اس کا ہر گوشہ میری شخصیت سے واقف ہے۔ میرا بستر، میز کرسیاں، وارڈروب، آئینہ، میرے پیراہن سب مجھے جانتے ہیں۔ (اگر جاننا ہی وجود کی دلیل ہے) میں نے بستر پر لیٹے لیٹے کیا سوچا ہے؟ چادر پر کروٹوں سے پڑنے والی شکنوں کو سلام ہے میں نے کیا کچھ نہیں سوچا ہے، اگر اس کو تحریر میں لایا جا سکتا، تو کم از کم انٹرپلانٹری فاصلہ کا احاطہ ضرور ممکن ہو جاتا۔ میں نے زندگی کے بارے میں سوچا ہے جو محض ایک لذت انگیز سزا ہے۔ انسانی تاریخ کے بارے میں سوچا ہے — ارتقائی نظریہ کے بارے میں سوچا ہے۔ جو محض پڑھانے کے کام آسکتا ہے۔ اس سے حاصل کچھ نہیں ہے اس لئے کہ حال سب کچھ ہے۔ ماضی مادرائیت کا حامل ہے — Abstract ہے۔ ایک پردہ ہے۔ ایک حجاب ہے جس کو ہم نے نہیں دیکھا ہے جس میں ہم نے سانس نہیں لی ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا کیا — ماضی کلاسیکی تخیل ہے۔ دل بہلانے کا کام آتا ہے۔ جیسے ورڈز ورتھ کی شاعری ماضی ماضی کے انسان جو پیوند خاک ہو گئے ان کا رونا کیا — ہم کیروسن لیمپ، گھوڑا گاڑی، مادام بوواری یا امراؤ جان ادا جیسے کردار کے بارے میں کیوں سوچیں؟ کیسے سوچیں جبکہ ہمارے سامنے ۰۰۷ ایجنٹ جیمس بانڈ کا (Thunderball) تھریلر دکھایا جا رہا ہے، الکٹرک لیمپ جل رہا ہے ریڈیو گرام سے ولیسٹرن سمفنی سن رہے ہیں۔ پھر نتھو خاں کی سارنگی کو کون پوچھے؟

حال اچھا ہے۔ اس لئے کہ ہم حال میں جی رہے ہیں۔ ہماری آنکھیں کھلی ہیں۔ حال اچھا ہے کہ سب چیزیں خریدی جا سکتی ہیں کیا عمدہ دور ہے کہ نہ مجنوں بننے کی ضرورت ہے اور نہ فرہاد۔ نہ تیشہ چھننے کی ضرورت ہے اور نہ کر نیری۔ ماضی کے چاند ستاروں کا جب بھرم نہ رہا تو بیچارا ماضی، "اونہو" —

پتہ نہیں اسی انداز میں اور نہ جانے کتنے مسائل کے بارے میں میں نے سوچا ہے۔ عورت کے بارے میں بھی سوچا تھا، لیکن اس دن — ہاں اس دن باہر یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ میں نے دریچے بند کر کے پردے سرکا دیئے تھے۔ ہیٹر جل رہا تھا اور میں اونی گاؤن میں لپٹا آرام کرسی پر لیٹا ہلکے ہلکے سگار کے کش لے رہا تھا کہ اچانک دروازہ پر دستک ہوئی — اور

میں جیسے جاگ پڑا۔

یہ دستک بڑی نرم و نازک تھی ـــــ ہوا کی طرح ـــــ میں نے سوچا بھی یہی کہ ہوا ہے' ـــــ لیکن یہ دستک پھر سنائی دی۔ میں نے پھر یہی سوچا ـ ہوا ہے ـــــ

ہاں ہوا ہے ـ مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا ـ کون ہوسکتا ہے بھلا اس وقت، مگر دستک کی آواز قوسوں کی طرح کمرے میں پھیلتی رہی میری سماعت کے ہاتھ انھیں سمیٹتے رہے ـ اور جب یہ ہاتھ تھک گئے (مگر تھک کیوں گئے؟) میں نے بڑھ کر آہستہ سے دروازہ کھولا جیسے میرے استقبال کو ہوا کھڑی ہو ـ مگر میں نے دروازہ پر چنبیلی کے پھولوں جیسا ایک ہاتھ دیکھا، لانبی لانبی مخروطی انگلیاں ـ برآمدہ میں اندھیرا تھا مگر یہ مخروطی انگلیاں بڑی روشن تھیں ـ ان سے بڑی میٹھی روشنی پھوٹ رہی تھی اور مجھے بھینی سی خوشبو کا احساس ہوا ـ اوہ معاف کیجئے، دستک دینے والی لڑکی نے کہا اور ایکدم سے پلٹ گئی ـ برآمدے کے اندھیرے میں پشت کی جانب سے میں اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا ـ میں نے صرف اس کی انگلیاں دیکھی تھیں، اس کا چہرہ ایک لمحہ کے لئے بھی میرے سامنے نہ آسکا تھا' ـ اور نہ اس نے اس کا موقع ہی دیا تھا کہ میں اس کے بارے میں دریافت کرسکتا ـ وہ چلی گئی ـــــ وہ کیوں آئی تھی ـــــ وہ کون ہے! ـ اس سے ایسی غلطی کیوں سرزد ہوئی ـــــ وہ عمداً آئی تھی ـ بس یہ اس کی ایک ادا تھی، ـــــ وہ پھر آئے گی ـ

منطقی طور پر میں نے سوچا تو سارے استدلال ناموافق ٹھہرے اور جن کا لب و لباب یہ تھا کہ اس سے غلطی ہوئی تھی ـ یہ محض اتفاقیہ بات تھی اور کچھ نہیں ـ بہت سے ایسے اتفاقات ہوتے ہیں، اور ایسے حسین اتفاقات کئی بار ہوتے ہیں ـ

مگر ان تمام منطقی دلیلوں کے باوجود میں نے محسوس کیا تھا کہ اس دستک میں بڑی اپنائیت تھی، لگاوٹ تھی، وہ دستک بے معنی نہیں تھی ـــــ میں بہت دیر تک کرسی پر دراز سوچتا رہا اور جتنا سوچا یہ دستک زینہ بہ زینہ میرے دل میں اترتی چلی گئی ـ وہ روشن انگلیاں میرے ذہن میں چراغ کی طرح لو دے اٹھیں ـ

یہ دستک کل بھی ہوگی ـــــ ضرور ہوگی ـ کس وقت ہوگی ؟ کسی وقت بھی ہوگی مجھے اس دستک کا انتظار کرنا ہوگا ـ میں تمام رات کروٹیں بدلتا رہا ـ کئی بار میں نے اپنے ذہن سے ان روشن انگلیوں کو نوچ کر جدا کردیا لیکن اس دستک کی آواز دل کے نہاں خانے میں گونجتی رہی ـ

میں نے دوسرے دن اسی وقت پھر ان انگلیوں کا انتظار کیا ـ میں نے ہوا اور ہاتھوں کی دستک کا ہزار بار ذہن میں موازنہ کیا خود دروازہ پر دستک دیکر اس فرق کو سمجھنے کی کوشش کی اور پھر انتظار کرتا رہا ـ کربناک انتظار اور تب میں نے محسوس کیا کہ میری تنہائی کو اس دستک نے ڈس لیا ہے ـ وہ خوبصورت ہاتھ ہر جگہ موجود ہے، میری نگاہوں کے سامنے ہمہ وقت موجود ہے ـ

تیسرے دن صبح سے شام تک میں برآمدے میں بیٹھا لان پر ٹہلنے والی لڑکیوں کو دیکھتا رہا ـ شاید وہ ہاتھ نظر آجائے، اور اگر نظر آجائے تو میں اس سے ضرور انتقام لوں گا ـ میری جھنجھلاہٹ بڑھتی جارہی تھی ـ لیکن وہ ہاتھ کہیں نظر نہ آیا ـ سامنے پہاڑوں پر سورج طلوع ہوتا رہا ـ شام پھیلتی اور گہری ہوتی رہی ـ پھول جھکتے رہے مگر وہ ہاتھ نظر نہ آیا ـ لیکن میں اس ہاتھ کو بھول نہیں سکا ـ اس دستک نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا ـ میں اسے کیسے یوں فراموش کرسکتا تھا ـ میں اس ہاتھ کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا ـ

دن، ہفتہ، اور پھر ایک ماہ گذر گیا ـــــ وہ ہاتھ نظر نہ آیا نہ وہ دستک سنائی دی پھر دھیرے دھیرے میرا دل ایک بند دروازہ بنتا گیا جس پر ہر لمحہ اس خوبصورت ہاتھ کی دستک سنائی دیتی ـ میری بند آنکھیں کھل جاتی ہیں میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا

مگر وہ ہاتھ کہیں دکھائی نہیں دیتا،

ڈیم اٹ، میں اکتا کر سوچتا ہوں۔

دنیا میں بہت سارے کام ہیں، مثلاً یہ کہ مجھے ایک مضمون لکھنا ہے ماں کی خیریت دریافت کرنی ہے۔

اور ایک دن میں اسی دستک کے انتظار میں تھا کہ ایک گاڑی ڈاک بنگلے کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ میری ماں بہت بیمار اور تھکی تھکی سی برآمدے کی سیڑھی طے کر رہی تھی۔ ان کے پیچھے ایک نازک نازک سی خوبصورت لڑکی تھی۔

میں ماں کو سہارا دیکر اندر لے آیا۔ ان کی آواز میں کپکپی تھی۔

"اس سے ملو — یہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں — میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔ میں چاہتی تھی تم اسے اپنے لئے پسند کرو تو تمہاری شادی کر کے سکون سے مرسکوں —

میں قطعی چپ ہوں — میرے سامنے اسما کھڑی ہے وہ کہہ رہی ہے مجھ سے شادی کرلو۔

وہ روشن خوبصورت انگلیاں چراغ کی طرح لو دے رہی ہیں، جن کا میں روز انتظار کرتا ہوں۔ میں نے ماں کو بستر پر لٹا دیا ہے۔ وہ لڑکی باہر لان پر ٹہل رہی ہے۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا ہے، باہر یخ بستہ ہوا چل رہی ہے، میں نے دروازہ بند کر دیا ہے۔ اتنے میں دھیرے دھیرے دستک ہوئی ہے، وہی جانی پہچانی دستک — میں دوڑتا ہوں — میری سانس پھول رہی ہے میں نے دروازہ کھولتے ہی اس کی انگلیوں کو پکڑ لیا ہے۔ تو یہ تم تھیں —

"ہاں —، وہ کمرہ میں آجاتی ہے اندر روشنی ہے میں دیکھتا ہوں یہ تو وہی لڑکی ہے جسے آج صبح ماں لائی ہے۔ تمہارا نام اسما ہے نا۔

میں سرگوشی میں پوچھتا ہوں —

"ہاں" وہ جھکی جھکی نظروں سے کہتی ہے۔

"یہ دستک تم نے ہی دی تھی — ؟

"ہاں —" وہ اسی انداز میں کہتی ہے۔

اور میں اس کا ہاتھ تھام لیتا ہوں — تم اسما ہو — تم وہی دستک والی لڑکی ہو —، اور اچانک میرے ذہن میں انگلیوں کی شمع بجھ جاتی ہے، اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس لڑکی نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اور میں اچانک اندھیرے سے روشنی میں آگیا ہوں۔

(ڈرہم۔ (انگلینڈ) سے)

قیصر تمکین

سواستکا

میں نے اس کو سب سے پہلے وی آنا میں دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو تھا مگر اس نے پھرتی سے یہ مہلک ہتھیار اپنی لانبی برساتی میں چھپا لیا۔

اس پراسرار اجنبی سے دوبارہ میری ملاقات ڈسلڈورف میں ہوئی۔ وہاں میں نے ایک نئی بات دیکھی۔ اس کے بائیں ہاتھ کی آستین پر سواستکا بنا ہوا تھا۔ جب میں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا تو وہ مسکرایا۔ بڑی لاتعلقی کی قسم کی مسکراہٹ تھی وہ۔ مجھے ایسا جان پڑا جیسے میں اس شکل کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ بہت پہلے یقیناً وی آنا میں ملنے سے بھی پہلے۔

میں نے اپنی حیرانی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے نظریں ملتے ہی بڑی شناسا مسکراہٹ کا تیر چھوڑا۔ وہ بھی یونہی مسکرایا پر ہم ملے نہیں کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔

مدت گذری اس واقعہ کو۔ ایک آدھ بار جب مجھ کو اس کا خیال آیا بھی تو میں نے سوچا کہ چند عجیب و غریب حالات کی طرح یہ ملاقات بھی تھی۔ مگر اس اجنبی سے ملنے کا انداز بھی خوب تھا۔ اور یہی انداز مجھ کو اکثر یاد آتا اور میں اسکو خاصا دلچسپ محسوس کرتا۔

لیکن مجھ کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا جب میں نے کمال حیرت کے ساتھ وہی چہرہ ۱۵ دسمبر کو لا جیونزاں تراکس روسیو میں بھی دیکھا۔ وہ نوجوانوں کے ہوسٹل میں رات کے ناچ میں شامل تھا میں اس کو نہ دیکھتا مگر ہوا یہ کہ اتفاق سے تمام نوجوان اور البیلی لڑکیوں نے یکے بعد دیگرے بڑی بناوٹی خوش اخلاقی سے اس کی رقص کی پیشکش مسترد کر دی۔ میں نے اپنی ہم رقص کے ساتھ گنبد ہال کے ستونوں سے گذرتے ہوئے ایکشمع بجھائی اور بڑی سرعت کے ساتھ قدم بدلے تو اسکو لانبے ستون کا سہارا لئے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "یہ دور ارذل ترین مخلوق کے عروج کا دور ہے۔"

تیسرے ناچ میں میرے ساتھ سی آسا بی اردن کی ایک کالے رنگ، چپٹی ناک اور الجھے الجھے خشک بالوں والی ایک نیگرو حسینہ تھی۔ اس کا بدن آگ کی طرح حرارت بخش اور اس کا دل دودھ میں دھوئے ہوئے سنگ مرمر کی طرح اجلا اور بے داغ تھا۔ میں نے اس کے چکنے ہوئے آبنوسی ماتھے پر کنواری مریم کا تقدس بھی دیکھا۔ اسوقت اس کی بانہیں کرہ ارض کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے معلوم ہو رہی تھیں۔

میرا پُراسرار اجنبی شناسا بڑبڑا رہا تھا! "یہ دور ارذل ترین مخلوق کے عروج کا دور ہے" اس نے دی گول کو بھی برا بھلا کہا پانچویں جمہوریہ کو بھی گالی دی مگر میں نے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے ہجوم کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر گانا شروع کر دیا۔ "بہاروں کی رونق

ہمارے ہی دم سے۔ ہمارے ہی دم سے۔ بہاروں کی رونق۔ بہاروں کی رعنائیاں ۔۔!"
میں نے جب اس کی طرف دیکھ کر تالی بجائی اور سب کی سنگت میں چلا کر کہا ۔"
ستاروں کی تابندگی ۔۔۔ ہمارے ہی دم سے ہے
سمندر کو گہرائیاں ہم نے دی ہیں
بہاروں کو رعنائیاں ہم نے دی ہیں
تو وہ برا مان گیا۔ شاید میرا لہجہ اس کو برا لگا۔ شاید اس نے گیت پسند نہیں کیا کیونکہ وہ وہاں سے بہت ہی احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کر گیا۔
"تم خفا کیوں ہو۔۔؟ آؤ نا ہماری سنگت اختیار کرو ۔ یہ دیکھو یہ دوسری لڑکی جو میرے ساتھ مل کر گا رہی ہے یہ باربیڈاس سے آئی ہے۔ اس کی آواز کا سریلا پن تو محسوس کرو ۔۔۔!"
اس نے گلاس غصے میں ایک طرف پٹخ دیا اور کرسی زور سے ایک طرف کھسکا کر وہاں سے بھی چل دیا۔ میں نے اپنی نظروں کو ایک جاسوس کا کام سونپا اور اس جاسوس نے کلوک روم سے واپس آکر بتایا کہ اُس عجیب آدمی کی برساتی کے اندر تو ایک لمبا خنجر چھپا ہوا تھا۔
"اوداغ موسیو ۔۔۔ "میرے نظروں کے جاسوس نے بہ آواز بلند اسکو الوداع کہی۔
مگر یہ وداع آخر نہیں تھی۔ وہ مجھ کو پھر ملا۔ اب کی مجھ کو پہچاننے میں ذرا دقت ہوئی وہ بڑا بڑھیا ڈبل سوٹ پہنے ۔۔۔ سیواٹے میں مصروف گفتار تھا۔ اس کے لہجے میں اعتماد۔ الفاظ میں شائستگی اور چہرے پر بڑی پروقار ملائمت تھی۔
"تم منحوس یہاں بھی آگئے ۔۔۔" اس نے زور سے چلا کر کہا۔ اس کی آواز مائیکروفون پر سے ہوتی ہوئی اس وسیع و پر شوکت ہال میں گونج گئی۔
"ہاں ۔۔ میں یہاں بھی ہوں ۔ وہاں بھی ہوں ۔ ہر جگہ ہوں ۔ میں تو ہر جگہ ہوں ہمت ہے تو میری آمد پر قدغن لگا دو ۔۔"
پر وہاں خاموشی تھی۔ میری آواز نجانے کن ان دیکھی ۔ اجنبی وادیوں سے گونجتی ہوئی خود مجھ تک واپس آگئی۔
"میں یہاں ہوں میں وہاں ہوں ۔ میں ہر جگہ ہوں ۔ میں اس دور کا ضمیر ہوں۔ مجھ کو مار سکو تو بولو ۔۔ ؟" میں نے پھر ایک فلک شگاف نعرے کی مانند اس ہال کو دہلا دیا اور اجنبی اور ان دیکھی وادیوں سے آئی ہوئی صدائے بازگشت نے میری ہاں میں ہاں ملائی
"مجھ کو مار سکو تو بولو ۔۔۔ ؟"
میں نے کہا! "میں نے وہ خنجر بھی دیکھا ہے جو تمہارے لباس میں پوشیدہ ہے ۔ میں نے وہ نشان بھی دیکھا ہے جو تمہارے بائیں ہاتھ کی آستین پر مرتسم ہے ۔ پر میں تمہارے جھوٹے سہاروں کو پاش پاش کر دوں گا ۔۔"
"میں ان سہاروں کو پاش پاش کر دوں گا ۔۔ " بازگشت نے پھر میری بات دہرائی ۔
پھر ایسا لگتا تھا جیسے چاروں طرف وادیاں ہی وادیاں ہوں اور ان وادیوں کی تنگنائیوں میں صرف میری ہی آواز گونج رہی ہو۔
"مجھ کو مار سکو تو بولو ۔۔۔ ؟"
میں نے کسی وسیع و عریض دریا کے کنارے پر غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی طرح اس کا چہرہ دھندلاتا ہوا دیکھا۔

دھیرے دھیرے وہ جانا پہچانا اجنبی معدوم ہو گیا۔

میں ہنستے ہوئے گنگناتا ہوا پریس ایسوسی ایشن کی شاندار عمارت میں داخل ہوا۔ خبر رسانی کے مرکزی کمرے میں کرتین باغ نے بہت سے کاغذات میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔ میں نے ان سب پیغامات کو اہم کاغذات کی کشتی میں ڈالا اور کرتین باغ سے کہا "وہ میرا شناسا اجنبی مجھکو سیوائے میں بھی ملا تھا۔ اس نے مجھ کو بلا کسی سبب کے بُرا بھلا کہا ہے۔"

"ہاں وہ یہاں بھی آیا تھا ـــ اگر تمہارے بیان کردہ حلیئے پر بھروسہ کروں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ پراسرار اجنبی یہاں بھی آیا تھا ـــ"

میرے کچھ اور پوچھنے سے قبل ہی کرتین باغ نے کہا! "مگر سنو۔ ان پیغامات میں تم کو دلچسپی ہوگی۔ ان سب کا خلاصہ تین سو تین سو الفاظ میں کر کے شام کے اخبارات کے لئے بھیج دو ـــ"

میں اجنبی کے بارے میں بھول گیا۔ میرے دل میں ان وادیوں کی خوشبو تھی جہاں ارذل ترین مخلوق اپنے عروج کے دور میں داخل ہو رہی تھی۔

لیکن جب میں نے ان تمام پیغامات کا خلاصہ کر کے ایک رپورٹ ٹیلی پرنٹر روم میں شام کے اخبارات کے لئے بھیجی تو میرا جی تھکا ہوا تھا۔ مجھے اس اجنبی کا خیال پریشان کر رہا تھا۔

یہ سب خبریں میرے گھر کی تھیں۔ اس علاقے کی تھیں جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی اور جوانی کے تپتے ہوئے ریگستان کی طرف ایک نہ بجھنے والی پیاس کے ساتھ افتاں وخیزاں قدم بڑھائے تھے۔ جہاں میں نے ننگے پاؤں اسکول جانا سیکھا تھا اور تہواروں کے دنوں میں بھوک دیوتا کے زہریلے ناخنوں سے اپنے وجود کو بار ہا کھرچا ہوا دیکھا تھا۔

کرتین باغ نے چلتے وقت مجھ کو ایک لفافہ دیا اور میں عجلت میں یہ دیکھنا بھول گیا کہ اس نے کیا کہا تھا۔

پنسیلو نیا کے ریلوے اسٹیشن پر میں بہت ہی تھکا ہوا تھا۔ جنوب کے ایک نامعقول شہر سے نیویارک تک ریل کے ذریعہ سفر کرنے کا مشورہ کوئی احمق ہی دے سکتا تھا۔ میں نے بغیر کسی احمقانہ مشورے کے یہ بدبختی مول لی تھی۔ اور پھر شامت اعمال کہ آج اتوار کا دن تھا۔

نیویارک میں اتوار کا دن ایسا ہی ہے جیسے کوئی الھڑ حسینہ اپنے مشکل دنوں میں آپ کی ساتھی ہو۔

"ارے ـــ" میں نے بے ساختہ کہا۔

کلب ۴۲ کے صدر دروازے پر جو پُراسرار شخص مسکرا رہا تھا وہ وہی منحوس اجنبی تھا۔ میں نے غصے میں آگ اگلتے ہوئے چلا کر کہا: "مجھ کو مار سکو تو بولو ـــ؟"

اس نے اپنے ہاتھوں سے جو غیر فطری اور غیر معمولی طور پر لانبے تھے میرے نفیس پورٹ مانٹو کی طرف اشارہ کیا اور تیزی سے ایک طرف کو چل پڑا۔

میرے پورٹ مانٹو میں کوئی چیز بھی غیر معمولی نہیں تھی۔ صرف ایک لفافہ ہی شامل تھا جو کرتین باغ نے مجھ کو دیا تھا اور جسے کھولنا میں بھول گیا تھا۔

لفافے کے اندر ایک کاغذ پر ایک سرخ صلیب بنی ہوئی تھی۔ قبل اس کے کہ میں اس نشان کا مطلب سمجھتا یہ نشان چلیپائی

شکل میں جلنے لگا۔ کاغذ ایسے ہی دھیرے دھیرے سیاہ ہو کر چُر مُرا گیا جیسے کسی نے جلتی ہوئی سگریٹ رکھ دی ہو۔ پھر یکایک پورا کاغذ بھڑک اٹھا۔ صلیب والے حصے نے پورے کاغذ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس رات مجھ کو نیند نہیں آئی۔

آرام دہ وی سی ٹن کے کیبن میں بیٹھے بیٹھے میں ملکوں ملکوں، شہروں شہروں ہوتا ہوا جب گھر پہونچا تو آنگن میں املی کا وہ درخت کٹ چکا تھا جس کے سائے میں ہم جوان ہوئے تھے۔ وہاں پر ایک صلیب جل رہی تھی۔ گھر میں کوئی نہ تھا صرف دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔

ایک خوفناک قہقہے نے میرا خیر مقدم کیا۔ وہاں میرا منحوس شناسا۔ وہی پُراسرار اجنبی تھا جس کے چہرے پر فتحمندی کی چمک تھی۔

(ڈارلنگٹن (انگلینڈ) سے)

آنسوؤں کے پُل سے

(صفحہ ۳۰۲ سے آگے)

تھے جب ام امیرہ کی کوکھ اور سینہ بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر کھا رہے تھے تو اسرائیلی سپاہی قہقہے لگا کر فاتحانہ انداز میں کہتے تھے،
آج ہم نے اُس عرب ماں کو ختم کر ڈالا۔ جو نسل عربی میں اضافہ کرتی تھی۔
انہوں نے عرب ماں کو ختم کر ڈالا۔ لیکن وہ اُس "امیرہ" کو ختم نہیں کر سکتے جو دنیائے عرب میں ہر جگہ ہے۔
اور جو آنسوؤں کے پُل پہ کھڑی اُس گھر کی جانب دیکھ رہی ہے جو لاشوں کے انبار سے اسرائیل خود اپنے ہاتھوں اُس کے لئے تیار کر رہا ہے۔

آؤ ــ امیرہ ــــ ہم اُس گھر میں چلیں!

پیاسے پنچھی

(صفحہ ۳۰۴ سے آگے)

ذہنوں کو ٹھنڈک پہنچا سکتی ہے مگر پیاسی روحوں کو تر نہیں کر سکتی۔ آؤ بھیگے ذہنوں اور تپتے جسموں کو لئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں کہ زندگی کی ان سچائیوں کا اعتراف کر کے ہیں اُن بہاروں کو اوڑھ لینا چاہیئے جو ہماری ٹھنڈک اور حرارت کا سامان تو ہیں مگر پیاسی روحوں کا مداوا نہیں ــــ ورنہ حوا کی ڈسی ہوئی تنہائی کے پیچھے صدیوں میں پھیلا ہوا گرم اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں ڈوب کر نہ آج تک مجھے سکون ملا ہے نہ تمہاری پیاس بجھی ہے۔ اضطراب و تشنگی کے اس صحرا میں ذہنی سکون کے اس نخلستان کو غنیمت جانو کہ پلکوں کی صدائیں ناکام نہیں لوٹیں۔ وہ بھیگی ہوئی دوپہری کہانیاں بن کر میرے اور تیرے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔

اور یہ کہانیاں بھلا کیسے عزیز نہ ہوں گی؟

فیض انصاری

دربارہ سنگھ

وہ جب ہوٹل سے نیچے اترا تو ٹیکسی غائب تھی۔

وہ لڑکھڑا گیا۔ جیسے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ قریب تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑتا کہ ہوٹل کے بوائے نے جو اس کے ساتھ نیچے آیا تھا دوڑ کر اس کو سہارا دیا تب ہی ایک اور ٹیکسی وہاں آکر رکی اور اس میں سے ایک جوڑا اتر کر ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سر کی جنبش سے ہوٹل بوائے سے پوچھا۔ "ماجرا کیا ہے۔"

"ان کی گھر والی کو سامان سمیت ایک ٹیکسی والا لے اڑا۔"

ہوٹل بوائے نے مختصر جواب دیا اور بے ہوش ہوتے ہوئے نوجوان کو سنبھال کر بیٹھ گیا۔

پہلے تو ٹیکسی ڈرائیور نے موٹر اسٹارٹ کی لیکن پھر نجانے کیا سوچ کر گاڑی بند کر دی اور جلدی سے نیچے اتر آیا۔

"چل اسے گاڑی میں ڈال دے" ڈرائیور نے پچھلا دروازہ کھول کر نوجوان کو سنبھالتے ہوئے بوائے سے کہا۔ پھر دونوں نے بے ہوش نوجوان کو موٹر کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا دوسرے لمحے ٹیکسی تیزی سے روانہ ہو گئی۔ اور ہوٹل بوائے حیران نگاہوں سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

"یہ بڑی بدنامی کی بات ہے استاد۔ اس ٹیکسی والے کو ڈھونڈ نکالنا ہی ہوگا"

"ضرور ڈھونڈا جائے گا بیچا سنگھ۔ ان حرام جادوں نے ہی اکھا میٹی کے ٹیکسی والوں" کو بدنام کر رکھا ہے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ اس بیچارے کا نیا نیا شادی ہوئے لاہے اور یہ اپنی دلہنیا کو بمبئی دکھانے لایا تھا۔"

امر چند بے ہوش نوجوان کی پیشانی پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"اسے تھوڑے چھینٹے اور بھی دو جلدی ہوش میں آجائیگا"

عبدل امر چند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"ارے عبدل آج بارہ بجے تیری گاڑی تو وی ٹی پر تھی نا"

"تھی تو استاد مگر میں ریل کے آنے سے پہلے ایک سواری لے کر چلا آیا تھا"

عبدل دربارہ سنگھ کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کچھ دھیان میں ہے کہ وی ٹی پر کس اڈے کے ٹیکسی والے تھے"

"اپنے اڈے کا تو صرف میں تھا اور زیادہ ٹیکسیاں جے جے دھوبی تالاب اور وی ٹی کی ہی تھیں۔"

"ہوں . . . . دھوبی تلاب"

دربارہ سنگھ کی کالی ڈاڑھی لرزنے لگی جیسے اس نے اصلی مجرم کا پتہ چلا لیا ہو مارے غصے کے اُس کا جسم کانپنے لگا۔

دن ہفتوں میں بدلے اور ہفتے مہینوں میں لیکن دلیپ کا دکھ ایک لمحہ کے لئے اس سے جدا نہ ہوا۔ دربارہ سنگھ اور اس کے بچاسوں ساتھیوں نے اُس ٹیکسی والے کا پتہ لگانے کے ہزار جتن کئے مگر معلوم نہ ہو سکا کہ بمبئی کے ہزاروں ٹیکسی والوں میں وہ کون کمینہ ہے جو دلیپ کی نئی نویلی دلہن کو اس کے سینکڑوں روپوں کے زیورات کے ساتھ لے اڑا۔ دربارہ سنگھ دلیپ کو لیکر بمبئی کی ہر اُس بدنام جگہ پر گیا۔ جہاں اس قسم کی مجبور عورتوں کو بیچ دیا جاتا ہے اور پھر خریدنے والے اُن سے پیشہ کرا کے اپنی ادا کی ہوئی قیمت سود در سود وصول کرتے رہتے ہیں لیکن اس کو ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ یوں اُسے دسوں ہی پیشہ ور لڑکیاں ملیں جن کی کہانیاں دلیپ کی دلہن چمپا سے بہت کچھ ملتی جلتی تھیں لیکن ان میں دلیپ کی چمپا کوئی نہ تھی۔

چمپا ایک دیہات کی سیدھی سادھی لڑکی تھی۔ دلیپ بچپن سے اسی کا دیوانہ تھا۔ چمپا تھی بھی چمپا کلی جس پر کسی بھی بھونرے کا دل کچھا دہ ہو سکتا تھا۔ پھر دلیپ تو اس پر اس وقت سے فدا تھا جب اس کی کونپلیں بھی ٹھیک سے نہیں پھوٹی تھیں۔

دلیپ اُسی کے گاؤں کے ایک بڑے کسان کا لڑکا تھا۔ گاؤں کے اسکول سے پڑھ کر وہ اونچی تعلیم کے لئے شہر آگیا تھا۔ پورے پانچ برس وہ شہر میں رہا اور نجانے اس کی نگاہوں سے کیسی کیسی صورتیں گزریں لیکن اُن میں ایک بھی تو ایسی نہ تھی جو اُس کی نگاہوں پر چڑھ سکتی۔ وہ جب بھی شہر کی کسی خوبصورت اور بنی سنوری لڑکی کو دیکھتا تو اس کو ایسا لگتا جیسے وہ اپنے گاؤں کے مورتی کار کی کوئی پتلی دیکھ رہا ہو جس کو رنگ و روغن لگا کر مورتی کار سجا دیتا ہے اور چہرے پر چونا پوت کر حسین بنا دیتا ہے۔ دلیپ کو شہر کی ہر لڑکی کے چہرے پر ایسا ہی چونا پُتا ہوا نظر آتا تب ہی اُس کی نگاہوں میں چمپا کا ٹماٹر کی طرح سرخ چہرہ گھوم جاتا اور اس کا دل فوراً اُڑ کر گاؤں پہونچ جاتا اور وہ تڑپ اٹھتا۔

اور پھر جب اُس نے میٹرک پاس کر لیا تو اپنے باپ کو ایک خط لکھ کر یہ سمجھا دیا کہ اگر اس کی شادی چمپا سے نہ کی گئی تو وہ گاؤں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے شہر چلا آئے گا۔ بوڑھا باپ اپنے جوان بیٹے کی یہ خواہش پوری کرنے کے لئے اس لئے مجبور ہو گیا کہ وہ دمہ کا مریض تھا اور دلیپ ہی ایک جوان بیٹا تھا جو اس کے ایک بڑے کاروبار کو سنبھال سکتا تھا۔ اگرچہ اس کی تمنا تھی کہ دلیپ کی شادی وہ گاؤں کے پٹیل کی اس لڑکی سے کرے گا جو گاؤں کے اسکول میں پانچویں پاس ہو کر نکلی ہے اور اپنے باپ کی تنہا اولاد ہے مگر باپ کو اپنی لاچاری کے آگے اپنے ہی ایک مزدور کی اَن پڑھ لڑکی سے اپنے ہونہار لڑکے کی شادی کر دینی پڑی اور پھر شادی کے ایک ہفتہ کے بعد ہی اپنے بیٹے اور بہو کو بمبئی کی سیر کے لئے جانے کی اجازت بھی دینی پڑی۔

بمبئی دیکھنے کی تمنا دلیپ کے دل میں اسی وقت پیدا ہوئی تھی جب وہ اپنے گاؤں کے اسکول کی پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور وہاں کے ہیڈ ماسٹر کا لڑکا جو بمبئی میں نوکری کرتا تھا کچھ دنوں کے لئے اس کے گاؤں آیا تھا۔ وہ روز شام کو چوپال پر بیٹھ کر گاؤں کے چھوٹے بڑے لڑکوں کو بمبئی کے ایک سے ایک دلچسپ قصے سناتا اُس کی سندرتا کا تذکرہ کرتا۔ اُس کی آکاش سے باتیں کرتی ہوئی بلڈنگوں کی تعریف میں اپنی زبان سکھا لیتا اور پھر اُن فلم ایکٹروں کا ذکر جن کو گاؤں کے نوجوان اور بھولے

بجائے لڑکے ٹورینگ سینما کے پردے پر ہی دیکھتے تھے کچھ اس انداز سے گویا کہ جیسے وہ سب اس کے گھر کے دوست ہوں ۔

گاؤں سے بمبئی آتے وقت اس نے ہیڈ ماسٹر سے ان کے لڑکے کا پتہ لکھ لیا تھا ———————

——————— لیکن ہیڈ ماسٹر نے دلیپ سے کہا تھا کہ وہ پہلے کسی ہوٹل میں ٹھہر جائے اور پھر اس کے لڑکے کے پتے پر جائے اس لئے کہ اس کا لڑکا جس مکان میں رہتا ہے وہ بمبئی کے بڑے اسٹیشن سے کافی دور ہے۔ ٹیکسی والے بہت کرایہ مانگیں گے ۔ میرا لڑکا ساتھ ہوگا تو وہ تم لوگوں کو لوکل گاڑی سے تھوڑے سے پیسوں میں لے کر چلا جائے گا۔ ہیڈ ماسٹر نے دلیپ کو یہ بھی صلاح دی تھی کہ وہ شہر کے ریلوے اسٹیشن سے لڑکے کو اپنے بمبئی پہونچنے کا تار دیدے تاکہ وہ تم لوگوں کو لینے اسٹیشن آجائے لیکن دلیپ نے تار اس لئے نہ دیا کہ وہ اپنی چمپا کو ہوٹل میں ٹھہرانا چاہتا تھا اور کسی تیسرے کے بغیر بمبئی کے سیر سپاٹے کرنا چاہتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کے لڑکے کا پتہ تو اس نے محض باپ کے مشورے پر لکھ لیا تھا ورنہ اسے شہر میں رہنے کے اپنے تجربے پر پورا بھروسہ تھا۔ یہی ناکہ بمبئی ناگپور سے دوگنا بڑا ہوگا۔ وہاں کی ہوٹلوں کا ڈبل ریٹ دس پندرہ روپیہ روز ہوگا ٹیکسی کے بارے میں تو اسے معلوم ہی تھا کہ اس میں ایک میٹر لگا ہوتا ہے، اس کا بتایا ہوا کرایہ ہی ادا کرنا پڑتا ہے لیکن اسے کیا خبر تھی کہ ناگپور کے تجربے بمبئی میں کام نہیں دیتے جو دھوکے ناگپور کے اندھیروں میں کھائے جاتے ہیں وہ بمبئی کے اجالوں میں کھانے پڑتے ہیں

چمپا نے جب شادی کی رات دلیپ سے سنا تھا کہ وہ اسے بمبئی دکھانے لے جائیگا تو اس کے دل میں ایک انجانا سا خوف پیدا ہوا تھا اور اس نے دبی زبان میں دلیپ سے کہا تھا ۔

"دوکسی چھوٹے شہر میں چلو نا ۔"

اور دلیپ اس کی اس بات پر بڑی زور سے ہنسا تھا۔ اور بولا تھا

"بچگی شہر بڑے ہی دیکھے جاتے ہیں اور پھر بمبئی تو ہمارے دیس کی ویسی ہی دلہن ہے جیسی تو اس وقت میری ہے ۔"

چمپا بیچاری مسکرا کر رہ گئی تھی لیکن اس کے دل میں یہ خوف برابر بیٹھا رہا تھا کہ وہ بمبئی نہ جانے کیسی دلہن ہے؟"

اس وقت جب دلیپ امر چند کی ٹیکسی کی اسٹرینگ پر بیٹھا ہوا سواری کا انتظار کر رہا تھا تو اس کے کانوں میں چمپا کی یہ دبی آواز سنائی دے رہی تھی کہ "دوکسی چھوٹے شہر چلو نا"

اور دلیپ کو بمبئی کی وہ اونچی اونچی آکاش سے سر ٹکراتی بلڈنگیں جو اس کی حد نگاہ تک دائرے میں پھیلی ہوئی تھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسی کہ وہ ہمالیہ کی چوٹیاں ہوں جس پر دلیپ نہیں تن سنگھ ہی چڑھ سکتا ہے۔

تب ہی ایک جوڑا اس کی ٹیکسی میں داخل ہوا اور پشت سے اس کے کانوں میں آواز آئی ۔

"وی ۔ ٹی"

دلیپ نے موٹر ڈرائیونگ سیکھ لی تھی دربارہ سنگھ نے اسے سمجھایا تھا کر اس پر مجبور کیا تھا اس لئے کہ وہ لوٹ کر اپنے گاؤں نہیں جانا چاہتا تھا۔ گاؤں جاتا بھی تو کیا منہ لے کر دوستوں سے بڑی بڑی باتیں کر آیا تھا۔ باپ کے بار بار منع کرنے پر بھی بمبئی آنے کی ضد کی تھی ۔ ماں نے اکیلے جانے کے لئے کہا تھا تو جواب دیا تھا کہ میرے ہوتے " تمہاری بہو بمبئی میں کھو نہیں جائیگی اور سب سے بڑی بات اس کے استاد نے کہی تھی کہ بیٹا بمبئی میں اکیلے نہ گھومنا اور میرے لڑکے کو تار ضرور دے دینا۔ پھر تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ اب وہ گاؤں کس منہ سے جاتا اور ان سب کے سوالات کا کیا جواب دیتا ۔ !

جے جے کے سرکل پر اُسے ٹیکسی کھڑی کر دینی پڑی آگے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ٹریفک جام تھا۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور جب کلیرینس ملا تو اس کی نگاہ سائیڈ سے پاس ہوتی ہوئی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر پڑی۔ اس کے پاؤں اپنے آپ بریک پر پڑ گئے۔ کار ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی اور وہ دروازے سے باہر سر نکال کر پیچھے جاتی ہوئی ٹیکسی کو دیکھنے لگا۔ بات چند لمحوں کی تھی مگر اتنی ہی دیر میں ایک ساتھ کئی ہارن بج اٹھے اور ٹریفک پولیس نے سیٹیاں بجانا شروع کر دیں۔ پیچھے بیٹھے ہوئے پنجابی نوجوان نے ڈانٹ کر کہا۔ ڈرائیور گاڑی بڑھاؤ۔

وی ٹی پر پہونچ کر جب اُس نے کار کھڑی کی تو گاڑی سے اترتے ہوئے جوڑا پنجابی میں بڑبڑانے لگا۔ اس نے بات سمجھی تو نہیں لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ اُس کی گذشتہ حرکت پر اُسے ہی کچھ برا بھلا کہہ رہے تھے۔ جب میٹر بدل چکا تو ایک بڑے توندوالا سیٹھ گاڑی کے پاس آیا۔ قریب تھا کہ وہ پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی میں داخل ہو جاتا کہ اس نے سیلف مار کر گاڑی اسٹارٹ کی اور سیٹھ سے کچھ کہے بغیر کلچ دبا دیا۔ گاڑی نے ایک جھٹکا دیا اور سیٹھ اس سے رگڑ کر چکر کھا گیا۔ ایک بار پھر اُسے مارواڑی زبان میں گالی سننی پڑی جسے سن کر بھی وہ نہ سن سکا اور دادر کی طرف چل پڑا۔

وہ جتنی تیز گاڑی دوڑا رہا تھا اور اتنا ہی اُس سے دور ہوتا جا رہا تھا اور جب وہ دادر کے ٹیکسی اسٹینڈ پر پہونچا تو اُسے یوں لگا کہ وہ پونا سے ممبئی پہونچا ہے۔ اسٹینڈ پر دربارہ سنگھ موجود تھا اگرچہ شام کا وقت اس کے کھانے پینے کا ہوتا ہے مگر نجانے آج وہ کیوں نہیں گیا۔ جیسے ہی دلپت ٹیکسی سے اترا دربارہ سنگھ نے اپنی جہاندیدہ نظریں اُس پر ڈال کر پوچھا۔

"وے چھورا کیوں گھبرا ئیلا ہے"

"استاد ــــ چمپا کو آج میں نے دیکھا۔" دلپت دربارہ سنگھ کے بالکل قریب آکر پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

چمپا ــــ؟ جیسے دربارہ سنگھ نے یہ نام پہلی بار سنا ہو۔

"ہاں استاد میری چمپا۔ ایک ٹیکسی میں ایک آدمی کے ساتھ وہ اسی طرف کو آتی دکھائی دی تھی۔" دلپت ساری بات ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

"او ـــ تو سی جو رو ــــ کب دیکھیلا ہے اُس کو" دربارہ سنگھ کو سب کچھ یاد آگیا۔

"اب سے صرف آدھا گھنٹہ پہلے ــــ"

"ٹیکسی کا نمبر یاد ہے۔" دربارہ سنگھ نے پوچھا

نہیں استاد میں چمپا کو پہچاننے میں نمبر پر دھیان ہی نہ دے سکا

"وے مورکھ ــــ اچھا ڈرائیور کا صورت دھیان میں ہے" دربارہ سنگھ جھلا سا گیا۔

ہاں استاد ــــ وہ سردار . . . . . .

"ایکدم اوکا پتا ہے دے ــ ڈرائیور سردار ساں تو اکھا ممبئی میں بھرپڑے لا ہے۔

دلپت نے سر جھکا لیا۔ دربارہ سنگھ خلاؤں میں گھورنے لگا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

"اچھا تو سی اڈے پر ٹہر" دربارہ سنگھ دلپت کی ٹیکسی میں سوار ہو کر اندھیری کی سمت چل پڑا۔

کافی رات گئے جب دربارہ سنگھ آیا تو وہ شراب میں دھت تھا۔ اُس کی گاڑی عبدل چلا کر لایا تھا۔ دربارہ سنگھ

نے نشیلی آنکھوں سے دلیپ کو دیکھا اور یہ کہتا ہوا اپنی جھولا کھاٹ میں دھنس گیا :-

"توسی جورو رنڈی ہوگئی ہے وے"

دلیپ کو ایسا لگا جیسے دربارہ سنگھ نے ایک زور کا چانٹا اس کے گال پر رسید کر دیا ہو لیکن تب ہی عبدل نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اسی ہوٹل کی طرف لے کر چلدیا جس کے دروازے بند تھے مگر اندر روشنی ہو رہی تھی۔

دلیپ نے صبح ہونے سے پہلے دربارہ سنگھ کا اڈا چھوڑ دیا۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا صرف عبدل سے اتنا کہا کہ چمپا رنڈی بھی ہوگئی ہے تو بھی میری جورو ہے میں اُسے ضرور حاصل کرونگا"

اور پھر وہ کبھی دربارہ سنگھ کے اڈے پر لوٹ کر نہیں آیا لیکن وہ دربارہ سنگھ کا چین اور نیند ضرور حرام کر گیا۔ جب سویرے عبدل نے اُس کو بتایا کہ اُس نے رات نشے کی حالت میں دلیپ کی جورو کو رنڈی کہہ دیا تھا اور دلیپ اسی بات پر ناراض ہوکر چلا گیا ہے تو دربارہ سنگھ نے اپنے ہونٹ کاٹ لیئے۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس نے دلیپ کی جورو کو رنڈی نہیں کہا بلکہ اپنی بہن کو رنڈی کہا ہے۔

وہ صبح تھی اور آج کی شام ہے کہ دربارہ سنگھ نے ایک قطرہ شراب نہیں پی وہ کئی کئی دن اڈے پر بھی نہیں آیا۔ اُس کے اڈے کے ہر ڈرائیور کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ دربارہ سنگھ دلیپ اور اس کی جورو کو تلاش کر کے ہی رہے گا۔

دلیپ نے پچھلے ایک سال تک چمپا کو بمبئی کے اُجالوں میں تلاش کیا تھا۔ لیکن دربارہ سنگھ کے طمانچے نے اُسے راہ دکھا دی تھی کہ چمپا بمبئی کے اندھیروں میں ہی ملیگی اور وہ اُسی رات سے بمبئی کے گہرے اندھیروں کو چیر رہا تھا۔ وہ سارے جھونپڑے وہ سارے تہہ خانے وہ سارے اڈے اور وہ ساری اونچی اونچی بلڈنگیں جہاں عصمتوں کی دکانیں لگا کرتی ہیں جہاں رات کی تاریکیوں میں عزتیں لٹا کرتی ہیں۔ جہاں دولت اور جبر کی قوتیں عصمتوں کی دھجیاں اُڑا کر بازار کی جنس بنا دیتی ہیں وہ اب دلیپ کی گزرگاہیں تھیں۔ اس کے پھولوں کے ہاروں کی منڈیاں تھیں وہ دن ڈھلے ایک بڑے سمنٹ کے پائپ کی پناہ گاہ سے نکلتا اور اپنے لمبے بالوں میں چہرہ چھپائے چمپا کے پھول کی مالائیں لے کر کوٹھے کوٹھے اڈے اڈے اور جھونپڑی جھونپڑی چلا جاتا۔ اب اُسے دنوں کی خبر نہیں تھی اس کی آنکھیں اگر کچھ دیکھتی تھیں تو بمبئی میں اجالا کب ہوتا ہے اور شام کب آتی ہے صرف وہ راتیں جو بمبئی کے دولت مندوں کی ہوتی ہیں۔ عیش پسندوں کی ہوتی ہیں۔ عصمتوں کے خریداروں کی ہوتی ہیں۔ عصمتوں کے لٹیروں کی ہوتی ہیں اور اُن دلالوں کی ہوتی ہیں جو جوا کی بیٹیوں کو ہی نہیں بکواتے بلکہ اُن کی عصمتوں کا بھی مول تول کرتے ہیں

دلیپ نے چند ہی راتوں میں اُن ان گنت چمپاؤں اور اُس کی مسلی ہوئی کلیوں کو دیکھ ڈالا تھا جو اُس کے جیسے ہی گاؤں اور قصبات سے ورغلا کر لائی گئی تھیں یا وہ کوئی بڑا سبز باغ دکھا کر یہاں پہنچا دی گئی تھیں ان کے اسمگلر اور تاجر محض ٹیکسی والے ہی نہیں تھے اُن اونچی ہوئی کاروں کے مالک بھی تھے جو اونچی سوسائیٹیوں میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

اُونچی عمارتوں میں لبسے ان بیچے نگروں کو دیکھ کر کتنی ہی بار دلیپ کے جی میں آئی کہ کسی رات ان پر پٹرول چھڑک کر ماچس کی کاڑی دکھا دے۔ لیکن جب اس نے سوچا کہ ایک بمبئی کے جل جانے سے کیا ہو گا۔ ایسے کتنے ہی شہر ہیں جہاں اونچے لوگوں نے ایسے نیچے نگر بسا رکھے ہیں تو وہ دل مسوس کر رہ گیا اور ایک ہی خیال اُس کے دماغ میں لبا رہا کہ اپنی چمپا کو تلاش کرلے!

اور پھر ایک رات ـــ ایک اندھیری بلڈنگ کی تاریک سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک موڑ پر اس نے دیکھا ـــ

چمپا دربارہ سنگھ کے ساتھ اس کی بغل سے نیچے اتر رہی ہے ۔

چند لمحوں کے لئے اس کے لپکتے ہوئے قدم رک گئے ۔ اس کے ذہن کے پردوں پر دربارہ سنگھ کی تصویر ابھر آئی اور اُس کے یہ الفاظ کانوں میں گونجنے لگے ۔ "توسی جورو تو رنڈی ہو گئی ہے وے" پھر دوسرے ہی لمحے اُس کے ہاتھ سے چمپا کے پھولوں کی مالائیں زمین پر گر گئیں اور اُس کے سارے جسم میں بجلی دوڑ پڑی ۔ وہ برق رفتاری سے سیڑھیاں پھلانگنے لگا ۔ لیکن پہلی منزل کی پہلی سیڑھی تک دربارہ سنگھ کہیں بھی دکھائی نہ دیا ۔ دربارہ سنگھ نہیں ملا تو چمپا کیسے ملتی وہ پھر لوٹ پڑا ۔ اس کی رفتار سست پڑ گئی تھی ۔ ایک منزل دوسری منزل اور پھر تیسری منزل ــــ

یہ دربارہ سنگھ نہیں ہے ۔ کوئی بھی ہو ــــ وہ تیسری منزل کی گیلری میں اُس طرف لپک پڑا جہاں ایک سردارجی ایک نائیکہ سے کھڑے باتیں کر رہے تھے ۔ اُسے قریب آتے دیکھ کر سردارجی بھی چونک گئے اور دلیپ نے بھی اپنے آپ کو سنبھال لیا ۔ تب ہی اُس کی نظر پاس کے کمرے کے اندر گئی جہاں دو لڑکیاں سرگوشیاں کر رہی تھیں ۔ وہ چمپا کہہ کر اس کمرے میں داخل ہو گیا ۔ اُس کے پیچھے سردارجی اور نائیکہ بھی دوڑے دلیپ ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اس سے کہہ رہا تھا ۔

"چمپا ــــ چمپا یہ تو کہاں آ گئی ــــ"

"مگر میں چمپا نہیں ہوں آپ کو دھوکا ہوا ہے ۔"

اس لڑکی نے سختی سے اپنا ہاتھ دلیپ کے ہاتھ سے چھڑا لیا ۔ ادھر سردارجی نے دلیپ کا گلا پکڑ لیا اور نائیکہ اس لڑکی کو درمیان میں پڑے پردے کے پیچھے لے کر چلی گئی ۔

جیسے ہی سردارجی دلیپ کو دھکیل کر کمرے کے باہر لائے اور اُسے پیٹنے لگے ایک اور سردارجی وہاں آ دھمکے ۔ انھوں نے بڑھ کر دوسرے سردارجی کی گردن دبوچ لی اور دلیپ سے گرج کر کہا ۔

نکال توسی جورو کو وے اس سردار کو میں دیکھتا ہوں ۔ اور دلیپ کمرے میں گھس کر نائیکہ سے چمپا کو چھڑا لایا ۔

چمپا دلیپ سے لپٹ کر رونے لگی ۔ تب ہی دربارہ سنگھ نے دلیپ سے گرج کر کہا ۔

توسی کیا دیکھتا ہے وے ۔ چل لے چل اس نرک سے میری بہن کو ۔

خالدہ شفیع

جن

تایا ابا نے جونہی گھر کی چوکھٹ میں قدم رکھا تائی جان اور شہزادی بیگم کی آوازوں کے ساتھ اپنی بچوں اور عورتوں کی بہت سی آوازوں نے ہلّہ بول دیا۔ ان کے نتھنے قطرات کی بُو سے پھڑ پھڑائے۔ انہوں نے سامان وہیں کونے میں رکھوا دیا اسفید براق کرتہ کو جھاڑا اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے رعب اور طنطنے سے آگے بڑھے۔ چنانچے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے بوسیدہ برقعوں والی دو عورتیں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل آئیں اور میں چوہیا کی طرح دبک کر تخت کے پیچھے جا بیٹھی۔ گھر کی فرسودہ سیاست کا تعفن بری طرح پھیل رہا تھا۔ سامنے پیپل کے درخت پر شہزادی بیگم کی جگنوؤں والی لال چُندیا اور فیروزی ساٹن کی شلوار ادھ جلی لٹکی ہوئی تھی اور نیچے ہی کچھ ہڈیاں بڑے سلیقے سے ایک پلیٹ میں سجی رکھی تھیں۔ تایا ابا کی سرخ و سپید پیشانی پر تیوریاں ناگنوں کی طرح لہرائیں نتھنے پھیل گئے اور آنکھوں میں آگ بھر گئی سامنے ہی شہزادی بیگم تخت پر بے جان سی بیٹھی روئے جا رہی تھی۔

”دولہن اب یوں جان ہلکان کرنے سے کیا ہوگا ——— صدقے کے لئے پیچھے پڑ گئے ہیں —— تیرے باپ تو مولوی ہیں انہی سے کیوں نہیں کوئی تعویذ لے لیتیں، تائی جان ٹھنڈے پانی کا گلاس لئے بیٹھی تھیں ”ہونہہ تو پھر جنوں والا حقہ ہے“ تایا ابا عین شہزادی بیگم کے سر پہ کھڑے تھے۔

”ریاض کی ماں بتا اب کے جن کیا کیا لوٹ لے گئے۔ تایا ابا نے یہ پوچھتے ہی لاٹھی اس طرح گھمائی جیسے چاہتے ہوں اسی سے اپنی بہو کا سر پلپلا کر دیں۔ تائی جان ان کی غیر متوقع آمد سے حیران ایکدم تکے جا رہی تھیں پھر منہ ٹھا بڑھا کر بولیں۔

”وہی ـ کرماں والے ـ اجاڑ لے گئے گھر ——— دولہن کے تین بھاری جوڑے لے گئے بکس میں ہڈیاں پڑی ملیں کچھ کپڑے پلنگ پر رکھے تھے وہ جلے پڑے ہیں رات اتنی پریشانی میں گزری ہے کتے الگ رات بھر بھونکتے رہے۔ پھر اب صبح سے دولہن کو غش پر غش آ رہے ہیں کرماں والا کچھ کہتا ہے اسے۔ مجھے تو سنائی نہیں دیتا کہتی ہے بڈھا ہے —— ریاض کے ابا آپ ہی جائیے مولوی جا کے پاس اب تو ——

”تائی جان ایک ہی سانس میں کہے جا رہی تھیں۔

شہزادی بیگم نے رو رو کر آنکھیں سُجا لی تھیں ناک سرخ انگارہ ہو رہی تھی رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی سیاہ بالوں کی لٹیں سر پر میں پیشانی پر کروٹیں لے رہی تھیں ہونٹ تک دہک رہے تھے ”جبھی تو جن آتے ہیں اس پر“ تایا ابا نے شہزادی بیگم کو اس

طرح دیکھ کر سوچا ــــ یہ ان کا غصہ نہ جانے کہاں رفوچکر ہو گیا تھا سمندر کی موج کی طرح جو گھر داخل ہوتے ہی ابھری اور شہزادی بیگم کو یوں دیکھتے ہی ٹوٹ گئی تھی۔

"جوڑے تو اب کیا بنیں گے لفیبہ ہی سنا ہے برا ہے،" تائی جان نے لسی بھرا گلاس تایا ابا کی طرف بڑھایا اور ایکدم چونکیں "دو رہا من کے ابا ــــ وہ سیف بھی احتیاطاً دیکھ لینا کل صبح کھلی تھی۔ آج صبح دیکھا تو بند ــــ نہ جانے میرا وہم ہے یا انہی کرماں والوں کے کارنامے۔ کل دن میں بھی چھوٹے چھوٹے پتھر اور کنکر آتے رہے" تایا ابا لسی کا گلاس وہیں چھوڑ سیف کے سامنے کھڑے تھے ڈھائی ہزار کی رقم غائب تھی چند بکھرے ہوئے سکے منہ چڑا رہے تھے۔ انہوں نے لاٹھی زور سے گھما کر زمین پر دے ماری "دولہن بیگم! ــــ" پوری عمارت کانپ اٹھی۔ دیکھو میں تیرا کیسے جن نکالتا ہوں ــــ مجھے معلوم نہیں جن نکلتا کیسے ہے" انہوں نے دانت پیس کر دیکھا اور پھر آس پاس رکھی ہوئی چیزوں کو اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیا۔ چابیاں سیدھی تائی جان کی گود میں جا گریں۔ کرسیاں چیخیں۔ پیڑھیاں چلائیں مونڈھے لڑھکتے ہوئے سارے صحن میں پھیل گئے۔ شیشیاں ڈبے اور برتن کھڑکھڑاتے بچتے اوندھے منہ جا گرے اور پھر تایا ابا نڈھال ہو کر چارپائی پر گر پڑے۔ "ہائے یہ تایا ابا پر سوار جن تو سب سے زیادہ خطرناک ہے۔" میں نے سہم کر سوچا اور طرح طرح کی یاد کی ہوئی دعائیں پڑھ ڈالیں پھر جنوں کو انتہائی پیارے پیارے ناموں سے پکار کر کہتی رہی کہ مجھ پر سوار نہ ہوں میں ہمیشہ ان کی عزت کرتی رہوں گی۔ تائی جان اپنا خون آلود پیر سہلاتی زخمی شیرنی کی طرح تایا ابا کو گھور رہی تھیں اور دولہن بیگم پیپل کی اوٹ میں بلی کی طرح سمٹی سکڑی شکل بنائے بیٹھی تھیں۔

جنوں کا یہ تیسرا غیر متوقع اور سب سے زیادہ سخت حملہ تھا اس زمانے کے تو جن بھی بڑے بزدل تھے ہمیشہ تایا ابا کی غیر موجودگی میں آ کر ستاتے تھے اور چیزیں مارا کے جاتے کبھی دولہن بیگم کے کپڑے کبھی کوئی گہنا اور کبھی سنہری گڑ کی بھیلیاں۔ ایک دادا جان کے زمانے کے جن تھے منہ در منہ شرارت کرتے تھے پھر معافی بھی مانگ لیتے تھے خود تایا ابا اور تائی جان کئی بتاتیں بتائی تھیں اچانک رسی پر دھلے کپڑے آگ پکڑ لیتے یا حقے کی چلم اچانک زمین پر آن گرتی یا آگ پر رکھی ہوئی ہنڈیا کا سارا گوشت غائب ہو جاتا لیکن جب وہ دادا جان کے رعب سے واقف ہو گئے تو ان کی کبھی ہمت ہی نہ ہوئی پہلے خود آکر دادا جان سے قرآن شریف پڑھتے رہے پھر اپنے بچوں کو بھی بھیجنے لگے آخری دنوں میں انہوں نے دادا ابا کی بڑی خدمت کی رات ٹانگیں دباتے صبح ان کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی چلم میں آگ بھر جاتے گھر صاف ستھرا کر جاتے سردیاں ہوتیں تو پانی بھی گرم ملتا خود دادی جان وقتاً فوقتاً کام کروا لیتی تھیں وہ وضو کر کے دو پٹکی بلکل مار کر سیمنٹ والے کمرے کے کونے میں منہ ڈال کر بآواز کہتیں "کرم دین اپنے آقا کے کپڑے دھو دینا آج فضلاں نہیں آئے گی بیمار ہے،" اور تھوڑی ہی دیر بعد تایا ابا کے کپڑے رسیوں پر سوکھنے کے لئے ڈال دیئے جاتے۔

تائی جان کے ساتھ جنوں والا قصہ خاندان بھر میں مشہور تھا بات ہی کچھ ایسی تھی کہ تائی جان اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تھیں کٹورہ سی چھلکتی آنکھیں ابروؤں کے خم اتنی کمانوں سے نکلے ہوئے آنکھوں کے تیر ہی تو تایا ابا کے دل میں پیوست ہو گئے تھے سرخ و سفید رنگت اس پہ ایک دن وہ کھلے صحن میں کھٹولی کی اوٹ میں نہانے لگیں تایا ابا اندر سو رہے تھے کہ اچانک اٹھ بیٹھے اور باہر چلے آئے۔ دیکھا تو آپ ہی آپ کنوئیں سے پانی بھرا تو کا (پانی کی مشک) آن کر تائی جان پر الٹ جاتا اور دبے دبے قہقہے ابھرتے۔ وہ زور سے خدا کا واسطہ دے کر دھاڑے تو بگڑی اور کرتے کی ذرا سی جھلک دکھائی دی۔ انہوں نے تائی جان کو بالوں سے پکڑ کر ایسا مارا کہ تائی جان کے ہونٹ آہستہ سے پھڑپھڑاتے اور بالکل مردانہ آواز میں جن کہتا رہا۔ میاں جی معاف کر دو اب بالکل نہیں آؤں گا۔

پھر اس نے ناک رگڑی اور وعدہ کیا کہ آپ کی سات پشتوں تک کو کبھی نہیں ستائے گا۔ تایا ابا بھی فوراً پہچان گئے تھے۔ شمّے جن کو پیلی والے نوردین کے خاندان سے تھا اور یہ خاندان بھی دادا جان کا دم بھرتا تھا۔ تائی جان کے پٹ پٹا کر جب حواس درست ہوئے تو کہتی رہیں موا جن جو گا اب کرے تو ادھر کا رخ ۔۔۔ میں خود چوٹی ادھیڑ کر نہ رکھدوں تو۔ نہ معلوم وہ کس جن کو کہہ رہی تھیں۔ تایا ابا نے اگرچہ دادا جان کی طرح جنوں کو تعلیم نہ دی تھی اور نہ ہی جنوں پر قابض ہونے کا دعویٰ کیا تھا تاہم جن نکالنے کے فن سے واقف تھے اسی لئے شمّے جن نے پھر ادھر کا رخ ہی نہ کیا۔ قد و قامت اور ڈیل ڈول میں تایا ابا خود بھی جنوں سے کچھ کم نہ تھے سات فٹ قد سرخ و سفید رنگت اس پہ کڑکڑاتی سفید چادر باندھے کرتے پہ سیاہ صدری پہنے پر کلف دار پگڑی، جب چلتے تو تنومند جوان تک رشک کرتے اور حسد میں مبتلا ہو جاتے۔ محلے کی عورتیں اور مرد دونوں اکثر ان سے جن نکلوانے آتے تھے۔ پہلے تو وہ جن زدہ مریض سے تفصیلی گفتگو کرتے اور لانے والوں سے بھی سوال کئے جاتے پھر الگ ایک کمرے میں لے جاتے جہاں کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی اس کے بعد کمرے میں شور و غل بپا ہو جاتا طرح طرح کی بے ہنگم آوازیں آتیں جیسے دھوبن کپڑے پٹخ رہی ہو یا دھنیا روئی دھن رہا ہو یا گھوڑا بان گھوڑے پر چابک چلا رہا ہو یا جیسے ایکدم سے بہت سارے گھوڑے کمرے میں دوڑ لگا رہے ہوں یا جیسے کئی ایک تیز رفتار انجن ٹکرا گئے ہوں پھر اچانک سناٹا چھا جاتا اور جن اتر جاتا۔ باہر نکلنے پر مریض سے لاکھ پوچھا جاتا جن کس طرح اترا۔ لیکن وہ سر جھکائے گھر کی جانب چل دیتا اور زیادہ رد پہ صحت مریض مسکا دکھا کر کہتا "کس کمبخت پر جن سوار ہوا تھا طبیعت تو ٹھیک ہے" ایک بار مریاں کی لڑکی پرنہ جانے کیسا جن سوار تھا کہ تایا ابا نے مریاں سے کہا تھا تو جلدی سے اس کی شادی کر ڈال ورنہ تیری خیر نہیں۔ شید و کہتی تھی مریاں کی لڑکی نے ایک دفعہ پتنے کی کھوئی (کنواں) سے نہا کر موتیا کے پھول بالوں میں لگائے تھے اور کانوں میں پہنے تھے اسی لئے اس پر جن آ گئے تھے ۔۔۔ ہونہہ! تو امی اسی لئے تو کہتی ہیں کنواریاں خوشبو نہیں لگاتیں جن آ جاتے ہیں۔ ہر وقت کی ایسی باتیں سن کر ایسے ڈراؤنے خیال آتے کہ نیند کوسوں دور بھاگ جاتی اللہ میاں اس سے بہتر تھا کہ ہم بھی جن ہی ہوتے یہ نامعقول انسانوں پر ہی کیوں آتے ہیں پھر آنے کے ذرا ڈھنگ ملاحظہ ہوں۔ خوبصورت اور جوان عورتوں پر اور ان کی قیمتی اشیاء پر۔ شید و کہتی تھی جن خود بھی بڑے خوبصورت ہوتے ہیں گورے گورے پیلے پیلے کپڑے پہنتے ہیں موتیا کی کلیاں دے جاتے ہیں۔ ایک دن جھولی میں بہت سی کلیاں لئے کہتی تھی فضل جن دے گیا ہے ۔۔۔ "پر تو تو کہتی تھی خوبصورت لڑکیوں پر آتے ہیں میں نے اسے دیکھکر بے ساختہ کہا اس پر وہ دیر تک روتی رہی تھی اور میرے کچھ بھی پلے نہ پڑا۔

مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ تایا ابا زبردست مرد ہیں انہیں جنوں کی نئی نسل قطعی پسند نہ تھی جو ان کی غیر موجودگی میں فضول حرکتیں کرتی تھی ۔۔۔ جنوں کا یہ نیا سلسلہ تو اسی وقت شروع ہوا جب تائی جان ریاض میاں کی دولہن شہزادی بیگم کو بیاہ لائیں۔ شہزادی بیگم کے آتے ہی ایک بار پھر جنوں نے یہ گھر دیکھ لیا تھا شہزادی بیگم اگرچہ بظاہر تائی جان کی طرح تو خوبصورت نہ تھیں لیکن ادائیں اتنی چنچل تھیں کہ ریاض میاں تو کیا خود تایا ابا کی زبان پر آتے ہوئے شکایتوں کے پلندے واپس حلق میں جا گرتے۔ وہ اسی محلے کے عالم دین کی لڑکی تھی اور انہیں جھٹ پٹ تائی جان ہی بیاہ لائی تھیں عالم دین جو اب مولوی صاحب کہلاتے تھے انہوں نے اسی شہر کے پرائمری اسکول سے چار جماعتیں پاس کی تھیں اور اپنے شاگردوں کے ہر بار کے مروڑنے پر کہتے "اُس زمانے کی چار اس زمانے کے بی۔ اے کے برابر ہیں ۔۔۔" باپ قصائی تھا اور کند چھرے سے بڈھے بکرے ذبح کرتا تھا یہ چونکہ بے حد نرم دل تھے بکرے کی 'میں' سنتے ہی لرزہ طاری ہو جاتا تھا اس لئے باپ کا پیشہ نہ اپنا سکے قریب ہی کی مسجد سے قرآن شریف پڑھا لیکن وہاں بھی جنوں کا راج تھا کوئی مولوی صاحب دو تین دنوں سے زیادہ قیام

نہ فرما سکے۔ اس طوائف الملوکی میں چھل توں قرآن شریف اردو ترجمہ کے ساتھ پڑھا جن کسی کے قبضے میں ہی نہ آتے تھے وہ جگہ جگہ گندگی پھیلا جاتے مسجد کی چٹائیاں اور لوٹے غائب ہو جاتے غسل خانوں میں رو نگٹے کھڑا کر دینے والے جملے لکھے جاتے لیکن عالم دین مولوی صاحب بن کر اسی مسجد میں آئے اور جنوں کا قلع قمع کر دیا شام ہوتے ہی بھر بھر ملوے کے ڈونگے اور جلیبیوں کی سینیاں مولوی صاحب کے ہاں آنے لگیں پھر بچے بھی دوبارہ ختم قرآن شریف پڑھنے کے لئے آنے لگے لیکن جنوں کی مخلوق سے زبردست کیا ہوا کہ مولوی صاحب پر بھی جن آنے لگے بچے مسجد جانے سے کترانے لگے چند لڑکیاں تو کہتی تھیں کہ مولوی صاحب پر جن آتے ہیں وہ پڑھاتے پڑھاتے ایکدم چیخ کر اٹھ جاتے ہیں اور اپنے کپڑے اتار کر پھینک دیتے ہیں پھر جیٹ لیٹ کر بچوں سے جسم دبواتے ہیں ـــــ اتفاق سے یہ ساری باتیں تایا ابا کے علم میں نہ آسکی تھیں ورنہ جن نکالنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اب شہزادی بیگم پر جن آنے لگے تھے۔ توبہ! ـــــ یہ جن بھی اچھی خاصی پرسکون زندگی میں کیسی واہی تباہی پھیلا جاتے ہیں لیٹے لیٹے جو کبھی خیال آجاتا تو ہاتھ پیر سن ہو جاتے جیسے بچھو ڈنک مارنے لگتے آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل جاتا اور جسم سے روح سرکنے لگتی انسانی زندگی میں جن نہ ہوتے تو وہ یقیناً بہت خوشگوار ہوتی۔

شہزادی بیگم کو بیاہ لانے کے بعد پہلی بار جب تایا ابا لائل پور اپنی زمینیں دیکھنے گئے تھے تو ایک شام تائی جان جو کسی کام سے اندر گئیں تو دیکھا شہزادی بیگم بال کھولے بیٹھی ہے اور آنکھوں میں وحشت ہے انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں، اماں جی میں لٹ گئی ـــــ ذرا یہاں دیکھئے تو آدھا زیور غائب تھا بستر کی چادر اور گوٹا لگا سوٹ جگہ جگہ سے جلا پڑا تھا گوشت کا ٹکڑا بکس کے پاس ہی پڑا تھا شہزادی بیگم کے آنسو یوں رواں تھے جیسے ساون بھادوں کی جھڑی تائی جان خدا جانے کیا کیا پڑھ کر پھونکتی رہیں۔ تایا ابا کو واپس آنے پر معلوم ہوا تو دانت پیستے ٹہلتے رہے۔ پھر اتنا کہا "میں تیرا پتہ معلوم کر لوں گا" کچھ دنوں کے بعد کھڑکی کے پاس پڑے بکری کے سینگ ملے اور صبح ہی صبح شہزادی بیگم کے کمرے کے سامنے پڑے مٹی کے ڈھیلے ملتے، تایا ابا بہت کھوج لگاتے رہے لیکن جن ہاتھ نہ لگتے تھے۔ یہی کاروائی محلے کے دوسرے گھروں میں بھی ہوتی رہی رسولن کے سرہانے رکھی ہوئی بالیاں اچانک غائب ہو گئیں دوسرے دن پھر وہیں رکھی مل گئیں۔ چند سال اطمینان سے گزر گئے جنوں کا نام ونشان نہ رہا۔ دوسری بار پھر تایا ابا کو باہر جانا پڑ گیا اور ایک مہینہ باہر رہے واپسی پر پھر جنوں کی کئی ایک وارداتیں سنیں اور شہزادی بیگم ریاض احمد کے رکھوائے ہوئے دو ہزار روپے جنوں کے حوالے کر چکی تھیں واپسی پر تایا ابا نے یہ سنتے ہی شیر محمد سے شہزادی بیگم کو چمکیاں لگوائیں شہزادی بیگم کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی ہونٹ عجیب طریقے سے پھڑپھڑاتے اور مردانہ آواز میں کوئی بولا "آئندہ نہیں کروں گا ـــــ اس دفعہ معاف کر دو ـــــ مجھے بے حد ضرورت تھی" اور وہ چلا گیا تایا ابا آواز ہی نہ پہچان سکے لیکن سب کہتے تھے شہزادی بیگم کا اتارا ہوا جن باری باری محلے کے کسی نہ کسی گھر میں قیام کر لیتا ہے اور اہل مکیں کو پریشان کرتا ہے اس کے بعد معلوم ہوا مسجد میں جا اترا ہے اور مولوی صاحب کو پریشان کرتا ہے بچوں نے وہی شکایت دہرائی تو والدین نے انہیں ڈانٹ دیا اس پر مولوی صاحب پر جن تو آتا لیکن چند ایک لاوارث بچوں کے سامنے جو زیادہ تر مسجد ہی میں رہتے تھے ان بچوں کی آنکھوں میں دہشت اور حیرانی بڑھتی گئی اور ان کے چہرے سفید پڑنے لگے لیکن سب کی آنکھوں پر جنوں کا دبیز سایہ تھا۔

ایک عرصے کے بعد اب پھر جب وہ باہر گئے تھے تو جنوں نے ان کی غیر موجودگی میں نقصان پہنچایا تھا وہ پڑے پڑے کروٹیں بدلتے رہے شام کھانا بھی نہ کھایا رات پھر نہ جانے کہاں رہے۔ تائی جان اور شہزادی بیگم کی ہستی گم تھی وہ دیر تک سجدے میں پڑی رہی دعائیں مانگتی رہیں تمام تکلف کر لوٹا بھی بھرا یا لیکن کسی نام پر بھی لوٹا نہ گھوما ـــــ آج کل کے قرآن والے بھی ایسے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا، ایک ہمارے زمانے میں تمہارے بڈھے سر منٹوں میں معلوم کر لیتے تھے وہ تائی جان پانی بھرا لوٹا رکھ کر دوبارہ وضو کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں اور شہزادی بیگم

جاکر سو رہیں۔

تایا ابا پر نئی نسل کے جنوں کا کھوج لگانے کا جن سوار تھا لیکن وہ انہیں شکست پر شکست دیئے جاتے تھے۔ چند دنوں کے بعد زندگی پھر معمول پر آگئی جن غائب ہوگئے تھے نہ تو شہزادی بیگم نے شکایت کی اور نہ ہی تایا ابا نے ذکر کیا لیکن تایا ابا کے باہر جانے کے دن پھر قریب آرہے تھے۔ انہیں جلد ہی ضروری جانا تھا اس لئے ایک شام وہ اچانک چلے گئے۔ پہلی رات خیریت سے گذر گئی دوسری شام تائی جان نماز پڑھ رہی تھیں اور شہزادی بیگم وضو کر رہی تھیں کہ چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آئی پھر جیسے قریب ہی کوئی ہانپ رہا تھا تائی جان نے سلام پھیر کر شہزادی بیگم کو دیکھا تو وہ انہی کی طرف آرہی تھی۔

"اماں جان آپ نے کچھ دیکھا —" شہزادی بیگم جا نماز پر بیٹھ گئی۔

"ہاں کچھ آہٹ محسوس ہوئی تھی — میں سمجھی ہوا سے ڈالیاں ہلی ہونگی۔"

"اوں ہونہہ اماں — وہ تھے سفید کپڑوں میں —"

"ہاں؟ — آہٹ سے دو ہی لگ تھے اور جیسے ہانپ رہے تھے"، تائی جان سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں

"حوصلہ رکھو اماں — مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے ہاتھ جوڑے معافی مانگتے ہوں"

"اچھا! —

"ہاں — بارعب تھے سفید داڑھی نورانی چہرے — ہاتھوں میں تسبیح — ڈرنے کی بات نہیں —"

شہزادی بیگم نے تسلی دیکر نماز کی نیت باندھ لی۔ تائی جان دیر تک جا نماز پر بیٹھی رہیں نہ جانے کب نیند آگئی اور وہیں سو رہیں۔

تاریک آسمان پر اکا دکا ستارے چمک جاتے دسویں کا چاند سنگترے کی پھانک کی طرح لگتا تھا جو بار بار بدلیوں میں جا چھپتا — کہ چھت پر سے اچانک ایک سیاہ سایہ کودا اور اس کے پیچھے ایک اور سایہ پہلا سایہ شہزادی بانو کے کمرے میں داخل ہوگیا اور سرعت سے دو چار چکر لگائے پھر کوئی چیز ہلنے سے بجی اس کے بعد جیسے کوئی چیز گھسیٹی جا رہی ہو دوسرا سایہ سائے کی طرح پہلے سائے کے پیچھے لگا رہا۔ اندھیرے میں دو سائے آگے پیچھے دوڑتے رہے سب گہری نیند سو رہے تھے پھر اچانک دونوں سائے ٹکرا گئے ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور پھر سناٹا چھا گیا —

صبح تایا ابا نے اپنے صحن میں محلے بھر کے لوگوں کو جمع کر لیا تھا اور گرجدار آواز میں اعلان کیا کہ مشہور معروف جن کو قبضہ میں کیا جا چکا ہے اور اس جن کا جن آج میں سب کے سامنے اتاروں گا۔ شہزادی بیگم بے حد خوفزدہ تھی صبح سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا سب کے دل دھڑک رہے تھے تائی جان بھی دیکھنے کو کوٹھے پر جا چڑھی تھیں تایا ابا بدستور پگڑی سر پر جمائے لاٹھی ٹیکتے، دندناتے ہوئے پچھلی کوٹھری میں گئے — اور چادر میں لپٹے ہوئے سائے کو کنارے سے کھینچتے ہوئے لاکر یوں پھینکدیا جیسے مرا ہوا چوہا — جونہی چادر ہٹی سب نے دیکھا مولوی صاحب سر جھکائے بیٹھے ہیں — اور تایا ابا مجھے بہت بڑے جن معلوم ہو

عفرا بخاری

آخری بیان

خالو محمد کورٹ سے باہر آئے تو ان کا سر جھکا ہوا اور مونچھوں کے کونے ڈھلکے ہوئے تھے۔
خالہ جس کی زبان پر "یا وکیل" کی تسبیح تھی ایک دبی سی پھنکار کے ساتھ مڑی اور اپنا پنجہ غیاث کی کلائی میں گاڑ کر بولی۔
"ٹیکسی لو بیٹا منہ کیا دیکھ رہے ہو ـــ
غیاث نے ہاتھ سے اشارہ دیا تو ایک تیزی سے اسی سمت آتی ہوئی ٹیکسی رک گئی۔
خالو محمد سٹپٹائے سے آگے جا بیٹھے اور وہ تینوں پچھلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی فوراً صاف ستھرے آئینے کی مانند چمکتی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی ـــ
خالہ لگاتار اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی ـــ اور بار بار پونچھنے سے اُن کی آنکھیں بیر بہوٹی ہو گئی تھیں۔ . . اور دوپٹے کے دونوں کونے بھی بھیگ گئے تھے۔
"آخر اسی کے صدقے نکلے ناں۔"؟
خالہ سے صبر نہ ہو سکا تو فلمی ڈرائیور کی پرواکئے بغیر بڑبڑئی۔ خالو محمد جو پہلے ہی کافی صدمہ اٹھا چکے تھے خالہ کی اس بات پر اپنے آپ میں کچھ اور دبک گئے ـــ خالہ ہوں ـــ ہُوں۔ کرکے پھنکارنے لگی ـــ جونہی ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رکی۔ خالہ چھلانگ لگا کر اتری اور برقع پھڑپھڑاتی تیزی سے چوبی زینے پر چڑھنے لگی ـــ
سہیلہ اور غیاث ان کے پیچھے تھے۔ مگر خالو اوپر آنے کے بجائے سر جھکائے ہوٹل کے اندر چلے گئے۔
"آج یہ رات یہیں کاٹیں گے" ـــ غیاث نے تنگ زینے پر چڑھتے ہوئے سرگوشی کی۔
اور سہیلہ تاسف سے بولی
"خالہ نے بے چاروں سے ایک بات بھی نہیں کی۔"
"مگر وہ صبح تڑکے ان کے نام پر کالے بکرے کا صدقہ دینے کا پکا ارادہ کر چکی ہے"۔ غیاث نے سنجیدگی سے کہا۔
اور سہیلہ دبی آواز میں ہنس پڑی۔
جب وہ اوپر پہنچے خالہ کھونٹی پر برقع لٹکا کر وضو کی چوکی پر بیٹھ چکی تھی۔

"میں تو اب نوافل پڑھنے لگی ہوں اور رات بھر پڑھوں گی۔ تم لوگ کھانا کھا کر سو رہنا وہ پاپی تو بیچ ہی رہے گا تم فکر نہ کرنا"
خالہ ہاتھوں اور کہنیوں سے پانی ٹپکاتی ان کے پاس آئی ـــــ پھر دوپٹے سے منہ پونچھتے ہوئے بولی۔
"اللہ کی قسم وہ لڑکی فرشتہ تھی فرشتہ۔ اپنے آخری دو لفظوں میں وہ میرا بال بال اپنے احسان میں باندھ گئی ہے۔ عمر بھر پڑھ پڑھ کر بخشوں تو بھی کافی نہیں ـــــ ارے میں اسے احسانوں کے طعنے دیتی تھی اب وہ آ کے دیکھے میں کیسے اس کے ایک ہی احسان میں بے بس ہو گئی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں ربّا اگر عمر بھر میں کوئی نیکی کر سکوں تو یہ نیکی اسی کے کھاتے میں ڈال دینا اس نے میری عزت میرا سہاگ بچایا ہے . . . . مگر یہ سب کچھ اس نے میرے لئے کیا ـــــ ہاں میرے لئے" خالہ نے بڑے دعوے سے چھاتی بجائی۔
غیاث چپ چاپ نظریں جھکائے سگرٹ پیتا رہا۔ مگر سہیلہ کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ خالہ نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا. . . .
خالہ نے دبی سی سسکی لی اور جانماز پر جا کھڑی ہوئی۔ اتنے میں سمندر خان کھانا لے کر آ گیا۔ دونوں نے مکمل خاموشی سے کھانا کھایا پھر کر کے اندر چلے گئے۔

غیاث نے بند کھڑکیوں کو کھولا تو کمرہ کچے دھان کی خوشبو سے بھر گیا۔ غیاث دیر تک دریچہ میں چپ کا کھڑا رہا سہیلہ پلنگ پر بیٹھ گئی سب کچھ وہی تھا وہی خوشبو وہی کمرہ مگر گل پری موجود نہ تھی ـــــ سہیلہ کو حال پر ماضی کا گمان گزر رہا تھا۔ گذشتہ پچھلے سال تو وہ یہاں ہنی مون منانے آئے تھے ـــــ اور وہ دن کس قدر پر لطف و مسرور کن تھے۔ سہیلہ پچھلے سال کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو یاد کرنے لگی۔
اس دن اونچی ایڑی کی جوتی کے ساتھ غیاث کے بازو کا سہارا لئے پتھروں کو کاٹ کاٹ کر بنائی گئی ـــــ بے ڈھنگی اور ناہموار سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس نے زندگی کو کس قدر مکمل اور بھرپور محسوس کیا تھا ـــــ جونہی اونچائی کی طرف جاتے ہوئے اس کا قدم ڈول جاتا تمکنت سے چلتے ہوئے غیاث کے بازو کی گرفت اس کے گرد مضبوط ہو جاتی۔ اور ایک سرشاری کے عالم میں اس کے گلابی رخسار دیکھنے لگتے ـــــ وہ اس وقت کسی ہلکی پھلکی چڑیا کی طرح ہوا کے بازوؤں پر سوار تھی۔ اور غیاث پروقار انداز میں سر بلند کئے چلتا ہوا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ ان کے پیچھے قلی ان کا سامان لئے آ رہا تھا۔ ایک ہولڈال ایک اٹیچی ایک بیگ اور ایک ٹوکری جس میں خالہ کے لئے کچھ سوغاتیں تھیں۔
اچانک مزدور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے نکل گیا۔ وہ بڑے ہموار اور بے جھجک قدم اٹھا رہا تھا۔ دونوں سر اٹھا کر حیرت ملی دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھنے لگے ـــــ
"تم پہلے بھی یہاں آ چکے ہو" ـــــ سہیلہ نے اچانک غیاث کے ماضی کے قریب تر ہو جانے کی خواہش کے ساتھ پوچھا۔
"ہاں" ـــــ
اب سیڑھیاں ختم ہو گئی تھیں اور وہ ایک بڑے بڑے پتھروں سے بھرے بے ڈھنگے مگر ہموار قطعہ زمین پر تھے۔
"یہی ہے" ـــــ غیاث ایک چھوٹے سے ریسٹورانٹ کے سامنے رک گیا۔
"رکھ دو بھئی" اس نے مزدور سے کہا اور اسے پیسے دینے لگا ـــــ ہوٹل میں اس وقت خاصی بھیڑ تھی مگر خالو محمد نے انہیں فوراً دیکھ لیا۔ اور اپنی مصروفیت سے سر اٹھا کر بولے ـــــ
"تمہارا ٹیلیگرام مل گیا تھا"
"ہوں" ـــــ غیاث نے سر ہلایا۔

"جاؤ بھئی اوپر جاؤ۔" خالو نے جلدی سے کہا غالباً وہ سہیلہ کو یوں بے پردہ دیکھ کر گڑبڑا گئے تھے۔

"یہ سامان"

"سمندر خان یہ سامان اوپر لے جاؤ" ـــــ خالو نے آواز دی اور وہ تنگ چوبی زینے پر چڑھنے لگے ـــــ

"جیئو آؤ کو تیل چوؤں" خالہ غیاث کو نظر انداز کر کے پکی پنجابنوں کی طرح اس سے لپٹ گئی ـــــ خالہ کے نرم نرم سینے کے دباؤ اور حدت کو محسوس کر کے وہ جھینپ گئی ـــــ ایسی گرم جوشی اور محبت سے تو اس کی ساس نے بھی کبھی اسے گلے نہ لگایا تھا۔ وہ اسی وقت خالہ کے اخلاص اور محبت کی قائل ہو گئی تھی ـــــ

خالہ ان کی آمد پر خوش بہت خوش تھی اور وہ اپنی خوشی کا اظہار بھی چاہتی تھی۔ انہیں بٹھا کر وہ دوڑی دوڑی گئی اور چوبی زینے میں منہ ڈال کر سمندر خان کو آوازیں دینے لگی۔

"جلدی چائے لاؤ لڑکے" ـــــ

پھر وہ خوشی سے بوکھلائی ہوئی ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ خالہ نے لمبے چوڑے افسانے چھیڑ دیئے تھے، اگلی پچھلی باتیں دہرا رہی تھی ـــــ اچانک باتوں کے بہاؤ میں پل بھر کو رک کر بولی۔

"یہ کمرہ میں نے تمہارے لئے ٹھیک کروا دیا ہے۔ اسے گل پری نے صاف کیا ہے۔ اور اسے دیکھو گویا پہاڑ ڈھکیلا ہے، وہیں ڈھیر ہو گئی ہے۔"

دونوں نے کرسیوں کو ذرا سا جھکا کر کمرے کے اندر جھانکا کوئی میلا سا دوپٹہ لپیٹے ننگے فرش پر لیٹا تھا۔

'پگلی ہے' ـــــ خالہ نے افسوس سے کہا ـــــ "تمہیں تو یاد ہو گی" ـــــ

"ہاں خالہ مگر تب یہ پگلی تو نہ تھی"۔ غیاث نے سوچ کر جواب دیا ـــــ

"ہاں بیٹا تب یہ ٹھیک تھی" ـــــ خالہ نے کہا پھر سہیلہ کی طرف دیکھ کر بولی ـــــ

"جب میں یہاں آکر رہی تو یہ چھ برس کی تھی ـــــ پھر یہ میرے پاس ہی پلی بڑھی ـــــ دو سال ہوئے میں نے اس کی شادی کر دی تھی ـــــ اسی کے اپنے خاندان کا ایک آدمی تھا۔ مگر اسے ایک ماہ کے اندر مالیخولیا ہو گیا تب سے یہ پھر میرے پاس ہے ـــــ اف تو یہ بے چاری کی کیسی بری حالت ہو گئی تھی۔ کپڑے پھاڑ دیتی تھی اور گالیاں بکتی تھی ـــــ مگر اب تو یہ پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے ـــــ کیوں بیٹا یہ کبھی بالکل ٹھیک ہو جائے گی ـــــ؟"

غیاث نے ٹانگ پر ٹانگ دھرے، اطمینان سے سگرٹ نکال کر سلگایا پھر اس کا طویل کش لے کر بولا۔

"بغیر علاج کے کیسے ممکن ہے ـــــ؟"

خالہ نے نہایت توجہ سے بات سنی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی معصومیت اور اخلاص کو دیکھ کر سہیلہ کو غیاث کا یہ جواب بڑا دل شکن لگا۔ خاص کر وہ اس کے بے غرض جذبے سے بہت متاثر ہو چکی تھی خالہ کے مایوس دل کو تسکین پہنچانے کی خاطر اس نے فوراً کہا۔

"خالہ میرا تو خیال ہے یہ ضرور ٹھیک ہو جائے گی آخر اب تک فرق پڑتا آیا ہے" ـــــ

"ہاں بیٹا" ـــــ خالہ نے ذرا توقف سے کہا۔

اس نے میز پوش کے کونے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے سے مایوسی اور دکھ ٹپک رہا تھا ـــ

" مگر بیٹی اس کی قیمت اس بچی کو بھاری ادا کرنی پڑتی ہے " ـ

" کیا مطلب " ـــ دونوں نے سر اٹھا کر حیرت سے خالہ کی طرف دیکھا خالہ کچھ سٹپٹا سی گئی ـــ اتنے میں سمندر خاں پیالے لے کر آ گیا ـــ سہیلہ چائے بنانے لگی ـــ

لال آٹے کی ڈبل روٹی معمولی قسم کی مٹھائی اور کوئی دو درجن ابلے ہوئے انڈے تھے ـ

" یہاں انڈہ اور مرغ بہت سستا ہے " ـــ خالہ نے انڈوں کی مضحکہ خیز تعداد کے بارے میں کچھ کہنا ضروری سمجھا باقی اناج مہنگا ہے ـ "

" غربت بھی بہت ہے " ـــ غیاث نے ادھ جلے سگرٹ کو راکھ دانی میں پھینک کر کہا ـــ پھر چائے کا پیالہ پکڑتے ہوئے بولا ـــ

" خالہ بات ادھوری رہ گئی " ـــ

خالہ نے سر پر ہاتھ مارا اور دکھ سے بولی ـــ " تم اپنے خالو کی طبیعت سے واقف ہو ـ وہ بڑا جابر اور سخت مزاج آدمی ہے ـ اس کے ساتھ نبھانے کی خاطر میں اپنے دل و دماغ کو برف بنا چکی ہوں " ـ

" مگر خالہ یہ تو آپ کی پسند کی شادی تھی ـ اور اسی لئے آپ کو شہر بدر بھی ہونا پڑا تھا " ـــ

غیاث نے زیر لب مسکرا کر کہا ـــ

" ہاں بیٹا " ـــ خالہ کھسیانے پن سے ہنسی " مگر میں طبیعت کی بات کر رہی ہوں ـ تمہارا خالو اس لڑکی کو اس حالت میں گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا ـــ مگر میں نے اسے چھوٹی سے بڑی کیا تھا ـ پھر اس کے ماں باپ یا کوئی بھائی بہن بھی نہ تھا ـ میں اسے یوں بے یار و مددگار دھکا دینے کو تیار نہ تھی ـــ جب اسے دورہ پڑتا ـــ تمہارا خالو طیش میں آ جاتا ـ پہلے پہل تو وہ ہونٹ کاٹتا نیچے اتر جاتا اور رات رات بھر وہیں رہتا مگر ایک رات وہ آپے سے باہر ہو گیا ـ اور اس نے آتش دانی سے جلتی لکڑی نکال کر اسے کھینچ ماری ـــ

" اوہ " ـــ غیاث نے بے چینی سے پہلو بدلا ـــ

اور سہیلہ نے چائے کا پیالہ یوں تیزی سے میز پر رکھا جیسے گرم چائے نے اس کا حلق جھلس دیا ہو ـــ

" جس جگہ جلتی لکڑی پڑی اس جگہ اسی وقت چربی نکل آئی میرا خیال تھا گل پری طوفان مچا دے گی مگر اسے تو جیسے سانپ سونگھ گیا ـ کوئی جری سے جری آدمی بھی اس تکلیف کو اف کئے بغیر نہیں سہہ سکتا تھا ـ مگر اس نے یہ سب کر دکھایا ـ میں حیران بھی تھی اور روتی بھی رہی تھی ـ تمہارے خالو سر لپیٹ کر سو گئے تھے میں نے دوائی تیار کی ـ مگر وہ ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی ـ بلکہ الٹا مجھے نوچنے لگی ـ بولی ـــ " تم کون ہو بیچ میں آنے والی " ـــ اس نے میرا دوپٹہ نوچ پھینکا اور میرا گریبان ہاتھوں میں پکڑ لیا ـ پر میں نے برا نہیں مانا ـ اس لڑکی نے مجھے بہت سکھ دیئے ہیں ـ اور یہ باتیں اس کے اختیار میں نہ تھیں ـ اسی واقعہ کے بعد سے تمہارے خالو کا ایسا ہاتھ کھلا ہے کہ ذرا سی حرکت پر بری طرح پیٹنے لگتے ہیں اسے پٹتے دیکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے

پھر یہ فکر بھی رہتی ہےکہ کہیں چوٹ آگئی تو اتنی ہتھ کڑی لگ جائے گی۔ مگر اتنا ہے کہ اب یہ پہلے سے بہت بہتر ہے دورے کم پڑتے ہیں اور ان کی شدت بھی کم ہوتی ہے۔ وہاں سکون اور خاموشی رہتی ہے۔ اب تو گھر کا چھوٹا موٹا کام بھی کرنے لگی ہے۔"

"مگر یہ کوئی علاج نہیں" —— سہیلہ نے زبردست احتجاجی لہجے میں کہا یوں تو اس کا ذہن کچھ اور بھی خستہ ہو جائے گا"

سہیلہ نے تائید چاہی مگر غیاث چپ چاپ بیٹھا سگرٹ پیتا رہا۔

یہی کمرہ خالہ نے انھیں دیا تھا۔ جہاں پچھلی طرف کے کھیتوں سے دھان کی خوشبو ہر وقت اٹھتی رہتی اور ان کے دماغوں کو معطر کرتی رہتی۔

رات کو دونوں سونے کے لئے لیٹے تو سہیلہ نے کہا

"غیاث تمہارے خالو تو مجھے جاہل آدمی معلوم پڑتے ہیں۔ ایک کمزور اور بیمار عورت پر ہاتھ اٹھاتے انہیں شرم نہ آتی ہوگی!"

غیاث دھیرے سے ہنس پڑا تھا —— "ہے تو بری بات مگر" "تم بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکی ہو۔ میرے خیال میں گل پری یوں نہیں سوچتی"——

"کیوں" —— سہیلہ نے بے اعتباری سے کہا

غیاث کروٹ کے بل لیٹ گیا . .

"جذبات کی دنیا بھی عجیب شے ہے۔ میرا خیال ہے ایک ذہنی طور پر بیمار شخص کے جذبات بھی تقریباً ہم جیسے ہوتے ہیں تم میری بات سمجھ رہی ہو نا —" سہیلہ کو خاموش دیکھ کر وہ ہلکے سے ہنسا۔

"اور خالہ بے چاری کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ وہ ٹھیک ہو رہی ہے۔ اب تو وہ بے چاری ایک ایسی گتھی بنتی جا رہی ہے جس کا الجھا سرا ڈھونڈنا اتنا آسان نہیں رہا —"

"وہ پورے طور پر پاگل نہیں ہے" —— سہیلہ نے کہا

"ہاں اسی لئے میں نے اسے گتھی کہا ہے۔" غیاث نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں تو وہ ذہنی طور پر مایوس ہے اور خالو کی مار پٹائی نے اس پر خوف و دہشت بھی سوار کر دی ہے۔ تم نے اس کا چہرہ دیکھا ہے کیا غیر انسانی ہے۔

پھٹی پھٹی خوفزدہ آنکھیں — شکنوں سے بھری کھردری اور بے رونق جلد اور چہرے پر کچھ اس قسم کا کھنچاؤ اور کرختگی ہے جیسے کہ . . . . ہاں جیسے کہ غیر فطری زندگی بسر کر رہی ہو —"

"یہاں تم مجھ سے متفق ہو گئی ہو —— مگر وہ ذہنی طور پر اتنی حساس نہیں ہے۔ جتنا تم سمجھتی ہو" ——

"میں تمہاری کسی بات سے متفق نہیں ہوں" — سہیلہ نے عورتوں والا ہتھکنڈا استعمال کیا اور دوسری طرف کروٹ لے لی —

صبح سہیلہ دیر سے اٹھی پھر کسلمندی کا بہانہ کئے بستر پر دراز رہی دراصل وہ خالو جیسے قابل نفرت شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی — لیٹے لیٹے وہ کھلی کھڑکی سے آنے والے خوشبودار جھونکوں میں لمبے لمبے سانس لیتی رہی۔ اتنے میں دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اس نے نظریں گھما کر دیکھا اور جھری بن گل پری کا چہرہ دیکھ کر اسے استعجاب آمیز مسرت ہوئی۔

اس نے اشارے سے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ گل پری آجائے گی۔ مگر گل پری فوراً اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتی اندر آگئی اور بلاتکلف و بلا اجازت اس کے سفید براق بستر پر بیٹھ گئی۔ سہیلہ کی قدرے پتائی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ قریب سے دیکھنے پر وہ خاصی غلیظ نظر آرہی تھی۔ اس کے ناخن ٹیڑھے میڑھے اور غلیظ تھے۔ اس کا جسم اور کپڑے میلے اور بدبودار تھے۔ سر کے بال چیکٹ تھے — اور غور سے دیکھنے پر ان میں جوئیں رینگتی نظر آسکتی تھیں — شاید وہ کسی وقت خوبصورت رہی ہو۔ مگر دو سال سے جسمانی اور ذہنی اذیت اٹھاتے رہنے کے بعد وہ اپنا حسن کھو چکی تھی۔ اب تو وہ کسی ایسے پودے کی مانند نظر آرہی تھی جسے ایک جگہ سے اکھیڑ کر دوسری جگہ لگا دیا گیا ہو اور جو نئی مٹی میں جڑیں پکڑنے سے پہلے سوکھا اور بے برگ و بار نظر آتا ہو۔

ایک عجیب کراہیت محسوس کر کے سہیلہ تھوڑا سا پیچھے کو کھسک گئی۔ "کیا یہ کبھی پہلے کی طرح ہو سکے گی" — اس نے مایوسی سے سوچا تھا ....

گل پری مسلسل پیلے پیلے دانت نکالے ہنس رہی تھی — سہیلہ نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی دراصل وہ خالو کے بارے میں اس کے تاثرات معلوم کرنا چاہتی تھی۔ گل پری ہنس ہنس کر کچھ کہتی رہی مگر اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی سہیلہ کی سمجھ میں نہ آسکا۔

اچانک گل پری اٹھی .... اور ہنسی ہی کرتی باہر نکل گئی سہیلہ نے اطمینان و سکون کا سانس لیا۔

اُف وہ کیسا ہونقوں کا سا چہرہ تھا۔ اس لڑکی میں یقیناً اب جذبے مر چکے ہیں۔ یہ نہ نفرت کر سکتی ہے نہ محبت — اور خالو بے چارے واقعی قابل رحم ہیں"

جب وہ باہر آئی خالو نیچے جا چکے تھے — غیاث دیوانی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ دانت مانجھ کر اور آنکھوں پر چند چھینٹے مار کر وہ غیاث کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"تمہارے خالو ابھی ناشتہ بھجوا دیتے ہیں" خالہ نے نہایت شفقت سے کہا۔

"یہاں تو بھوک بھی بہت لگنے لگی ہے"

اس نے ذرا دور زمین پر چیکڑا مار کر بیٹھی ہوئی گل پری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —

خالہ اس بات پر نہال سی ہو گئیں — وہ لپک کر زینے کی طرف گئیں اور سمندر خاں کو آواز دی۔ خالہ کی اس محبت پر سہیلہ کو بہت پیار آیا۔ جب خالہ لوٹ کر آئیں تو اس نے کہا —

"خالہ گل پری کبھی نہاتی دھوتی نہیں" —

خالہ چوکی کھینچ کر پاس بیٹھ گئیں اور قدرے آواز دبا کر بولیں۔

"نہاتی ہے۔ جب چھڑیاں برستی ہیں تب دس چھڑیاں گن کر کھاتی ہے پھر نہاتی ہے" خالہ کے لہجے میں غصہ تھا۔

غیاث زور سے ہنس پڑا۔ پھر سہیلہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ابھی دونوں میں بڑی پر لطف لڑائی ہو رہی تھی —

خالہ خفیف سا مسکرائیں مگر غصیلہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے بولیں .... وہ بڑی گھنی ہے۔ سو احسان کیے ہیں پر

سوکنوں کی طرح لڑتی ہے میرے ساتھ"۔

"مگر کس بات پر" ۔ سہیلہ کو اس نئے انکشاف پر بڑی حیرت ہوئی۔

خالہ نے ہلکے سے آنکھ ماری

"یہی جانے میری تو سمجھ میں اس کی ایک بات نہیں آتی پر بابا مجھے اس سے ڈر ضرور آتا ہے کسی دن میرا یا تمہارے خالو کا گلا نہ گھونٹ دے ۔ کمبخت جنونی آدمی کے اندر کوئی دوسری طاقت ہوتی ہے"

سہیلہ کی نظریں گل پری پر جمی تھیں جس کے چہرے کے ناگوار تاثرات کو بھانپ کر اسے حیرت ہو رہی تھی ۔ ظاہر ہے خالہ کی باتیں اسے اچھی نہ لگ رہی تھیں اور وہ ماتھے پر بے شمار شکنیں ڈالے اور آنکھیں سکیڑے کچھ بڑبڑا رہی تھی ۔

"بد دعائیں دے رہی ہے" خالہ نے کھسیانے پن سے کہا ۔ مگر اس کے لہجے میں غصے کی جگہ اب ممتا اور پیار جھلک رہا تھا ۔

مرتے وقت بھی گل پری کے چہرے کا تاثر کچھ ایسا ہی تھا ۔ اچانک سہیلہ کو یاد آیا ۔ اور اسے کچھ حیرت سی ہوئی ۔

غیاث کھڑکی سے ہٹ آیا تھا اب وہ پلنگ پر دراز چھت کو گھورتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا ۔ اس دن جب خالہ کا ٹیلیگرام ملا تو دونوں پریشان ہو رہے تھے . . . . خالہ بے چاری کا ان کے سوا اور کون اس دنیا میں تھا ۔ غیاث نے ٹائم ٹیبل دیکھا اور رات کی گاڑی میں سوار ہو گئے دونوں خاموش اور فکر مند تھے ۔ ابھی تک انہوں نے اس معاملے پر بات نہ کی تھی . . . . کوئی ایسا خوف تھا جو ان کی زبان بند کیئے ہوئے تھا ۔

آخر سہیلہ نے بہت حوصلے سے کام لے کر کہا تھا ۔

"خدا کرے خالو خیریت سے ہوں"

"تمہارا خیال ہے خالو کو کسی نے نقصان پہنچایا ہے" غیاث نے سگرٹ کے دھوئیں میں کچھ دیکھتے ہوئے کہا تھا

"ہاں" ۔ سہیلہ بولی

"میرا خیال اس کے برعکس ہے" ۔ پھر وہ چپ ہو گئے ۔

جب وہ پہنچے خالو کو ایک روز پیشتر گل پری کو قتل کرنے کی کوشش کے الزام میں گرفتار کیا جا چکا تھا ۔ خالہ نے انہیں چپکے سے سب کچھ بتا دیا تھا ۔ خالو نے اسے کپڑے دھونے کا ڈنڈا مارا تھا جو مہلک ثابت ہوا ۔

مگر انہوں نے بیان میں یہی کہا تھا کہ وہ گر پڑی تھی ۔

"خدا کے لئے کچھ کرو ۔ اس منحوس کی خاطر میں اپنا گھر اجاڑ بیٹھی ہوں نہ وہ بدبخت میرے گھر میں ہوتی نہ یہ دن دیکھنا پڑتا" ۔ خالہ باؤلی ہوئی جا رہی تھی . . . .

گل پری اس وقت تک زندہ تھی اور ہسپتال میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی ۔ وہ دونوں اسے دیکھنے ہسپتال گئے تو وہ جانکنی کی اذیت میں مبتلا تھی ۔ دو دن سے وہ بیہوش تھی اور اس کے ہوش میں آنے کی کوئی امید بھی نہ تھی ۔ پھر بھی تھانیدار اس کا آخری بیان قلمبند کرنے کو وہاں بیٹھا تھا . . . .

موت سے کچھ دیر پہلے اس نے اچانک آنکھیں کھول دیں تو سبھی کو از حد حیرت ہوئی ۔

تھانیدار فوراً اس پر جھک کر بے صبری سے بولا۔

"گل پری تمہیں محمد خان نے مارا ہے"——

گل پری کی بجھی بجھی بے جان نظریں جو غیر متکلم اور بے معنی انداز میں چیزوں پر پھسل رہی تھیں اچانک تھانیدار کے چہرے پر جم گئیں —— اور ان میں راکھ میں دبی چنگاری کی سی چمک نظر آنے لگی۔ . . . اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی ——

"ہاں — ہاں — کہو" —— تھانیدار نے بے صبری سے اسے حوصلہ دیا۔ "تمہیں محمد خاں نے مارا ہے" ——

یکبارگی جیسے اس نے اپنی پوری قوت کو مجتمع کر لیا ہو اس نے بڑے زور سے دائیں بائیں نفی میں سر ہلایا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے خرخراتی سی آواز نکلی —— نہیں —— نہیں ——

'پھر' تھانیدار نے مایوس ہو کر اپنے کان اور قریب کر لئے۔

"ہاں پھر کس نے مارا ہے"

تب گل پری کے چہرے پر ایسا ہی ناگوار تاثر پھیل گیا تھا ماتھے پر شکنیں ڈالے اور آنکھوں کو سکیڑے وہ اپنے مخصوص غیر واضح انداز میں بڑبڑانے لگی تھی۔ غیاث اس کے بائیں ہاتھ جھکا کھڑا تھا۔ اچانک وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سہیلہ نے محسوس کیا وہ کانپ رہا تھا اور اس کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔

وہ گل پری کے بیان سے پریشان کیوں ہوا تھا۔ سہیلہ کو تعجب ہو رہا تھا۔

تھانیدار اسی طرح جھکا گل پری کی بڑبڑاہٹ کو سمجھنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ مگر اچانک موت واقع ہو گئی اور یوں دو لفظوں میں بیان مکمل ہو گیا۔ خالو کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا گیا تھا ——

اچانک سہیلہ نے مڑ کر غیاث کی طرف دیکھا۔

"گل پری کے بیان سے تم پریشان کیوں ہو اٹھے تھے" اس نے پوچھا ——

غیاث نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کچھ دیر تک ٹکٹکی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

کیا تم نے ایسا محسوس کیا تھا۔

'ہاں' —— غیاث نے ٹھنڈا سانس بھرا پھر تھوڑے توقف سے بولا۔

"میں اس وقت سے دکھی ہوں کیا تم نے وہ بیان سنا تھا"

"سب نے سنا تھا" سہیلہ نے کہا۔

"نہیں وہ بیان کسی نے نہیں سنا اگر سنا بھی تو سمجھا نہیں مگر میں اس کی مخصوص بڑبڑاہٹ کو کچھ سمجھا تھا

"کیا سمجھ گئے تھے" —— سہیلہ نے تعجب سے پوچھا غیاث نے کھلے دروازے سے باہر دیکھا پھر اس کی نظریں تخت کے ایک کونے پر جم گئیں جہاں خالہ کا دوپٹہ پھیلا ہوا تھا۔ خالہ سر بسجود تھی۔

"کیا سمجھ گئے تھے" —— سہیلہ نے اضطراب سے پوچھا۔

"گل پری نے اپنے آخری بیان میں الزام خالہ پر لگا دیا تھا"

غیاث پتھرائی نظروں سے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا۔

حسن اجمل مسرت

ماں کی گالی

اللہ رکھا شہر کا سب سے بڑا اسٹاکسٹ تھا۔

روئی اناج یا لوہے کا اسٹاکسٹ نہیں بلکہ لڑکیوں کا ۔ حسین جسموں کی تجارت اس کا پیشہ تھا اور اس کے اسٹاک میں ہر قیمت اور ہر مذاق کی لڑکی موجود تھی۔ معمولی جھونپڑیوں سے کر انتہائی فیشن ایبل کوٹھیوں تک اس کا بزنس پھیلا ہوا تھا اور اس کے گاہکوں میں چھکڑ فروشوں سے لے کر اعلیٰ حکام اونچے سماجی کارکن اور سرکردہ تاجر تک شامل تھے۔ اور اس کے پاس کشمیری، پنجابی، سندھی، بنگالی اور ہندو مسلمان اور کرسچین ہر قسم کی لڑکی مل سکتی تھی۔

یہ دھندا شہر میں یوں تو بہتیرے لوگ کر رہے تھے مگر جس کمال سے اللہ رکھے نے یہ دھندا پھیلایا تھا اس کی نظیر نہیں تھی۔ وہ دوسرے دلالوں کی طرح لڑکیوں کا کمیشن ایجنٹ نہیں تھا بلکہ اس کی تمام لڑکیاں اس کی تنخواہ دار تھیں۔ ملک کے طول و عرض سے تجبہ فروش نئی لڑکیاں لا کر اس کے ہاتھ فروخت کر جاتے تھے اور وہ ان لڑکیوں کو ان کی عمر اور شکل و صورت کے اعتبار سے ایک مقررہ تنخواہ پر ملازم رکھ لیتا اور شہر کے کسی حصے میں بسا دیتا تھا۔ گاہکوں سے اسے کیا ملتا اس سے لڑکیوں کو کوئی سروکار نہ تھا انھیں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اللہ رکھے سے مقررہ تنخواہ مل جاتی۔ حتیٰ کہ اس کی لڑکیوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اللہ رکھے کے پاس کل کتنی لڑکیاں تھیں اور ان کی تنخواہیں کیا تھیں۔

یہ اللہ رکھے کا تجارتی راز تھا اگر ایک اندازے کے مطابق شہر کے مختلف حصوں میں کم از کم ستّر لڑکیاں اللہ رکھے کی پشت پناہی میں پیشہ کر رہی تھیں اور انھیں اللہ رکھے سے کم از پانچ سو اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار ماہانہ تک تنخواہ ملتی تھی اور یوں وہ ہر ماہ اتنی رقم تنخواہوں کی صورت میں بانٹتا تھا جتنی ایک اوسط درجہ کے کارخانے کے مالک کو بانٹنا ہوتی ہے۔

اللہ رکھا اگر چاہتا تو وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی ایک مل مالک کی سی شان و شوکت پیدا کر سکتا تھا مگر نہ معلوم یہ اس کی کوئی مصلحت تھی یا محض عادت کہ وہ ایک اوسط درجے کی بستی میں رہتا تھا اور ہمیشہ گھٹیا قسم کے ہوٹلوں میں بیٹھتا تھا اور انھیں گھٹیا قسم کے ہوٹلوں سے اس کے اعلیٰ قسم کے گاہک محفوظ جگہوں پر جانے کے اجازت نامے لئے آتے تھے اور علاقہ کے تھانے والے اپنا ماہانہ وصول کرتے تھے ــــــ اور یوں اللہ رکھا کا بزنس انتہائی خاموشی اور سکون سے چل رہا تھا۔

اللہ رکھا اس بزنس میں کیسے داخل ہوا یہ ایک طویل داستان ہے۔

پنجاب کے ایک دیہات میں جس کا اب اسے نام بھی یاد نہیں تھا ایک دولتمند زمیندار تھا اور اس زمیندار کی بیٹی کے حسن کے چرچے دور

مدد پھیلے ہوئے تھے چنانچہ سردیوں کی ایک رات جب گاؤں میں ڈاکہ پڑا تو ڈاکو مالِ غنیمت کے ساتھ اس حسین لڑکی کو بھی اٹھا لے گئے ۔ اور مدتوں بعد وہ لڑکی دوبارہ نظر آئی تو اس طرح کہ اس کی لاش نہر میں تیر رہی تھی اور نہر کے کنارے ایک نوزائیدہ بچہ قدرت کے ستم پر بلک بلک کر رو رہا تھا ۔ یوں اللہ رکھے نے دنیا میں پہلا قدم رکھا ۔ اور شاید اس کا نام اللہ رکھا بھی اس لئے پڑ گیا کہ اللہ کے علاوہ اس کا کوئی رکھوالا نہیں تھا ۔ اللہ رکھے کی ماں حسین تھی مگر وہ انتہائی بدصورت تھا اور یہ بدصورتی شاید اس گناہ کا پرتو تھی جو اس کے ڈاکو باپ نے اس کی معصوم ماں کے ساتھ کیا تھا ـــــ یا اس نفرت کا اظہار تھی جس سے اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا ۔

ابتدائی ایام میں اللہ رکھا کیسے زندہ رہا یہ اُسے قطعی یاد نہیں ۔ لیکن جب اس نے دنیا کو محسوس کرنا شروع کیا تو وہ ایک یتیم خانے میں تھا اور سمجھتا تھا کہ دنیا کے تمام بچے غالبًا اس کی اور اس کے ساتھیوں کی طرح ریوڑ کے ریوڑ آسمان سے ٹپک پڑتے ہیں اور مار مار کر جانوروں کی طرح سدھائے جاتے ہیں ۔ لیکن جب وہ رات کو سوتا تو خواب میں اسے ایک عجیب سی بات نظر آتی ـــــ وہ دیکھتا کہ دو آنکھیں جن میں یتیم خانے کے نگراں کی آنکھوں کی سی خشونت نہ ہوتی اس کے سامنے چراغوں کی طرح روشن ہو جاتیں اور پھر آہستہ آہستہ ان کی لوئیں رقیق ہونے لگتیں ـــــ آنسوؤں کی طرح قطرہ قطرہ ہو کر کوئی چیز ان آنکھوں سے بہہ نکلتی اور اس کے جسم پر ٹپ ٹپ گرنے لگتی اور اسے ایسا لگتا جیسے وہ خوشبوؤں میں نہا گیا ہو جیسے اس پر کسی نے عطر کی پھواریں چھوڑ دی ہوں ـــــ اور وہ جاگ پڑتا ۔ آپ ہی آپ اس کے دل میں ایک ایسی کسک پیدا ہوتی جس کی وجہ وہ دریافت نہ کر پاتا اور چپکے چپکے روتا رہتا ۔ پھر ایک دن اس نے اپنا یہ خواب ایک ساتھی سے بیان کیا تو وہ پوچھنے لگا ۔

"کیا تمھاری امی زندہ نہیں ہیں ؟ "

"نہیں"

"ارے پگلے تو خواب میں تجھے جو دو آنکھیں دکھائی پڑتی ہیں نا ـــــ وہ تیری امی کی ہیں" ۔

امی ! امی کی آنکھیں !!

اور اس روز سے اس نے ماں کے مجرد تصور کو ایک جیتا جاگتا خیال بنا لیا ۔ اس سے پہلے اس کے پاس ماں کا کوئی تصور نہیں تھا ۔ اس کے ذہن میں اپنی ماں کا ایک خیالی خاکہ تک نہیں تھا مگر خواب میں نظر آنے والی ان آنکھوں نے اسے ایک ماں دے دی تھی اور اب وہ ماں اسے دن کے اُجالے میں بھی رہ رہ کر یاد آنے لگی تھی اور اس کے بعد جب خواب میں اسے وہ دو آنکھیں دکھائی پڑتیں اور ان میں سے کوئی چیز قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکتی تو وہ خواب میں "امی امی" کہہ کر روتا ۔

یتیم خانے میں کھانا ضرورت سے کم اور مار ضرورت سے زیادہ ملتی ہے اس لئے بچے عمومًا لالچی اور عیار ہو جاتے ہیں چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ اللہ رکھا بھی ان خصوصیات سے آراستہ ہوتا گیا ۔ اب وہ اپنے سے چھوٹے بچوں کو پھسلا کر ان کے حصے کی روٹی چھین لیتا اور خود شرارتیں کر کے دوسروں کو سزا دلوا دیتا ۔ اور یہی سب سیکھتے سیکھتے وہ سمجھدار ہو گیا ۔ پھر ایک رات جب وہ نگراں کے پیر دبا رہا تھا تو اس کی ننگی ننگی آنکھوں میں اللہ رکھے کو ایک ایسی بات دکھائی دی جس کو وہ کوئی قطعی معنی تو نہیں پہنا سکا مگر ایک حیوان کی سی چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلا دیا ۔ چنانچہ اسی رات وہ یتیم خانہ سے بھاگ نکلا ۔

کچھ دنوں اس نے بھیک مانگی ۔ کچھ عرصہ اخبار بیچے اور آخر رکشہ چلانے کا پیشہ اختیار کر لیا اور یہیں سے اس کی قسمت نے پلٹا کھایا ۔ ایک شام ایک چلبلی سی عورت نے رکشہ لیا اور اسے شہر کے مختلف بازاروں میں دوڑاتی پھری ۔ پھر جب کافی رات ہو گئی تو تنگ آ کر اس نے

رکشہ روک لیا۔

"اب میں آگے نہیں جاؤں گا ـــ میرا کرایہ دو اور دوسرا رکشہ کرلو"

اور وہ عورت بڑی بے حیائی سے مسکرائی۔ "کرایہ تو نہیں ہے۔"

"کرایہ نہیں ہے! اللہ رکھا بھونچکا رہ گیا۔" پھر کیا رکشہ پر بیٹھنے کو اللہ میاں نے کہا تھا؟"

"اللہ میاں نے تو نہیں ایک آدمی نے کہا تھا ـــ اور وہ نہیں ملا۔ مل جاتا تو تمھیں منہ مانگا کرایہ دیدیتی"۔

"کون ہے وہ آدمی؟"

اور اس عورت نے اپنی بائیں آنکھ آہستہ سے دبائی۔ "گاہک!"

ارے باپ رے رنڈی!

اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اس روز اس نے پہلی بار ایک طوائف کو قریب سے دیکھا تھا۔ اور یہ بات جان کر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ طوائف بھی قلاش ہوتی ہے۔ اس نے تو سنا تھا کہ طوائف عورت کی وہ قسم ہے جو سر سے پیر تک سونے سے پیلی ہوتی ہے اور جس کے ایک اشارے پر لوگ جان تک قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اور اس طوائف کے پاس رکشہ کا کرایہ بھی نہیں تھا۔ یہ کیسی کسبی تھی جو گلی گلی اپنا جسم بیچنے کے باوجود بھی مفلس تھی ـــ!

"اچھا بابا میری جان چھوڑو"۔ اس نے سوچ کر کہا۔ "میں کرایہ بھی نہیں مانگتا"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے" اس عورت نے کہا پھر کچھ سوچ کر بولی: "اچھا تم میرے گھر چلو۔ وہاں میں تمہیں کرایہ دیدوں گی"

چنانچہ وہ اس عورت کو اس کے گھر پہونچانے گیا۔ اور وہاں جس سکے میں اسے ادائیگی ہوئی وہی سکہ وہ آج تک چلا رہا ہے!

یہ پہلی عورت تھی جس کی دلالی اس نے شروع کی۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس کا کاروبار یہاں تک بڑھ گیا کہ اب دور دور کے قحبہ فروش اس کے پاس نئی لڑکیاں فروخت کرنے آتے تھے اور شہر کے مختلف حصوں میں اس کی سینکڑوں تنخواہ دار لڑکیاں پیشہ کر رہی تھیں اور ہر مہینہ ان کی تنخواہوں کی صورت میں وہ اتنی رقم ادا کرتا تھا جو ایک اوسط درجے کے مل مالک کو ادا کرنی پڑتی ہے۔

اس عروج کے پیچھے پورے پندرہ سال کی انتھک محنت تھی۔ اور اب اللہ رکھا رکشہ چلانے والا ننھا چھوکرا نہیں رہا تھا بلکہ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو چلے تھے۔ لیکن اب بھی اسے خواب میں وہ آنکھیں پابندی سے دکھائی پڑتی تھیں۔ اور وہ ہر رات سوتے میں بچہ بن جاتا تھا اور "امی امی" کہہ کر چپکے چپکے روتا تھا۔

ذہنی طور پر وہ اب بھی اس نہر کے کنارے پڑا بلک رہا تھا جس کی لہروں میں اس کی بدنصیب ماں کی لاش تیر رہی تھی!

ایک روز مستانہ پنجاب سے کوئی نئی لڑکی لایا۔

"دیکھو گے تو پھڑک اٹھو گے استاد۔" مستانہ نے اسے بتایا۔ "کالج کی چھوکری ہے کالج کی!

"مگر تیرے ہتھے کس طرح چڑھ گئی؟"

"اشٹیشن پہ بیٹھی رو رہی تھی سالی۔ یار کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی تھی اور یار زیور لوٹ کر اڑن چھو ہو گیا تھا۔" مستانہ نے کہا پھر زور پیدا کرنے کے لئے اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا "قسم اللہ پاک کی استاد۔ میں نے ایسا مال بڑے بڑے بازاروں میں نہیں دیکھا"

اور جب اللہ رکھے نے اس نئے مال کو دیکھا تو اسے دل ہی دل میں مستانہ کی بات کا قائل ہونا پڑا۔ وہ لڑکی سر جھکائے زینے پر

بیٹھی تھی اور اگرچہ اللہ رکھا اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اللہ رکھے کے سامنے تو نسوانی جسم جیسے بول اٹھتے تھے اور اس لڑکی کے سڈول شہ جسم کا ایک ایک انگ ستانے کی بات پر دلالت کر رہا تھا۔ چنانچہ اللہ رکھے نے اس لڑکی کو خرید نے کا فیصلہ کر لیا۔ ستانے نے اسکے منہ مانگی قیمت اللہ رکھا چاہتا تھا کہ بولی لگانے سے پہلے ایک نظر اس کا چہرہ بھی دیکھ لے۔ چنانچہ اس نے لڑکی کو مخاطب کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا"؟

مگر وہ لڑکی سر جھکائے بیٹھی رہی اور پیر کے انگوٹھے سے چپکے فرش کو کرید تی رہی۔

چنانچہ ستانہ گرجا۔ "بولتی کیوں نہیں — استاد تیرا نام پوچھ رہے ہیں"

اور تب اس لڑکی نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ "بے بی!"

اور ایک بجلی تھی جو اللہ رکھے کی نظروں میں کوند گئی۔ یہ آنکھیں تو اس کی جانی پہچانی تھیں۔ یہ تو اس کے خواب کی آنکھیں تھیں جو حقیقت بن گئی تھیں۔ اور اس نے چپ چاپ ستانے کو دس ہزار روپے پکڑا دیئے اور بے بی کو گھر لے آیا۔

بے بی کو گھر چھوڑ کر اللہ رکھا بازار سے کھانے پینے کی چیزیں لینے چلا گیا اور جب لوٹ کر آیا تو اس نے دیکھا کہ بے بی گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی۔ ساری لڑکیاں شروع شروع میں یہی کرتی ہیں اور اللہ رکھا وہ تمام گر جانتا تھا جنہیں چھیڑنے سے انہیں راہ پر لگایا جا سکتا ہے مگر اس نئی لڑکی کو روتا دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور اس کا پندرہ برس کا تجربہ بھی جھانکنے لگا۔

بڑی ہمت کر کے اس نے لڑکی کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "رونے سے کیا فائدہ ......"

مگر وہ آگے نہ بول سکا۔ اس کے سامنے پھر وہی آنکھیں تھیں۔ اس کے خوابوں کی آنکھیں۔ اور ان سے آنسو قطرہ قطرہ ہو کر ٹپک رہے تھے۔ اور اچانک اللہ رکھے کو محسوس ہوا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ خوشبوؤں میں نہا گیا ہو۔ جیسے اس پر کسی نے عطر کی پھواریں چھوڑ دی ہوں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور بے سدھ ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ اور اس رات پھر اس نے خواب میں اپنی ماں کی آنکھیں دیکھیں۔ اور دیر تک روتا رہا۔ پھر اس طرح جیسے کوئی سوتے میں چلتا ہے وہ ڈگمگاتا ہوا بے بی کے کمرے میں پہنچا اور کٹے ہوئے درخت کی طرح دھم سے اس کی آغوش میں گر پڑا۔ بے بی نے بے بسی سے اپنا جسم چرانا چاہا مگر اللہ رکھے نے اپنا سر اس کے سینے پر ٹیک دیا اور اس کے گرم گرم آنسو بے بی کے سینے میں جذب ہونے لگے اور بے بی نے سنا اللہ رکھا سسک سسک کر بس ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا —

"امی۔ امی!"

نہر کے کنارے بلکتے ہوئے بچے کے لئے شاید یہ پہلی آغوش تھی!

اللہ رکھے نے بے بی کو بازار میں نہیں بٹھایا۔

یہ بات نہیں تھی کہ اس نے اپنا پیشہ ترک کر دیا تھا۔ اس کا کاروبار اسی رفتار سے چل رہا تھا مگر بے بی پر اس نے اس دھندے کا سایہ بھی نہ پڑنے دیا۔ بے بی اس کا گھر دیکھتی۔ اس کے لئے کھانے پکاتی۔ اس کا بستر لگاتی اور اللہ رکھا جب دن بھر کی مصروفیت کے بعد تھکے واپس آتا تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اوپر ایک خوف سا طاری کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ سہما سہما گھر میں داخل ہو اور اسے دیکھتے ہی بے بی اس پر برس پڑے۔ اس سے خفا ہو جائے۔ اسے کھانا نہ دے۔ چنانچہ وہ مصنوعی تھکی ہوئی آواز سے اسے مخاطب کرتا۔

"بے بی کھانا لے گا۔"

اور بے بی خاموشی سے میز پر کھانا لگا دیتی

اور ایسے ہی ایک موقع پر جب وہ رات کا کھانا کھا رہا تھا بے بی نے اس سے پوچھا۔ "تم مجھے بے بے کیوں کہتے ہو اللہ رکھے ـ میرا نام تو بے بی ہے !"

"اوہ ـ مجھ سے یہ انگریزی نام نہیں لئے جاتے۔ اللہ رکھے نے بات ٹالنے کی سعی کی حالانکہ بے بی کہنا اس کے لئے مشکل بھی نہیں تھا۔ مگر نہ جانے کیوں جب بھی وہ بے بی کو پکارتا تو غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے "بے بے" نکلتا۔ چنانچہ رک کر اس نے پوچھا۔ "کیا تمہیں میرا بے بے کہنا برا لگتا ہے ؟"

"برا تو نہیں لگتا ـ" بے بی نے کہا پھر کچھ سوچ کر ہنسنے لگی ۔ "مگر ہماری طرف بے بے ماں کو کہتے ہیں !"

مگر اس نے ہمیشہ بے بی کو بے بے کہا۔ اور بے بی اکثر سوچتی کہ نہ معلوم یہ کس قسم کا انسان ہے اور اس سے کیا چاہتا ہے ۔ وہ اللہ رکھے کے پیشے سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ رکھے نے اسے دس ہزار کے عوض حاصل کیا تھا۔ اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اللہ رکھے کا مقصد کیا تھا ؟ اصولاً اسے جسم فروشی کرنا چاہیئے تھی مگر اللہ رکھے نے اسے اپنا گھر سونپ دیا تھا۔ لیکن اس خیال سے نہیں کہ بے بی اس کی خدمت گذاری کرے بلکہ وہ خود بے بی کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا ـ اور اس طرح اس سے سمجھتا تھا جیسے اس نے بے بی کو نہیں بے بی نے اسے خریدا ہو۔

یہ عجیب سی بات تھی۔ اور یہ اس سے بھی عجیب بات تھی کہ دن جسموں کا سودا کرنے والا بے خبر اللہ رکھا جب رات کو تھک ہار کر سوتا تو بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتا اور خواب میں اپنی ماں کو یاد کرتا۔ لیکن اب جب بھی ایسا ہوتا تو بے بی دبے پاؤں اللہ رکھے کے کمرے میں چلی آتی بڑے ہولے سے اس کے بستر پر بیٹھتی اور اس کا سر اپنے سینہ پر رکھ لیتی ـ اور اللہ رکھا بچوں کی طرح بہل کر سو جاتا۔

بازار میں اللہ رکھے کی نئی لڑکی کے بڑے چرچے تھے ۔ عام خیال یہ تھا کہ اللہ رکھا اس نئی لڑکی کو کسی بڑی قربانی کے لئے تیار کر رہا تھا۔ مگر اللہ رکھے کی زبانی آج تک کسی نے اس لڑکی کا تذکرہ نہیں سنا تھا۔ اس نے اپنے کسی بھی گاہک سے بے بی کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا تھا ـ اور اس کے گاہک اس لئے اللہ رکھے کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے کہ اگر انہوں نے اس نادیدہ لڑکی میں ذرا سی بھی دلچسپی ظاہر کر دی تو اللہ رکھا اس کی قیمت کئی گنی بڑھا دے گا۔

اللہ رکھا اپنے گاہکوں کی اس دلچسپی سے بے خبر تھا اور بے خبر رہنا بھی چاہتا تھا۔ اس نئی لڑکی میں جس کا نام بے بی تھا اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی ۔ جب تک وہ لڑکی اس کے سامنے رہتی وہ اپنے آپ میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کرتا۔ ایک عجیب سی آسودگی تھی اس کی قربت میں ـ جیسے دوپہر کی کڑی دھوپ میں کسی چھتنار درخت کا ٹھنڈا سایہ ـ اور اللہ رکھے کی زندگی میں تو دھوپ ہی دھوپ تھی۔ اسے یہ سایہ بڑا عزیز تھا ـ

جب وہ دن بھر کی تھکن لے کر گھر واپس آتا اور بے بی اپنی منتظر نگاہوں سے اسے دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس لڑکی کے اردگرد ایک چاندنی ہے جو پھیلی ہوئی ہے ۔ ایک نور ہے جو احاطہ کئے ہوئے ہے ۔ اور جب بے بی رات کے کسی حصہ میں اللہ رکھے کا سر اپنے سینے پر رکھ لیتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے بے بی کے وجود کی چاندنی قطرہ قطرہ اس کے جسم میں سرائیت کر رہی ہے اور اس کی ایک بے نام سی تشنگی کو آسودگی مل جاتی ۔ جیسے کسی شیر خوار بچے کے حلق میں ماں کی چھاتی کا دودھ قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہو ـ جیسے اس کے اندر کی تاریکی میں اجالے کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں ـ اور یہی وہ آسودگی تھی جس سے ہمکنار ہونے کے بعد وہ بچوں کی سی میٹھی نیند سو جاتا تھا۔

لیکن ایک شام بے بی کی آنکھوں کے دیئے دھندلائے ہوئے تھے۔ اور یہ تبدیلی اللہ رکھے نے فوراً محسوس کر لی۔
"کیا بات ہے بے بے؟"
"کچھ نہیں؟"
"گھر یاد آرہا ہے؟" ہولے سے اس نے پوچھا۔
"گھر۔۔۔ !" اور اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔" "نہیں تو"۔
"پھر کیا بات ہے بے بے ۔۔۔ دیکھو مجھ سے کوئی بات نہ چھپایا کرو"
"بات یہ ہے اللہ رکھے کہ اکیلے گھر میں میرا جی نہیں لگتا۔" اس نے کہا۔ "نہ کوئی کام ہے نہ کاج۔ نہ کہیں آنا جانا"
"بس اتنی سی بات!" اللہ رکھے نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "اچھا یہ بتاؤ جب تم اپنے گھر میں تھیں تو تمھارا وقت کتنا تھا؟"

"تب میں اسکول جاتی تھی ۔۔۔ گھر کا کام کاج کرتی تھی"۔
"یہ تمھارا ہی گھر تو ہے بے بے۔ یہاں بھی کام کاج کرو۔ جی چاہے تو اسکول میں داخلہ لے لو"
"سچ اللہ رکھے!؟"
"ہاں بے بے۔ تم جو چاہو گی وہی ہوگا۔ مگر بے بے تم اس طرح اداس نہ ہوا کرو"۔
چنانچہ اس نے بے بی کو اسکول میں داخل کرادیا۔ اور اب وہ ہر صبح پابندی سے اسے اسکول چھوڑنے اور ہر دوپہر کو کام چھوڑ کر اسے واپس لینے جاتا تھا۔
ایسی ہی ایک دوپہر تھی جب وہ بے بی کو اسکول سے واپس لا رہا تھا کہ ایک لمبی سی کار نے بڑی بدتمیزی سے اس کا راستہ اس نے دیکھا یہ اس کا مستقل گاہک موتی والا تھا ۔۔۔ چھوٹا موتی والا۔ جو اپنے باپ بڑے موتی والے کی بلیک مارکیٹ اور کمائی کو اللہ رکھے کی لڑکیوں پر بڑی بے دردی سے صرف کرنے کا عادی تھا۔
موتی والا نے بڑی بے تکلفی سے کار کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ "آؤ اللہ رکھے۔ بڑے موقع سے ملے"
"نہیں ۔۔۔ شکریہ موتی والا سیٹھ۔ میں چلا جاؤں گا"۔
اور تب موتی والا نے ایک عقاب کی نظر سے بے بی کو گھورا۔ اور گاڑی بند کر کے باہر آگیا۔
بے بی سہم کر دو قدم آگے بڑھ گئی۔ اور اللہ رکھے نے دیکھا بے بی کی آنکھیں کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح بے قرار ہوگئیں۔
"چیز لاجواب لائے ہو استاد۔" اس نے بڑے فحش انداز میں اللہ رکھے کو آنکھ ماری۔ "کیا مدرانہ ہے ان کا"
"موتی والا"! اللہ رکھا اچانک چیخ اٹھا۔ پھر تھم کر کہنے لگا۔ "یہ اس کام کی لڑکی نہیں ہے!"
اس کے بعد اس نے آگے بڑھنا چاہا مگر موتی والا نے اسے بازو سے تھام کر روک لیا۔
"ہم سے استادی سالے!" اس نے اللہ رکھے کی پیٹھ پر ٹھوکا دیا۔ "میں جانتا ہوں۔ تم نتھ کی رقم کے چکر میں ہو"
"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" اللہ رکھے کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔۔۔۔۔ اس کے ڈاکو باپ کا خون جس کر گزرنے کی تڑپ تھی۔ "قسم پروردگار کی موتی والا اب آگے نہ کہنا ۔۔۔ یہ میرے گھر کی لڑکی ہے!"

"گھر کی لڑکی ہے۔" مگر موتی والا جو دلالوں سے تکرار کا عادی تھا بولتا چلا گیا۔ "میں سمجھ گیا تم سالے ابھی خود مزے لوٹ رہے ہو۔ اور ۔ اور ۔" لیکن اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ اللہ رکھے نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اور اسے مار کے ہونٹ پر گرا کر اس کے نرخرے پر اپنی پوری قوت صرف کر دی حتیٰ کہ موتی والا مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد اللہ رکھے نے بے بی کو اس کے گھر کا ٹکٹ دلا کر ریل پر بٹھا دیا ۔ جی بھر کے رویا ۔ اور خود کو پولیس کے حوالہ کر دیا قتل ثابت تھا۔ مگر عدالت وجہ قتل کو سمجھنے سے قاصر تھی اور وکیل سرکار اسی کوشش میں اللہ رکھے کو رگڑ رہا تھا۔

"تم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ تم نے اشتعال میں آ کر موتی والا کو قتل کر دیا۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

"ہاں یہ صحیح ہے!" اللہ رکھے نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا تم عدالت کو بتاؤ گے کہ تم مشتعل کس بات پر ہو گئے تھے؟"

"ہاں میں بتاتا ہوں ۔" اور اللہ نے ہونٹوں پر زبان پھیری ۔ ایک لمحے کے لئے سارا منظر اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا ۔ بے بی ۔ موتی والا ۔

اور بے بی کی آنکھوں میں رینگتی ہوئی خون کی لکیریں ۔ اور اس کے گلے کی ساری رگیں پھول کر تن گئیں۔ وہ سر سے پیر تک کپکپا اٹھا۔ اور پھر اچانک اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اندر سے ٹوٹ گیا ہے۔ "اس نے ۔ اس نے مجھے ماں کی گالی دی تھی!"

اور عدالت ایک مشترکہ قہقہے سے گونج اٹھی ۔ بھڑوا اور ماں کی گالی پر قتل! بات ہی ہنسی کی تھی۔

لیکن یہ قہقہے اللہ رکھے کا پیچھا نہ کر سکے۔

وہ نہر جس کے کنارے وہ زندگی بھر بلکتا رہا تھا بڑی تیزی سے اسے اپنی لہروں میں بہا لے گئی تھی۔

اعتبار ساجد

ہالٹ

"ہالٹ ۔ !"

ایک گرجتی ہوئی سی جانی پہچانی آواز نے بے ساختہ قدم روک لئے ۔ گھوم کر دیکھنے کی کوشش کی تو عین کنپٹی کے قریب سے گھڑگھڑاتا ہوا ایک ٹرک تیزی سے گزر گیا ۔ ایک لمحے کے لئے ڈیزل آئل کے دھوئیں کے بادل پھنکارتے ہوئے ابھرے دوسرے ہی لمحے کسی نے انتہائی بے دردی سے ٹائی کی قمیص کا کالر پکڑ کر کھینچا اور فٹ پاتھ پہ لے آیا "مرجاتا کمبخت ۔" جھنجھلائی ہوئی مانوس آواز نے کہا بے ساختہ چونکنا پڑا ۔ سامنے ماسٹر ہالٹ کھڑے تھے !

پوپلے میں دب کر بھنچے ہوئے آلو جیسا چہرہ ۔ اگلے دو دانت ندارد ۔ جسم پر پلپلیٹے کا بھدا بوسیدہ کوٹ ۔ ہاتھ میں لوہے کی زنگ خوردہ موٹھ والی چھڑی اور آدھے سر سے کنپٹی تک بالوں کا صفایا ۔

"سر آپ ۔ آپ" ہم ماسٹر ہالٹ کا یہ روپ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے " آپ نے کیسے پہچانا مجھے ۔"

پتلی پتلی سیاہ انگلیاں چھاج کی طرح منہ کے سامنے پھیلا کر بولے "ہم کیسے بھول سکتے ہیں ۔ اب ۔ یہ چال تو ہماری ہی تربیت یافتہ ہے نا ۔"

آنکھوں تلے یکے بعد دیگرے کئی گم گشتہ یادیں تھرا گئیں ۔ "واہ ۔ کیا غضب کی یادداشت پائی ہے آپ نے ۔"

"سنا ہے تم جرنلسٹ ورنلسٹ بن گئے ہو ۔" انہوں نے اتنی لاتعلقی سے کہا کہ پہلی مرتبہ اپنے صحافی ہونے پر خفت ہوئی ۔

"آپ کیا کر رہے ہیں آج کل ۔" خفت کے مارے موضوع بدلنا پڑا ۔

معلوم ہوا ایک ٹیکسٹائل ملز کے آفیسرز کلب میں اس بات پر معمور ہیں کہ آفیسرز ریکٹ سے شٹل کاک کو ہوا میں اچھالیں اور یہ لپک جھپک کر کھیل کے آداب سکھائیں اور ساتھ ہی شٹل کاک اٹھا اٹھا کر دیں ۔ تنخواہ جھٹکے جھٹکے ڈیڑھ سو تیائی ۔

سات آٹھ برس بعد ملاقات ہوئی تھی ۔ ہم نے ایک قریبی ریسٹوران کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہاں چل کے بیٹھتے ہیں ۔ چھڑی جھلاتے، لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے ریسٹوران کی طرف بڑھے ۔ ریسٹوران میں داخل ہونے سے پہلے حکم ہوا " ہالٹ ۔ "

ہم نے قدرے ناگواری سے استفسار کیا ۔ چھڑی کو اپنی سوکھی پنڈلیوں پہ مارتے ہوئے کہا ۔ "یہ ہوٹل بازی غلط ہے ۔"

"غلط ہے یا صحیح ہے ۔ آپ اندر چلئے ۔" ہم نے بازو پکڑ لیا ۔ یکایک ایک پینترا بدلا ۔ بازو ہماری گرفت سے آزاد ہو گیا ۔

کہنے لگے ۔ " سوچا کرو ۔ تین آنے کی ایک پیالی چائے ملتی ہے ۔ دو آنے میں بوٹ پر پالش ہو جاتی ہے ۔ چار آنے میں شیو بن جاتی ہے ۔ ایک آنے میں ایک ڈبی ماچس اور کے ٹوکے دو سگریٹ آتے ہیں تبا ؤ پیٹ مقدم ہے کہ دوسری ضروریات ؟ "

لیکن بوڑھے بازو جوان بازوؤں سے مدافعتی جنگ نہ لڑ سکے ۔ ماسٹر بالٹ کو ہماری خواہش کا احترام کرنا پڑا ۔ یادش بخیر ! ماسٹر بالٹ سے پرائمری میں پالا پڑا تھا ۔ اس زمانے میں خاصے چوڑے چکلے دبنگ آدمی تھے ۔ دو تین فرلانگ تک عموماً ان کی آواز بآسانی سنی جاتی تھی ۔ اسکول بھر میں یا چھٹی کی گھنٹی گونجتی تھی یا ان کی آواز ۔ کوئی تیسری آواز رقیب ہونے کا شرف حاصل نہ کر سکی ۔ دو جنگیں دیکھ چکے تھے ۔ چنانچہ ہر بات میں ڈسپلن کا خیال رکھنا ضروری تھا ۔ اسکول میں ماسٹروں سے دو بدو مقابلے کرتے تھے ۔ ہیڈ ماسٹر سے بھی خاصے معرکے گرم رہے تھے ۔ اصولاً یا مجاہد یا شہید کے مقولے پر کاربند تھے ۔ چنانچہ مار پیٹ میں عدم تشدد کی پالیسی کے قائل نہیں تھے ۔ اکثر مٹھی بھینچ کر کہتے ۔ " دشمن پر بھیڑیئے کی طرح ٹوٹ پڑو تکا بوٹی کر ڈالو ۔ چبا جاؤ ۔ فنا کر دو ۔ " دشمن کا نام آج تک انہوں نے نہیں بتایا ۔ تربیت البتہ دے ڈالی ۔ اس اُدھوری تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے آپس میں لڑتے تو ایک دوسرے کو دشمن کا نام دے کر وہ سر پھٹول کرتے کہ مجبوراً بیچ بچاؤ کے لئے ماسٹر بالٹ کی خدمات حاصل کرنی پڑتیں ۔ انہوں نے کبھی لڑتے شیروں کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی ۔ ایسا کرنے کی تحریک دی جاتی تو ہاتھ کی انگلیاں چھاج کی طرح مجمع کی طرف پھیلا کر کہتے ۔" دھیرج دھیرج ٹھنڈا کر کے کھاؤ ابھی نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا ۔ " نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی کی ٹانگ ٹوٹتی کسی کا سر ۔ ماسٹر بالٹ کو اللہ نے کبھی یہ توفیق نہیں دی کہ لڑائی جھگڑا بند کروا دیں ۔ حالانکہ ان کے ایک ہالٹ پر اسّی اسّی لڑکوں کی ایک جماعت چٹان کی طرح اٹل ہو جاتی ۔

کہنے کو ڈرل ماسٹر تھے ۔ لیکن بباطن ہر فن مولا تھے ۔ کسی جماعت کو تاریخ پڑھاتے کسی کو جیومیٹری ۔ کہیں علامہ اقبال کے اشعار کی تشریح کرتے کہیں اقلیدس کی تھیوری بیان کرتے ۔ جنگ پلاسی پڑھانے لگتے تو مٹھیاں بھینچ لیتے ۔ کرسی سے اچھل اچھل پڑتے ۔ بے ساختہ اپنے لمبے بالوں کو پکڑ پکڑ کر جھٹکے دیتے ۔ غزوۂ بدر تک پہنچتے تو حالت غیر ہو جاتی ۔ پہلے تو آہستہ آہستہ " حق اللہ جی ہاں " کا ورد ہوتا ۔ پھر جنگ چھڑنے کا تذکرہ آتے ہی کرسی سے الگ ہٹ جاتے ۔ کتاب میز پر رکھ دیتے ۔ ہاتھ قلم کا منہ بچھاڑ لیتے ۔ چھڑی سے ہوا میں تلوار چلا کر دکھاتے ۔ کمنٹری ساتھ ساتھ جاری رہتی ۔ "

" وہ مارا ۔ کفار کا صفایا بول دیا ۔ بولو بولو ۔ نعرۂ حیدری ۔ "

" یا علی ۔ " پوری کلاس چنگھاڑتی ۔ ایک سماں بندھ جاتا ۔

فرط جوش میں پسینہ پسینہ ہو جاتے ۔ گلے کی رگیں پھول کر یوں دکھائی دیتیں گویا آپ نے حلق میں لمبے لمبے سرکنڈے چھپا رکھے ہیں ۔ منہ سے کف جاری ہو جاتا ۔ بال بکھر جاتے ۔ آستین کے بٹن کھل جاتے ۔ "

" دشمن کا قلع قمع کر دو ۔ کٹ مرو ۔ لپٹ جاؤ ۔ اڑنگی دے مارو ۔ فنا کر دو ۔ تباہ و برباد کر دو "

پھر نڈھال ہو کر کرسی پر گر پڑتے ۔ گویا میلوں دوڑتے رہے ہوں ۔ کاپیوں کے پنکھے کی ہوا اور دستی نلکے کا ٹھنڈا پانی پی کر وہیں کرسی میں ڈھیر ہو کر فرماتے ۔ " نعت سنانے والی پلٹن کھڑی ہو جائے ۔" سر پہ رومال یا ململ کی ٹوپی جمائے دو تین لڑکے دانت نکوسے کھڑے ہو جاتے ۔

" پکی سرکار (انگلیاں چومتے ہوئے) کی شان میں نعت خوانی کرو ۔ اٹین شن ہو کر ۔ "

مذہب اور جنگ سے انہیں بڑی محبت تھی ۔ مذہب کا نام آتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لاتے ۔ گلوگیر لہجے میں آسمان کی طرف

چھڑی اٹھا کر کہتے — " فی اللہ جی ہالٹ ۔ "

اسکول میں برگد کے پیڑ کے نیچے ایک چبوترہ بنا تھا۔ سامنے ایک دیوار اٹھا دی گئی تھی اور نچوا ڑے کسی نے سفید سے سے لکھ دیا تھا " یہ مسجد ہے ۔ " ماسٹر ہالٹ فارغ اوقات میں اس چبوترے پر سجدہ ریز نظر آتے ۔ ایک ڈیڑھ ماہ تک عبادت کا یہ انفرادی اور اجتماعی سلسلہ جاری رہا پھر کسی سبز پوش موذن نے آکر ہیڈ ماسٹر سے کہا " چبوترے کا رخ کعبے کی طرف نہیں ہے ۔ "

ماسٹر ہالٹ سلام پھیر رہے تھے۔ کسی نے آکر یہ انکشاف کیا تو سبز پوش موذن کے قدموں میں لوٹ گئے۔ رو رو کر پوچھتے کہ کعبہ اگر ادھر نہیں ہے تو کدھر ہے ۔

معلوم ہوا بنیاد رکھنے والوں نے موذن سے چونکہ مشورہ نہیں لیا۔ اس لئے کعبہ سے ڈیڑھ فٹ ترچھا چبوترہ بن گیا۔
ماسٹر ہالٹ کی صورت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ۔ اس روز کھیل کے میدان میں یکایک پاؤں پھسلا تو پورے قد سے زمین پر آ رہے ۔ لنگڑاتے ہوئے اٹھے ۔ ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکلی ۔ " فی اللہ جی ہالٹ — "

چھڑی ٹیکتے ہوئے چنگھاڑے — " کوئک مارچ ۔ "

ایک سو دس لڑکوں کی نو قطاریں چل پڑیں ۔ لنگڑاتے لنگڑاتے ساتھ ساتھ چلنے لگے ۔ " لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ " گھٹنے کا درد شدید تھا ۔ ایک جگہ لیفٹ رائٹ کہتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے ۔ ایک سو دس لڑکوں کی نو قطاریں چلتی رہیں ۔ اسکول کے احاطے کی ناپختہ دیوار ڈیڑھ دو فٹ اونچی تھی ۔ لیفٹ رائٹ کرتی ہوئی نو قطاریں دیوار پھلانگ کر بازار میں جا پہنچیں ۔ ماسٹر ہالٹ نے جو سر اٹھایا تو سب غائب ۔ ادھر ادھر دیکھا ۔ کامل سکوت ۔ گڑبڑا کے ہالٹ ہالٹ چیختے ہوئے چھڑی لہراتے لپکے ۔

دیوار پھاند کر اسکول سے باہر نکلے ۔ دور ایک لمبی سی قطار بھیڑ بکریوں کی طرح چلی جا رہی تھی ۔

ماسٹر ہالٹ کی مادری زبان پنجابی تھی ۔ چنانچہ چھڑی ہلاتے گالیاں بکتے لپکے ایک سو دس لڑکوں کی طرف ۔

" اوئے ہالٹ اوئے ہالٹ ۔ تہانوں موت پوے — ہا — ہا — ہالٹ ! "

فاصلہ جب بدستور رہا تو جھنجھلا کر بولے ۔ " ڈبل مارچ ۔ "

اکثر یوں ہوتا کہ کوئک مارچ کہہ کے ہالٹ کہنا بھول جاتے ۔ یا کسی سبق کی طوالت سے اکتا کر حی اللہ جی ہالٹ کا نعرہ لگاتے ۔
سیکرٹری آف اسکول کی آمد پر آپ نے ساٹھ بینسٹھ لڑکوں کو پریڈ کے لئے منتخب کیا ۔ کئی دن تک ریہرسل کراتے رہے ۔ انسپکٹر خاصا خبطی یعنی ان سے موسم کی خرابی کا رونا رونے لگا ۔ آپ کوئک مارچ کرا چکے تھے ۔ باتوں میں کچھ ایسے مگن ہوئے کہ ہالٹ کہنا بھول گئے ۔
یہ ظاہر ہے آپ کی سالانہ ترقی رک گئی ۔

ان کے معاشی حالات خاصے متاثر ہوئے ۔ غریب تھے لیکن غیور اتنے کہ اگر کسی نے سگریٹ پیش کی تو سفارش یا رشوت کا یہ دے کر پیشکش رد کر دی ۔ سنا ہے سالانہ ترقی کی اس روک تھام پر چھڑی ہاتھ میں پکڑے انسپکٹر کے دفتر میں جا دھمکے تو اقوال زریں سے مزین ایک لمبی دار تقریر کی ، ما حصل یہ تھا کہ غریبوں پر ظلم نہ ڈھاؤ ورنہ قیامت کے دن گریبان پکڑ کے رہ ، دیں گے ، پھر دعائیں سے چھڑی مار کر فرط جوش میں ٹیبل لیمپ چکنا چور کر دیا اور لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے باہر نکل آئے ۔
پکڑ باختیار تھا اور اسے غصہ بھی آ سکتا تھا ۔ چنانچہ آپ کو نوکری سے جواب مل گیا ۔ لبعد میں معلوم ہوا کہ آپ استعفیٰ اپنی بغل میں لگائے تھے لیکن پیش کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا ۔ اگلے دن ایک اچھوت کی بھانک قبدل ماسٹر کا تقرر ہو گیا ۔ نتیجۃً اب آپ کا

سیدھا انسپکٹر سے جا ملتا تھا۔ معطلی کے ان ایام میں بھی ماسٹر ہالٹ نے ہمیں نہ بخشا۔ اکثر ٹریخ کوٹ پہنے چھڑی بغل میں دبائے آنازل ہوتے۔ نیا ڈرل ماسٹر ہمیں کوئک مارچ کا حکم دیتا تو آپ ڈبل مارچ کروا دیتے۔ ادھر سے ہالٹ ہوتا تو یہاں سے کوئک مارچ کا حکم صادر ہو جاتا۔ نئے ڈرل ماسٹر کی مونچھیں خطرے میں پڑ جاتیں۔ وہ ڈنڈا بغل میں دبائے ایک ایک کے سر پر منڈلاتا پھرتا۔
ماسٹر ہالٹ کو اسی زمانے میں نسیان کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ چنانچہ ڈرل ماسٹر کی ہالٹ کو کوئک مارچ سے توڑ کر گھر چلے جاتے۔ اور ہم لوگ حسب ترتیب گلیوں بازاروں میں لیفٹ رائٹ کرتے پھرتے۔ ڈرل ماسٹر زچ ہو گیا۔ چند دنوں بعد اس نے یہ ترکیب نکالی کہ ہمیں پریڈ گراؤنڈ میں لا کر خود دیوار کے پیچھے جا کر سگریٹ پینے لگتا۔ ماسٹر ہالٹ نمودار ہوتے اور کوئک مارچ کہہ کر نو چکر ہو جاتے۔ جب ہم ہاتھ جھلاتے، سینہ تانے کوئیک مارچ کرتے دیوار پھاندنے لگتے تو یکایک دیوار کے پیچھے سے ڈرل ماسٹر کا سر نمودار ہوتا اور وہ سگریٹ پھینک کر "ہالٹ" کہتے ہوئے ہمارے سامنے سینہ سپر ہو جاتا۔
ہیڈ ماسٹر نے ماسٹر ہالٹ کو اپنے کمرے میں بلا کر سمجھایا کہ یہ حرکت آئینی، اصولی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے انتہائی غلط ہے کہ آپ ملازمت ترک کر چکنے کے بعد اسکول میں آدھمکتے ہیں اور اپنے سابقہ فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔ ہم چق کے پیچھے کھڑے یہ کارروائی بچشم خود دیکھ رہے تھے۔
ماسٹر ہالٹ کرسی سے اٹھے۔ ٹریخ کوٹ اتار کر میز پر رکھا۔ ٹانگے پتلون کے پائینچے پلٹ کر اوپر چڑھائے اور چھڑی اٹھا کر کمال بے باکی سے بولے۔ "یہ تو ہو گا۔"
"یہ نہیں ہو گا۔" ہیڈ ماسٹر گرجے۔ "میں آئینی طور پر آپ کو ——"
"ہالٹ" ماسٹر ہالٹ گرجے بلکہ اچھلے۔ "میں آئینی، سماجی، ثقافتی، ادبی اور علمی خدمات کے جذبات سے سرشار ہو کر یہاں آتا ہوں۔ آپ سے پیسہ نہیں مانگتا۔ کسی کو ڈنڈا نہیں مارتا۔ یہ تو میری اسپورٹس مین اسپرٹ ہے جو مجھے پریڈ گراؤنڈ میں لاتی ہے۔"
یکایک ایک دھماکہ ہوا۔ ہم چق چھوڑ کے بھاگے۔ چھنا چھن ایک الماری کے شیشے ٹوٹے۔ دھڑام سے کرسی الٹی۔ پھر ایک گرجتا برستا سا نعرہ سنائی دیا۔ "نعرۂ حیدری —— حق اللہ جی ہالٹ"
اگلے دن ہیڈ ماسٹر کی پیشانی پر بندھی ہوئی پٹی نے چیخ چیخ کر اعلان کر دیا کہ ماسٹر ہالٹ کا داخلہ اسکول کی حدود میں حتمی طور پر بند ہو گیا ہے۔
سینکڑوں لمحے مرغابیوں کی طرح اڑتے ہوئے آئے اور پروں کی سنسناہٹ چھوڑ کر گذر گئے۔ پہلے کچھ دنوں تک تو ماسٹر ہالٹ گلیوں بازاروں اور سڑکوں پر نظر آئے اور ہالٹ کہہ کر فرداً فرداً ہر ایک کی خیر و عافیت دریافت کرتے رہے۔ گھنٹوں بیچ سڑک پر رک کر تاریخ اسلام کے اقتباسات سناتے۔ کبھی غائبانہ دشمن کے خلاف متحد ہو جانے کا حکم دیتے۔ کبھی کہتے۔ "ایک خط مستقیم اگر مشرق سے مغرب کی طرف جاتا ہوا اپنے مرکز سے ٹوٹ جائے تو جانتے ہو اسے کیا کہتے ہیں —— دھاگہ!"
معطلی کے بعد ان کا تکیہ کلام تھا ڈسپلن کی پابندی۔ منہ بگاڑ کر کہا کرتے۔ "ڈی سپ لن۔ ہاؤ غاغیب" جہاں سے ڈسپلن ختم ہوتا وہاں سے ان کی جماہی شروع ہو جاتی۔ پھر بیزارکن انداز میں آسمان کی طرف منہ اٹھاتے۔

حق اللہ جی بالٹ ۔"

آخری ملاقات مائی بس اسٹینڈ پر ہوئی تھی ۔ ایک بچہ آپ کے کاندھے پر تھا ایک گود میں ، ایک برخوردار انگلی پکڑے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ۔ چھڑی بغل میں دابے ، وہ جھنجلائے جھنجلائے انداز میں انگلی سے لٹکے ہوئے برخوردار سے کہہ رہے تھے ۔" ڈی سپ لن ——— اور یوس اباؤٹ ٹرن ۔"

ریسٹوران سے باہر نکل کر ہم نے پوچھا ۔" اب آپ کہاں جائیے گا سر ؟ "

چھڑی ہلا کر بولے ۔" سچی سرکار نے چاہا تو اب ہم اپنے گھر جائیں گے ۔"

ہم نے ازراہِ محبت کہا ۔" آئیے آپ کو رکشہ پر گھر چھوڑ آؤں ۔"

پلٹ کر بولے ۔" کیا مطلب ؟ تم نے کوئی کارخانہ لگا رکھا ہے پیسوں کا ، یا ٹکسال کھول رکھی ہے ۔ بابا ! ہم تو پیدل جاؤں گا ۔"

ہم نے کہا ۔" آئیے چلیں ——— "

چھڑی کی نوک ہماری طرف اٹھا کر بولے ۔" تم ——— " پھر بڑی بے باکی سے چھڑی پستول کی طرح سینے پر رکھ دی ۔ نوک دبائی تو ہمارے قدم لڑکھڑا گئے ۔ کڑک کر فرمایا ۔" یہ تو حالتیں ہیں تمہاری میں ساٹھ برس کا بڈھا ۔ چھڑی دکھائی تو لڑھک گئے ۔ سات میل پیدل چل پاؤ گے ہمارے ساتھ ——— ؟ "

" سات میل ——— " ہم منہ پھاڑ کر چیخے ——— " یا اللہ سات میل پیدل ۔"

انتہائی بے پروائی سے فرمایا ۔" روز جاتے ہیں ہم ۔ یہ تو ڈی سپ لن کی بات ہے ۔ پیسے بچاؤ ۔ صحت بناؤ اور دشمن کا قلع قمع کر دو ۔"

یہ کہا اور ٹریفک کی طرف منہ اٹھا کر ہالٹ کہتے ہوئے فٹ پاتھ پھلانگ گئے !!"


غزل

حفیظ ہوشیارپوری

عدم

عشرت رحمانی

ظہور نظر

شاعر لکھنوی

فضا ابن فیضی

جمیل نقوی

زلفی برلاس

مشفق خواجہ

مظفر حنفی

خورشید احمد جامی

حمایت علی شاعر

رفعت سلطان

مدحت الاختر

حفیظ ہوشیارپوری

پھر کہیں خاک بسر جاتے ہیں
اور با دیدۂ تر جاتے ہیں

پھر بنا رشتۂ نازک زنجیر
پھر گرفتارِ نظر جاتے ہیں

کوئی رہبر نہ کہیں مل جائے
نقشِ پا دیکھ کے ڈر جاتے ہیں

پاس رہزن ہے وہاں مجھ کو جہاں
لوگ بے زادِ سفر جاتے ہیں

دل کو مشکل سے خبر ہوتی ہے
حادثے سر سے گذر جاتے ہیں

یاد ہیں خوابِ پریشاں اتنے
شام ہوتی ہے تو ڈر جاتے ہیں

دل کی دھڑکن ہوئی پھر تیز حفیظ
اُٹھ کے پھر جانبِ در جاتے ہیں

حفیظ ھوشیارپوری

عجیب چیز ہے یہ ذوقِ آشنائی بھی
گراں نہیں مرے دل پر غمِ جدائی بھی

ترے لب و رُخ و عارض سے رنگ بھرتے ہیں
اگرچہ کہتے ہیں اکثر سخن شنائی بھی

نہ کوئی جبر کی حد ہے نہ اختیار کی حد
تجھے بھلا بھی دیا تیری یاد آئی بھی

کسی نے راہ میں لوٹا، کسی نے منزل پر
فریب راہزنی بھی ہے رہنمائی بھی

ترے خیال کی محویتوں میں ہم گم تھے
صبا تو آئی بھی تیرا پیام لائی بھی

حفیظ ذوقِ طلب ظرفِ دل پہ ہے موقوف
یہ جامِ جم بھی ہے اور کاسۂ گدائی بھی

عبدالحمید عدم

صحنِ حرم کی اصل بھی بنیادِ سنگ ہے
یہ میری احتیاطِ تماشا کا رنگ ہے

آتا نہیں قریب ترے۔ احترام سے
مجھ کو ترے ملاپ کی کتنی اُمنگ ہے

ہنس کر ملے زمانہ، تو ہے قدر کا نشاں
مجھ کو فقط یہ تجربۂ نام و ننگ ہے

جو شے خریدیئے، وہ پرکھ کر خریدیئے
عشق ایک آئنہ ہے، خرد ایک زنگ ہے

کتنی حسیں ہیں زہرہ جبینوں کی بستیاں
گلیوں میں چاندنی ہے، دریچوں میں رنگ ہے

میرا تو ساتھ دے گا وہ کم بخت کیا عدم
اب رہنما، خود اپنی قیادت سے تنگ ہے

عبدالحمید عدم

گمراہیٔ جنوں، وہ شعورِ عظیم ہے
جو راستہ غلط ہے، وہی مستقیم ہے

ہوں گے خدا کے اور بھی اوصاف بالیقیں
مجھ کو تو صرف اتنی خبر ہے کریم ہے

تخلیق کر لیا ہے پجاری نے دیوتا
کیا لا دوا اذیتِ ذوقِ سلیم ہے

تو نے جفا تو خیر بڑی دلبری سے کی
یہ بھی مری وفاؤں کا اجرِ عظیم ہے

ہوتی ہے کہنگی سے نئے پن کی ابتدا
جو چیز بھی جدید ہے، کافی قدیم ہے

دشتِ جنوں میں گو تنِ تنہا ہوں گامزن
اندیشے سفر میں کوئی تو میرا ندیم ہے

خوشبوئے گل میں اتنی حلاوت کہاں عدمؔ
دل میں بسی کسی کے بدن کی نسیم ہے

غلام ربانی تاباں

دور لطف ساقی کا کس کو راس آتا ہے
دل کی طرح پیمانہ ٹوٹ بھی تو جاتا ہے

کیوں سجائے بیٹھے ہو انتظار کی محفل
کس کو اتنی فرصت ہے کون روز آتا ہے

اور دیکھئے کیا ہوں مرحلے جدائی کے
رات گنگناتی ہے ، چاند مسکراتا ہے

زندگی عبارت ہے حادثات پیہم سے
ربط ٹوٹ جاتا ہے، ساتھ چھوٹ جاتا ہے

بے دماغیاں میری ، کم نگاہیاں تیری
عاشقی کا ناتا بھی کیسا عجیب ناتا ہے

شوق کو مبارک ہو خونِ آرزو تاباںؔ
اک چمن جراحت کا دل میں کھلتا جاتا ہے

ظہور نظر

رنجِ ستم نہ تھا کہ ملالِ جفا نہ تھا
لیکن مزاجِ دل کبھی اتنا بُرا نہ تھا

غم صبح و شام کا نہ رہا جب تو یہ کھُلا
حاصل تھا جب یہ غم وہی اچھا زمانہ تھا

اب تک گری نہ تھی کوئی دیوارِ دوستی
میں غم کے گھر میں آج تک اتنا ڈرا نہ تھا

خود آگہی بھی میری ترے غم کی دین ہے
میں اپنے آپ سے تو کبھی آشنا نہ تھا

ہر سانس سے ہے اب مری دھڑکن کو دشمنی
وہ دن گئے کہ دل سے مرا دوستانہ تھا

دامانِ وقت میں ہیں کئی ساعتیں مری
ایسا نہیں کہ وہ کبھی میرا ہوا نہ تھا

کچھ درد دوستوں سے بھی ہوتے ہیں دستیاب
کل تک مگر یہ بات نظرؔ مانتا نہ تھا

شاعر لکھنوی

آئے طوفان کے جھونکے کیا کیا
اُٹ گئے گرد میں چہرے کیا کیا

باغ کی کوئی خبر رہی نہ ملی
جانے مہکے ہوں شگوفے کیا کیا

دور تک جن میں بچھے ہیں کانٹے
پاؤں پڑتے ہیں وہ رستے کیا کیا

میں چمن میں ہوں مگر یاد نہیں
تھا بہار آنے سے پہلے کیا کیا

راہ کا ہم کو سمجھ کر تنکا
رقص کرتے ہیں بگولے کیا کیا

جرم تھی سعیٔ تکلم پہلے
اب ہیں چُپ رہنے پہ پہرے کیا کیا

غم ہزاروں تھے جو اپنائے ہیں
پھر بھی ہیں درد کے رشتے کیا کیا

ذکرِ بیداریٔ گلشن پہ مجھے
آئے ہیں نیند کے جھونکے کیا کیا

خود کہے دیتی ہیں آنکھیں شاعر
دل میں اُبھرے ہیں سویرے کیا کیا

فضا ابنِ فیضی

زخمی چہرے، اُکھڑی تیور بستی بستی پھرتے ہیں
ہم ہیں یا کچھ درد کے پیکر بستی بستی پھرتے ہیں

شاید کوئی بُت پتھر کا روک لے آوازیں دے کر
اپنا تیشہ توڑ کے آذر بستی بستی پھرتے ہیں

جیون کا یہ روگ چھپائے کب تک ہاتھ نہ آئیں گے
زخموں کی بُو سونگھتے نشتر بستی بستی پھرتے ہیں

ہاتھوں میں پندارِ وفا کا ٹوٹا سا کشکول لئے
ایک تمہارے در کے گداگر بستی بستی پھرتے ہیں

اپنے عہد کی عُریانی سے لوگو شرم آتی ہے ہمیں
اوڑھ کے ہم زخموں کی چادر بستی بستی پھرتے ہیں

دنیا کا یہ رُوپ تو دیکھو قاتل زہر کے تاجر بھی
لے کر ہاتھ میں کوزۂ شکر بستی بستی پھرتے ہیں

اچھی بری قدروں کی پرکھ بھی ٹھیری ہے دشوار یہاں
کالے ہیرے، اُجلے کنکر بستی بستی پھرتے ہیں

اپنے شہر میں بن کر ہیں اک جلا وطن شہزادہ ہم
رُسوائی کا تاج پہن کر بستی بستی پھرتے ہیں

ایسی بھی کیا حوصلہ مندی موجوں سے ٹکرانے جائیں
سُوکھے دریاؤں کے شناور بن کر بستی بستی پھرتے ہیں

ناکردہ جُرموں کی صلیبیں خود اپنے کاندھوں پہ اٹھائے
ہم جیسے معصوم پیمبر بستی بستی پھرتے ہیں

دیکھیں اس بازار میں اپنے فن کا اب کیا دام لگے
عِلم و دانش کے سوداگر بستی بستی پھرتے ہیں

کوئلے اب صابون سے دھل کر اجلے ہو جاتے ہیں فضا
بھر کے کیا کیا رُوپ سخن ور بستی بستی پھرتے ہیں

جمیل نقوی

جانے کیسے طے ہوگا زیست کا سفر تنہا
عشق ہے اِدھر تنہا، حُسن ہے اُدھر تنہا

دل کو ڈسنے لگتی ہے شام ہی سے تنہائی
ہے اگر یہی حالت ہو چکی سحر تنہا

کتنی دل نشیں یادیں آس پاس رہتی ہیں
باوجود تنہائی دل نہیں مگر تنہا

دیکھیں کون ہوتا ہے اب رفیقِ تنہائی
گھوم کر پلیٹ آئی بزم سے نظر تنہا

یاد کے دھندلکوں میں رات یوں گذرتی ہے
جیسے جلتی رہتی ہے شمع رہگذر تنہا

گو ہجوم ہے ہر سو، زندگی کے میلہ میں
میں نے خود کو پایا ہے پھر بھی بیشتر تنہا

غم بھی اک حقیقت ہے اے جمیل سوچو تو
دل کو کیا سکوں دے گی عظمتِ ہنر تنہا

مرتضیٰ برلاس

اپنا تو بس کام یہی ہے سب کے غم اپناتے رہنا
ناخن زخمی کرتے رہنا ، ہر گتھی سلجھاتے رہنا

جانا ہے تو شوق سے جاؤ دور نگر آباد کرو
وقت ملے تو گاہے گاہے خوابوں کو مہکاتے رہنا

آج یہ جن دیواروں کو تم اونچا کرتے جاتے ہو
کل کو ان دیواروں سے پھر اپنا سر ٹکراتے رہنا

ہم ہیں وہ آواز جو گھٹ کر ساری فضا میں گونجیں گے
بعد ہمارے آوازوں کو زنجیریں پہناتے رہنا

لوگ تو تم کو بادل سمجھیں ، پانی کی اُمید کریں
اور تمہارا کام ہمیشہ پتھر ہی برساتے رہنا

ہم تو ہیں بس شام کا دیپک اول شب بجھ جائیں گے
تم ہی یارو آخر شب تک دیپ سے دیپ جلاتے رہنا

مشفق خواجہ

پھر ذہن میں اُبھرے وہی یادوں کے دُھندلکے
پھر درد سے لبریز ہوئے شعر غزل کے

پھر دل کو ملی اک غمِ تازہ کی رفاقت
بیتے ہوئے غم تازہ ہوئے رُوپ بدل کے

اک لمحۂ جاں بخش کا فیضان ہے یہ بھی
دل خاک ہوا آگ میں خود اپنی ہی جل کے

بیگانہ روی اُس کی ہے، تنہا روی میری
کیا دل کو ملا شوق کی راہوں پہ بھی چل کے

آگاہ کرے جو مرے احوال سے مجھ کو
ایسا بھی کسی آنکھ سے آنسو کوئی ڈھلکے

بکھرے ہوئے خوابوں کو سمیٹوں تو یہ سوچوں
کیوں فاصلے بڑھتے ہی گئے فکر و عمل کے

اک شخص خوش انفاس کے احسان ہیں کیا کیا
جو بات بھی ہوتی ہے سو لہجے میں غزل کے

مظفر حنفی

کیونکر ہنسی نہ آئے اس ندرتِ ادا پر
وہ جال پھینکتے ہیں اب نکہت و صبا پر

یکسر عمل سے خالی نازک خیالیاں ہیں
تعمیر ہو رہے ہیں اُونچے محل ہوا پر

ہمراز کی طرف وہ گھبرا کے دیکھتا ہے
جب اُس کو چھیڑتے ہیں ہم سرخیٔ حنا پر

تیری ہر اک ادا پر قربان جا رہے ہیں
مشکوک ہیں جو دل میں تیری ہر اک ادا پر

اب "جی حضور والے" محسوس کر رہے ہیں
مغرور ہو گیا وہ تحسین ناروا پر

کس بدسلیقگی سے بسمل تڑپ رہا ہے
چھینٹے کہیں نہ آئیں قاتل تری حیا پر

اشعار بھی مظفرؔ سر چڑھ کے بولتے ہیں
لبیک کہہ رہا ہے وہ بھی مری صدا پر

خورشید احمد جامی

لکھ گیا چہروں پہ اپنا مرثیہ
وقت بھی کتنا بڑا فن کار تھا
شب کے ویرانے میں دیوانہ کوئی
دیر تک منہ چھپا کر تکتا رہا
کون - آوازوں کی اتنی بھیڑ میں
اے نوائے دل تجھے پہچانتا
رات کی بستی سے نکلا تھا کوئی
دن کے صحراؤں میں جا کر کھو گیا
بیٹھ کر خوابوں کی جلتی ریت پر
کون طوفانوں کو دیتا ہے صدا
ساتھ ہو تم ایک سائے کی طرح
یاد ہے اک خوب صورت حادثہ
زندگی وہ طفلِ ناداں ہے کہ جو
بھول بیٹھے آج خود اپنا پتہ
پیار کے زینے پہ اک آہٹ ہوئی
درد کے پہلو سے اک شعلہ اٹھا
کچھ نہیں ہے راستوں میں دور تک
کھڑکھڑاتے خشک پتوں کے سوا
جیسے اک اک لفظ کے ماتھے پہ اب
نقش ہے جامی ہمارے نام کا

خمار انصاری

اس محفلِ جمود میں نغمہ سرا ہوں میں
گلبانگِ زندگی ہوں سرودِ وفا ہوں میں

میں چپ رہوں تو بحر کے سینے کا ہوں سکوت
بولوں تو کائنات کے دل کی صدا ہوں میں

جلتی ہوئی زمین پہ سایہ کئے ہوئے
سورج کی تیز دھوپ میں کب سے کھڑا ہوں میں

یہ بیکراں سکوت، یہ سنسان تیرگی
اپنی نوائے کرب سے خود چونک اٹھا ہوں میں

یہ ملک جس میں سوچنے والوں کا قحط ہے
میرا یہ جرم ہے کہ یہاں سوچتا ہوں میں

اے رات! اس قدر مرے بجھنے کا غم نہ کر
یہ دیکھ، تیرے ساتھ کہاں تک جلا ہوں میں

ہے صلح و آشتی مرا مسلک مگر خمار
للکارتا ہے کوئی تو پھر انتہا ہوں میں

رفعت سلطانہ

کچھ نہیں عالمِ بہار و خزاں
اپنا احساس ہو اگر نہ جواں

سفرِ زندگی نہیں آساں
ہر طرف راہ میں ہیں سنگِ گراں

تجھ کو بھی لگ گئی جہاں کی ہوا
تو بھی ہے میرے حال پہ خنداں

دور ہو جائیں دکھ زمانے کے
صاحبِ درد ہو اگر انساں

میری غیرت نے دی مجھے آواز
آ گئی بھول کر جو لب پہ فغاں

یوں فضاؤں میں ہے تری آواز
جیسے خوشبو چمن چمن رقصاں

تو اسے طنز کیوں سمجھتا ہے
میں تو حالات کر رہا ہوں بیاں

سوچنا پڑ گیا زمانے کو
مٹ کے بھی ہم نہ جب ہوئے لرزاں

وقت مجبور کر نہ دے جب تک
کون ہوتا ہے موت کا خواہاں؟

تو مری بات کا جواب نہ دے
میں سمجھتا ہوں خامشی کی زباں

زندگی کامیاب ہے اُن کی
جو ہوئے بے نیازِ سود و زیاں

مجھ کو اس کی تلاش ہے رفعت
جو مرے دل میں ہے کہیں پنہاں

مُدحت الاختر

پیاسے ہی ندی میں ڈوب گئے
سیراب جو تھے ساحل پہ رہے

دھرتی ہے کہ پیاسی ہے اب تک
بادل تو برس کر تھم بھی گئے

کنکر ہی رُوا ہے محنت کا
موتی بھی ملے تو بھیک ملے

پھر آج سمندر بے کل ہے
ہے کوئی جو اس کا زہر پیئے

صدیوں کی روایت ٹوٹ گئی
تاروں کا بھرم کھل جانے سے

نکلا ہی نہیں جیسے سورج
کہتے ہو کہ تارے ڈوب گئے

وہ روپ وہ آنگن یاد آیا
ویرانے میں جب پھول کھلے


طنز و مزاح

مختار زمن

پرکاش پنڈت

احمد جمال پاشا

ست پرم شمس شعر

سلیم فصیح احمد

یوسف ناظم

سید رضا کاظمی

حامد بردس

مختار زمن

صبحے چہ صبحے
شامے چہ شامے

صبح

"اری نصیبن! او نصیبن۔ کہاں "دفعان" ہوگئی۔ گھنٹے بھر سے کہہ رہی ہوں کہ اُبٹن غسل خانے میں رکھ دے۔ مگر کم بخت سنتی ہی نہیں" ۔۔۔ بیگم وحید نے بیزاری سے کہا۔

نصیبن پھٹی جوتیاں گھسیٹتی بڑبڑاتی، باورچی خانے سے بھاگی ۔۔۔ "اے بڑی بیگم میں کہہ تو رہی ہوں کہ سب بیبج ہُواں رکھ دیں۔ آپ جاکے دیکھیں تو۔"

بیگم وحید آہستہ آہستہ چلتی ہوئی غسل خانے میں داخل ہوگئیں۔ اور اگلے ایک گھنٹے کے لئے گھر میں امن وامان ہوگیا۔

بیگم وحید ہمارے ملک کی رہنے والی خدا کی اس مخلوق سے تعلق رکھتی تھیں جو اپنے کو "سوشل ورکر" کہتے ہیں ۔۔۔ لیکن چونکہ ہر سوشل ورکر پیدائشی لیڈر بھی ہوتا ہے اس لئے وہ دوسروں سے یہی امید رکھتی تھیں کہ انہیں لیڈر رکھیں، وہ اگر ایک طرف شاعرہ، ادیبہ اور پہنچی ہوئی مذہبی رہنما تھیں تو دوسری طرف نہایت ماڈرن لیڈی اور پارٹیوں کی جان تھیں ۔۔۔ یا سمجھی تھیں انہیں "جیسا دیس ویسا بھیس" کا مقولہ ازبر تھا اور اسی پر عمل کرتی تھیں۔ وہ نوکروں پر چیختیں تو معلوم ہوتا کہ مشین گن چل رہی ہو ان سے کم بولتیں اور بولتیں بھی تو ایسے کہ چلتے چلتے چھری کی نوک سے کچوکا لگا دیا ۔۔۔ پارٹیوں میں وزیروں سفیروں سے بات کرتیں تو ان کے ساتھ منہ سے پھول جھڑتے۔ مگر نوجوانوں کے سامنے ان کی گفتگو فاختہ کی "کوکو" سے ملتی جلتی معلوم ہوتی۔ وحید صاحب کے متعلق لوگوں کی معلومات محدود تھیں۔ صرف چند خاص آدمیوں کو یہ معلوم تھا کہ بیگم وحید کے مکان کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ اس میں جو بڈھا پڑا کھانستا رہتا ہے وہی وحید صاحب ہیں۔ ہاں بیگم وحید ترقی کرکے چراغِ خانہ سے شمعِ محفل بن گئی تھیں۔ بیس سال سے ۔۔ گویا قیامِ پاکستان کے وقت سے ۔۔۔ یہ شمع جل رہی تھی۔ مگر تیل تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا ۔۔۔

آج بیگم وحید کے یہاں "حلقے" کا دن تھا۔ اور صبح سے وہ اسی کی تیاری میں مصروف تھیں۔ چونکہ پاکستان

ایک اسلامی ملک ہے اس لئے بیگم وحید نے بھی اسلامی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ اگر یہ ملک لادینی یا اشتراکی یا عیسائیوں کا ہوتا تو حلقے وغیرہ کی ضرورت نہ پیش آتی، دوسری ضرورتیں پیش آتیں۔ بیگم وحید نے اپنے ۶۰ سالہ جسم کو خوشبوؤں میں بسایا، ابٹن لگایا، آنکھوں میں کاجل بھرا، پھڑکتا غرارہ اور پہن کرتا پہنا۔ گلے میں بیلے کے پھولوں کا گجرا ڈالا، کپڑوں پر عطر حنا ملا، اور تقدیس کی دیوی بن کر غسل خانے سے نکلیں۔ کمرے میں اگربتیاں اور لوبان سلگایا گیا اور ہر جمعرات کی طرح آج بھی بیبیاں اُن کے گھر جمع ہوئیں۔ ہر خاتون سیر سیر بھر میوہ، پستہ بادام وغیرہ اپنے ساتھ لائی۔ اور سب نے مل مل کر قُل ھُواللہ پڑھنی شروع کی۔ بیگم وحید نے یہ حلقہ اسی لئے شروع کیا تھا کہ حاجت مندوں کی حاجت روائی کا ایک سلسلہ قائم ہو جائے۔ اور اُونچے درجے کی عورتوں کو مذہب کی طرف رغبت ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ غریب غربا تو یوں بھی مذہبی ہوتے ہیں لیکن امیر لوگ مذہب سے غفلت برتتے ہیں، اس لئے ان میں مذہبی جوش پیدا کرنا ایک اسلامی ملک کے مستقبل کو سنوارنے کا موثر ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ بچھلے حال غریب عورتیں میوہ تو کیا چھٹانک بھر چنے بھی نہ لا سکتی تھیں۔ مذہب کی خاطر جب وہ اتنا بھی نہیں کر سکتیں تو بلا دم حلقے میں آنا کیا ضرور تھا!

بیگم وحید نے عورتوں سے خطاب کیا، اور انہیں بتایا کہ پڑھے ہوئے بادام اور پستے مکے شریف بھیجے جائیں گے تاکہ ہر عورت کی مُراد بر آئے۔

ان خواتین کی مرادیں بہت جائز اور عموماً حب الوطنی پر مبنی تھیں، اور ان مرادوں کا پورا ہونا پاکستان کی ترقی پر خوشگوار اثر ڈال سکتا تھا۔ مثلاً ـــ

بیگم احمد کے میاں اگر ڈپٹی سکریٹری سے جوائنٹ سکریٹری ہو جائیں تو بتایئے ملک کی خدمت کا دائرہ کتنا وسیع ہو جائے گا ـــ؟

یا بیگم ممتاز کا بیٹا اگر کُٹیانہ میمن سوسائٹی کے بانی سیٹھ محمد بھائی صالح بھائی ذکریا کی لڑکی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جائے تو کلچر اور دولت کے امتزاج سے ملک کا کتنا بھلا ہو گا؟۔ اس کے علاوہ ممتاز صاحب کا سارا قرضہ ادا ہو جائے گا۔ اور باقی بیٹیوں کی تعلیم اور بیٹوں کی شادی میں بھی آسانی ہو گی۔

بیگم وحید نے سب کے لئے دعا کی اور پھر اپنے اور اپنے بچوں کے لئے دعا کرائی۔ ڈھیروں میوہ جو ایک طرف جمع تھا مقفل کر کے رکھ دیا گیا ـــ پھر مہمانوں کو الائچی ڈال کر چائے پلوائی گئی ـــ چند پیالی چائے کے عوض اتنا ڈھیر سارا میوہ کوئی برا سودا نہیں تھا ـــ

بیگم وحید کی مذہب پرستی کی بنا پر انہیں حکومتِ پاکستان کے خرچ پر حج کرنے اور خواتین کے وفد کی لیڈری کرنے کا موقع مل چکا تھا۔ اسی حج کی بدولت انہوں نے حج سے واپسی پر عرب کے پاک اور متبرک سونے سے اپنی بیٹیوں کی شادی کے زیور بنوا لئے تھے۔

اور اسی مذہبی شغف کے ذریعے انہیں "مسجد کمیٹی" کی ممبری حاصل ہوئی تھی۔ یہ مسجد مضافات کراچی میں مہاجروں کی نئی بستی میں بنائی گئی تھی۔ بیگم وحید نے اس کی تعمیر میں نہ صرف مدد کی۔ چندہ جمع کیا، بلکہ جب مسجد بن کر تیار ہو گئی تو

ایک دن خود ہی اس پر "مسجد حمیدیہ" کی تختی بھی لگا دی! — اگر اس بہانے اُن کا نام ہو گیا تو کیا ہرج ہے۔ انہوں نے محنت بھی تو کی تھی۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے حلقہ ختم ہو گیا، اور تمام خواتین رخصت ہو گئیں۔ بیگم وحید کی بیٹیوں نے مٹھیاں بھر بھر کر میوے کی پھنکیاں لگائیں — بیگم وحید آرام کرنے چلی گئیں۔

شام

"اری نصیبن - او نصیبن - کہاں مر گئی - گھنٹے بھر سے کہہ رہی ہوں کہ غسل خانے میں میرے سارے پاؤڈر اور لوشن رکھ دے، مگر کم بخت سنتی ہی نہیں —" بیگم وحید نے سہ پہر کی چائے کے بعد شام کو ہونے والی پارٹی کے خوش آیند خیال سے سرشار ہو کر کہا۔

نصیبن ایک مرتبہ پھر بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے سے نکلی — "صبوں جلیہ - شام پالٹی — کر توڑ دی بڑھیا نے —" پھر اونچی آواز سے بولی "اے بیگم سب سیمان ٹھوان رکھا ہے - آپ جائیے — میں نے گرم پانی بھی رکھ دیا ہے"۔

بیگم وحید ایک مرتبہ پھر غسل خانے میں داخل ہو گئیں۔

جب وہ تیار ہو کر نکلیں تو ان کی وضع بالکل بدل چکی تھی۔ وہ یوں تو اب، ہمکے پیٹے میں تھیں مگر لباس کا انداز اور مذاق جوان لڑکیوں کا سا تھا — وہ لڑکیاں جو نویں دسویں کے آگے نہیں پڑھتیں۔ دیسی فلمیں دیکھتی ہیں، ہیروئینوں کے لباس کی نقل کرتی ہیں اور ننگا رخانوں میں درخواستیں بھیجتی ہیں کہ ہمیں بھی "چانس" دو۔

آج بیگم وحید نے خاص طور پر بڑے ٹھسّے سے تیاری کی تھی، اس لئے کہ امریکن سفیر کی پارٹی میں جانا تھا، جہاں بڑے بڑے وزیر، سفیر، افسر، بلیک مارکیٹر، سوسائٹی لیڈیز، سبھی آنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے سفید بالوں میں تازہ خضاب لگایا، مصنوعی بالوں کا ایک گچھا اپنی کھوپڑی پر جمایا۔ پھر اُلٹی کنگھی کر کے اُسے چھپایا، مصنوعی بالوں کی لمبی چوٹی کو اپنی چوہیا کی دُم جیسی اصلی چوٹی میں اٹکایا، اور تقریباً ایک گھنٹے کی محنت کے بعد اُن کے بالوں کی وہ مطلوبہ شکل پیدا ہوئی جو بیئے اور کوّے کے گھونسلوں کے امتزاج سے پیدا ہو سکتی ہے۔ جب ان کے دو منزلہ بال تیار ہو گئے تو پاؤڈر کو لوشن میں گھول کر چہرے کی جھریوں میں بھرا گیا۔ اوپر سے گلابی پاؤڈر کی تہہ چڑھائی گئی۔ باریک بلاؤز کے گلے کی "غیلیں" نیچی اور بلاؤز اونچی تھی۔ ہفتے میں پیٹ کی دبیز جھرّیاں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا گوشت کے سمندر میں طوفانی لہریں اٹھ رہی ہیں —

بیگم وحید کا بچپن چونکہ دیہات اور چھوٹے قصبات میں گذرا تھا اسی لئے باوجود ماڈرن ہونے کے بعض پرانی رسمیں ابھی تک سنبھالے جاتی تھیں۔ مثلاً باوجود سخت گرمی کے گہری سُرخ ساری زیب تن کی۔ ساری باندھ کر چلنے میں اب تک تکلف ہوتا تھا۔ اور اونچی ساری کے نیچے سے زرد رنگ کا پیٹی کوٹ جھانکتا رہتا تھا۔ لپ اسٹک وغیرہ لگا کر پھر پان کھا لیا۔ اس لئے کہ تنباکو کی عادت چھٹنی مشکل ہے۔

اس طرح بنک ٹنک سے درست ہو کر جب وہ پارٹی میں پہنچیں تو لوگ زیر لب مسکرائے۔ وہ زیادہ فیشن ایبل نوجوان سفارتی افسروں، با اثر سیاست دانوں اور لکھ پتی ساہو کاروں سے گفتگو کرتی رہیں ——— ماننا پڑے گا کہ بیگم وحید انگریزی نہ جاننے کے باوجود انگریزی بولنے کی جو دلیرانہ کوشش کرتی تھیں وہ قابل داد تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی انگریزی بیساکھیاں لگا کر چل رہی ہے لیکن چل تو رہی ہے۔ اور چلتی کا نام گاڑی ہے۔

بیگم وحید شراب سے متنفر تھیں لیکن شریر نوجوان لوگ جب پاکولا کے گلاس میں "جن" ملا کر پلا دیں تو وہ کیا کریں؛ پاکولا کے دو چار گلاس کے بعد اُن کی آنکھوں میں لال ڈورے پڑ گئے تھے۔ بات بات پر ہنسی آتی تھی۔ سفارتی افسروں کے ساتھ تصویریں کھنچواتے وقت وہ کھلی پڑتی تھیں ——— ان کا خیال تھا کہ شاید یہ تصویریں اگلے دن شام کے اخباروں میں آجائیں گی۔ لیکن یہ شام کے اخبار والے نہایت بیہودہ ہیں۔ جوان اور طرحدار گمنام لونڈیوں کی تصویریں تو چھاپ دیتے ہیں اور نیچے لکھ دیتے ہیں کہ "کل کی فلاں پارٹی کی ایک حسین مہمان" لیکن بیگم وحید جیسی مشہور و معروف ہستی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اپنی تصویر چھپوانے کے لئے انہیں بار بار فون کرنا پڑتا ہے۔

پارٹی بہت دیر تک جاری رہی۔ اس دوران میں بیگم وحید نے امریکی افسروں سے باتیں کر کے انہیں سمجھا دیا کہ سوشل ورکر ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ وہ امریکہ کی سیر کریں اور وہاں کے سوشل ورکروں سے تبادلۂ خیالات کریں۔ اور امریکہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیگم وحید کو دعوت دے تاکہ پاکستان سے خوش گوار تعلقات پیدا ہوں اور امن عامہ کے لئے جو خطرات پیدا ہو رہے ہیں وہ دور ہو جائیں ——— رہا پاکستان تو حکومت پاکستان کے لئے بھی لازمی تھا کہ وہ ان کے امریکہ جانے میں تمام سہولتیں مہیا کرے تاکہ وہ امریکی عوام اور خصوصاً عورتوں کو مسئلہ کشمیر سمجھا سکیں۔ غرض کہ پاکستان، امریکہ اور امن پسند ملکوں کے مقاصد ایک مرکز پر جمع ہو رہے تھے اور وہ مرکز تھا بیگم وحید ——— !

بیگم صاحبہ پارٹی میں اپنی شرکت سے مطمئن ہو کر گھر پہونچیں اور بستر پر لیٹ کر واشنگٹن اور نیویارک کا تصور کرنے لگیں کہ شاید خواب ہی میں نیویارک آجائے۔

پرکاش پنڈت

چاند کا اغوا

(ایک فینٹسی)

دنیا کی آبادی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور لوگ پریشان تھے کہ اگر یہ آبادی اسی طرح بڑھتی رہی تو ایک دن نہ صرف سر چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی، نہ صرف تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں ملے گا بلکہ اناج کے ایک ایک دانے کے لئے چھینا جھپٹی شروع ہو جائیگی۔
لوگ تو بڑھتی ہوئی آبادی کے ہاتھوں پریشان تھے ہی لوگوں پر حکومت کرنے والی حکومتیں اُن سے زیادہ پریشان تھیں۔ آئے دن چوریاں ہوتی تھیں۔ ڈاکے پڑتے تھے اور ادھر کچھ عرصے سے تو قتل تک کی وارداتیں ہونے لگی تھیں۔ بڑے غور و خوض اور باہمی صلاح مشورے کے بعد دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں نے اس مسئلہ کا حل سوچنے کے لئے ایک کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا۔
کانفرنس کئی ہفتے تک چلتی رہی۔ بڑی لمبی چوڑی اور گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ بعض حکومتوں کے نمائندے 'واک آؤٹ' تک کر گئے لیکن مسئلہ جہاں تھا وہیں کا وہیں رہا۔ کچھ حکومتوں کے نمائندوں کا خیال تھا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کو کم کرنے کے لئے ہر پندرہ بیس برس کے بعد ایک عالمگیر جنگ کرنی چاہیئے جس سے کم از کم ایک چوتھائی آبادی کم ہو سکتی ہے۔ بعض نمائندے جنگ کے خلاف اور وبا کے حق میں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جنگ میں اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے تباہ کن ہتھیار بنانے میں حکومتوں کے اربوں روپے ضائع ہو جاتے ہیں۔ جنگ اور آبادی سے بچنے کا سستا اور آسان نسخہ یہ ہے کہ جس ملک کی حکومت اپنے ملک کی آبادی کم کرنا چاہتی ہو، وہ اپنے ملک کے کسی بھی حصے میں طاعون پھیلانے والے چوہے یا ہیضہ پھیلانے والی مکھیاں چھوڑ دے۔ لوگوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی اور بڑی صفائی سے کافی آبادی کا صفایا ہو جائے گا۔ بعض نمائندوں نے ملکی چنگری کے بغیر چوکھا رنگ لانے کی رائے دی۔ ان کی گرانقدر رائے یہ تھی کہ خوشحال ملکوں کی حکومتیں ضرورت مند ملکوں کو اپنے کھانے پینے کی فاضل چیزیں قیمتاً، اُدھار یا مفت دینے کے بجائے انہیں سمندر میں غرق کر دیا کریں۔ آبادی اپنے آپ کم ہونی شروع ہو جائیگی۔ لیکن یہ تینوں ترکیبیں چونکہ کافی بار آزمائی جا چکی تھیں اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا تھا — یعنی وقتی طور پر تو چند لاکھ لوگ جنگ سے، وبا سے یا بھوک سے مر جاتے تھے لیکن پھر جلد ہی کئی لاکھ اور پیدا ہو جاتے تھے اور آبادی کا مسئلہ پہلے سے بھی خطرناک ہو جاتا تھا چنانچہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کے ان نمائندوں نے ان تجویزوں کو منظور نہیں کیا۔ انہوں نے ایک

" بڑے ملک کے نمائندے کی اس تجویز کو بھی منظور نہیں کیا کہ آبادی کو کم کرنے کے بجائے ایٹم، ہائیڈروجن، نائیٹروجن وغیرہ بموں کو ایک ساتھ استعمال کرکے آبادی کو سرے سے ہی ختم کر دیا جائے کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ حکومتوں کے نمائندوں نے اس کارآمد تجویز کو اس لئے نامنظور نہیں کیا تھا کہ انہیں بانسری بجانے کا بہت شوق تھا بلکہ اس تجویز میں دوسروں کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی موت بھی نظر آتی تھی اور آپ جانیئے وہ بڑی بڑی حکومتوں کے نمائندے ہوں یا چھوٹی سے چھوٹی ٹلڈیاں، اپنی جان سب کو عزیز ہوتی ہے۔ جب تمام نمائندے بول بول کر تھک گئے اور نتیجہ وہی نکلا جو ایسی کانفرنسوں کا ہمیشہ نکلا کرتا تھا تو صاحب صدر نے اٹھ کر کہنا شروع کیا۔

" عزیز دوستو! یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہم کسی مسئلہ کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ دراصل ہمارا فرض مسئلوں کو حل کرنا نہیں، انہیں زیادہ اور زیادہ الجھانا ہے اور میں خوش ہوں کہ اس بار بھی ہم نے بڑی کامیابی سے اپنا یہ مقدس فرض ادا کیا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ جیسا کہ آپ رحمدل دوستوں کا خیال ہے کافی اہم مسئلہ ہے لیکن یہ اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا کہ آپ حضرات سمجھتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں یہ مسئلہ چٹکیوں میں حل کیا جا سکتا ہے ... "

اس پر نمائندوں نے تالیاں بجا بجا کر پورا ہال سر پر اٹھا لیا اور ہمارے فخر کے صاحب صدر کی باچھیں کھل گئیں۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے صاحب صدر نے کہا :—

ہمارے سائنسدان اس مسئلہ کو چٹکیوں میں حل کر سکتے ہیں۔ ہمارے سائنسدان، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کیا نہیں کر سکتے؟ اگر ہمارے سائنسدان دوربین ایجاد کر سکتے ہیں کہ ہم نزدیک کی چیزوں کو دیکھنا چھوڑ کر دور کی چیزیں دیکھنا شروع کر دیں۔ اگر ہمارے سائنسدان بجلی کی مصنوعی روشنی ایجاد کرکے ہمیں باطن کی روشنی سے بے نیاز کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کے اس معمولی سے مسئلہ کو حل نہ کر سکیں۔ آخر جنگ کے تباہ کن ہتھیار کس نے تیار کئے؟"

" سائنسدانوں نے" پورے ہال نے نعرہ لگایا " چوہوں، مکھیوں اور مچھروں میں وبائیں پھیلانے کی تاثیر کس نے پیدا کی؟"

" سائنسدانوں نے" ہال نے اور بھی زور سے نعرہ لگایا " بڑے پیمانے پر بحری، بری اور ہوائی خودکشی کے لئے بحری جہاز، ٹینک اور ہوائی جہاز کس نے ایجاد کئے؟"

" سائنسدانوں نے" اس بار نمائندوں نے اس زور سے نعرہ لگایا کہ کسی بھی نمائندے کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

" تو پھر آپ ہی بتایئے۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟" صاحب صدر نے فتح مندانہ نظروں سے نمائندوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض ملکوں کے سائنسدان، جن میں میرے عظیم ملک کے سائنسدان بھی شامل ہیں بڑے اکھڑ، ڈھب اور خودسر ہیں اور اکثر اپنی حکومتوں کے احکامات کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ انہیں مطیع کرنے کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر اس مسئلہ کا حل ڈھونڈنے میں وہ کوئی عذر پیش کریں تو انھیں ان کی خواہش کے مطابق قید بامشقت جلاوطنی، یا پھانسی کی سزا دے دی جائے۔ ہم چونکہ انصاف پسند اور شخصی آزادی کے علمبردار ہیں اس لئے سزا انہیں ان کی پسند کے مطابق ہی دینی چاہیئے۔"

اور یہ کہہ کر صاحب صدر نے تالیوں کے شور میں اپنی تقریر ختم کر دی۔ نمائندے اس حتمی فیصلے سے بہت زیادہ مطمئن

اور محفوظ ہوئے اور خوشی خوشی اپنے ملکوں کو لوٹ گئے۔

اتفاق کی بات! جب ان ملکوں کی حکومتوں نے اپنے اپنے سائنسدانوں کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تو انہوں نے اس مسئلے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لی۔ فرق صرف یہ تھا کہ تقریباً تمام سائنسدان آبادی کو کم کرنے کے بجائے موجودہ آبادی کو زیادہ سے زیادہ روٹی کپڑا اور رہنے کی جگہ فراہم کرنے کے حق میں تھے اور وہ اسی سلسلے میں نت نئے سائنسی اور کیمیاوی تجربے کرنے لگے۔

ایک سائنسدان نے سوت، اون یا ریشم کے بجائے درختوں کی چھال اور گھاس پھونس سے ایسا کپڑا تیار کر دکھایا جو اصل کپڑے کو مات کرتا تھا اور قیمت کے لحاظ سے بھی اصل کپڑے سے بہت سستا تھا۔ ایک اور سائنسداں نے مٹی پانی کے بغیر ہی اپنے شیشے کے مرتبانوں میں پھلدار پودے اگا دیئے اور تھری کوئلے سے کھانڈ تیار کر دی۔ ایک اور سائنسداں کی نگرانی میں ایک ایسا مکان تیار ہونے لگا، جس کی ایک دو نہیں، پوری تین سو منزلیں تھیں اور اس مکان کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر بھی لے جایا جا سکتا تھا۔ لیکن ان تمام ایجادوں کے جملہ حقوق چونکہ حکومتوں نے اپنے نام محفوظ کر دا لئے تھے اس لئے دنیا کے لوگوں کو کیا خود ان کے اپنے ملک کے لوگوں کو بھی ان سے کچھ فائدہ نہ پہنچ سکا۔

اس سے پہلے جو سائنسداں چاند پر پہنچنے کی کوشش اور تجربے کر رہے تھے وہ اور بھی زور شور کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ چند برس میں وہ چاند پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس طرح دنیا کی کافی آبادی چاند پر آباد کی جا سکے گی۔ بڑے بڑے آلوں کے ذریعے وہ زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ ناپ چکے تھے۔ راستے کی مشکلات کا حل بھی انہوں نے ڈھونڈ نکالا تھا اور اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے تھے کہ چاند کی سرزمین قریب قریب انھیں اجزا سے بنی تھی جن اجزا کا مرکب ہماری یہ زمین ہے۔ چاند کی آب و ہوا، چاند کے دن اور رات، چاند کے موسم اور چاند کی قوت کشش کے بارے میں بھی انہیں تمام تر معلومات حاصل ہو چکی تھیں اور اب صرف ایک ایسے راکٹ کی تیاری باقی تھی جو پچاس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکے اور اسطرح صرف پانچ گھنٹے میں آدمی کو زمین سے چاند تک پہنچا دے۔ دس اور پندرہ ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑنے والے خلائی طیاروں کا ان کا تجربہ تو کامیاب بھی ہو چکا تھا۔

حکومتیں اپنے اپنے سائنسدانوں کو اس مہم کی جلد از جلد کامیابی کے لئے دل کھول کر امداد دے رہی تھیں کیونکہ حکومتوں کا خیال تھا کہ چاند پر اپنے اڈے بنانے کے بعد وہ بڑی آسانی سے مریخ، زہرہ، مشتری وغیرہ پر بھی اپنے جھنڈے گاڑ سکیں گی۔ جو ہماری اس زمین سے کہیں زیادہ بڑے سیارے ہیں۔

چاند پر پہنچنا اور وہاں آباد ہو جانا ہی کچھ کم حیرت کی بات نہ تھی کہ ایک دن دنیا بھر کے اخباروں میں ایک ایسی خبر شایع ہوئی کہ جس کسی نے اسے پڑھا یا سنا، مارے تعجب کے دم بخود رہ گیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے"؟

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

"ناممکن"

"قطعی ناممکن"

لوگوں اور حکومتوں نے اور خود سائنسدانوں نے بے یقینی ظاہر کی ــــ چاند پر پہنچا تو جا سکتا ہے لیکن چاند کو یا زمین کو یا کسی بھی سیارے کو اس کی جگہ سے ہٹانا کسی سائنسدان کے تو کیا خود اللہ میاں کے بس کی بات نہیں۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ بے یقینی ڈھل مل یقین میں تبدیل ہونے لگی۔ "ممکن ہے ایسا ہو سکتا ہو"

"دنیا میں کیا چیز ممکن نہیں"

"سائنس کی لغت میں لفظ 'ناممکن' نہیں ہے"۔

اور لوگ اور حکومتیں اور سائنسدان اس خبر کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔

خبر میں کہا گیا تھا کہ ایک سائنسدان، جسے کسی زمانے میں اس کے ملک کی حکومت نے حکم عدولی کے جرم میں ملک بدر کر دیا تھا اور ان دنوں وہ ایک گمنام جزیرے میں رہتا تھا، اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اگر اسے ضروری مدد دی جائے تو وہ زمین سے چاند پر پہنچنے کے بجائے چاند ہی کو زمین پر اُتار لا سکتا ہے۔ سائنسدان نے بڑی تفصیل اور بڑے اعداد و شمار کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ آج سے کروڑوں برس پہلے چاند ہماری زمین کا ویسا ہی ایک حصہ تھا جیسا کہ اربوں برس پہلے ہماری زمین سورج کا حصہ تھی۔ ایک طرح سے چاند کو زمین کا روٹھا ہوا بیٹا سمجھنا چاہیئے جو کسی وجہ سے روٹھ تو گیا لیکن پھر اس خیال سے کہ شاید اماں کبھی اُسے منا لے، وہ ہر وقت ماں کے گرد چکر کاٹتا رہتا ہے ــــ اس سائنسدان کا دعوےٰ تھا کہ وہ اپنے تیار کردہ آلوں کے ذریعے بحرالکاہل کے پانیوں میں اتنی زیادہ قوتِ کشش پیدا کر سکتا ہے کہ اس سے چاند زمین کے گرد اپنی گردش ترک کر کے چپ چاپ بحرالکاہل میں اتر آئے گا۔ آخر بحرالکاہل ہی تو وہ جگہ تھی جہاں سے کسی زمانے میں چاند نکل بھاگا تھا اور آخر میں اس سائنسدان نے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلہ کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس مسئلہ کا اس سے بہتر اور کوئی حل نہیں کہ دنیا کو براعظم افریقہ جتنا بڑا ایک اور براعظم دے دیا جائے ــــ اور یہ بات تو ہر سائنسدان جانتا ہے کہ چاند کا رقبہ براعظم افریقہ کے رقبے جتنا ہے۔

جس طرح بے یقینی کے بادل چھٹ گئے تھے اور اس کی جگہ ڈھل مل یقینی نے لے لی تھی اسی طرح ڈھل مل یقینی سے یقینی کی فضا تیار ہو گئی اور بڑے بڑے ملکوں کی حکومتوں نے اس سائنسدان کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش شروع کر دی۔ ہر حکومت دوسری حکومت پر سبقت لے جانا چاہتی تھی کیونکہ اب جنگ سے دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنا قریب قریب ناممکن ہو چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا ــــ جس ملک کی مدد سے چاند زمین پر اُترے گا، وہی ملک بلا شرکتِ غیرے چاند کا مالک ہوگا کولمبس نے جب پرتگال کی مدد سے نئی دنیا دریافت کی تھی تو اس پر پرتگال کا ہی جھنڈا لہرایا تھا اور پھر ہر ملک کی حکومت کا خیال تھا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کا سب سے زیادہ شدید خطرہ اسی کو درپیش تھا۔

جس ملک کی حکومت نے اس سائنسدان کو ملک بدر کیا تھا، اس نے اسے دوبارہ شہری حقوق دینے کے ساتھ ہر طرح کی مدد دینے کی بھی پیشکش کی، مگر سائنسدان نے اسے بھی ٹھکرا دیا۔ اس نے ان تمام ملکوں کی حکومتوں کی پیشکشوں کو ٹھکرا دیا جو مدد دینے کے بدلے میں اس سے چاند پر اپنے قبضے کی شرائط منوانا چاہتی تھیں۔ حکومتوں کے بجائے اس نے دنیا کے عام لوگوں سے اپیل کی کہ وہی اس کی مدد کریں کیونکہ بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ کسی ایک ملک یا قوم کا نہیں، پوری انسانی نسل کا مسئلہ ہے۔ جو شخص چاند کو زمین پر اتارنے میں جتنی زیادہ مدد دے گا، چاند کے زمین پر اُترنے کے بعد اتنی زیادہ ہی اس پر اس کی ملکیت ہوگی۔

اس سائنسدان نے جب حکومتوں کی مدد کو ٹھکرا کر براہ راست دنیا کے عام لوگوں سے مدد حاصل کرنے کا اعلان کیا اور لوگ اس کی مدد پر آمادہ نظر آئے تو حکومتوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کام لینا شروع کر دیا۔ پہلے اپنے جاسوس بھیج کر انہوں نے اس سائنسدان کو رشوت دینے کی کوشش کی۔ اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی تو اسے موت کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ جب سائنسدان نے ان گیدڑ بھبکیوں کی بھی پروا نہ کی اور برابر عوام سے مدد کی اپیل کرتا رہا تو حکومتوں نے اپنا رخ عوام کی طرف موڑ دیا۔ بڑی بڑی جہاز راں کمپنیوں کی طرف سے اعلانات شائع کرا دیئے گئے کہ اگر چاند بحرالکاہل میں اتر آیا تو نہ صرف جہاز راں کمپنیوں کے دیوالے پٹ جائینگے۔ نہ صرف کئی ملکوں کے درمیان تجارت اور آمد و رفت کا سلسلہ کٹ جائیگا بلکہ مچھلیاں اور موتی دستیاب ہونے بند ہو جائینگے اور یوں دنیا ان قدرتی نعمتوں کی کافی بڑی مقدار سے محروم ہو جائیگی۔ کچھ سائنسدانوں سے یہ بیانات بھی دلوائے گئے کہ اگر چاند زمین پر اتر آیا تو اسوقت ایسا خوفناک طوفان اور زلزلہ آئے گا کہ دنیا تہس نہس ہو جائے گی اور اگر کسی طرح دنیا اس تباہی سے بچ گئی تو چاند کی ٹھنڈک نہ رہنے کی وجہ سے زمین پر سورج کی گرمی اتنی زیادہ بڑھ جائیگی کہ سب کچھ جھلس کر راکھ ہو جائے گا۔

بڑے بڑے شاعروں کو ڈرا دھمکا کر اس قسم کی نظمیں لکھوائی گئیں کہ اگر چاند نہ رہا تو حسن کا احساس بھی نہیں رہیگا ایک چاند ہی تو ایسی چیز ہے جسے دیکھکر ہم اپنے بچھڑے ہوئے عزیز دلبر کو یاد کرتے ہیں۔ چاند میں جھانک کر ہم ان کے چہرے دیکھ لیتے ہیں۔ انہیں پا لیتے ہیں۔

بہت ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی سازشوں میں آ کر اس سائنسدان کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیتے کہ سائنسدان نے اپنے ایک ہی بیان سے اس پورے زہر کا اثر ختم کر دیا۔ اپنے بیان میں اس نے حکومتوں کی ان حرکتوں کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا اور لوگوں سے کہا کہ اگر وہ اسی طرح اپنی حکومتوں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب موجودہ آبادی کو جنگ، وبا اور ناکہ بندی سے بھی زیادہ خوفناک طریقوں سے ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ نتیجہ اس بیان کا یہ ہوا کہ لوگ پہلے تو اپنی حکومتوں کے خوف سے خفیہ طور پر اور پھر بے دھڑک ہو کر کھلے عام اس سائنسدان کی مدد کرنے لگے۔

تقریباً ہر روز سائنسدان اپنی کارگزاری نشر کر دیتا تھا کہ اب اس کے تیار کردہ آلوں میں اتنی قوت پیدا ہو گئی ہے کہ چاند کو ڈھائی لاکھ میل کی دوری سے دو لاکھ میل کی دوری پر لایا جا سکتا ہے۔

اب وہ دوری ڈیڑھ لاکھ میل تک پہنچ سکتی ہے! اب ایک لاکھ پچیس ہزار!

اور اگر لوگ اسی طرح اس کی مدد کرتے رہے تو عنقریب چاند کو اٹھارہ ہزار میل کی دوری پر لایا جا سکے گا۔ جس کے بعد چاند کی اپنی قوت کشش بالکل ختم ہو جائے گی اور وہ ایک مہینے میں زمین کے گرد چکر لگانے کے بجائے صرف ڈیڑھ گھنٹے میں زمین کے گرد پورا چکر لگانا شروع کر دے گا اور پھر رفتہ رفتہ زمین پر اترنا شروع کر دے گا اور سیدھا بحرالکاہل کی گود میں پہنچ جائے گا۔

ادھر وہ سائنسدان چاند کو زمین پر اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا اور دوسری طرف دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں اپنے اپنے سائنسدانوں کو مجبور کر رہی تھیں کہ وہ اس سائنسدان کے آلوں کا توڑ ایجاد کریں۔ چاند کو کسی صورت میں بھی زمین پر نہ اترنے دیا جائے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو غضب ہو جائے گا۔ لوگ اپنی حکومتوں سے بدظن ہو جائینگے اور عین ممکن ہے

کو بغاوت تک کر دیں۔ جن سائنسدانوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا انہیں شخصی آزادی کے ماتحت ان کی من پسند سزائیں دے دی گئیں۔

بغاوت کا خطرہ حکومتوں کو اس لئے تھا کیونکہ وہ سائنسدان اپنی روزمرّہ کی کارگزاری نشر کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو کچھ ہدایات بھی دیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے کہا کہ اگر کسی ملک کی حکومت زمین پر چاند کے اتر آنے کے بعد چاند کے علاقے پر قبضہ کرنے کے لئے لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا چاہے تو لوگ بھرتی ہونے سے صاف انکار کر دیں۔

ایک بار اس نے کسی بھی ملک کے خلاف لڑنے سے لوگوں کو منع کرتے ہوئے کہا کہ اگر ان کی حکومتیں انہیں لڑنے پر مجبور کریں تو وہ بھاگ کر چاند کے علاقے میں چلے آئیں۔ چاند کو زمین پر اتارنے میں انہوں نے کوئی مدد دی ہو یا نہ دی ہو، چاند کے علاقے میں انہیں پناہ مل جائے گی۔ اور ایک بار تو اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ چاند کو زمین پر اتارنے کے آلوں کے علاوہ اس نے بعض ایسے آلے بھی ایجاد کر لئے ہیں کہ اگر پوری دنیا کی آبادی بھی چاند کے چھوٹے سے علاقے میں چلی آئے تو وہ سب کے لئے بنیادی ضرورت کی چیزیں یعنی روٹی، کپڑا اور رہنے کو مکان فراہم کر سکتا ہے۔

دنیا کے لوگ زمین پر چاند کو اترتا دیکھنے کے لئے جتنے بے چین تھے اس سے زیادہ اشتیاق انہیں چاند کی سرزمین پر آباد ہونے کا تھا ـــــ کتنی خوبصورت ہوگی وہ دنیا جہاں جنگ ہوگی نہ وبائیں پھوٹیں گی۔ کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ ہر شخص اپنی نیند سوئے گا، اپنی نیند جاگے گا ـــ سب کو یکساں طور پر روٹی روزگار، کپڑا اور رہنے کو جگہ ملے گی۔

اور لوگوں نے اپنی حکومتوں کے احکامات پر کان دھرنا بند کر دیئے۔ ہر کسی کے کان صرف ایک ہی اعلان سننے کو بیتاب رہنے لگے کہ اب چاند زمین پر اترا چاہتا ہے۔

خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور سائنسدان کے اس اعلان سے لوگوں کے چہرے پھول کی طرح کھل اٹھے کہ آج سے ٹھیک نویں دن چاند زمین پر اتر آئے گا۔ اعلان ہونے کی دیر تھی کہ دنیا کے لوگوں نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ اپنی بڑی بڑی کوٹھیوں سے اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں سے کارخانوں اور دفتروں اور کھیتوں سے نکل آئے اور انہوں نے اپنی فالتو چیزیں ضرورت مندوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیں۔ آخر بے کار کا بوجھ اٹھانے سے کیا حاصل!

لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر حکومتیں بے حد پریشان ہوئیں کہ اگر لوگ ہی نہیں رہیں گے تو وہ حکومت کس پر کریں گی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے سائنسدانوں نے اب تک ضرور ایسے آلے ایجاد کر لئے ہونگے، جو ان کے حکم کے مطابق چاند کو زمین پر نہیں اترنے دیں گے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ خود سائنسدان بھی اپنی تجربہ گاہوں سے نکل کر عام لوگوں میں شامل ہو گئے ہیں تو ان کے غم و غصہ کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے اپنے پرانے پٹھوؤں کی طرف دیکھا اور خزانوں کے موہنہ کھول دیئے۔ لیکن اب وہ پٹھو بھی حکومتوں کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں نہیں رہے تھے، لوگوں کے ساتھی بن چکے تھے۔ آخر انسان کا ضمیر بھی تو کوئی چیز ہے۔ چاندی کے چند ٹھیکروں کے لئے آدمی کب تک اپنے بھائیوں سے غداری کرتا رہے۔ انہوں نے لوگوں سے اپنے اب تک کے تمام قصوروں کی معافی مانگ لی تھی اور انہیں حکومتوں کی چالبازیوں سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

جب لوگوں کو بس میں کرنے کی کوئی اور صورت نظر نہ آئی تو حکومتوں نے اپنا آخری حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ جو شخص بھی ملک کی سرحد پار کرنے کی کوشش کرے اسے فوراً گولی سے اڑا دیا جائے۔ لیکن کیسا حکم اور کیسی فوج؟ فوجوں کے ہراول دستے تو عوام کی صفوں میں سب سے آگے کھڑے تھے بندوقوں کے بجائے انہوں نے بچوں اور بوڑھوں

کو، بیماروں کو اور کمزوروں کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور راستوں کی واقفیت کی وجہ سے لوگوں کی رہبری کا کام سنبھال لیا تھا بس چند منٹوں کی دیر تھی اور لوگوں کے قافلے دنیا کی سب سے خوبصورت وادی کی طرف کوچ کرنے والے تھے کہ انہوں نے تعجب سے دیکھا — ان کے حاکم! جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ جنہوں نے آج تک لوگوں پر ظلم وجور سے حکومت کرنے کے علاوہ کچھ سیکھا ہی نہ تھا، سر جھکائے لوگوں کی پچھلی صفوں میں آ کھڑے ہوئے ہیں اور مارے شرم کے زمین میں گڑے جاتے ہیں لوگ اس عجیب وغریب کرشمے کو ابھی سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ ریڈیو پر سائنسدان کی آواز سنائی دی :۔

"اے دنیا کے لوگو! میری طرف سے مبارکباد قبول کرو کہ چاند مقررہ وقت سے پہلے ہی زمین پر اتر آیا ہے۔"
سائنسدان کے اس اعلان پر لوگ خوشی سے اچھلنے کودنے اور ناچنے گانے لگے۔ ہر شخص کا چہرہ چاند کی طرح چمکنے لگا۔

"اے دنیا کے لوگو! ریڈیو پر سائنسدان کی آواز دوبارہ سنائی دی "تم لوگ چاند کی سرزمین پر پہنچنے کے لئے بے تاب ہو گئے — اور تم لوگوں کی بے تابی ٹھیک بھی ہے کیونکہ آج تک تم لوگ ایک ایسی دنیا میں رہتے رہے ہو جہاں سوائے دکھ اور تکلیفوں کے تمہیں اور کچھ ملتا ہی نہیں تھا۔"

ذرا دیر کے لئے رک کر سائنسدان نے پھر کہنا شروع کیا "لیکن آج سے تمہارے سب دکھ درد، تکلیفیں اور مصیبتیں ختم ہو جائینگی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ تم اسی طرح مل جل کر رہ سکو۔ تمہاری اس زمین میں، جس پر تم رہتے ہو، اتنی زیادہ دولت دفن ہے کہ اگر تم آپس میں مل جل کر اسے ڈھونڈھ نکالو تو موجودہ آبادی سے سیکڑوں گنا زیادہ آبادی اس دنیا میں سکھ چین سے رہ سکتی ہے وہ ہزاروں میل لمبے علاقے جو صدیوں سے اجاڑ اور بنجر پڑے ہیں، تم انہیں لہلہاتے کھیتوں میں بدل سکتے ہو۔ اپنے سائنسدانوں اور انجنیئروں کی مدد سے تم دریاؤں کا رخ موڑ سکتے ہو۔ علاقوں کی آب وہوا تبدیل کرسکتے ہو اور ان کاموں کے لئے تمہیں اتنے زیادہ لوگوں کی ضرورت ہوگی کہ تمہیں آبادی کی کمی کا افسوس ہونے لگے گا"۔

لوگ حیران تھے کہ سائنسدان چاند کی بات کرنے کے بجائے یہ کیا اوٹ پٹانگ قصہ لے بیٹھا ہے کہ سائنسدان نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "چاند بجز اس کا ہل میں نہیں اترا، تم نے اور میں نے مل کر اسے دنیا کے ہر علاقے میں اتار دیا ہے۔ آسمان کا چاند تو ہمیشہ آسمان پر چمکتا رہے گا"۔

اور یہ کہکر سائنسدان خاموش ہو گیا۔



احمد جمال پاشا

طلسماتِ اُلّو

وہی ہوتا ہے

جو منظورِ خدا

ہوتا ہے

(پیروڈی)

جادو کی اس کتاب میں اُلّو سے جو دراصل ایک طلسماتی پرندہ ہے اور جس کی عقل مندی اور نحوست مسلّم ہے۔ ہر طرح کے شعبدہ جات حاصل کرنے کے اصولوں کا نچوڑ یکمشت پیش کر دیا گیا ہے۔ اور بہت سے مجرّب، تیر بہدف ٹونے، ٹوٹکے اور چٹکلے بھی شامل ہیں۔ ساتھ ہی اُلّو کی نحوست اور سوتے جاگتے اس کو دیکھنے کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔

مؤلف و مرتبہ:-

استاد بیدا لعلی خاں بقلم خود

ضروری نوٹ:- اگرچہ اس قسم کے عملیات اور سفلیات سراسر خلافِ عقل اور قیاس ہیں۔ مگر پھر بھی پرانی عملیات کی کتابوں میں بکثرت پڑھے ہیں اس لئے شوقین حضرات کے لئے ان کا عطر پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر خیال رہے کہ ہر معاملے میں عامل ہی ہر طرح ذمہ دار ہوگا۔ اور ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ ناشر

شعبدہ یا ٹوٹکا

پیدائش سے قبل ہی سے مجھے طلسمات اور شعبدہ بازی کا شوق تھا۔ شروع شروع میں تو ہاتھ کی صفائی اور تاش کے پتوں تک ہی معاملہ محدود رہا، لیکن بعد میں ایک کامل اُستاد کی رہنمائی میں مجھے حیرت ناک طلسمات سیکھنے اور کرنے کا موقع ملا۔ اور خدا کے فضل و کرم سے اس میں کما حقہٗ کامیابی حاصل کی۔ یقیناً چراغ سے ہی چراغ جلتے ہیں، اس لئے مجھے امید ہے کہ میرا ہر عمل جو میرا آزمایا ہوا ہے اور ساری عمر اس فن سے روزی حاصل کی ہے اور یہ سچ مچ کے عمل ہیں نہ کہ محض نقل بازی۔ ان سے راہ چلتا تک بلا تکلف فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ شرائط پر عمل واقعی کیا جائے پھر شعبدہ یا ٹوٹکا غلط ثابت ہونے کی میری ذمہ داری۔ یہ دعویٰ اس لئے بھی دلیل کا محتاج نہیں کہ میرا اور اُلو کا جتنا ساتھ رہا ہے۔ شاید ہی کسی اُلو کا آپ کا اتنا ساتھ رہا ہوگا۔ اس لئے میں اس کے طلسم سے اتنا واقف ہوں۔ فقط، خادم بیدل علی

طلسماتِ اُلو

سنگدل معشوق قدموں پر لیٹے دشمن دوست بن جائے

پلید نماشی کی شام کو اُلو کو اس طرح پکڑیے کہ اس کے بدن سے خون نہ نکلے، اس کو ذبح کرکے داہنی آنکھ اور جگر نکال لے، پھر دونوں اشیاء کو تعویذ بنا کر حمائل گلو کرکے دشمن کے سامنے جائے۔ وہ مہربانی اور الطاف سے پیش آئے، مقدمہ واپس لے لے۔ فوجداری کا خیال دل سے نکال دے۔

اُلو کے پروں کا، کاجل لگا کر نیک ساعت میں مطلوب کے سامنے جائیں۔ چشم زدن میں معشوق بے تاب و بے قرار ہو کر گرفتار عشق ہوگا۔ مجرب ہے۔

دو لوگوں میں عداوت کرا دو۔

اُلو کو جال لگا کر یا اُس کو نشہ کھلا کے گرفتار کرے۔ اور پھر جب اُلو تندرست ہو یعنی نشہ وغیرہ سے باہر ہو، اُس وقت اسے ذبح کریں۔ اور جن کے درمیان عداوت کرانی ہو، ان دونوں کے کپڑوں کے ٹکڑے اس کے خون میں رنگ لیں، اور پھر سکھا کر جلا ڈالیں، اور راکھ فریقین میں سے کسی ایک کے سر پر چھوڑ دیں۔ دونوں میں لڑائی ہو جائے۔ تا عمر صلح نہ ہو سکے۔

امتحان میں کامیابی ہوگی

اُلو کو عطارد کی ساعتوں میں ذبح کریں، اور اس کا دماغ سائے میں سُکھایا جائے۔ ایک ہفتہ بعد خشک ہو

جائے تو چالیس دن تک تاروں کی چھاؤں میں رکھیں، پھر اسے روغن زیتون میں ڈال دیں۔ وہ تیل پیشانی میں چپڑ کر امتحان ہال میں جائیں۔ دماغ برابر چلے گا۔ پرچے اچھے ہوں گے "بوطیقا" اور "اردو شاعری پر ایک نظر" فٹا فٹ سمجھ میں آئے گی۔ نقل کیجیے، تو کوئی پکڑ نہ پائے گا۔ اور امتحان میں کامیابی ہوگی۔

علمی ادبی بحث میں کامیابی ہوگی

اُلّو کا بھیجہ سُکھا کر گائے کے اصلی گھی میں حل کر کے سر پر لگا کر کسی بھی علمی ادبی محفل میں شرکت کریں سامنے والے کی زبان تالو سے لگ جائے گی اور آپ مثل بلبل کے چہکتے رہیں گے۔ الّو کا دماغ استعمال کرنے کے بعد اگر تبصرہ کرنے بیٹھا جائے تو بلا کتاب پڑھے ابھی سے اچھی تصنیف کے پُرزے اُڑائے جا سکتے ہیں۔

مکان خالی کرالو

کرایہ دار سے مکان خالی کرانا ہو تو اُلّو کو سالم ذبح کر کے اُس کو مکان کے کسی بھی حصے میں دفن کر دیں۔ کرایہ دار خود بخود مکان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ سالم اُلّو کسی یتیم خانے یا کلاس میں ہرگز بھی دفن کرو، ورنہ یتیم اور لڑکوں کا ٹھکانہ نہ رہے گا۔ اور تم پر گناہ پڑے گا۔ جمی جمائی دوکان اور کارخانے کے لئے بھی یہی حکم ہے۔

عورت کے دل کا حال جان لو

کسی نیک ساعت میں اُلّو کا دل عورت کے سینے پر رکھ دیں، جب وہ گہری نیند سو رہی ہو۔ خواب میں برابر بڑبڑائے گی، اور اپنے دل کا سارا راز اُگل دے گی۔

نوٹ:- یہ عمل ۲۰ سال سے کم اور ۹۰ سال سے زیادہ عمر کے مرد پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

پورا گھر میدانِ جنگ بن سکتا ہے

اگر قمری مہینے کی آخری تاریخوں میں کسی دشمن کے گھر میں اُلّو کے بال الگ الگ بکھرا دیئے جائیں تو اس کا ایک ایک فرد ایک دوسرے کا دشمن بن جائے گا۔ کوئی کسی کا اعتبار نہ کرے گا، نہ کسی کی سُنے گا۔ اگر یہ عمل گھر کے بجائے میدانِ جنگ میں کیا جائے تو اقوام متحدہ تک جنگ بندی نہیں کرا سکتا۔ معشوق سے عاشق کا دل کھٹا کرانے کے لئے یہ عمل مجرب ہے۔

پوشیدہ خزانے نظر آئیں

سایہ میں اُلّو کا کلیجہ سکھا کر بھوج پتر میں لپیٹ کر لال ریشم کے کپڑے میں تعویذ بنا کر سفید مرغ کے گلے میں لٹکا دیں۔ جس جگہ مال دفن ہوگا وہیں مرغ رک کر بانگ دے گا۔ بس وہیں کھودنے پر دفینہ نکل آئے گا۔

محبت کا ایک آسان ٹٹکہ

سفید آک کی جڑ، ہڑتال اور اُلّو کا خون ایک انگلی کے خون کی بوند میں حل کر کے ماتھے پر تلک لگاؤ اور محبوب کے سامنے سے گذرو۔ محبوب دل و جان سے دیوانہ وار عاشق ہو جائے گا۔ حاکم اور ماسٹر بھی اسی عمل سے مہربان ہو وے اور بگڑے ہوئے کام بن جائیں۔ حب کا بے نظیر ٹوٹکہ یہ بھی ہے کہ اُلّو کے خون کی راکھ کا سرمہ لگا کر سنگدل محبوب کے سامنے جائیں۔ کامیابی کی سو فی صدی گارنٹی۔

دشمن پاگل ہو جائے گا

اُلّو کی زبان اتوار کے دن زعفران اور دھتورے کے بیج کے عرق میں ملا کر کسی طرح دشمن کو کھلا دیں۔ کھلانے سے پہلے دل ہی دل میں " یَا حِزْدَائِیْلُ " سو بار پڑھ کر دشمن پر دم کر دیں۔ دشمن کی عقل زائل ہو جائے اور پاگل کہلائے۔ یک یک میں ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر کو مات کر دے، اور جگہ جگہ خوار ہو۔

مرگی دور کریں

اُلّو کے ذریعے علاج معالجہ حیرت انگیز حد تک مفید ہوتا ہے۔ اُلّو کے جسم کا کوئی ایسا حصہ نہیں جو کسی نہ کسی بیماری کو دور کرنے میں طلسم کا کام نہ کرے۔

اُلّو کے ناخنوں میں مٹی کی ایک موٹی تہہ جمی رہتی ہے۔ یہ مٹی حیرت انگیز طلسماتی اثر رکھتی ہے۔ اس کو چاندی کی ڈبیا میں رکھ لو۔ دورہ پڑنے پر نسوار کی طرح سونگھو۔ دورہ ختم ہو جائے گا۔

سانپ بچھو ڈسنے پر

اُلّو کے پتے کے پاؤڈر کو بھینس کے گرم دودھ میں ملا کر مار یا گزدم گزیدہ کو پلا دیں۔ اگر سانپ کا کاٹا ہے تو اس کو چالیس دن تک زہر کے توڑ کے لئے یہ دودھ پلایا جائے۔ زہر اُتر جائے گا۔ زہریلے سیاسی حریفوں اور ساس بہو کے لئے بھی مجرب ہے۔

بے موسم کے پھل کھائیے

اگر خواہش ہو کہ بے موسم کے پھل کھانے کو ملیں تو ایک کانسی کی تھالی لیجئے اس میں سیانے گورخر کا دودھ چاندنی میں بھر کر رکھ دیجئے۔ صبح کو اس کا دہی بنا لیجئے۔ دہی سے مکھن نکالئے اور جس پھل کا دل چاہے اس کا نام لے کر مکھن میں اُلّو کا انڈا ڈال دیجئے اور تھالی بند کر کے کھولئے۔ پھل موجود ہوگا۔ مگر یہ پھل خود کھائیے یا غریب میں بانٹئے مگر اسے بیچنے کی کوشش نہ کیجئے ورنہ نقصان ہوگا۔

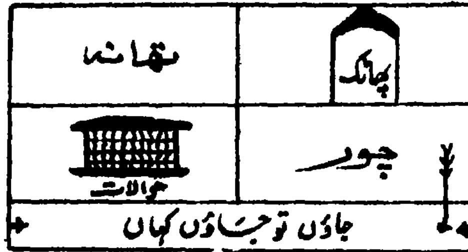
تیرتے میں تھکن نہ ہو

اُلّو کے پَر اور کھال ایک تھیلی میں سی کر کمر سے باندھ کر تیرنے سے جو تیرنا نہ جانتا ہو وہ بھی تلاطم دریا میں پار کر جائے گا۔ اس تھیلی کے سہارے سمندروں میں بھی مسلسل پیرا جا سکتا ہے۔ قطعاً تکان نہ ہوگی۔

چور گرفتار ہو جائے گا

چاند گرہن کے دن جس وقت گرہن جاری ہو۔ بیری کے کانٹوں کی راکھ، اُلّو کی بیٹ، اُلّو کا خون اور کٹی بیری کے پتوں کا عرق ہم وزن لے کر روشنائی بنالیں، اور مندرجۂ ذیل نقش گھر میں کسی پاک جگہ پر دفن کردیں۔ چور گھر میں گھستے ہی پکڑ لیا جائے گا۔ روپیہ پیسہ لاکھ کھلا رکھا رہے کوئی نظر نہ کرے۔ چوکیدار رکھنے یا کتا پالنے کی ضرورت نہ پڑے۔

نقش یہ ہے



جیسی شکل چاہو تبدیل کرلو

ایک عامل نے چشم دید واقعہ بیان کیا ہے:

اُن کو ایک سنسان سڑک پر ایک تیس سالہ خوش پوشاک نوجوان ملا۔ اور ان کو دیکھتے ہی سیاہ سانپ بن گیا۔ پھر ایک خوف ناک دیو بن گیا۔ پھر سادھو بن گیا۔ اس کے بعد بھالو بن گیا۔ آخر میں اُلّو بن کر پھر سے اُڑ گیا۔ عامل اسے زندگی بھر تلاش کرتا رہا۔ اور ۵ سال بعد اُنہیں اُلّو کے جادوئی کرشمے سے ایک بلیک مارکیٹیر کی اصلی شکل میں مل گیا۔ اس کا عمل یہ ہے:۔

اُلّو کی ہڈی کے نوکیلے پن میں اُلّو کے تازے خون کی سیاہی بھرلو، اور یہ تحریر کرو:

"ساوتیر کالرگے کیو لا ریا یام"

اس شبدہ سے دس سال مشق کے بعد پلک جھپکتے میں جس جگہ چاہو بلا ٹکٹ کے پہنچ جاؤ۔ اس عمل کو اکثر ٹکٹ چیکر کا استعمال کرتے ہیں اور محفوظ رہتے ہیں۔

عالم فاضل ہو جاؤ

عالم فاضل ہونے کے لئے لکڑی کو جلا کر کوئلہ بناؤ۔ اس آگ پر شیشے کا ایک برتن رکھ دو جس میں اُلّو کا مغز ڈالو۔ جب تک دماغ خاک نہ ہو جائے یہ منتر پڑھتے رہو۔ یاد رہے کہ یہ منتر ہندی کا ہے :-

"کشند چیدرا اجاناستی آ"

جب شیشے کا دماغ کوئلہ ہو جائے تو اس میں ۶ ماشہ گل سوسن کا پانی ڈال دیں۔ لیجئے یہ ایک طرح کی روشنائی تیار ہو گئی۔ اب اس روشنائی سے نیک ساعت، نیک دن، نیک تاریخ کو رات کے وقت مندرجہ ذیل نقش تحریر کر کے موم جامہ کر کے حمائل کر لیں۔ اور پھر اُلّو کے طلسمات ملاحظہ کریں۔

نقش یہ ہے :

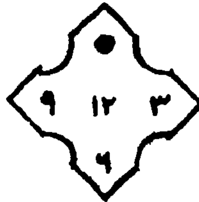
۲۰	۲	۴	۲۰	۵۰
۵۰	۵۰	۵۰	۷	۵۰
۲	۵۰	۵۰	۵۰	۵۰
۵۰	۵۰	۵۰	۵۰	۵
۵۰	۲	۲	۵۰	۲

کبھی نہ ختم ہونے والا طلسمی آٹا

سات دریاؤں کا پانی لو، اس میں سات قسم کی مٹی، کنکر، پتھر اور چاک یعنی کھریا مٹی ڈالو، اس میں اُلّو کی خاک رکھ کر گوندھ لیں، آٹا تیار ہو جائے گا۔ اس آٹے کی روٹیاں اگر سارے شہر کے محتاجوں کو بھی کھلاؤ تو آٹا کبھی ختم نہ ہوگا۔

نوٹ :- غلہ فروش اور راشن کی دوکانوں والے ہرگز ہرگز طلسمی آٹا نہ تیار کریں، ورنہ نقصان اٹھائیں گے

محبت کے لئے بے خطا طلسمات



اگر یہ نقش نیک نیتی کے ساتھ پُر کریں تو طلسم کی خوبی سے سنگدل معشوق قدموں پر آگرے اور مطیع و فرمانبردار

رہنے یعنی شادی کے بعد امور خانہ داری میں بھی دلچسپی لے اور ساری عمر خدمت گزاری کی آرزو کرے۔ نقش الّو کی کھال پر گدھی کے دودھ سے تحریر کریں اور دودھ چھان کر محبوب کو پلا دیں۔

ریس میں گھوڑا اوّل آئے

گھنی ہوئی بھنگ اور پسی ہوئی ہلدی سے اُلّو کی صاف کھال پر ایک مسلّم گھوڑا بنایئے اور جب ریس کا وقت قریب ہو تو بیلچے کے سبز رنگ کے ڈورے سے گھوڑے کے گلے میں باندھ دیں تو وہ گھوڑا اوّل آئے گا۔ آزمائی ہوئی ترکیب ہے۔ ڈربی والے ہمیشہ یہ تعویذ پھسڈی گھوڑے کے باندھ کر زیادہ سے زیادہ رقم اور نام کما لیتے ہیں۔

دن میں تارے نظر آئیں

چھٹانک بھر اُلّو کے بازو کے پر کھرل کر لیں، پھر اسے تین چھٹانک شوربے کے تیزاب میں حل کر دیں۔ پھر تھوڑا سا نمک کا تیزاب ملانے کے بعد اس میں سیر بھر پانی ملا دیں۔ اور ایک کانچ کے برتن میں دن بھر پڑا رہنے دیں۔ اس پر تین دن تک تھوڑا تھوڑا پانی ڈالتے رہیں۔ تیزاب کا اثر زائل ہونے پر اُلّو کے پروں کے رنگ کا جوہر نکال لیں، اور اسے ایک شیشی میں محفوظ کر لیں۔ اس سرمہ کی ایک سلائی اگر دن میں بھی لگا لیں تو دن کو تارے نظر آجائیں ورنہ کچھ نہ نظر آئے گا۔ اس سرمے کی تجارت بھی کی جا سکتی ہے۔ جوتشی اور نجومی بہت خریدیں گے۔ مالا مال ہو جاؤ گے۔

گھر بھر میں سانپ نظر آئیں

اگر سانپ کی کینچلی کو اُلّو کے پر سے لگا کر چراغ کی بتی میں پیسٹ کر جلائیں تو جہاں تک روشنی ہو سانپ ہی سانپ نظر آئیں۔ کرایہ دار سے مکان خالی کرانے کے لئے بہت منہ زور نسخہ ہے۔

سارے گھر میں پانی ہی پانی نظر آئے

بھیڑیئے، مچھلی اور اُلّو کی چربی ملا کر اس کا چراغ جلائیں، تو روشنی سے گھر بھر میں پانی ہی پانی نظر آئے گا بائیسکوپ بنانے والوں کے لئے بہترین چٹکلا ہے۔

لڑائی کرا دو

ساہی ایک چھوٹا سا جانور ہوتا ہے۔ اس کا کانٹا بہت بڑا سا سیاہ و سفید ہوتا ہے۔ اگر اس کا کانٹا اُلّو کے جسم سے چھوا کر کسی کے گھر میں دفن کر دو تو گھر کے لوگ آپس میں لڑتے رہیں گے۔

اگر مختلف سیاسی پارٹیوں کے متحدہ محاذ ــــ یا اپنے خلاف محاذ ہو ــــ تو اس کو ختم کرنے کے لئے یہ ٹونا مجرّب ہے۔

اندھیرے میں سُوئی ڈھونڈ لو

اُلّو کے سر اور بال لے کر ہموزن کھرل کر لیں ۔ پھر دونوں چیزیں انسانی سر کے کاسے میں تیل ڈال کر ملائیں ۔ اُس میں ایک سادی سفید روئی کی بتی ڈال کر چراغ روشن کر دیں ۔ اس چراغ سے کاجل تیار کریں ۔ اُسے آنکھ میں ڈال کر اندھیری رات میں بلا ٹارچ کے صاف نظر آئے ۔ آپ کی آنکھیں اُلّو کی طرح چمکیں اور سوئی تک مل جائے سوائے انسانیت اور انصاف کے ہر چیز نظر آئے ۔

نیندیں اُڑا لو

اکثر ایسے معاملات درپیش ہوتے ہیں کہ نیند آنے سے بنے بنائے کام بگڑ جاتے ہیں ۔ ایسی صورت میں ایک اُلّو ذبح کریں مگر احتیاط رہے کہ اس کی ایک آنکھ کھلی رہے ۔ اب کھُلی آنکھ خشک کر کے پاکٹ میں رکھ لیں ۔ جب بھی اپنے پاس رکھیں گے جاگتے رہیں گے ۔ اور جُدا کرتے ہی نیند آجائے گی ۔ خاص بات یہ کہ اس کا استعمال ہرگز ہرگز صحت پر اثر نہیں کرتا بلکہ مقوی دل و دماغ ہے ۔ اس کے عام استعمال سے ایک ماہ متواتر رت جگا ممکن ہے ۔

نوٹ :- چور اور ڈاکو اگر اس عمل سے فائدہ اٹھانا چاہیں گے تو ناکامی ہوگی ۔ یہ عمل صرف نیک کاموں کے لئے تاثیر رکھتا ہے ۔

منگنی حسبِ مرضی ہو جائے

منگنی پر رضامندی نہ ہونے کی صورت میں لڑکی یا لڑکے والا مندرجۂ ذیل نقش کو اُلّو کے خون سے بھوج پتر پر تحریر کرے اور پھر نقش کو ٹوپی میں رکھ کر لڑکی والوں کے یہاں جائیں تو نسبت ہو جائے :-

۱۱　۱۸　۱۱　ط　۱۱　۱۱　۵　۲۴　۱۱　۱۱

۱۱　نام کا محمد　۱۱　۱۱　ط　۸　کہ　۱۱

نوٹ :- دوکان یا مکان کی پگڑی بھی اسی عمل سے طے ہو سکتی ہے ۔

روزگار مل جائے گا

اگر اتفاق سے کوئی بے کار ہو، روزگار کی صورت نہ ہو تو نجومی یا جنتری سے سورج گرہن معلوم کرے ۔ گرہن سے ۳۹ دن قبل سے گوشت، پیاز، لہسن اور انڈا مچھلی سے پرہیز کرے، اور روزانہ چھ سو اکیاون بار مندرجۂ ذیل اسماءِ گرامی پڑھے :-

" یاہو ـــ ہو یا ـــ ہو ہو "

اور پھر جب چالیسواں دن، یعنی چاند گرہن کا دن ہو تو انہیں کلمات کو اُلّو کے خون سے تحریر کرے، اور اپنے ساتھ رکھے روزگار مل جائے گا۔

لیکن جرائم پیشہ اسے آزمانے کی کوشش نہ کریں ورنہ اُلٹے پھنس جائیں گے۔

دشمن کو تباہ و برباد کرنے کے لئے

اگر اُلّو کے دونوں پاؤں کسی منحوس ساعت میں دشمن کے گھر کسی بھی حصّے میں دفن کر دیں۔ اس گھر میں تباہی و بربادی اپنا ڈیرہ جمالے اور جب تک وہ پاؤں موجود رہیں گے بربادی ہوتی رہے گی۔

حاکم تسخیر ہو جائے گا

اُلّو کے قلم سے اپنے ماتھے یعنی پیشانی پر "آ آ و ل ل لو" لکھ کر حاکم کے پاس جائیں، وہ مطیع ہوگا۔ کام بنیں گے۔

لوگوں کے لباس اُتر جائیں

اگر اُلّو کی آنکھوں اور خراطین کو پیس کر سرخ کپڑے میں فلیتہ کریں اور چراغ جلائیں تو مدرشنی میں سب برہنہ نظر آئیں۔ ٹیڈیوں کی مصیبت ہو جائے۔

معشوق قبضے میں آجائے

کامروپ جادوگر جوگی نے لکھا ہے کہ: "میں نے جب بھی کسی عشق کے مارے کو یہ جنتر بتایا تو وہ سو فی صد کامیاب ہوا۔" اس جنتر کو چمگادڑ کے خون سے ہرن کی کھال پر اُلّو مار کر قلم سے لکھیں، پھر انجیر کے پھل دار درخت پر کسی شاخ سے لٹکا دیں۔ اور جنتر کی تاثیر دیکھیں۔

جنتر یہ ہے:



عاشق کا نام .... پریمیکا کا نام

اُلّو۔ اس میں شک نہیں کہ اُلّو ایک بالکل منحوس پرندہ ہے۔ سوتے جاگتے، گھر یا ہوا میں اس کو دیکھنے سے

(باقی صفحہ ۴۱۲ پر)

ڈاکٹر ستیہ پرکاش سنگر

تو بھی احمق ہے!

نیویارک کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے اُسے پیاس لگی تو اُس نے ایک ریستوران میں جاکر کوکا کولا مانگا۔ بوتل ختم کی تو اس کی تہہ میں ایک مُردہ چوہیا پڑی تھی۔ پہلے تو اُسے خیال آیا کہ یہ نقلی قسم کی چوہیا ہے۔ امریکی کوکا کولا میں اس قسم کی بات کا ہونا ایکدم عجیب اور ناقابلِ یقین تھا۔ یہ نقلی چوہیا بوتل کا حصہ تھی۔ آخر امریکی اور ہندوستانی ——— کوکا کولا میں۔۔۔ کچھ تو فرق ضرور ہوگا۔ لیکن اس نے بغور دیکھا۔ وہ سچ مچ چوہیا تھی۔ اُس کا اثر بوتل کے پانی میں ضرور ہوگا۔ اُس نے زہر پیا تھا۔ اُسے اُبکائی آنے لگی۔ اُس نے ریستوران کے رجسٹر میں شکایت درج کرائی اور اپنا نام اور پتہ لکھا۔ ریستوران کا نام اور پتہ اپنی نوٹ بک میں لکھا اور گھر واپس آگیا۔

گھر یعنی کرائے والے کمرے میں واپس آکر وہ پھر اس معاملے پر غور کرنے لگا۔ وہ یہاں ایک سال کے لئے وظیفہ پر آیا تھا۔ یہاں آنے کے لئے اُسے کس قدر تگ و دو کرنی پڑی تھی۔ دلّی جاکر کلچرل سفارت خانہ کے چکر کاٹنے پڑے تھے۔ وہاں پر کام کرنے والے دیسی صاحبوں کی خوشامد کرنی پڑی تھی۔ انہیں خوش کرنے کے لئے کئی تدابیر اختیار کرنی پڑی تھیں۔ امریکہ کو وہ دنیا کے سبھی ترقی یافتہ ممالک سے خوشحال تر جانتا تھا۔ امریکی تہذیب کا وہ دلدادہ تھا۔ انگریز کے چلے جانے کے بعد اب امریکن ہی صاحب تھا۔ دوسرے ملکوں کے بہت کم لوگ ہندوستان میں نظر آتے تھے۔ انہیں اپنے ملک میں بہت کام تھے۔ یہاں آکر کیا بھاڑ جھونکتے لیکن امریکی خود کو خوشحال بنا چکے ہیں۔ اب وہاں کرنے کے لئے کام ہی کیا رہ گیا ہے؟ انگریز ہندوستان میں صدیاں تیاگ کر بھی اُسے پوری طرح مہذب بنانے میں ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ محض اپنی تہذیب کا پرچار کرنے اور ملک کو لوٹنے میں مشغول رہا۔ اُس کے اندر حکومت کی بو گھر کر چکی تھی۔ وہ جذبۂ برتری کا بُری طرح شکار تھا۔ دوسروں سے ملنا جلنا تک پسند نہ کرتا——— ہندوستان میں رہ کر، یہاں سے روزگار کمانے کے باوجود، وہ ہمیشہ یہاں کے لوگوں سے علیحدگی اختیار کئے رکھتا۔ اُسے ہر وقت ملک کو لوٹنے کی فکر دامن گیر رہتی۔ پہلے اُسے غلام بنایا، بعد ازاں اُسے تباہ کرنے میں جُٹ گیا۔ لیکن نئے صاحبوں میں کس قدر فرق ہے! یہاں سے پیسہ لے جانے کے بجائے وہ ہمیں کروڑوں نہیں؟ اربوں روپیہ دیتا رہا ہے۔ ہمیں لوٹنے کے بجائے خود لُٹتا رہا ہے۔ قرضہ دے رہا ہے۔ ہماری عزت بنائے رکھنے کے لئے وہ ہم سے سُود ضرور وصول کر رہا ہے۔ لیکن اس کے بدلے میں اپنے کلچر کا مفت پرچار کر رہا ہے۔ ہمارا نوجوان، اُس کلچر کے اتنے مفید پہلوؤں کو ٹھکرانے کے

ساتھ اپنے کلچر کا حصہ مان رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یورپ اور امریکہ کے مشنری اس دقیانوسی ملک کے لوگوں میں عیسائیت کا پرچار کرنے اور انہیں عیسیٰ مسیح کی بھیڑوں میں شامل کرنے کے لئے اپنی زندگی صرف کر دیتے۔ یہاں کے لوگوں کو نیا ایمان دیتے اور اپنے لئے جنت میں عمدہ سیٹیں ریزرو کرا لیتے۔ آج رُوپ بدل گیا ہے۔ دھرم کی جگہ کلچر نے لی ہے۔ اِسے پھیلانے کے لئے ملک کی یونیورسٹیوں میں مضبوط اڈّے بن گئے ہیں۔ وہ دن لد گئے جب یہاں کے لوگ انگریز کی چاپلوسی کرنے میں ایک دوسرے کو مات دیتے تھے۔ اب ہماری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہماری ترقی یافتہ یونیورسٹیوں میں سیمینار ہوتے ہیں۔ اُن پر دل کھول کر پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ہندوستانی طلباء اپنے دل کے ظلمت کدوں کو کلچر اور تہذیب کے نور سے منوّر کرتے ہیں۔ امریکی کلچر اور سیاست اور تواریخ کے بارے میں بیش بہا قیمتی باتوں کو سیکھتے ہیں۔ ہمارے پروفیسران اس قسم کے سیمیناروں میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ مہینوں اس کے لئے تیاری کرتے ہیں۔ رات کو شاندار ڈنر ہوتا ہے۔ وسکی کے دور چلتے ہیں۔ برسوں سے کھادی پہننے کے عادی پروفیسران اُس دن سوٹ میں ملبوس ہو کر آتے اور پیگ پر پیگ چڑھاتے ہیں۔ چائے اور گنّے کے رس پر زندگی بسر کرنے والے کالجوں کے یہ اساتذہ شیمپئین پی کر سرور حاصل کرتے ہیں۔ امریکی تہذیب کے گُن گاتے ہیں۔

اُس کا امریکی تاریخ پڑھانے والا پروفیسر اُس پر مہربان تھا اور اُسی کی عنایت سے وہ وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ جو پروفیسر کلاس میں بھارتیہ سبھیتا کے گُن گایا کرتا تھا وہ اُس رات ہندوستانیوں کی بدخوئی کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ڈنر کے دوران جب کچھ اصحاب نے ہندوستانی معاشرت اور بھارتیہ سرکار کی پالیسی پر نکتہ چینی کی تھی، تو سب نے تائیداً سر ہلایا تھا۔ ایک ہندوستانی نے یہاں تک کہہ دیا کہ گوا پر ہندوستانی حملہ پرتگال کے ساتھ سخت ناانصافی تھی پروفیسر صاحب نے اس کی بات کی تائید نہیں کی، لیکن تردید بھی نہیں کی تھی۔

اُسے وظیفہ تو مل گیا۔ لیکن ریسرچ کا موضوع چُننے کے لئے بڑی کاوش کرنی پڑی تھی۔ ریسرچ کے طالب علموں کی بھرمار ہونے کے سبب، موضوع کی تلاش ہی ایک پیچیدہ مسئلہ بن گئی تھی۔ دوستوں سے صلاح و مشورہ، اور احباب سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد وہ موضوع کا انتخاب کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ امریکی اور ہندوستانی بلیوں کی سائیکالوجی کا موازنہ کرے گا۔

اور جیسے اُس سے عملی مذاق کرنے کے لئے کسی مسخرے نے کوکا کولا والی بوتل میں چوہیا کو ڈال دیا۔ دن رات بلیوں سے الجھنے والا شخص چوہیا کی ستم ظریفی کا شکار ہو گیا۔ لیکن چوہیا کا اس طرح بوتل میں چلا جانا اور کسی کی نظر اس پر نہ پڑنا، ایک عجیب سی بات تھی۔ ہندوستان میں اگر یہ بات ہو جاتی، کوئی حیرت کا اظہار نہ کرتا۔ میونسپل کمیٹی کی میٹنگ میں ممبران بوتل میں بند سانپ کا بچہ دکھلاتے تھے جو نل کے پانی کے ساتھ آیا تھا۔ برف کے تودوں میں چھپکلی اور چوہا بھی مل جاتا تھا۔ لیکن امریکہ، ہندوستان نہیں۔ وہاں پر ایسی بات کا ہونا ایک دم ناقابلِ یقین ہے۔ لیکن وہ اپنی آنکھوں پر کیسے شک کر سکتا تھا؟ اگر کوئی دوسرا اُس سے اس قسم کی بات کرتا، وہ اُس پر یقین ہی نہ کر پاتا۔ چوہیا کا بوتل میں داخل ہو جانا ایک بات ہے، اور اس طرح کا زہریلا، گندہ کوکا کولا پینا دوسری، چاہے پینے والا بلیوں کی سائیکالوجی پر ریسرچ اور امریکی اور ہندوستانی بلیوں پر موازنہ کرنے ہی وہاں کیوں نہ آیا ہو۔

اُسے اُبکائی آنے لگی۔ کہیں معاملہ سنجیدہ نہ ہو جائے۔ زہر اس کے جسم میں سرایت نہ کر جائے۔ وہ تو اس ملک

میں وظیفہ لے کر ریسرچ کرنے آیا تھا، نہ کہ یہاں کی مٹی کے اندر دفن ہونے۔ مٹی کتنی ہی متبرک کیوں نہ ہو، تھی تو وہ غیر ملک کی۔ نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ یہاں ہرگز نہیں مرے گا۔ یہ کام وہ واپس اپنے ملک میں جا کر کرے گا۔ اور ابھی وہ جوان سال تھا۔ ابھی اس نے زندگی میں دیکھا ہی کیا تھا؟ وہ زندہ رہے گا۔ زندہ رہنے کے لئے موت سے جنگ آزمائی کرے گا اُسے مات دے گا۔ چاروں شانے چت گرائے گا۔

اُس نے قے کر دی۔

معاملہ نازک صورت اختیار کر رہا تھا۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس جانا ہوگا۔ ڈاکٹر کو کنسلٹ کرنا اور علاج کرانا ہوگا۔ لیکن اس نے ہندوستان میں اس بات کو سُن رکھا تھا کہ امریکہ میں ڈاکٹر لوگ حد سے زیادہ پیسے وصول کرتے ہیں۔ جہاں ایک طرف اشیاء خوردنی سستے داموں پر میسر ہیں، وہاں ڈاکٹر اتنے ہی مہنگے ہیں۔ دوسرا کوئی چارا بھی نہ تھا۔ یہاں نہ تو یونانی شفاخانہ تھا، نہ ایورویدک دوائی خانہ، ہندوستان میں اس بات کا کس قدر آرام تھا۔ طبیعت خراب ہونے پر کسی بھی سرکاری ڈسپنسری میں داخل ہوگئے اور مفت کی پڑیا لے کر منہ میں جھاڑ لی۔ یہاں کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ پڑیا والی بات ہی نہ تھی۔ ڈاکٹر کی فیس کا خیال کرتے ہی اُس کے جسم میں کپکپی آگئی۔ ساتھ ہی متلی ہونے لگی۔

ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہوگیا۔

ڈاکٹر نے دوائی دی۔ اُسے اتنی خوشی شفایاب ہونے کی نہ تھی، جتنا خوف بل کے خیال سے پیدا ہو رہا تھا۔ آخر کار بل ملا۔ بیس ڈالر کا! توبہ! اس قدر گراں ہیں یہاں کے ڈاکٹر! معمولی دوائی کے لئے بیس ڈالر!

لیکن بل کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے اُسے نہایت قیمتی مشورہ بغیر فیس وصول کئے دیا۔ یا شاید اُس کی قیمت اسی بل میں شامل کر لی۔

ڈاکٹر نے تجویز پیش کی کہ وہ کمپنی کو نوٹس دے اور اس سے ہرجانہ وصول کرے۔

معقول تجویز تھی۔ ڈاکٹر نے اُسے مزید یہ مشورہ دیا کہ وہ وہیں سے ٹیلیفون پر بات کرے۔ اس نے کمپنی کے مینجر سے فون پر بات کی۔ اسے جملہ حالات سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر کا حوالہ دیا۔ مقدمہ چلانے کی دھمکی دی۔ مینجر نے اُس کے فلیٹ کا نمبر نوٹ کیا۔ اور اس سے ملنے کا وقت دیا۔

ڈاکٹر نے اُسے تبلایا کہ کمپنی معقول معاوضہ دے گی۔

اپنے فلیٹ میں آکر اُس نے سگریٹ سلگایا اور کرسی پر بیٹھ کر لفظ 'معقول' کے بارے میں سوچنے لگا۔ کتنی رقم 'معقول' کے زمرے میں آسکتی ہے؟ ڈیڑھ سو روپیہ تو ڈاکٹر نے وصول کر لیا۔ دن بھر اسی فکر اور سوچ بچار میں گذر گیا۔ کتنمنہ دماغی اُلجھن اور ذہنی کاوش ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے اُسے ڈاکٹر کے پاس دوبارہ جانا پڑے۔ کم از کم اُسے ایک ہزار روپیہ مانگنا چاہیئے۔ لیکن وہ انکار کر دے تو؟ پھر معاملہ بگڑ جائے گا۔ موقع نکل جائے گا۔ پھر ہاتھ تو نہیں آئے گا۔ پانچ سو مناسب رہے گا۔ ہے یہ بھی زیادہ۔ ہندوستان میں کوئی پانچ آنے بھی نہ دے گا۔ چوہیا نکلی، تو کیا ہوگیا؟ بوتل میں سے ہاتھی کیسے نکل سکتا ہے؟ دودھ میں سے نہ جانے کتنی بار مکھی نکلتی ہے اور حلوائی اس طرح کا جواب دے دیتا ہے۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا کچھ ایسی خوشگوار ہے کہ مکھیاں دیکھ یا ان دیکھے نگلنے پر متلی آتی ہے نہ اُبکائی۔ پانچ سو سے زیادہ مانگنا مناسب نہیں۔ غیر ملک میں

آکر وہاں کے کمپنی منیجر پر رعب ڈالے اور منہ کی کھائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آکر اسے کوئی کھری کھوٹی سنائے۔ کہیں پستول ہی نہ داغ دے۔ ان لوگوں کا کیا ٹھکانہ ___ وہ موقع محل دیکھ کر بات کرے گا۔ یہ پانچ سو سے بات شروع کرے گا۔ اگر اس نے آنا کانی کی، اس رقم کو گھٹا دے گا۔ ہزار مل جائے تو وہ کچھ ضروری چیزیں خرید سکے گا۔ بش شرٹ، سوٹ اور کیمرہ وغیرہ۔

وقت مقررہ پر منیجر آیا۔ ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق اس نے سنجیدگی اختیار کر کے چوہیا والے کوکا کولا کی بات کی جسے پی کر ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی، بلکہ ایمان بھی بگڑ گیا۔ اگر اسے معقول معاوضہ نہ ملا تو وہ استغاثہ دائر کر دے گا۔

منیجر نے فوراً پوچھا۔

"کتنا معاوضہ چاہتے ہو"؟

"آپ کتنا دے سکتے ہیں؟"

"جتنا آپ چاہتے ہیں"

"اگر پانچ سو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے بڑی جھجک سے کہا

"پانچ سو!" منیجر نے پوچھا۔

"میرا مطلب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"مجھے منظور ہے۔ یہ لیجئے۔" منیجر نے جیب سے نوٹوں کا پلندہ نکال کر، اس میں سے دس دس ڈالر کے پچاس نوٹ نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"پانچ سو ڈالر!" اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ڈالر سے بڑا سکہ اس ملک میں نہیں ہوتا"

"میرا مطلب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اس بحث سے اب کوئی فائدہ نہیں" منیجر نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے جتنا معاوضہ مانگا، میں نے دے دیا۔ اس سے زیادہ مانگتے، اتنا دے دیتا۔ اب بات طے ہو گئی۔ لیجئے اس دستاویز پر دستخط کیجئے کہ آپ کو کمپنی کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے۔"

اور دستخط لے کر منیجر چلتا بنا۔

اس نے اپنی دانست میں پانچ سو روپیہ بھی جھجک کر مانگا تھا اور یہاں پانچ سو ڈالر مل گئے۔ آٹھ گنا زیادہ۔ اب اس نے ایک ہزار روپیہ والا کیمرہ خریدا۔ احباب نے اس کا نام ہی چوہیا کیمرہ رکھ دیا۔

مردہ چوہیا کا وہ کس قدر شکر گذار تھا۔

لیکن اسے پانچ سو ڈالر ملنے کی اتنی خوشی نہ تھی جتنا ایک ہزار ڈالر نہ مانگنے کا رنج تھا۔ بھارت میں لوٹ کر وہ اس دکھ کو کبھی نہ بھول سکا۔ سب سے زیادہ ملال اسے دل کی لعنت کا تھا جو اسے ہمیشہ طعنہ زنی کرتا کہ ؎

تو ہی احمق چند نوٹوں پر قناعت کر گیا
ورنہ ڈالر کی کمی اس خزانے میں نہ تھی

رضیہ فصیح احمد

پروفیسر صاحب

پروفیسر شاد لنچ کھانے سے فارغ ہو کر دھوپ میں اخبار لیکر بیٹھے ہی تھے کہ حسب معمول بیوی نے گھر کی شکایات کے دفتر کھول دیئے۔ آج ان کے تیور زیادہ بگڑے ہوئے تھے ورنہ روز تو یوں ہوتا تھا کہ وہ اپنی بات کہتی رہتی تھیں، اور پروفیسر ان کی باتوں پر سر ہلاتے ہوئے مزے سے اخبار پڑھتے رہتے تھے، شاذ و نادر ہی یہ حادثہ ہوتا تھا کہ بیوی کو ان پر بات نہ سننے کا شک گزرے مگر ایسے موقعوں پر وہ کانوں میں پڑے ہوئے ایک آدھ لفظ کو ایسی خود اعتمادی سے دہرا کر دوبارہ بات سننے کی فرمائش کرتے کہ بیوی کو یقین ہو جاتا کہ بس کہانی کا کلائمکس ہی ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ وہ اُسے دہرا دیتیں اور سب کچھ ٹھیک ہو جاتا مگر آج ان کا مطالبہ عوام کی ضد کی طرح بیگانہ تھا یعنی یہ کہ نہ صرف شکایت سنو بلکہ کچھ عملی اقدام بھی کرو۔ یہ عملی اقدام پروفیسر صاحب کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ایک تو اس لئے کہ وہ پیدائشی طور پر عملی نہیں علمی آدمی تھے، دوسرے اب نامعلوم کن وجوہ کی بنا پر ان کی یادداشت ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھی جبکہ دنیا کے دھندے مع ایک عدد بیوی اور آٹھ بچوں کے ان کی ذات سے اسی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ پروفیسر صاحب کی یادداشت کم ہونے کی (جو اب گم ہونے کی حد تک پہنچ گئی تھی) وجوہات پر مورخین میں زبردست اختلاف پایا جاتا تھا۔ ان کے دوستوں کا خیال تھا کہ جب وہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے انگلستان گئے تو باقی سب کچھ تو صحیح سلامت لے آئے مگر اپنی یادداشت کسی سیم تن کی نذر کر آئے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ کھوپڑی کا بکس بھی دوسرے عام بکسوں کی طرح ہوتا ہے، یعنی اس میں ایک حد تک ہی سامان آسکتا ہے۔ اگر بکس پہلے ہی بھرا ہوا ہے اور آپ اس میں کچھ اور چیزیں ٹھونسنا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس میں سے کچھ نکالنا پڑے گا، چنانچہ پروفیسر صاحب نے جب علم کا اسٹاک جمع کرنا شروع کیا تو کاٹھ کباڑ نکال کر پھینکتے رہے جس میں ان کے سارے دوستوں اور رشتہ داروں کے نام پتے، شہر کی گلیاں اور سڑکیں آشناؤں کے چہرے سب کچھ نکل گیا۔ بڑی مشکل سے بس نیچے تہہ میں اُن کا اپنا، ماں باپ کا اور بیوی بچوں کا نام پڑا رہ گیا۔ ضرورت پڑنے پر ان ناموں کو نکالنے میں بھی کافی دقت ہوتی تھی مگر خیر نشستم برخاستم نکل آتے تھے۔ یہ زمانے کی ستم ظریفی تھی کہ انھیں اتنا وقت میسر نہیں آنے دیتا تھا کہ وہ کبھی فرصت پا کر ان ناموں کو گرم کپڑوں کی طرح دھوپ ہوا دیدیں کہ سیلن میں پڑے پڑے گل سڑ نہ جائیں۔ کچھ لوگ جو علم طبیعات میں اعتقاد رکھتے ہیں اس خیال کے حامی تھے کہ پروفیسر صاحب کی یاد کا کھونا ان کی عمر کا تقاضہ ہے۔ اب اگر انھوں نے شادی اس وقت کی جب ان کے بیٹے کو کرنی چاہیئے تھی اور باپ اس وقت بنے جب ان پر دادا کا رشتہ زیادہ سجتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بوڑھے نہیں ہوئے اور اگر ان کے تو اُسے جسمانی

ان کی حفاظت کر رہے ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ دماغی قوتیں بھی ان کا ساتھ دیں بعض شریر لوگوں کا جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے یہ بھی خیال تھا کہ پروفیسر صاحب کی غائب دماغی خود ساختہ ہے جو خود بہرے بن جانے کی طرح بڑا کام آتی ہے۔ جب دل چاہا جسکو پہچانا ورنہ ٹال گئے جو بات چاہی یاد رکھی ورنہ بھول گئے لیکن اس بات کو ماننے میں یوں تامل ہے کہ اس عادت کی وجہ سے پروفیسر صاحب کو اپنی پروفیسری سے ہاتھ دھونا پڑا اور کئی دفعہ دوسری پروفیسری یعنی بیگم صاحبہ سے ہاتھ دھوتے دھوتے بچے۔ یہ دونوں قصے بعد میں بیان کئے جائیں گے کیونکہ ابھی وہ قصہ رہا جاتا ہے کہ بیگم نے اخبار ان کے ہاتھ سے چھین کر یہ الٹی میٹم دیدیا کہ آج انہیں اس سلسلے میں کچھ کرنا ہی ہوگا —

پروفیسر صاحب کرسی پر کھوئے کھوئے بیٹھے اس غبی بچے کی طرح جس کے غور سے سبق سننے کے باوجود کچھ پلے نہ پڑے بیوی کی بات ذہن نشین کرنے کی کوشش کرنے لگے جو صرف اتنی سی تھی کہ آج پھر خانساماں نے ان کی سہیلیوں کے سامنے ان کی توہین کی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ انھوں نے پیر طبعی پر سوتے ہوئے خانساماں کو اٹھا کر جلد سے جلد چائے اور پکوڑے بنا کر لانے کا حکم دیا اور آکر سہیلیوں سے باتیں کرنے لگیں۔ موجود سہیلیوں نے غائب سہیلیوں کے بارے میں کچھ ایسی دلچسپ داستان چھیڑ دی (ضروری نہیں کہ غیبت ہی ہو) کہ وہ ڈیڑھ گھنٹے تک نہ اٹھ سکیں اور جب سہیلیوں نے چلنے کے لئے پر تولے اور وہ یہ کہہ کر اٹھیں کہ ارے چائے تو بالکل تیار ہے تو باورچی خانے میں آن کر کیا دیکھا کہ نہ خانساماں صاحب ہیں، نہ چولھا جل رہا ہے نہ چائے کے برتنوں کا دور دور پتہ ہے۔ بڑی مشکل سے سہیلیوں کو اور ایک گھنٹہ روک کر انھوں نے خود چائے بنا کر پلائی وہ بھی خالی چائے اور ان کے جانے کے بعد جب وہ باہر نکلیں تو خانساماں صاحب سر تک دھوپ میں گھاس پر لمبے لیٹے ہوئے تھے اور انھوں نے اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ بیگم صاحبہ نے ان سے چائے بنانے کو کہا تھا" اب بتائیے انھوں نے اختتامیہ کہا — " اس کو کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری کہ نہیں —" پروفیسر صاحب اس نالائق بچے کی طرح جس سے دو اور پانچ جوڑنے نہ آرہے ہوں اور ہر وقت ماسٹر کے چپتے کا خطرہ ہو چپ چاپ یہ واردات سنا کئے۔ معلوم تھا کہ آخر بولنا تو پڑے گا۔ جواب غلط ہوا تو خیر نہیں اس لئے جب تک بھی چپ بیٹھ جائے غنیمت ہے۔

" اب بولئے نا کیا کہتے ہیں —" ؟ بیوی کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ ان کا دل چاہا کہدیں۔ بھول گیا ہوگا بے چارہ — مگر یہ جواب تو ایسا تھا جیسے نالائق بچہ جوڑنے کے بجائے الٹا گھٹا دے۔ جواب میں تھوڑی بہت غلطی تو برداشت ہو سکتی ہے مگر یہ کہ سوال کو کیا ہی غلط طریقے سے جائے کون برداشت کر سکتا ہے۔ دوسرے اس میں ایک نفسیاتی نکتہ اور بھی تھا۔ یہ کہدینے سے دوسرا تو بچ جاتا تھا اور الٹی آنتیں گلے پڑ جاتی تھیں۔ زد سیدھی ان پر پڑتی تھی۔ " ہاں بھول کیوں نہ جائے گا جیسے مالک ویسے نوکر . . . . . . ہاں وہ بجلی ٹھیک کرنے کے لئے لکھ دیا آپ نے —" ؟ یا نسے کا پلٹ جانا غبی سے غبی، غائب علم اور اناڑی سے اناڑی کھلاڑی پسند نہیں کرتا اور حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اسی لئے کلاس میں برابر والوں سے پوچھنے اور امتحانوں میں نقل کرنے کی بنیاد پڑی۔ چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد پروفیسر صاحب نے کہا " بلاؤ اس نالائق کو میں خود اس سے بات کروں گا —" ان کی آواز میں غصہ کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ نہ وہ دراصل اس سے ناراض تھے انھیں یقین تھا کہ وہ بے چارہ بھول گیا ہوگا اور یہ بات ان کے نزدیک نہ جرم تھی نہ قابل سزا تھی بلکہ ان کا بس چلتا تو ہر ایسی خطا پر کچھ بخشش دیا کرتے مگر ایسا اس بات کو جو بظاہر ختم تو کرنا تھا اور بیوی عملی اقدام کا مطالبہ پہلے ہی کر چکی تھیں۔ بے چارے پروفیسر صاحب کو اپنی یادداشت کے بدلے عمر بھر زور سے ایک اور چیز پیدا کرنی پڑی تھی جسے دنیا " ٹیکٹ " یا مصلحت یا دنیاداری کہتی ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو پروفیسر صاحب اس دنیا میں اتنے ہی بے یار و مددگار ہوتے جیسے کوئی اندھا بغیر لاٹھی کے یا لنگڑا بغیر سہارے

کہ بیوی نے آج پروفیسر صاحب میں عمل اقدام کا یہ کرو فر دیکھا تو بقول ارد و محاورے کے باغ باغ ہو گئیں۔ جھٹ ایک بیٹے کو بھیجا کہ خانساماں کو فوراً بہ حضور پروفیسر صاحب حاضر کرے۔ جی تو ان کا چاہتا تھا کہ خود جائیں اور دو چار جلی کٹی سناتی ہوئی لائیں مگر اب اس کا کیا کیجئے کہ اک عمر گزری خانساماں صاحب کے کان ان باتوں سے بلند ہو چکے تھے۔ جتنی دیر لڑکا انھیں ڈھونڈے آپ ان کا حلیہ سن لیجئے۔

اپنی زبان سے وہ اپنی عمر سو سال سے اوپر بتاتے تھے اور اس بات پر شک کرنے والے کو خدا کا منکر ٹہراتے تھے۔ اگر یہ بات ٹھیک تھی تو اس میں شک نہیں کہ یوں چاہے لاکھ ان کے ناک، آنکھ اور دانتوں نے جواب دیدیا ہو مگر کاٹھ اور ہاڑ سے وہ ساٹھ پینسٹھ سے زیادہ کے نظر نہ آتے تھے وہ اس سیکنڈ ہینڈ گاڑی کی طرح تھے کہ جس کا انجن تباہ ہو چکا ہو، باڈی کی حالت بہت خستہ ہو پھر بھی یہ ماننے میں تامل ہو کہ وہ دو لاکھ میل چل چکی ہے۔ انھیں کئی مرتبہ یہ کہتے سنا گیا تھا کہ ان کے لڑکوں کی یہ لمبی لمبی سفید داڑھیاں ہیں اور وہ ان کے پاس بیٹھے ہوں تو ان کے باپ نظر آتے ہیں۔ انھیں اس بات پر بھی فخر تھا کہ وہ برطانیہ کے وقتوں کے "کک" ہیں۔ ایک زمانے میں ان کی تنخواہ سو روپیہ ماہوار تھی مگر اب گھٹتے گھٹتے چالیس روپے پر آگئی تھی اور بیگم صاحبہ اکثر یہ بات کہتی تھیں، کہ میں ہی ہوں جو چالیس دے رہی ہوں، کوئی دوسرا اسے دس میں بھی نہ رکھے۔ اب اگر آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ وہ اتنی عاجز تھیں تو انھیں نکال کیوں نہیں دیتی تھیں تو یہ مسئلہ دنیا کے بہت سے سیاسی مسئلوں کی طرح پیچیدہ تھا۔ اس میں کئی معاشی، معاشرتی، خانگی و خارجی پہلو تھے یعنی پروفیسر صاحب کی تنخواہ کم اور کنبہ زیادہ تھا۔ جوان جہاں لڑکیوں کا ساتھ بھی تھا۔ بیگم ایک خاص معیار زندگی بھی قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کی شعلہ مزاجی اور چرب زبانی کے لئے بھی ایسا شخص عین مناسب تھا جو سننے کا تکلف برطرف کر بیٹھا ہو۔ اور بھی کئی باتیں تھیں جن کا اندازہ عقلمند قاری کو آہستہ آہستہ خود ہو جائے گا۔ پروفیسر صاحب کا چھوٹا بیٹا قادر خانساماں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے حاضر ہوا۔ خوش قسمتی سے بیوی اس وقت تک اندر جا چکی تھیں۔ خانساماں نے اپنے گھٹنے کے دکھنے جوڑوں پر ہاتھ رکھ کر چبوترے کی اکلوتی سیڑھی پار کی اور پروفیسر صاحب کی خدمت میں آداب بجا لائے۔ پروفیسر صاحب نے چاروں طرف اخبار کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ ایسے وقت اخبار ان کے بڑا کام آتا تھا۔ کوئی بات یاد کرنی ہے یا سوچنی ہے تو اخبار کا سہارا ہے کہ جیسے اسے پڑھ رہے ہیں، اہم خبر ختم ہو گئی تو بات کریں گے۔ یہ تو ہے ہی تو بعض سپنروں کے دیسے ہی ماسل سپورٹ ہوتی ہے۔ اخبار ان کی جیل کلرکی بیگم ساتھ لے گئی تھیں اور ان کو یک و تنہا اس صورت حال سے نمٹنے کو چھوڑ گئی تھیں۔ خانساماں نے پیدا اپنی جھکی ہوئی کمر اور کچھ ناوقت بلائے جانے کے سبب فرشی سلام کیا تو پروفیسر صاحب گھبرائے۔ خانساماں کے آنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی اس لئے وہ یہ بھول چکے تھے کہ یہ نامت کا مارا ان کا بلایا ہوا قید کیا ہے۔ انھوں نے آنکھ کے اشارے سے جھک کر پوچھا۔ "کون ہے"؟

"خانساماں ہے، آپ نے بلایا تھا" بچے نے کہا

"ہاں، ہاں۔" انھوں نے خوش ہو کر دانت نکال دیئے کہ بچہ یہ نہ سمجھے کہ وہ بالکل ہی بھول گئے ہیں۔ انھیں دراصل یاد آ بھی گیا تھا کہ انھوں نے اسے بلایا تھا مگر کیوں بلایا تھا یہ بات ذہن سے بالکل نکل چکی تھی۔

"کیا حال ہے خانساماں" انھوں نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" خانساماں نے کہا اور مدت بعد جو صاحب کو اپنے حال پر مہربان دیکھا تو فوراً منہ پھیلا دیا۔

"صاحب، سردی بڑھ گئی ہے اگر ایک کوٹ کا انتظام ہو جاتا تو بڑی مہربانی ہوتی۔"

"کوٹ" ؟ پروفیسر صاحب نے کچھ تردد سے سوچا۔ انھیں کچھ شبہ تھا کہ کوٹ وہ موضوع نہیں جس کے تحت خانساماں ان کے حضور لایا گیا تھا۔

"ہاں صاحب۔ ایک اور عرض تھی۔"

"کیا" ؟

"جی رات کے لئے کسی بتی کا انتظام ہو جاتا، بڈھا آدمی ہوں، اندھیرے میں گرتا پڑتا یہاں سے جاتا ہوں۔ رات کو گر پڑا یہ دیکھئے چوٹ آئی ہے۔" خانساماں نے اپنی ٹخنوں سا اٹھا کر گھٹنا ان کے آگے کر دیا جس پر چوٹ کا کوئی نشان نہ تھا۔

"اوہو، ارے بھئی امجد (رحمان کہ جو بچہ ان کے پاس کھڑا تھا قادر تھا) ان کے گھٹنے پہ دوا لگا دو، ہاں آئیوڈین یا برنول کچھ ہی لگا۔"

"مہربانی بہت مہربانی —— خدا آپ کو خوش رکھے۔" خانساماں نے کہا اور سلام کر کے چلا گیا۔ پروفیسر صاحب نے کہا ارے بھئی شاید (وہ ابھی تک قادر سے مخاطب تھے) ہمیں اخبار تو لا دینا۔"

قادر اندر گیا۔ آج کا اخبار تو بیگم نے دودھ کی دیگچی پر ڈھانک دیا تھا وہ تو اسے ملا نہیں کوئی مہینہ بھر پہلے کا اخبار ایک میز پر پڑا تھا وہ اٹھا کر پروفیسر صاحب کو لا دیا جسے وہ بغیر کسی شبہے کے بیچ مضمون کی طرح پڑھنے لگے اور بہت دیر تک پڑھتے رہے یہاں تک کہ بیوی ایک بار پھر آ پہنچیں۔

"کیا کہتا تھا بڈھا —" ؟ انھوں نے سوال داغا۔

"بڈھا —" ؟ پروفیسر صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہی آپ کا چہیتا خانساماں۔"

"ہاں ہاں۔" اخبار غور سے دیکھتے ہوئے انھوں نے دماغ پر زور ڈالا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ یہ شبہ تو انھیں پہلے بھی تھا کہ خانساماں سے ان کی گفت و شنید کچھ تسلی بخش نہیں رہی۔ بیوی کے پوچھنے پر انھیں یقین ہو گیا کہ انھیں سرزنش کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ بڑے یقین اور اعتماد سے انھوں نے کہا۔ "میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔"

"کہتا کیا تھا کیوں نہیں بتائی اس نے چائے۔" ؟ "چائے۔ ؟ ہاں کہتا تھا اس نے سنا نہیں۔"

"سنا نہیں، جھوٹا زمانے بھر کا۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے بڈھا مگر جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتا۔ میں نے اسے مجبور کر کے بٹھایا تھا آنکھیں کھولی ہیں تو اس سے چائے اور پکوڑے لانے کو کہا ہے اور اس نے دھرا یا ہے اس پر کہتا ہے کہ میں نے سنا نہیں، بولئے اب بھی میرے سامنے

"جانے دو، میں نے اسے اچھی طرح ڈانٹ دیا ہے۔ اور کہہ دیا ہے کہ آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو تمہیں فوراً نوکری سے جواب دے دیا جائے

اگر اس وقت بیوی ان سے ایسی حرکت کی توضیح کر دالتیں تو وہ تاپتے رہ جاتے مگر وہ ان کے زور دار اعلیٰ سے اتنی خوش ہو گئیں کہ انھوں نے مزید گہرائی میں جانا مناسب نہ سمجھا اور شکایت کر دا، سے مطمئن ہو جانے کے بعد دیگر چھوٹی چھوٹی شکایات دہراتی رہیں۔ جن میں پروفیسر صاحب اتنے صحیح وقفے سے سر ہلاتے رہے کہ انھیں شبہ بھی نہیں ہوا کہ پروفیسر صاحب نے دراصل کا ایک لفظ بھی نہیں سنا ہے۔

یوسف ناظم

ابن سقراط کا خط
بنتِ بقراط کے نام

زیتون کی ڈالی ! یونہی لچکتی رہو۔

کل مقدونیہ کے سبز باغ میں تمہیں جھولا جھولتے دیکھ کر میں فرطِ محبت سے کانپنے لگا۔ محبت کا غلبہ اتنی شدت سے شاید ہی کبھی کسی اور پر ہوا ہو۔ تم پینگ لیتے وقت اوپر سے نیچے کی طرف آئیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے شیر کچھار سے نکلا ہو اور جب تمہارا جھولا نیچے سے اوپر کی طرف جاتا تو تم سرسبز و شاداب گل مہر کا درخت نظر آتیں۔ ایک مرتبہ تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے تم دھنک بن کر لہرا گئی ہو۔ میں اسی لمحے میں تم پر فدا ہو گیا کیونکہ فدا ہونے کے لئے اس سے بہتر شاید ہی کوئی اور موقع ہوتا۔ تم جھولا جھول کر جب زمین پر اتریں تو مجھے تمہارے قد کا صحیح اندازہ ہوا۔ مجھے تمہارے ہی قد کی لڑکی کی تلاش تھی۔ انسان کے جسم کی ساری چیزیں بہت ہیں اور انسان کی زندگی ہی میں اس کا ساتھ چھوڑ دینے والی ہیں صرف اس کا قد ہے جو آخر تک اُس کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ بات میں نے اپنے باپ سے معلوم کی ہے گو میرے والد کا خیال ہے کہ بعض صورتوں میں آدمی کا قد بھی جواب دے دیتا ہے۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ کمر خمیدہ لوگوں کا صحیح قد کیسے ناپا جاتا ہوگا۔ لیکن یہ ایک الگ بحث ہے اور صرف چند صورتوں میں ایسا ہوتا ہے ورنہ لوگ اپنا قد ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں۔ تمہارا قد میرے قد سے کچھ نکلتا ہی ہوا ہوگا۔ نکلا کرے۔ اس سے میری قیمت میں کمی نہیں آسکتی۔ ہم یونانیوں کو ہمیشہ پنجوں کے بل کھڑے رہ کر محبت جتانے کی عادت رہی ہے۔ (میرے والد کے شاگرد افلاطون محبت کے بارے میں ہمیشہ مجھے کوئی نہ کوئی بات سمجھاتے رہتے ہیں)

تمہارے قد کے علاوہ مجھے تمہاری دوسری چیز جو پسند آئی وہ تمہارا خاص الخاص حلیہ ہے۔ حلیہ آدمی کا ہمیشہ ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کی نقل نہ ہو سکے۔ یونانی شاعروں نے اپنی اپنی محبوباؤں کے حلیوں کے بارے میں کئی شعر کہے ہیں۔ یہ سارے شعر ایک سے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ان سب کی محبوبائیں توام نہیں ہیں۔ لیکن تم ان سب سے مختلف ہو مگر تم یہ سپاہیانہ لباس نہ پہنا کرو۔ یہ بھی کوئی پہناوا ہے جس میں معلوم نہ ہو سکے کہ آدمی کہاں چھپا ہوا ہے۔ تم اپنے والد سے کہہ کر اپنے لئے کسی نئی طرز کا لباس سلواؤ۔ تمہارے والد بہت ذہین آدمی ہیں۔ اور ان کا دماغ ہر معاملے میں خوب کام کرتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں وہ میرے والد سے بھی زیادہ عقلمند ہیں ـــ کیا تم نے اپنے والد کے دماغ کی کوئی رمق ورثہ میں پائی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اولاد میں والدین کی ذہانت منتقل نہیں ہوتی بلکہ کچھ ایسی عادتیں منتقل ہو جاتی ہیں جو نہیں ہونی چاہئیں۔ میرے ساتھ بھی یہی واقعہ

ہوا ہے۔ میرے والد کی ساری ذہانت افلاطون کے حصے میں آگئی ہے۔ (پتہ نہیں یہ کیونکر ہوا۔ لیکن تم دیکھنا افلاطون کے ساتھ بھی آگے چل کر یہی ہوگا اور اس کی ذہانت بھی اس کی اولاد میں نہیں، شاگردوں ہی میں بٹے گی)۔ لیکن چونکہ تمہارے والد کا کوئی شاگرد نہیں ہے اس لئے شاید تم محروم نہ رہی ہو۔ میں اسی بھروسے پر تم سے ربط بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم کتنی سمجھدار ہو۔ اگر تم بھی میری طرح غبی نکلیں تو ہم دونوں کہیں کے نہیں رہیں گے۔ افلاطون کا خیال ہے میں بالکل کند ذہن ہوں۔ سوائے محبت کے مسائل کے اور کوئی نکتہ میرے دماغ میں پرورش نہیں پاتا۔ تم مجھ سے ملنے سے پہلے اگر ایک مرتبہ افلاطون کا ایک انٹرویو دو تو ٹھیک رہے گا تمہارے اس انٹرویو کے بعد میں افلاطون سے مشورہ کرلوں گا۔ لیکن نہیں۔ افلاطون کی باتوں پر لٹو نہ ہو جانا۔ یہ بڑا عاقر دماغ شخص ہے۔ میرے والد جو کچھ کہتے ہیں خود انہیں تو یاد نہیں رہتا لیکن اس منحوس کو برابر یاد رہتا ہے۔

تم اگر سبز باغ میں پھر کبھی جھولا جھولنے جانے والی ہو تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔ یوں بھی میں وہاں اکثر موجود رہتا ہوں اور جھولوں کے ارد گرد ہی پایا جاتا ہوں۔ جھولا جھولنے والی لڑکیاں مجھے عام طور پر اچھی لگتی ہیں اور میں سبھی کو خط بھیجا کرتا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کیا تم کھانا پکانا بھی جانتی ہو۔ یقیناً جانتی ہوگی اور تمہارے ہاں کھانے فارمولوں کے مطابق پکائے جاتے ہوں گے جبھی تو تم اتنی تندرست اور توانا نظر آتیں۔ ہمارے ہاں تو کھانے پکانے کا کوئی تک ہی نہیں۔ جیسا پک گیا ہم لوگوں نے کھا لیا۔ ہمارے والد صاحب کو کھانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو کہتا ہوں انہیں ذائقہ محسوس کرنے والی زبان ہی نہیں ملی صرف بولنے والی زبان ملی ہے میں تو اکثر دوستوں کے ہاں جا کر اپنا پیٹ بھرتا ہوں۔ خود افلاطون کے ہاں کون سا اچھا کھانا پکتا ہے اور رہتا بھی تو وہ دن بھر یہیں ہے۔ اچھا کھانا میری کمزوری ہے۔ میری کمزوریاں اور بھی بہت سی ہیں۔ تم خود رفتہ رفتہ واقف ہو جاؤ گی ——— ہاں مجھے گھوڑے کی سواری کا البتہ بہت شوق ہے اور بعد میں تم بھی چاہو تو سیکھ سکتی ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا ——— اس سے بھوک کھلتی ہے۔ گھوڑے کی بھی اور سوار کی بھی۔ تمہارے لئے ابھی سے میں ایک عمدہ گھوڑی کی تلاش شروع کر دیتا ہوں۔ ——— تمہارے لئے سفید رنگ کی گھوڑی مناسب رہے گی۔ تم دیکھنا کیسی عمدہ چیز ڈھونڈ کر لاتا ہوں تمہارے لئے ——— سارا یونان اس پر فدا ہو جائے ——— افلاطون بھائی سے جب تم ملو تو اسے اپنے سیدھے ہاتھ کی چھنگلی کا ناپ بھی دے دینا۔ یاقوت کی انگوٹھی تو تمہیں پسند ہی آئے گی۔ اصل میں ہے یہ کہ میرے والد کے پاس ان کے معتقدین کے دیئے ہوئے کئی یاقوت یونہی پڑے ہوئے ہیں۔ ایک انگوٹھی تمہاری بن جائے گی تو ہمارا کیا نقصان ہو جائے گا یاقوت کے علاوہ اگر تمہیں اور کوئی پتھر پسند ہو تو مجھے بلا تکلف لکھ دینا ——— غالباً سنگ ستارہ بھی ہمارے ہاں پڑا ہوگا ——— یہ بڑھیا جو میرا خط لے کر تمہارے پاس آ رہی ہے بالکل بھروسے کی عورت ہے اور میرے علاوہ اور بھی لوگوں کی یہ خدمت سر انجام دیتی آئی ہے ——— میں نے اس سے پہلے جہاں جہاں بھی خط بھیجے اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ پہنچا دیئے تھے اور ان لڑکیوں کے والدین یا بھائیوں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

کاش میں سب سے پہلے تمہیں ہی خط لکھتا۔ تم بڑے باپ کی بیٹی ہو اور اگر ہم دونوں کے والد آپس میں سمدھی بن جائیں تو کتنا اچھا ہو ——— یوں بھی لوگوں کو ان کے نام سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں اگر بھائی نہیں تو ہم زلف تو ضرور ہوں گے ——— فقط

تمہارا
تو
ابن سقراط

سید صفا کاظمی

سوالیہ انسان

آپ نے یقیناً سوالیہ نشان دیکھا ہوگا۔ تحریر میں اس کا استعمال مختلف مواقع پر مختلف انداز میں کیا جاتا ہے بعض لوگ غالباً اپنی کم مائگی چھپانے کے لئے اپنی تحریروں میں سوالیہ نشان کا ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں یعنی جملہ کو مکمل نہ کرکے اس کے آخر میں سوالیہ نشان بنا دیتے ہیں۔ چند حضرات اپنی حرکات، انداز گفتگو وغیرہ سے بھی بالکل سوالیہ نشان نظر آتے ہیں یعنی آپ انہیں، ان کی حرکات دیکھ کر اور گفتگو سن کر سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہیں؟

یوں تو تحریروں میں چند دیگر نشانات بھی مستعمل ہیں جیسے نشانِ استعجاب، نشانِ استفہامیہ۔ لیکن ان سب میں سوالیہ نشان انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے پہلے مجھے اس کے خطرناک ہونے کا احساس نہ ہوا تھا۔ لیکن چند دن پہلے کے واقعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ ایسی ہی کسی صورت سے دوچار ہونے کے بعد کسی دل جلے نے سوالیہ نشان کی پیشانی پر زوردار مکہ مارا ہوگا جب ہی تو اس کی پیشانی آگے سے پچکی ہوئی ہے!۔۔۔ یقین نہ آئے تو کاغذ پر؟ نشان بنا کر دیکھ لیجیے!

لیکن سوالیہ نشان سے بھی زیادہ خطرناک سوالیہ انسان ہوتا ہے! اس حقیقت کا علم مجھے حال ہی میں ہوا ہے۔ ہوا یہ کہ میری خالہ جان نے مجھے بتلایا کہ ان کے مرحوم شوہر کے ایک قریبی دوست قریشی صاحب دوپہر کی ٹرین سے آ رہے ہیں اور ہمارے ہاں ایک ماہ قیام کریں گے۔ اس لئے میں ان کے استقبال کے لئے اسٹیشن جاؤں اور انہیں سر آنکھوں کے علاوہ ٹیکسی یا رکشہ میں بٹھا کر گھر لے آؤں!

لوگ کہتے ہیں کہ کسی شخص کے متعلق جو پہلا تاثر قائم ہوتا ہے وہ نہ صرف بہترین ہوتا ہے بلکہ بیشتر حالات میں درست بھی ثابت ہوتا ہے۔ لیکن میں اس قول کو قطعی غلط سمجھتا ہوں۔ جب میں نے ان بزرگوار کو اسٹیشن پر پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ انتہائی شریف، مہذب اور ملنسار نظر آئے۔ ملے دیر نہ ہوئی کہ انہوں نے یوں بات چیت شروع کی جیسے ہم دونوں برسوں کے پرانے دوست ہوں۔ انہوں نے میری، میرے والدین کی، میرے بیوی بچوں کی حتیٰ کہ مستقبل قریب و بعید میں پیدا ہونے والے بچوں تک کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے گھر کے

سکتے، بلیوں، طوطوں اور کبوتروں کے بارے میں بھی تفصیل سے پوچھا جنہیں نہ میں نے کبھی پالا ہے اور نہ آئندہ پالنے کا کوئی ارادہ ہے!

راہ میں جو لوگ نظر آتے گئے ان کے بارے میں، اُن کے رشتے داروں کے بارے میں، ان کے سماجی اقتصادی اور گھریلو حالات کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ میرے محلے میں داخل ہوتے ہی میرے پڑوسیوں کے جسمانی، سماجی، سیاسی، تاریخی اور جغرافیائی حالات کے بارے میں بے شمار سوالات کئے اور میں اُن سوالوں کے بوجھ تلے دب کر بغلیں جھانکنے لگا!

گھر میں داخل ہو کر انہوں نے گھر کے کمروں، الماریوں، اُن میں رکھی ہوئی مختلف چیزوں، اُن کے بنانے والے کارخانوں، اُن چیزوں کی قیمتوں کے بارے میں سوالات کی بوچھار کر دی!

اُن کی خوش قسمتی کہئے یا میری بدقسمتی کہ ان کی آمد کے دوسرے ہی دن میری سالگرہ کی تقریب تھی، اس موقع پر میں نے ان سے پیچھا چھڑانے کی لاکھ کوششیں کیں لیکن سب بے سود رہیں۔ اُس دن شام کو میں نے اپنے رشتہ داروں اور چند مخصوص دوستوں کو چائے پر بلایا تھا۔ جونہی تمام مہمان آ گئے میرے یہ کرم فرما اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو گئے اور سوالات کی جھڑی لگ گئی:

"یہ سامنے کون بیٹھا ہے؟
کیا نام ہے اس کا؟
اس کے باپ کا کیا نام ہے؟
یہ کیا کرتا ہے؟
اس کا باپ کیا کرتا ہے؟
اگر کچھ نہیں کرتا ہے تو کیوں؟
شادی شدہ ہے یا کنوارا؟"

گھبرا کر میں مہمانوں کے پاس سے اُٹھ گیا، اور دالان کے ایک کونے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ لیکن آپ جانیں اپریل کہیں مارچ سے دور رہ سکتا ہے! وہ بزرگوار بھی میرے پاس پہونچ گئے، اور سوالات شروع ہو گئے:

"وہ جو صوفے پر بیٹھا ہوا ہے وہ کیا اُس کرسی پر بیٹھے ہوئے نوجوان کا رشتہ دار ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تو دونوں کی شکل کیوں ملتی ہے؟"

"اس لئے کہ شکل کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ اُسے کس کے ساتھ ملنا چاہئے اور کس کے ساتھ نہیں ملنا چاہئے۔"

"آخر ایسا کیوں ہے؟"

"بس ایسا ہی ہے اور شاید اس لئے کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے!"

"کیوں؟"

"بس یونہی"

"اچھا یہ جو صاحب ابھی چند منٹ قبل آئے ہیں کیا یہ پڑھے لکھے آدمی ہیں؟"

"جی ہاں"

"کیا کیا پڑھا ہے انہوں نے؟"

"الف بے تے"

"کیا وہ دولت مند ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم"

"کیا اُن کے والد صاحب حیات ہیں؟"

"مجھے ابھی تک اُن کے مرنے کی اطلاع نہیں ملی ہے"

"اچھا یہ بتایئے کہ وہ سامنے ریچھ جیسا کون بیٹھا ہے؟"

"دیکھئے قبلہ، میرے دوستوں کے متعلق ایسی توہین آمیز بات نہ کہئے"

"اور وہ موٹی گردن والا ...."

"ہاں ہاں کہئے" میں نے دانت پیس کر کہا "اُس موٹی گردن والے کے بارے میں آپ کیا جاننا چاہتے ہیں"

"یہی کہ وہ اتنا موٹا کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ وہ دُبلا نہیں ہے"

"دبلا کیوں نہیں ہے؟"

"اس لئے کہ موٹا ہے!"

"تو کیا وہ موٹا ہونے کے لئے کوئی ٹانک استعمال کرتا ہے؟"

"جی ہاں"

"کون سی؟"

"کیسٹو فین"

"کیا وہ ورزش بھی کرتا ہے؟"

"جی ہاں"

"کون سی؟"

"سیڑھیاں چڑھنا اُترنا، ہلنا ڈولنا اور باتیں کرنا"

"اور وہ دائیں جانب جو مریل سا ....."

"دیکھئے جناب میں نے ابھی ابھی آپ سے کہا تھا کہ میرے دوستوں کے بارے میں ایسی باتیں نہ کیجئے"

"آپ نے کہا تھا؟
"جی ہاں"
"کب؟"
"ابھی۔ چند منٹ پہلے"
"کس سے کہا تھا؟"
"آپ سے ـــــ اور پھر درخواست کرتا ہوں کہ ازراہِ کرم میرے دوستوں کے بارے میں ایسے توہین آمیز سوالات نہ کیجئے۔ سمجھ گئے یا پھر سمجھاؤں؟"
"بھلا پھر کیوں سمجھائیے گا؟"
"اس لئے کہ اگر آپ نہ سمجھے ہوں تو...."
"آخر ایسی کیا بات ہے کہ میں نہ سمجھ سکوں"
"بات دراصل یہ ہے ـــــ بات یہ ہے کہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو آپ نہیں سمجھ سکتے"
"کیا واقعی؟"
"جی ہاں"
"لیکن اس کی وجہ؟"
"وجہ؟ بس میری بدقسمتی، اور کیا کہوں"
"آپ کی بدقسمتی؟ بیٹی سالگرہ کی تقریب کے مبارک موقع پر بدقسمتی کا رونا؟ بھئی خوب بلکہ بہت خوب!
دفعتاً میری نظریں ان کے گلے پر جم گئیں، اور ایک خطرناک خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ مستقبل نے مجھے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا ہے۔ یہ سوچ کر کہ خواہ مخواہ قتل کا مجرم بن کر اپنی بیگم کو بیوہ کیوں کروں، بس خون کے گھونٹ پی کر وہاں سے اٹھ گیا!
کئی دن گذر گئے۔ وہ زندہ رہے اور میں پھانسی کے تختے سے دور رہا۔ لیکن ان کے سوالات کی زد سے دور نہ رہ سکا۔ جب انہیں مجھ سے پوچھنے کے لئے کوئی سوال نہ سوجھتا تو وہ اس قسم کے سوال کرتے:
"چائے پی لی؟
منہ دھولیا؟
آج جلدی کیوں اٹھ گئے؟
کل دفتر سے دیر سے کیوں گھر آئے تھے؟"
عاجز آکر میں نے طے کیا کہ اب وہ کوئی سوال کریں گے تو میں زبان کے بجائے اشاروں سے جواب دیا کروں گا۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ دروازہ بند کر لینے سے کبھی موت کا فرشتہ باہر رہ سکتا ہے۔ جب میں نے ان کے دس بیس سوالوں کا جواب اشاروں سے دیا تو وہ کاغذ قلم لے آئے اور میرے سامنے رکھ کر کہنے لگے:

"بولتے کیوں نہیں؟ لکھ کر جواب دو۔"
میں نے لکھا: "زبان کچل گئی ہے اس لئے بولنے میں دشواری اور درد ہوتا ہے۔"
"زبان کیسے کچل گئی؟"
"دانتوں تلے آ گئی تھی۔"
"تو آپ نے زبان کو دانتوں سے دور کیوں نہ رکھا؟"
"اس لئے کہ زبان کو دانتوں سے دور نہیں رکھا جا سکتا۔"
"لیکن اُسے دانتوں تلے آنے سے تو بچایا جا سکتا ہے؟"
"ممکن نہیں تھا۔"
"ڈاکٹر کو دکھایا؟"
"جی ہاں۔"
"کس ڈاکٹر کو؟ کیا نام ہے اس کا؟"
"میں اس کا نام نہیں جانتا۔"
"قیاس تو کر سکتے ہیں۔"
"کس چیز کا؟"
"ڈاکٹر کے نام کا۔"
"میں قیاس آرائی کا قائل نہیں۔"
"اچھا تو اس کے باپ کا نام ہی بتلائیے۔"
"میں اس کے باپ کا نام بھی نہیں جانتا۔"
"آخر کیوں؟"
"اس لئے کہ میں بے کار سوالات کر کے دوسروں کو پریشان نہیں کیا کرتا۔ یہ میری عادت نہیں ہے۔"
"تو کیا کسی دوسرے کی ایسی عادت ہو سکتی ہے؟"
"جی ہاں۔"
"کس کی؟"
"بہتوں کی۔"
"لیکن میں نے تو ایک بھی ایسا آدمی نہیں دیکھا۔ بھلا بلا وجہ فضول سوالات کرنے کی کس کو عادت ہو سکتی ہے؟"
"ہو سکتی ہے!"
"لیکن کیوں؟"
"محض سوالات پوچھنے کے لئے۔"

"واہ ۔ بھلا فضول سوالات پوچھنے کے لئے بھی کوئی سوال کر سکتا ہے؟"

"ہاں جناب ہاں"

"کیا واقعی؟"

"جی ہاں"

"لیکن فضول سوالات کون پوچھتا ہوگا؟"

"گدھا!"

"کیا کوئی انسان بھی پوچھ سکتا ہے؟"

"اب اگر تم نے ایک بھی سوال پوچھا تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا" میں نے کاغذ پر لکھا، لیکن کاغذ انہیں نہ دیا، اور کچھ دیر تک آنکھیں موندے پڑا رہا، لیکن یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہوئی۔ چند لمحوں بعد انہوں نے پوچھا "اب کچھ آرام ہے؟" اور میں نے کہہ دیا "جی ہاں" بس سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اگلے دن بہت سوچ بچار کے بعد مجھے ایک ترکیب اور سوجھی۔ اب جونہی وہ میرے قریب آتے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی طرف دیکھتا۔ اپنے منہ کو مختلف انداز میں بگاڑتا۔ اور پاگلوں جیسی حرکات کرتا۔

اتفاقاً اس روز میرے ایک قریبی رشتہ دار کے ہاں پارٹی تھی، خالہ جان نے ضد کی تو میں انہیں بھی پارٹی میں لے گیا۔ جیسے ہی پارٹی ختم ہوئی انہوں نے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"وہ صاحب جو آپ کے دائیں جانب بیٹھے تھے کون تھے؟"

"کیا پوچھا آپ نے؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

انہوں نے خوفزدہ نظروں سے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا: "جو آپ کے دائیں جانب بیٹھے تھے وہ کون تھے؟"

"میرے تایا کا گھوڑا تھا"

"اور وہ جو آپ کے سامنے ساڑھی والی خاتون تھیں؟"

"وہ میرے چچا کی بکری ہے"

میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن کی جانب گھورتے ہوئے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبایا۔ اور وہ جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگے اور اپنے کمرے سے بستر لے کر گھر سے باہر نکل گئے۔

اُن سے تو خیر پیچھا چھوٹا لیکن اب میری خالہ جان مستقل سوال بنی ہوئی ہیں۔ وہ مجھ سے پوچھتی رہتی ہیں کہ قریشی صاحب تو ایک ماہ کے قیام کے ارادے سے آئے تھے پھر ایک ہفتہ کے بعد ہی کیوں چلے گئے؟ کہیں ناراض تو نہیں ہو گئے؟ تم نے تو کچھ نہیں کہہ دیا؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

حامد سروش

پہلی اور آخری قسط

نئے اور پرانے پڑھنے والے یہیں سے پڑھیں یہ روداد یہاں سے شروع ہو کر وہاں ختم ہو جاتی ہے نہ اس کی پہلی قسط پہلے چھپ چکی ہے اور نہ آخری قسط آخر میں چھپے گی بلکہ یہ پہلی اور آخری قسط ہی ہے ——

حیدرآباد سے میں شام کو پانچ بجے کے بعد عوامی گاڑی سے راولپنڈی کے لئے روانہ ہوا گاڑی میں بیٹھنے اور سفر شروع کرنے سے پہلے ہی میں بہت تھک گیا تھا اس لئے کسی سے بات کئے بغیر اپنی برتھ پر لبستر لگا کر مزے سے سو گیا —— صبح اٹھا تو —— اب اصل روداد شروع ہوتی ہے۔

سفر میں عموماً میں اپنے ساتھ فلمی رسالے رکھا کرتا ہوں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ فلمی دنیا کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات ہو جاتی ہے۔ دوسرے ریل کے ڈبے میں اچھی خاصی سوسائٹی بن جاتی ہے تیسرے یہ کہ اگر کوئی صاحب اپنی عادت سے مجبور ہو کر پرچہ لیکر کسی اسٹیشن پر چپکے سے اتر جائیں تو پرچے کے گم ہونے کا غم بھی نہیں ہوتا — اور لوگوں کی اخلاقی بدحالی پر ماتم کرنے کے لئے اچھا خاصا مواد فراہم ہو جاتا ہے چنانچہ برتھ سے اتر کر سیٹ پر بیٹھتے ہی معقول حلقہ بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیگ کے سارے رسالے تقسیم ہو گئے۔ ہر شخص افیمی کی طرح سر جھکائے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ ایک صاحب جو فلمی دنیا سے خاصی واقفیت رکھتے تھے بولے ——

آپ کس ایکٹرلیس کو پسند کرتے ہیں — ؟

میرے لئے یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا جس کا نام لیتا ہوں اسی کا عاشق سمجھا جاتا ہوں۔ ذرا تامل سے پوچھا۔

میں نہیں سمجھا آپ کیا کہہ رہے ہیں — ؟

جناب — میں نے پوچھا تھا آپ کس ایکٹرلیس کو پسند کرتے ہیں۔

کس لحاظ سے — ؟ میں نے سوال پر سوال جڑ دیا۔

اب وہ گھبرائے — یعنی مطلب — ؟

مطلب یہ کہ خوبصورتی کے لحاظ سے — یا اداکاری کے لحاظ سے۔

فرمانے لگے — دونوں "لحاظوں" سے ——

میں نے عرض کیا ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ایکٹریس بہت زیادہ خوبصورت ہے لیکن بہت زیادہ اچھی اداکارہ نہیں ہے ایک اداکارہ بہت زیادہ اچھی اداکارہ ہے لیکن بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہے چنانچہ میں آج تک پسند اور ناپسند کا فیصلہ نہیں کر سکا ـــــ مجھے افسوس ہے ـــــ

پتہ نہیں میری بات ان کی سمجھ میں آئی یا نہیں بہرحال وہ بظاہر مطمئن سے ہو کر رسالہ پڑھنے لگے ۔

ایک محترمہ بڑی استادی سے اپنے شوہر کو اغوا کر کے کہیں لئے جا رہی تھیں۔ ان کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی ۔ بڑی ٹکسالی زبان بول رہی تھیں۔ لوگوں کو رسالوں میں منہمک پا کر میں نے اردو سننے کے شوق میں ادھر کان لگا دیئے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ اردو پڑھیئے، اردو لکھئے اور اردو بولیئے۔ کوئی اس بات پر زور نہیں دیتا کہ اردو سنیئے جس طرح اردو لینا، پڑھنا اور لکھنا ضروری ہے اسی طرح سننا بھی۔ تو صاحب میں ان کی باتیں سننے لگا۔ وہ اپنے شوہر سے اس کی ماں بہنوں کی برائیاں کر رہی تھیں۔ ان کی ہر بات کی تان " تمھاری ماں بہنوں " پر ہی ٹوٹتی تھی ۔

خکر ہے جان چھوٹی تمھاری ماں بہنوں سے اللہ بچائے بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں ـــ اور تمھاری بہن کے بچے ـــ توبہ، انھوں نے اپنے دونوں پھول سے گالوں کو پیٹا۔ شوہر صاحب بدھو بنے بڑی سعادتمندی سے بیگم صاحبہ کی خرافات سن رہے تھے جب بہن کے بچوں کا ذکر آیا تو ان سے چپ نہ رہا گیا فرمانے لگے ۔

اور اگر کچھ کہو تو بڑی اماں کھانے کو آتی ہیں ـــــ

پھر سلسلۂ گفتگو بڑی اماں کی طرف منتقل ہو گیا۔ بیگم صاحبہ فرمانے لگیں ۔

ارے وہ تو خدا کے گھر سے پیٹ لکھا کے لائی ہیں، قیامت کے بورئیے سمیٹیں گی۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہیں لیکن حال دیکھو۔ توبہ،

ایک صاحب کچھ خواتین کے ہمراہ تنہا سفر کر رہے تھے میں دو تین دفعہ اٹھ کر کسی کام سے ان کے سامنے سے گذرا تو وہ میری طرف سے مشکوک ہو گئے۔ اب وہ باقاعدہ چوکیداری کے فرائض انجام دینے لگے۔ میں اٹھتا تو وہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے میں بیٹھتا تو وہ بھی بیٹھ جاتے میں نے اپنے ہم سفر سے کان میں کہا۔

معاملہ نازک ہے ـــــ

اور وہ جو میرے رسالوں کے احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے کہنے لگے۔ آپ بےفکر رہیئے ہم دیکھ لیں گے ۔

میں پھر اٹھا اور لیٹرین تک گیا وہ بھی اٹھے اور لیٹرین تک گئے۔ میں نے لیٹرین کا دروازہ کھول کر اس میں تھوکا۔ انھوں نے بھی اس میں سر ڈال کر تھوکا۔ پھر میں سر جھٹک کر واپس اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی سر جھٹک کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھے۔ میں پھر اٹھا ـــ وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھے۔ میں دو قدم چلا ـــ وہ بھی دو قدم چلے۔ میں پھر آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا لیکن وہ نہ بیٹھے بلکہ وہ لیٹرین تک گئے۔ دروازہ کھول کر سر اندر ڈال کر تھوکا پھر سر جھٹکا اور واپس آکر سیٹ پر دراز ہو گئے۔ ان کے دراز ہوتے ہی میں پھر اٹھا ـــــ وہ بھی اٹھے ـــــ میں بغیر کچھ کہے فوراً دھم سے بیٹھ گیا وہ بھی تھوڑے سے تامل کے ساتھ بیٹھ گئے ـــــ میں پھر اک دم اٹھا ـــــ وہ بھی اٹھے ـــــ میں پھر بیٹھ گیا ـــــ وہ بھی بیٹھ گئے ـــ میرا ہمسفر ضبط کے باوجود اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ وہ صاحب کچے ہو گئے۔ میں اس کی ہنسی اور ان کے خفیف ہونے کی پرواکئے بغیر اٹھا ـــ لیکن اب کی بار وہ نہ اٹھے ۔

شوہر صاحب والی محترمہ پان لگا رہی تھیں۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا — پان کھانے کو جی چاہ رہا ہے —
کہنے لگے — مانگ لیتے ہیں۔

میں نے کہا — یوں نہیں بیڈ عجب عورت ہے اور وہیں کوئی اچھی سی گالی لگا دی تو تمام عمر کڑھتے رہیں گے — یوں کرتے ہیں کہ میں سر پکڑ کر بیٹھا جاتا ہوں تم شوہر محترم سے کہو کہ میرے دوست کا جی متلا رہا ہے۔ ایک پان الائچی والا مل جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ اس نے کہا — مجھے ہنسی آ جائے گی —

میں نے کہا۔ اچھا تم سر پکڑ کر منہ گھٹنوں میں دے کر بیٹھ جاؤ باقی کام میں خود کر لوں گا۔

جوں ہی وہ سر پکڑ کر بیٹھا تو پہلے تو میں نے ایک بہت ہی بدمزاج صاحب بہادر کے تھرمس میں سے ٹھنڈا پانی نکال کر اسے پلایا اور جلدی جلدی خود بھی پیا اور ان کے تیوروں کی پرواہ کئے بغیر (کہ اس میں میرے دوست کی زندگی کا سوال تھا بے چارے کی طبیعت خراب تھی) کھلا تھرمس ان کے حوالے کر کے کہ آپ اسے بند کیجئے میں اپنے دوست کو سنبھالتا ہوں۔ اسکو سنبھالنے میں لگ گیا صاحب بہادر نے ایک جھٹکے سے تھرموس میرے ہاتھ سے لیا۔ اور اس کا سارا پانی چلتی ٹرین سے باہر پھینک دیا۔

میرا دوست ہنسی چھپانے کے چکر میں بالکل ہی دُہرا ہو گیا۔ ڈبے میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ شوہر صاحب اور بیگم صاحبہ بھی ہماری طرف متوجہ ہوئیں — میں نے کہا — بڑی مہربانی ہوگی اگر ایک پان الائچی والا دیدیں۔ میرے دوست کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انھوں نے کمال مہربانی سے ایک خوبصورت بیڑا میرے حوالے کیا۔ وہ پان اپنے دوست کے حوالے کر کے میں نے شوہر محترم سے کہا۔ ایک مجھے بھی عنایت ہو جائے کیونکہ ان کا حال دیکھ کر میرا حال بھی خراب ہونے لگا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ بڑے نیک لوگ تھے۔ انھوں نے بڑے خلوص سے ایک بیڑا مجھے عنایت کیا۔ بیگم صاحبہ نے آہستہ سے شوہر سے کہا کہد کے سانچی کے پان ہیں — اور کھوڑے میں لپا ہوا کتھا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد جب میرا ہمسفر اپنی جیب سے وہ پان نکال کر مجھے دینے لگا تو لاکھ چھپانے کے باوجود بیگم صاحبہ کی نظر اس پان پر پڑ گئی۔ حیرت سے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ انھوں نے جھک کر اپنے شوہر کے کان میں سرگوشی کی۔ لیکن ہم نے ان کی طرف سے پیٹھ موڑ کر اونگھنے کا پروگرام بنالیا —

لمبی اونگھ لیکر جب ہم اٹھے تو بالمقابل دو نئے چہرے بیٹھے ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ اپنے شوہر کو لیکر راستے میں کہیں اتر چکی تھیں دونوں سنگل سیٹوں پر دو اور صاحبان رونق افروز تھے۔ ان سیٹوں پر ذرا دیر پہلے بیگم صاحبہ اپنے شوہر سمیت جلوہ افروز تھیں — دائیں بائیں پیک کی پچکاریاں چلی ہوئی دیکھ کر مجھے ایک نظم یاد آ گئی۔

تونے جب کھایا پان — تیرے ہونٹوں سے لگا فتنۂ سرخ۔

خواتین والے صاحب اب ہر طرف سے مطمئن ہو کر اوپر والی برتھ پر پڑے لمبے لمبے خراٹے لے رہے تھے بالمقابل والے صاحب پولیس افسر دکھائی دیتے تھے۔ ان کے ساتھ کانسٹبل تھا ہمیں اونگھ سے بیدار ہوتے دیکھ کر انھوں نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

آپ کہاں سے آئے ہیں — ؟ کہاں جا رہے ہیں ؟ کس لئے جا رہے ہیں ؟ کیا کرتے ہیں — ؟ کیوں کرتے ہیں — ؟ وغیرہ ہم نے واجبی سے جوابات دیئے اور بار بار چور نظروں سے یہ بھی دیکھتے رہے کہ کہیں وہ ڈائری میں تو نوٹ نہیں کر رہے ہیں لیکن وہ بے حد شریف آدمی تھے۔ میں نے کسلمندی دور کرنے کے لئے اپنے ہمسفر سے اس طرح کہا کہ وہ بھی سن لیں —

اگر چائے مل جاتی تو ——

انھوں نے فوراً سپاہی کو بھیج کر ڈائننگ کار سے اسپیشن چائے منگوائی جو بڑی پر تکلف تھی۔ چائے پی کر بیٹھے ہی تھے کہ بیرا بل لیکر آگیا۔ ہمنے خالی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالنے چاہے۔ لیکن انھوں نے سختی سے منع کر دیا، جیسی ہمکو توقع تھی —— خدا سب کو ایسے فیاض اور سخی ساتھی عطا فرمائے۔

گفتگو کا سلسلہ چلا تو وہ ہمارے دوست کے والد کے دوست نکل آئے۔ اب کیا تھا سیتاں بجنے کو تواں۔ گفتگو ابھی اور چلی کہ اچانک ایک صاحب نے جو سنگل سیٹ پر براجمان تھے اور اخبار پڑھ رہے تھے گہری آہ بھر کر زیر لب قوم کے اخلاقی دیوالیہ پن کا مرثیہ بڑے دلگداز انداز میں پڑھ ڈالا۔ سب اچانک ہی ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے بلکہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر میں خود بھی کھڑا ہوگیا۔ کھڑے ہونے میں میرا سر اوپر والی برتھ سے جا لگا اور خواتین والے صاحب ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ مجھے کھڑا دیکھ کر وہ اور بھی بے چین ہوگئے۔ انھوں نے جھانک کر دوسری طرف بیٹھی ہوئی خواتین کی گنتی پوری کی۔ اور منھ ہی منھ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ خیر یہ تو تھا۔ جملۂ معترضہ۔ بات ہو رہی تھی ان ہمسفر کی جو بڑے سوز وگداز سے قوم کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ سب ہی پرسش احوال کے لئے بے چین تھے پہل میں نے کی —— خیر باشد۔

فرمانے لگے۔ طاقت کا اشتہار پڑھ رہا ہوں اور رو رہا ہوں

عرض کیا۔ رونے سے کھوئی ہوئی طاقت واپس تو نہیں مل سکتی ——

انھوں نے سنی ان سنی کر دی اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھکر امراض اور معجونوں کے وہ وہ نام گنائے کہ الاماں —— معلوم ہوتا تھا عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ میں نے پوچھا۔

آپ کسی دواخانے کے ایجنٹ تو نہیں ہیں!

جلال میں آگئے —— واللہ آپ کو ادب تو چھو کر نہیں گیا۔ ایکٹر معلوم ہوتے ہیں آپ کسی فلم کمپنی میں ملازم تو نہیں ہیں۔

لوگ ہنس پڑے۔ ہنسی کا زور ختم ہوا تو میں نے ان سے بڑے ادب سے عرض کیا۔

ایک دواخانے میں کام کرتا ہوں —— آپ سے ملکر بہت خوشی ہوئی۔

وہ اور بپھرے۔ بپھر کر کچھ اور گلفشانی کرنے والے ہی تھے۔ کہ سپاہی نے ان کی آواز ان کے گلے میں ہی دبا دی۔

صاحب سو رہے ہیں، ذرا آہستہ بولیئے۔

میں نے دیکھا پولیس افسر صاحب مزے سے خواتین والے صاحب کی برتھ پر پاؤں پھیلائے لیٹے ہیں۔ بڑے میاں کے بگڑے ہوئے تیور اور کھلا ہوا منھ دیکھکر میرے ہمسفر دوست سے ضبط نہ ہو سکا فرمایا۔

باقی آئندہ چیا —— اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بڑے میاں بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے۔

ٹرین بڑی تیزی سے مسافت طے کر رہی تھی۔ ہنستے ہنستے اور باتیں کرتے کرتے ہمارے اعصاب پر ایکبار پھر تھکن غالب آنے لگی تھی تب ہی اچانک کوئی اسٹیشن آگیا۔ ڈبے میں ایکبار پھر ہڑبونگ مچی۔ ایک بزرگ جو میرے دیئے ہوئے فلمی رسالے میں کسی خوبصورت ایکٹریس کی تصویر کئی گھنٹوں سے مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔ گھبرا کر اٹھے اور میرا رسالہ بھولے سے انھوں نے اپنے بیگ میں رکھا اور آنکھ بچا کر اترنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ میں نے ان کو پکارا۔

جناب میرا پرچہ ——

ان کے چہرے پر ندامت سی ظاہر ہوئی —"ہاں ہاں" کہکر بیگ ہاتھ سے رکھکر اسے بمشکل کھولا اور پرچہ میرے سامنے پھینک کر "معاف کیجئے گا" کہتے ہی اگلے ہی اسٹیشن اتر گئے — پتہ نہیں میرے شکریئے کے الفاظ ان کے کانوں تک پہنچے یا نہیں

نئے آنے والوں میں خوش قسمتی سے ایک ادیب صاحب بھی شامل تھے۔ انھوں نے آتے ہی بڑے طمطراق سے تعارف داغا اپنی زیر طبع اور زیر تصنیف کتابوں کے نام گنائے اور میرے پاس ہی براجمان ہو گئے۔

آپ کا شغل —؟ انھوں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

غیبتیں کرنا — میں نے مختصر سا جواب دیا — دراصل میں بہت تھکا ہوا تھا۔

کیا فرمایا۔ غیبتیں کرنا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ — بڑے زندہ دل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہنسے — بے ساختہ ہنسے جی خوش کر دیا۔ واہ کیا اچھا شغل ہے —؟

کچھ لکھنے وکھنے کا شوق تو ضرور ہوگا آنجناب کو —؟ ان کی طرف سے یہ دوسرا سوال تھا۔

جی ہاں — کیوں نہیں — دبی زبان سے میں نے کہا۔ خط و ط لکھ لیا کرتا ہوں۔

ان کو پھر ہنسی کا دورہ پڑا — میرا مطلب خطوط وغیرہ سے نہیں ہے بلکہ نظمیں وظمیں، شعر وعر، غزلیں وزلیں افسانے وفسانے، ناول وادل۔ طنزیئے وننزیئے!

عرض کیا — وظمیں، وعر، وزلیں، وفسانے وادل اور وننزیئے سے خاص شغف رکھتا ہوں۔ اور رسالوں میں تو نہیں البتہ وسالوں میں چھپتا دیتا بھی رہتا ہوں۔

قبل اس کے کہ وہ جھنجھلا کر کچھ فرمائیں ایک مولانا صاحب مع اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کے وضو کرکے ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے ہمارے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ وہ عصر کے وقت ظہر کی نماز پڑھنے آئے تھے۔

آپ ذرا اس سیٹ پر ہو جائیں میں ظہر کی نماز پڑھوں گا۔

ہم سب نے مؤدب ہو کر ان کے لئے جگہ بنائی۔ خیال یہ تھا کہ وہ نماز قصر کریں گے لیکن انھوں نے نفل تک پڑھ ڈالے نماز ختم کی تو میرے ہمسفر دوست نے میرے منع کرنے کے باوجود ان پر اعتراض جڑ دیا۔

سفر میں تو نماز آدھی ہو جاتی ہے —

مولانا صاحب نے بڑی نفرت وحقارت سے معترض کو دیکھا۔ اس کے تنگ لباس کو دیکھا۔ اس کی وضع قطع کو دیکھا —

اور سوال کا جواب دینے کے بجائے انھوں نے ایک نئی بحث کا آغاز کر ڈالا۔

تمھیں کیا پتہ مذہب کسے کہتے ہیں —؟

کیوں نہیں ہم مسلمان ہیں — میرے ہمسفر دوست کو غصہ آگیا۔

تم مسلمان ہو — انھوں نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا — تمھیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی —

اچھا اگر مسلمان ہو تو دعائے قنوت سناؤ —

میرے ہمسفر دوست کا رنگ اڑ گیا۔

سناؤں نا ــــ

ان کے لہجے میں تمسخر تھا، تضحیک تھی ــــ

اچھا چلو دعائے قنوت چھوڑو ــــ یہی بتلا دو کہ نماز جنازہ کیسے ادا کرتے ہیں ــ ؟

اپنے ہمسفر کو لاجواب دیکھ کر میں نے نہایت ادب سے ہاتھ اٹھا کر گذارش کی ۔

قبلہ ! مولانا صاحب میں سناؤں دعائے قنوت ــــ !

بات آپ سے نہیں ہو رہی ــــ مولانا صاحب نے خفگی سے کہا ۔

پھر بھی میں نے بات چپکا ہی دی ۔

مجھے سورہ یٰسین بھی حفظ ہے، اور نماز جنازہ بھی ــ حکم ہو تو ــــ !

وہ چڑ گئے ــــ آپ سے بات نہیں ہو رہی صاحب ۔

میں نے آہستہ سے اپنے سراسیمہ ہمسفر سے کہا ــ بُرے پھنسے ــ

میرے ہمسفر کو پسینہ آگیا تھا ۔ پسینے کے ساتھ ساتھ پنڈی کا اسٹیشن بھی آگیا تھا ــ میں جلدی سے بیگ سنبھال کر ان دونوں کو خدا کے سپرد کر کے پلیٹ فارم پر اتر آیا ــ یہاں سے مجھے کوہاٹ کے لئے ٹرین پکڑنی تھی ــ مجھے یقین ہے کہ میرے اترنے کے بعد خواتین والے صاحب نے اطمینان کا لمبا سانس لیا ہوگا ۔

طلسماتِ اُلو

(صفحہ ۳۹۰ سے آگے)

نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ اگر بستی میں بول پڑے تو ویرانہ ہو جائے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اسے دیکھتے ہی لاحول پڑھ دیا کریں۔

خبردار ۔ اُلو کو پکڑتے ہی ذبح کر دیں، ورنہ انسانی زبان میں گفتگو کرنے لگے گا۔ ناخوش ہونے پر بددعا بھی دے سکتا ہے۔ زندہ اُلو ہرگز ہرگز گھر میں نہ رکھیں۔ ورنہ نقصانات پہونچ جائیں گے۔

ہمارا دوستانہ مشورہ ہے کہ اُلو کے طلسم سے کام لینے کے لئے پلاسٹک کے اُلو کام میں لائے جائیں۔ اور اصل سے دور ہی دور رہا جائے۔ "رسک" لینے کی اس لئے بھی ضرورت نہیں کہ عام انسانوں میں بھی ہم کو ہر قسم کے اُلو مل جاتے ہیں جن کو بلا تکلف کام میں لایا جا سکتا ہے ــــ ہم نے ایسے اُلو بھی دیکھے ہیں، جو زندگی بھر اُلو کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ لہٰذا کیوں نہ ان سے کام بھی لیا جائے اور ان سے دور ہی دور بھی رہا جائے۔

ختم شد

انجم اعظمی ٥ سحر انصاری

نئی کتابیں

(تعارف و تبصرہ)

(تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

شہرِ درد ٥ جرمنی نامہ

نوجوان ورثہ کی داستانِ غم

شہرِ درد

شعری مجموعہ

مصنفہ : ادا جعفری

ناشر : گلڈ اشاعت گھر ۱۶۔بی سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

صفحات : ۲۰۷ قیمت : چھ روپے۔

ادا بدایونی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں ایک نیا لہجہ ، ایک نئی آواز تھی۔ اس نظم کا شمار جدید شاعری کی چند بہت اچھی تخلیقات میں کیا گیا۔ ادا کو بے حد سراہا گیا اور ان سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہو گئیں۔ لیکن درمیان میں ادا نے ایک طویل عرصہ گذارا ہے۔ جس میں وہ یا تو خاموش رہی ہیں یا بہت کم کہا ہے۔

"شہر درد" ادا بدایونی کی فنی پختگی کی ایک نئی منزل ہے۔ اس کے مطالعے سے گمان گزرتا ہے کہ ادا نے بعض حالات سے مجبور ہو کر فن سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کی ہوگی، لیکن فن انہیں دوبارہ رسوائی کے کوچے میں کھینچ لایا۔ یہ دونوں شعر اس سلسلے میں بڑے با معنی ہیں ۔

ہم تو کتنا کے گزرے مڑ کیا کریں
راستے سب کے سب آپ کے گھر گئے

کیسے کٹتیں پہاڑ سی راتیں
دل سے کانٹا اگر نکل جاتا

نوجوان ورتھر کی داستانِ غم

(ناول)

مصنف : گوئٹے
مترجم : ڈاکٹر ریاض الحسن ایم اے۔ پی ایچ ڈی
ناشر : ادبی سنڈیکیٹ ۱/۴ - بلاک ۳ ایف ۔ ناظم آباد کراچی
صفحات : ۱۹۲　　قیمت : ۵ روپے ۲۵ پیسے

مشہور المانوی شاعر گوئٹے کی منظوم تمثیل " فاؤسٹ " سے اردو داں طبقہ اچھی طرح واقف ہے کیونکہ اس کے کئی منثور و منظوم ترجمے اب تک ہو چکے ہیں۔ گوئٹے کے ناول " نوجوان ورتھر کی داستانِ غم " کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ گوئٹے جتنا عظیم شاعر تھا اتنا ہی صاحب طرز اور مقتدر نثر نگار بھی تھا۔ سائنس اور سماجی علوم سے اس کی بے پناہ وابستگی نے گوئٹے کو زندگی کے ایسے زاویئے دکھا دیئے تھے جو عام طور پر عام افراد کے مشاہدے میں نہیں آنے پاتے۔ ورتھر کی داستانِ غم میں گوئٹے نے اپنے عہد کے ایک ایسے نوجوان کا المیہ بیان کیا ہے جس نے کلیسائی بے اعتباری ، تشکیک اور تذبذب کے دور میں شعور کی دولت پائی اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک شادی شدہ خاتون شارلٹ سے محبت کرنے لگا ۔ لیکن عزتِ نفس اور زندگی کی اعلیٰ قدروں پر ایمان رکھنے کی وجہ سے وہ مزید تکلیف اٹھانے کے بجائے خودکشی کو ترجیح دیتا ہے اور بالآخر ایک معصوم دل اور مضطرب روح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے ۔ گوئٹے کا یہ ناول جس قدر مشہور ہوا اتنی شہرت شاید ہی کسی ناول کو نصیب ہوئی ہو۔ فرانس کے حکمران نپولین نے ایک ملاقات میں خود گوئٹے سے یہ کہا تھا کہ اس نے " ورتھر " کو سات دفعہ پڑھا ہے ۔ اور جب اس نے مصر پر چڑھائی کی تھی تو اس وقت بھی سفر میں اس کے ساتھ یہ کتاب موجود تھی۔ گوئٹے کا یہ ناول شاید اسی لئے ہمیشہ سے باغ و بہار ہے کہ اس کا موضوع فرسودہ ہونے والا نہیں ہے ۔ اس میں جس قصے کو المیے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے وہ ہر آزاد، خوددار اور حساس فرد کا مقدر ہے جو زمان و مکان سے مختص نہیں ہے۔

ڈاکٹر ریاض الحسن ایم اے - پی ایچ ڈی نے سنہ ۱۹۳۳ء میں اردو زبان میں گوئٹے کی اس تصنیف کا ترجمہ کیا تھا ۔ اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ براہ راست جرمن زبان سے اردو کا خوب صورت لباس تیار کیا گیا ہے۔

پاکستان میں اس کا دوسرا ایڈیشن اسی سال شائع ہوا ہے ۔ امید ہے کہ نئی نسل کے لوگ اس ترجمے سے بھرپور استفادہ کریں گے ۔

ڈاکٹر ریاض الحسن کا ترجمہ شگفتہ اور رواں دواں ہے اور ایک اچھے ترجمے کی تمام خوبیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔

(سحر انصاری)


SHEAFFER
Skrip

پی آئی اے

کی پروازیں

بنکاک
پیرس
استنبول
فرینکفرٹ
نیروبی
بغداد
روم

جاتی ہیں

ان کے علاوہ پی آئی اے کی پروازیں:۔ لندن - جنیوا - قاہرہ - بیروت - ماسکو - تہران - کویت - جدہ - ظہران - دوحا - دوبئی - بحرین - کابل - کراچی - ڈھاکہ - کھٹمنڈو - رنگون - کینٹن - شنگھائی - کو بھی جاتی ہیں۔

PIA

مزید تفصیلات کیلئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا کسی پی آئی اے آفس سے رجوع فرمائیں۔

پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز





سڑکوں کے قانون

- اچانک گاڑی مت روکیے۔
  ہمیشہ اپنے ارادے کا واضح اشارہ دیجیے۔
  رفتار کم کیجیے اور جہاں تک ممکن ہو سڑک کے بائیں جانب رہیے
- اوورٹیک کرنے کیلئے سمتوں کا اشارہ استعمال کیجیے۔
  اوورٹیک کرنے سے پہلے ایسا اشارہ دیجیے جیسے
  آپ دائیں جانب مڑنا چاہتے ہیں۔ اوورٹیک کرنے کے
  بعد سمت بتانے والے اشارہ کو اپنی عام حالت پر لے آئیے۔
- جب چوڑی سڑک اور گلی کے نکڑ پر پہنچیں۔ تو رک جائیں۔
  ہمیشہ چوڑی سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کو گزرنے کا
  موقع دیں۔ اگر کسی قسم کا اندیشہ ہو تو اس وقت تک
  ٹھہرے رہیں جب تک کہ آگے بڑھنا
  قطعی محفوظ نہ ہو۔
- ایسے چوراہوں پر جہاں دو مساوی اہمیت کی
  سڑکیں ملتی ہوں داہنے طرف سے آنے والی
  گاڑیوں کو راستہ دیں۔
- آپ اپنی گاڑی کسی نکڑ تک لاکر ٹھہر گئے ہیں تو
  صرف یہ فرض کرکے آگے کی طرف مت بڑھیے۔
  کہ راستہ صاف ہوگا۔





دوسروں کیلئے
مکمل بے پرواہی

اکثر ایسا ہوتا ہے۔ آگے جانے والی گاڑی کسی اشارے کے
بغیر اچانک رک جاتی ہے۔ مناسب اشارہ دینے اور روکنے
سے پہلے رفتار کم کرنے سے ایک خطرناک تصادم، گاڑی کی
ٹوٹ پھوٹ اور اپنے آپ کو یا دوسروں کو
زخمی ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔
اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔

م۔ احمد

رفتارِ عمل

ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

یونیورسٹیاں انگریزی کے بجائے قومی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنائیں (جسٹس وحید الدین)

انگریزی ذریعۂ تعلیم سے قوم کو زبردست نقصان پہنچ رہا ہے

اُردو ذریعۂ تعلیم بنانے پر کراچی یونیورسٹی کو خراجِ تحسین

لاہور۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس وحیدالدین احمد نے کراچی یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ملک کی یونیورسٹیوں پر زور دیا ہے کہ وہ انگریزی کے بجائے اردو اور بنگالی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے موثر اقدامات عمل میں لائیں۔ انہوں نے کہا کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم برقرار رکھنے سے قوم کے نوجوانوں کو طرح طرح کی مشکلات درپیش ہیں۔ کیونکہ پاکستان کے عوام اور نوجوان کسی غیرملکی زبان میں نہ تو صحیح طور پر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں اور نہ صحیح طور پر تعلیم ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دستور میں اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ سنہ ۱۹۷۲ء تک انگریزی کی جگہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے گا ــــ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس سلسلے میں بنیادی انتظامات ابھی تک نہیں کئے گئے۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی کو مبارکباد دی کہ اس نے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں پہل کی ہے اور امید ظاہر کی دوسری یونیورسٹیاں بھی ایسے ہی اقدام عمل میں لائیں گی۔

یونیسکو کے ادبی انعامات

ڈھاکہ۔ پاکستان کے قومی کتاب مرکز نے اعلان کیا ہے کہ عام دلچسپی کے موضوعات بالخصوص بچوں کے لوک گیت لوک کہانیوں پر مبنی تخلیقات پر سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء کا یونیسکو ادبی انعام فرخ احمد اور اشرف صدیقی کی کتابوں پر دیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے نام "پاکھر کھاشا" اور "کشوہ گنجیر لوک کہانی" ہیں جن کو بنگالی اکیڈیمی نے شائع کیا ہے ہر انعام کی رقم دو دو ہزار روپے ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نئے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم

علی گڑھ۔ اردو زبان کے مشہور ادیب اور عربی زبان کے مستند عالم ڈاکٹر عبدالعلیم کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نیا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم اس سے قبل اسی یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے شعبہ کے صدر تھے۔

تہران یونیورسٹی سے تین پاکستانیوں کو ڈاکٹریٹ

راولپنڈی۔ تہران یونیورسٹی نے فارسی زبان وادب پر تحقیقی کام کے سلسلے میں پشاور یونیورسٹی کے لیکچرر سید مرتضیٰ حیدری، محمد صدیق جان لیکچرر سلامیہ کالج لائل پور اور فدا پنجوانی کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں عطا کی ہیں۔

انور سدید ایم اے اردو میں اول آئے

لاہور۔ مشہور ادیب انور سدید امسال پنجاب یونیورسٹی کے امتحان ایم اے اردو میں اول آئے ہیں۔ انور سدید کے مضامین اور افسانے متعدد معیاری ادبی پرچوں میں شائع ہوتے ہیں۔

آرسی ڈی کا تحقیقاتی مرکز ادبی تخلیقات کے تراجم کرے گا

تہران۔ ادارہ برائے علاقائی تعاون وترقی کے ثقافتی تحقیقاتی مرکز نے انقرہ میں اپنے ایک اجلاس میں گزشتہ دنوں ہر سہ ممالک کے درمیان عظیم ترین ثقافتی روابط کی ترقی پر زور دیتے ہوئے تجویز پیش کی ہے کہ ہر ممبر ملک کی ادبی تخلیقات کا دوسرے ممبر ممالک کی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔

سی۔ ڈے۔ لیوس۔ ملک الشعراء

لندن۔ مشہور شاعر اور نقاد سیسل ڈے لیوس کو جان مینسفیلڈ کے انتقال کے بعد "ملک الشعراء" کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ یہ اعزاز صرف بلند پایہ اور شہرت یافتہ ادبی شخصیتوں کو ملتا ہے۔ جدید انگریزی شاعری میں سیسل ڈے لیوس ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اس اعزاز کی خبر سن کر انہوں نے جو اظہار خیال کیا ہے وہ ان کی فکری عظمت اور فطری بے باکی پر روشنی ڈالتا ہے۔ انہوں نے کہا "ملک الشعراء ہونے کو کچھ لوگ ایک اعزاز اور کچھ موت کا بوسہ کہتے ہیں"۔ 'A HOPE FOR POETRY' اور 'THE POETIC IMAGE' لیوس کی مشہور تنقیدی کتابیں ہیں۔

صابر تھاریانی کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ

کراچی۔ گجراتی زبان کے مشہور شاعر صابر تھاریانی کے قطعات کا منظوم اردو ترجمہ گزشتہ دنوں شائع ہوا ہے۔ گجراتی قطعات کا ترجمہ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی نے کیا ہے۔

مجنوں گورکھپوری کے اعزاز میں متعدد تقریبات

کراچی - خالق دینا ہال لائبریری کی جانب سے اردو کے مشہور نقاد مجنوں گورکھپوری کے ساتھ ایک شام کا انعقاد کیا گیا۔ شروع میں انجم اعظمی نے "ادب میں خواب اور حقیقت کا امتزاج" اور سحر انصاری نے "ادب کی موجودہ رفتار" پر مقالے پڑھے۔ مجنوں گورکھپوری نے مقالوں پر اظہارِ خیال کرنے کے بعد حاضرین کے سوالات کا جواب دیا۔ مجنوں صاحب نے کہا کہ وہ کل بھی ترقی پسند تھے اور آج بھی ترقی پسند ہیں۔ لیکن انہیں یہ کہنا ہے کہ ترقی پسند تحریک کو نئے زمانے میں کام کرنے کے لئے نیا لائحہ عمل پیش کرنا چاہئے۔ مجنوں صاحب نے کہا کہ یہ دور انتشار اور بحران کا ہے۔ لیکن اسے پوری وضاحت سے ادب میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

اس شام کے علاوہ مجنوں گورکھپوری کے اعزاز میں جامعہ کراچی، عبداللہ کالج، عبداللہ ہارون کالج، جناح کالج، نیو باغ کالج، انجمن ترقی اردو اور رائٹرز گلڈ نے تقریبات منعقد کیں۔ جن میں مجنوں صاحب نے ادب کے مختلف مسائل پر اظہارِ خیال کیا۔ کراچی میں اُن کی آمد سے ادبی حلقوں میں خاصی گہما گہمی اور رونق رہی۔ اور کراچی کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے کثیر تعداد میں شریک ہو کر مجنوں صاحب کے ارشادات سے استفادہ کیا۔

رشید احمد صدیقی پر ڈاکٹریٹ

حیدرآباد دکن - عثمانیہ یونیورسٹی نے سلیمان اطہر کو ان کے مقالے "رشید احمد صدیقی" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دینے کا اعلان کیا ہے۔

ادارۂ یادگارِ غالب کا قیام

کراچی - برصغیر پاک و ہند کے عظیم المرتبت شاعر مرزا غالب کی صد سالہ برسی فروری ۱۹۶۹ء میں شایانِ شان طریقے پر منانے کے لئے یہاں "ادارۂ یادگارِ غالب" کا قیام عمل میں آیا ہے۔ جس کے صدر فیض احمد فیض، معتمد عمومی مرزا ظفر الحسن، معتمد آمنہ مجید ملک، خازن اے مہاجر، اور اراکین میں سید سبط حسن، ممتاز حسین، شان الحق حقی، افتخار احمد عدنی، حمید نسیم، مسلم ضیائی، خواجہ معین الدین اور شمس عارف شامل ہیں۔ "ادارۂ یادگارِ غالب" صد سالہ تقریبات کا وسیع پروگرام مرتب کر رہا ہے۔

رُوسی ادیبوں کی پاکستان میں آمد

کراچی - مشہور سوویت شاعر میخائل لوکونن، اور یوری روما نتیف افریشیائی شعبہ کے سربراہ اِن دنوں پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے ہیں اور گلڈ کے مہمان ہیں۔ کراچی، لاڑکانہ، لاہور، ملتان اور راولپنڈی کا دورہ کرتے ہوئے وفد کے اراکین نے انکشاف کیا کہ جلد ہی پاکستان رائٹرز گلڈ اور سوویت رائٹرز یونین کے درمیان کتابوں کے تبادلے اور ترجمے کا ایک معاہدہ کیا جائے گا۔ نیز دونوں ملکوں میں ادیبوں کے تبادلے کا ایک جامع پروگرام بھی مرتب کیا جائے گا، تاکہ دونوں ملکوں کے دانشور طبقہ کو ایک دوسرے کی تہذیب و ثقافت کو سمجھنے میں مدد ملے۔ لینن انعام یافتہ شاعر میخائل لوکونن نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ روس اور پاکستان کے ادیب ایک دوسرے

سے بہت قریب ہیں اور انہیں گہری جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ روسی ادیبوں کا یہ وفد رائٹرز گلڈ کی دعوت پر پاکستان آیا ہے اور گلڈ کی نویں سالگرہ کی تقریبات میں جو ۳۱ جنوری ۱۹۷۰ء کو منعقد ہوں گی شرکت کرے گا۔

حبیب بنک کا
مجلس ترقی ادب کو عطیہ

لاہور۔ حبیب بنک لمیٹڈ لاہور نے اردو ادب کی ترویج و ترقی میں مجلس کی ان قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مجلس ترقی ادب لاہور کو چھ ہزار روپے کا عطیہ دیا ہے۔ یہ رقم بنک کے ایک آفیسر نے مجلس کے ناظم سید امتیاز علی تاج کو چیک کی صورت میں پیش کی۔ عطیہ قبول کرتے ہوئے ناظم مجلس نے فرمایا کہ حبیب بنک نے ملکی اور ملی استحکام میں جو بلند پایہ کردار ادا کیا ہے، وہ ناقابل فراموش ہے۔ میں یہ تحفہ بصد شکریہ قبول کرتا ہوں۔ میں مجلس کو اس عطیہ سے مطلع کرتے ہوئے فخر محسوس کروں گا۔

امریکہ میں غالب کی صد سالہ برسی

لاہور۔ کئی امریکی یونیورسٹیوں نے ۷۰-۱۹۶۹ء کے تعلیمی سال میں اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی صد سالہ برسی منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مرزا غالب کی صد سالہ برسی منانے کے لئے جو کمیٹی تشکیل کی گئی ہے، اس نے پاکستانی نقاد ڈاکٹر محمد صادق کو اس موقع پر غالب پر سیمینار اور دیگر تقریبات میں خطبات دینے کے لئے مدعو کیا ہے۔

اباسین آرٹ کونسل کی جانب سے
بہترین کتابوں پر انعام

پشاور۔ اباسین آرٹ کونسل پشاور نے سنہ ۱۹۶۸ء کی پانچ بہترین اردو اور پشتو نظم و نثر کی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ اردو نظم کا پہلا انعام فارغ بخاری کی کتاب "پشتو شاعری" اور اردو نثر کا پہلا انعام عمر یوسف زئی کو ان کی کتاب "آگ اور سائے" پر دیا گیا ہے اور پشتو نثر کا پہلا انعام "سید بہادر شاہ ظفر کو، اور پشتو نظم کا انعام محمد ہاشم بابر کو دیا گیا ہے۔

منٹو کی یاد میں!

لاہور۔ سعادت حسن منٹو کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے منٹو سوسائٹی کے زیر اہتمام گذشتہ دنوں یہاں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ... احمد ندیم قاسمی نے کہا کہ منٹو ایک دلیر لکھنے والے تھے۔ ان کے مداح انہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے وہ انسان کی خوبیوں اور کمزوریوں سے خوب واقف تھے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ منٹو گھٹیا جنسی تعلقات ہی سے دلچسپی رکھتے تھے، اور جنس ان پر سوار تھی۔ بلکہ وہ اس سے اسی حد تک دلچسپی رکھتے تھے جس حد تک اس کا ہماری زندگی سے تعلق ہے۔ پروفیسر ایرک اسپرین نے بھی اپنی تقریر میں منٹو کے فن کو سراہا۔

تیس (۳۰) سال کے بعد

نقشِ چغتائی

کا

نیا ایڈیشن نہایت آب و تاب اور رعنائی سے شائع کیا گیا ہے

یہ ایڈیشن: تصاویر کی ندرت، حُسنِ طباعت، سائز، کاغذ، جلد، ضخامت کے اعتبار سے پہلے ایڈیشن سے بالکل مختلف، نہایت جاذبِ نظر اور دلکش ہے۔

چغتائی آرٹ: کی رنگینیوں کا بے مثل مرقع ہے۔ اس کی اشاعت پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔

یہ نیا ایڈیشن: چھ رنگین تصاویر، سولہ ایک ایک رنگ تصاویر اور تین صفحہ تمہید سے مزین ہے۔ ہر ایک صفحہ منقش حاشیہ کے ساتھ دو رنگ میں اور تمام متن بلاک میں دلربا کاغذ پر چھپا ہے۔ ع
نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول
کی مثال قائم کی گئی ہے۔

آرٹ اور ادب: کے اس غیر فانی نقش کو دیکھ کر آپ پر ایک خاص وجدانی کیفیت طاری ہوگی۔ مصوری کی عدیم النظیر خدمت کے علاوہ اردو ادب اور طباعت کی عظیم الشان خدمت انجام دی گئی ہے۔

جلد سنہری نہایت خوبصورت بائبل نما

قیمت:- ۲۰ روپے

شیخ مبارک علی تاجر کتب، اندرون لوہاری گیٹ لاہور

آپ کی لائبریری کے لئے

مکتبۂ افکار اور اردو دنیا کی خوب اور خوبصورت کتابیں

اسلامیات

سیرت رسول اللہ — پروفیسر سید نواب علی — ۱۲/-
تاریخ صحف سماوی — " — ۵/-
معارف الحدیث — " — ۴/۷۵

ناول و افسانہ

حیدری کی مختصر کہانیاں — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۶/-
چاندی کا گھاؤ — کرشن چندر — ۹/-
ایک وائلن سمندر کے کنارے — " — ۶/-
سڑک واپس جاتی ہے — " — ۶/۷۵
ایک عورت ہزار دیوانے — " — ۵/-
ایک خوشبو اڑی اڑی سی — " — ۵/۲۵
دھواں دھواں سویرا — انور عظیم — ۸/-
اک بوند لہو کی — جوگندر پال — ۴/۲۵

شخصیت و فن

مجاز ایک آہنگ — مرتبہ: صہبا لکھنوی — ۱۵/-
دوسرا ایڈیشن (زیر اشاعت)
جوش نمبر — " — ۲۱/-
حفیظ نمبر — " — ۱۰/-
فیض نمبر — " — ۱۲/-

تنقید و تحقیق

تنقیدی تجربے — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۱۰/-
مومن اور مطالعۂ مومن — " — ۱۵/-
شاعری اور شاعری کی تنقید — " — ۱۲/-
جدید شاعری — " — ۱۵/-
رسالۂ کائنات — " — ۳/-
ہفت گلشن — " — ۴/-
شکنتلا — " — ۳/-
مادھونل اور کام کندلا — " — ۵/-
تہذیب و تحریر — مجتبیٰ حسین — ۵/-

شاعری

نبضِ دوراں — پروفیسر محمد علیگ — ۷/-
سی حرفی — مختار صدیقی — ۴/۵۰

سفرنامہ

میرے خوابوں کی سرزمین / مشرقی پاکستان — صہبا لکھنوی — ۴/-

زیر ترتیب

غالب ایک مطالعہ — مرتبہ: صہبا لکھنوی

لائبریریوں اور انفرادی خریداروں کے لیے معقول کمیشن کی رعایت

آج ہی طلب فرمائیے

مکتبۂ افکار، رابسن روڈ، کراچی — فون ۷۳۹۹۴